قرآن وحدیث کی روشنی میں تحقیقی فتاویٰ کا مجموعہ
فتاویٰ عباد الرحمٰن
جلد پنجم
مفتی عبد الرحمٰن ملاخیل صاحب دامت برکاتہم
رئیس دار الافتاء والتحقیق خطیب ابوبکر صدیق مسجد ڈیفنس
دار الافتاء والتحقیق
ابوبکر صدیق مسجد - فیز ۲ ڈی ایچ اے، کراچی
pasbanehaq

قرآن وحدیث کی روشنی میں تحقیقی فتاویٰ کا مجموعہ

فتاویٰ عباد الرحمٰن

جلد پنجم

مفتی عبد الرحمٰن ملاخیل صاحب دامت برکاتہم
رئیس دار الافتاء والتحقیق خطیب ابوبکر صدیق مسجد ڈیفنس

دار الافتاء والتحقیق
ابوبکر صدیق مسجد۔ فیز ۲ ڈی ایچ اے، کراچی

ناشر: مفتی عبدالرحمٰن ملاخیل صاحب رئیس دارالافتاء والتحقیق ابوبکر صدیق مسجد فیز ۲ ڈی ایچ اے

مطبع: ایجوکیشنل پریس پاکستان چوک کراچی فون نمبر: 32630051

مسائل معلوم کرنے کے لئے مفتی صاحب سے مندرجہ ذیل نمبروں پر رابطہ کرسکتے ہیں براہ کرم نماز اور آرام کے اوقات کا خیال رکھیں۔

برائے رابطہ فون نمبر: 02135804388

موبائل: 03132775126 0333-2251145

☆ ملنے کے پتے ☆

ناشر: مفتی عبدالرحمٰن ملاخیل (مندرجہ بالا تینوں نمبرز)

ایچ ایم سعید کمپنی ادب منزل پاکستان چوک کراچی فون نمبر: 32638114

دارالاشاعت اردو بازار کراچی فون نمبر: 32631861

اسلامی کتب خانہ علامہ بنوری ٹاؤن کراچی

قرآن محل اردو بازار ڈیرہ اسماعیل خان

مولوی سیف الرحمٰن عبدل خیل ڈیرہ اسماعیل خان فون نمبر: 03139341266

مکتبہ جاوید میانوالی شہر

مکتبہ رشیدیہ ۳ شیش محل روڈ لاہور فون نمبر: 04237364516

مکتبہ رشیدیہ سرکی روڈ کوئٹہ فون نمبر: 0812662263

نمبر شمار	عنوانات	صفحہ نمبر
1	﴿طلاق صریح اور کنایہ کا بیان﴾	32

نمبر شمار	عنوانات	صفحہ نمبر

نمبر شمار	عنوانات	صفحہ نمبر
38	﴿طلاق معلق کا بیان﴾	72

نمبر شمار	عنوانات	صفحہ نمبر

نمبر شمار | عنوانات | صفحہ نمبر

نمبر شمار	عنوانات	صفحہ نمبر

نمبر شمار	عنوانات	صفحہ نمبر

نمبر شمار	عنوانات	صفحہ نمبر

نمبر شمار	عنوانات	صفحہ نمبر

نمبر شمار	عنوانات	صفحہ نمبر

نمبر شمار	عنوانات	صفحہ نمبر

نمبر شمار	عنوانات	صفحہ نمبر

صفحہ نمبر	عنوانات	نمبر شمار

نمبر شمار	عنوانات	صفحہ نمبر

نمبر شمار	عنوانات	صفحہ نمبر

نمبر شمار	عنوانات	صفحہ نمبر
322	﴿سود کے پیسوں سے خریدی ہوئی چیز کو مسجد میں استعمال کرنے کا حکم﴾	339
323	﴿مسجد کے ملبہ کا حکم﴾	340
324	﴿ایسی تعمیر جسکے لئے مسجد کی نیت نہ کی ہو، کا حکم﴾	341
325	﴿نابالغ بچوں کو مسجد میں لانے کا حکم﴾	341
326	﴿امام کیلئے مسجد کی چیز باہر استعمال کرنے کا حکم﴾	342
327	**﴿کتاب الشرکۃ والمضاربۃ﴾**	343
328	﴿کسی شریک کو بطور ہبہ ملنے والی چیز میں دوسرے شرکاء کا حق نہیں﴾	343
329	﴿باپ اور بیٹوں کے درمیان مشترکہ تجارت کی ایک صورت کا حکم﴾	344
330	﴿گاڑی، جائیداد اور سامان وغیرہ سے شرکت کرنا جائز ہے یا نہیں﴾	345
331	﴿مشترکہ کاروبار میں بیٹے باپ کے معاون ہوتے ہیں شریک نہیں﴾	346
332	﴿شرکۃ الوجوہ کی ایک صورت کا بیان﴾	348
333	﴿شرکت کی ایک صورت﴾	351
334	﴿شریکین میں سے ایک مرتد ہو جائے تو شرکت باطل ہو جائے گی﴾	352
335	﴿مشترک کاروبار میں ایک بھائی کا منافع پر ذاتی رقم لگانا﴾	352
336	﴿دو بھائیوں کے درمیان مشترکہ مال کی تقسیم﴾	353
337	﴿کوئی ایک شریک ذاتی طور پر عمارت بنوائے تو اسمیں شرکت ہوگی یا نہیں؟﴾	354
338	﴿شرکت عنان کا ایک مسئلہ﴾	355
339	﴿شرکت ومضاربت کیلئے نقدی ضروری ہے﴾	356
340	﴿باپ اور بیٹوں کی مشترک کمائی باپ کی ملکیت ہے﴾	358

نمبر شمار | عنوانات | صفحہ نمبر

نمبر شمار	عنوانات	صفحہ نمبر

نمبر شمار	عنوانات	صفحہ نمبر

نمبر شمار	عنوانات	صفحہ نمبر

نمبر شمار	عنوانات	صفحہ نمبر
452	﴿اراضی مکہ کی خرید وفروخت کا حکم﴾	466
453	﴿اضافی اخراجات کو قیمت خرید کیساتھ ملانیکا حکم﴾	467
454	﴿نقد رقم قرض دینے کی بجائے ادھار سامان دینا﴾	468
455	﴿کمپنی کیلئے مال کمیشن پر فروخت کرنے کے متعلق ایک سوال﴾	469
456	﴿ڈیلر کے لئے کمیشن لینا جائز ہے﴾	470
457	﴿گارنٹی پر سامان دینے کا حکم﴾	471
458	﴿حرام اور ناجائز چیز کے بیچنے کا حکم﴾	472
459	﴿ادائیگی ثمن سے پہلے مشتری کے قبضے میں مبیع کا ہلاک ہونا﴾	472
460	﴿ایک چیز کو مختلف داموں پر فروخت کرنا﴾	473
461	﴿یوٹیلٹی اسٹور سے اشیاء خریدنے کا حکم﴾	474
462	﴿کسی چیز کو اس شرط کے ساتھ بیچنا کہ واپس مجھ ہی کو بیچو گے﴾	474
463	﴿شرط فاسد لگانے سے بیع فاسد ہو جاتی ہے﴾	475
464	﴿بیع فسخ ہو تو بیعانہ کی رقم واپس کرنا ضروری ہے﴾	476
465	﴿جانوروں کو قسطوں پر لینا﴾	476
466	﴿کتے کی خرید وفروخت کا حکم﴾	477
467	﴿ادائیگی سے پہلے بائع کا اسی چیز کو واپس کم ریٹ پر خریدنا﴾	478
468	﴿سونا ادھار بیچنا؟﴾	479
469	﴿سونا، سونے کے بدلے میں ہو تو نقد اور برابری ضروری ہے﴾	480
470	﴿مٹی میں شامل سونے چاندی کے ذرات مٹی سمیت پیسوں سے بیچنا جائز ہے﴾	481

صفحہ نمبر | عنوانات | نمبر شمار

صفحہ نمبر	عنوانات	نمبر شمار

صفحہ نمبر	عنوانات	نمبر شمار

نمبر شمار	عنوانات	صفحہ نمبر

﴿طلاق صریح اور کنایہ کا بیان﴾

﴿تین طلاقوں کے متعلق ایک مسئلہ﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام مفتیان عظام مسئلہ ذیل کے بابت:

مسئلہ: زید اور عائشہ دونوں میاں بیوی ہیں، عائشہ کی گھر میں ساس سے کسی مسئلہ پر الجھن ہوئی تو میکے چلے گئی زید کو پتہ چلا تو اسکے گھر چلا گیا اور کہا "مجھے آپ نے بہت تنگ کرلیا اس لئے میں تمہیں طلاق دیدونگا اپنی حرکتوں سے باز آجاؤ" تو اسکے بھائی نے زید سے کہا کہ تم طلاق دے رہے ہو، زید نے ہاں کہا، پھر زید سے عائشہ کے بھائی نے کہا کہ کیا طلاق ہے؟ تو زید نے کہا، طلاق ہے، طلاق ہے، طلاق ہے۔ پشتو میں عائشہ کے بھائی نے کہا "طلاق دہ؟ تو زید نے کہا "طلاق دہ، طلاق دہ، طلاق دہ"۔ ازراہ کرم قرآن وحدیث کی روشنی میں جواب مرحمت فرمائیں۔

﴿جواب﴾ مذکورہ صورت میں تینوں طلاقیں واقع ہوگئی ہیں، اب کوئی رجوع نہیں ہوسکتا اور حلالہ شرعیہ کے بغیر دوبارہ نکاح بھی نہیں ہوسکتا۔ عورت عدت پوری گذار کر چاہے تو دوسری جگہ شادی کرسکتی ہے۔

لما في الدر المختار: (۲۹۳/۳، طبع سعيد)

كرر لفظ الطلاق وقع الكل وان نوى التاكيد دين

ولما في فتاوى قاضيخان: (۲۱۵/۱، طبع قديمي)

رجل قال لغيره أطلقت امراتك؟ فقال نعم بالهجاء او قال بلى بالهجاء ولم يتكلم به يقع الطلاق.

ولما في العالمگيرية: (۳۱۰/۱، طبع قديمي)

متى كرر لفظ الطلاق بحرف الواو او بغير حرف الواو يتعدد الطلاق ـــــ رجل قال لغيره: أطلقت امراتك؟ فقال نعم بالهجاء او قال بلى ـــ يقع الطلاق الخ

ولما في خلاصة الفتاوى: (۸۱/۲، طبع رشيديه)

رجل قال لاخر هل طلقت امراتك فقال بالهجاء، ن-ع-م بمعنى نعم او قال لها ابتدا انت ط.ا.ل.ق. بمعنى طالق يقع بخلاف ما لو قرا اية السجدة بالهجاء، حيث لايلزمه السجدة لانه ليس بقرآن، اما الطلاق يتعلق بلفظ يدل عليه.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: ریحان اللہ

۵ جمادی الثانی ۱۴۳۳ھ — فتویٰ نمبر ۳۷۷۸

﴿ایک دو تین بولنے سے طلاق نہیں ہوتی﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ اگر کسی نے اپنی بیوی سے کہا تجھے طلاق ہے پھر تھوڑی دیر خاموش رہنے کے بعد کہا ایک دو تین اب پوچھنا یہ ہے کہ مذکورہ صورت میں ایک طلاق واقع ہوگی یا تین طلاقیں؟

﴿جواب﴾ مذکورہ صورت میں دونوں جملوں کے درمیان خاموش رہنا محض سانس توڑنے کی غرض سے معمولی سا اگر تھا تو یہ کل ایک ہی بات شمار ہوگی اور تینوں طلاقیں واقع شمار ہوں گی اب رجوع نہیں ہوسکتا اور حلالہ شرعیہ کے بغیر دوبارہ نکاح بھی نہیں ہوسکتا البتہ اگر سانس توڑنے کی غرض سے خاموش نہیں ہوا بلکہ ویسے ہی ایک طلاق دینے کے بعد کچھ خاموش رہنے کے بعد پھر ایک دو تین بولا ہے تو اس صورت میں صرف ایک ہی طلاق واقع ہوگئی ہے دوران عدت وہ رجوع کرنا چاہے تو کرسکتا ہے۔

لما فی ردالمحتار جلد۳/۲۶۷ طبع ایچ ایم سعید

وفی الخانیہ قال لزوجتہ انت طالق وسکت ثم قال ثلاثا ان کان سکوتہ لانتطاع النفس تطلق ثلاثا والا تقع واحدۃً

ولما فی الفتاوی العالمگیریہ جلد۱/۸۶ طبع مکتبۃ رشیدیہ

رجل قال لامراتہ انت طالق وسکت ثم قال ثلاثا ان کان السکوت لانتطاع النفس یقع الثلاث وان کان لا لانتطاع النفس لا یقع الثلاث

ولما فی خلاصۃ الفتاوی جلد۱/۸۶ طبع مکتبۃ رشیدیۃ

وفی الفتاوی رجل قال لامراتہ انت طالق وسکت ثم قال ثلاثا ان کان السکوت لانتطاع النفس یقع الثلاث وان کان لا لانتطاع النفس لا یقع الثلاث.

واللہ اعلم بالصواب: شفقت اللہ — الجواب صحیح: مفتی عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ

فتوی نمبر: ۳۸۷۰ — ۲۴ ذی الحجہ ۱۴۳۴ھ

﴿بیوی کو تین طلاقیں دینے کا حکم﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک آدمی نے گھریلو لڑائی جھگڑے کے دوران اپنی بیوی کو تین مرتبہ کہہ دیا جا تجھے طلاق طلاق طلاق اب وہ شخص کہتا ہے کہ میں نے یہ الفاظ چونکہ نہایت غصے کی حالت میں کہے ہیں لہٰذا طلاق نہیں ہوئی پوچھنا یہ ہے کہ

اس طرح الفاظ کہنے کا شرعاً کیا حکم ہے اور غصے سے کہنے کی وجہ سے حکم پر کوئی اثر پڑتا ہے یا نہیں؟

﴿جواب﴾ مذکورہ صورت میں تینوں طلاقیں واقع ہوگئی ہیں اب رجوع نہیں ہوسکتا اور حلالہ شرعیہ کے بغیر نکاح نہیں ہوسکتا اور شوہر کا کہنا کہ "میں نے غصے کی حالت میں طلاق دی ہے اس لیے طلاق نہیں ہوئی" غلط ہے طلاق عموماً غصے کی حالت میں ہی دی جاتی ہے ہوش وحواس ہوتے ہوئے اگر چہ سخت غصے کی حالت میں ہو تب بھی طلاق واقع ہو جاتی ہے لہٰذا عورت عدت گزار کر دوسری جگہ چاہے تو شادی کرسکتی ہے اس شوہر کا اب کوئی حق زوجیت باقی نہیں رہا۔

لما فی قوله تعالیٰ سورة البقرة پاره ۲)

الطلاق مرتان فامساك بمعروف أو تسريح باحسان......الیٰ قوله تعالیٰ فان طلقها فلا تحل له حتیٰ تنكح زوجاً غيره....الخ

ولما فی سنن ابی داؤد:(۱/۳۲۴، مکتبه: رحمانیه)

عن سهل بن سعدٌ فی هذا الخبر قال فطلقها ثلٰث تطليقات عند رسول الله صلی الله عليه وسلم فانفذه رسول الله صلی الله عليه وسلم.

ولما فی الهدایه:(۳۷۳/۲ طبع رحمانیه)

وطلاق البدعة ان يطلقها ثلاثاًبكلمة واحدة او ثلاثاًفی طهرواحد فاذافعل ذالک وقع الطلاق وكان عاصياً

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ　　　　واللہ اعلم بالصواب: ضیاء الحق المکی

۳ محرم الحرام ۱۴۳۳ھ　　　　فتوی نمبر: ۳۶۲۴

﴿طلاق رجعی کی ایک صورت﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک شخص نے اپنی بیوی سے کہا کہ "تمہیں طلاق طلاق" تو اس صورت میں عورت کو کونسی اور کتنی طلاق واقع ہوئی؟ کیا شوہر بغیر نکاح رجوع کرسکتا ہے یا نہیں؟　　　　مستفتی: شاجہان ڈیروی

﴿جواب﴾ صورت مذکورہ میں عورت مدخول بہا ہے تو دو طلاق رجعی واقع ہوئی شوہر کو دوران عدت رجوع کا حق حاصل ہے لیکن یاد رہے آئندہ کیلئے صرف ایک طلاق کا حق باقی رہیگا، کسی بھی موقع پر مزید ایک طلاق دیدی تو رجوع نہ ہوسکے گا لہٰذا احتیاط سے رہے اور دوران عدت شوہر نے اگر رجوع نہیں کیا تو عدت گزرنے کے بعد عورت آزاد ہو جائیگی دوسری جگہ چاہے تو شادی کرسکے گی۔

لما فی قوله تعالیٰ:(پارہ ۲ آیت نمبر ۲۲۸/سورۃ بقرہ)

(وبعولتهن احق بردهن فی ذالک)

ولما فی روح المعانی (۲/۲۹۳)مکتبہ رشیدیہ

(احق بردهن)الی النکاح والرجعة الیهن وهذ اذاکان الطلاق رجعیا للایة بعدها

ولما فی الدر المختار:(۲/۲۹۳طبع:سعید)

کرر لفظ الطلاق وقع الکل وان نوی التاکید دین

وفی الشامیة قوله (وان نوی التاکید دین)بان قال للمدخول بها انت طالق انت طالق الخ قوله (وان نوی التاکید)ای وقع الکل قضاء وکذااذا اطلق اشباه ای بان لم ینوی استینا فا ولاتاکید لان الاصل عدم التاکید

ولما فی الفتاوی الهندیه:(۱/۳۵۵طبع: رشیدیہ)

ولو قال لها انت طالق طالق او انت طالق انت طالق ـــ تقع ثنتان اذاکانت المرئة مدخولا بها

ولما فی الفتاوی الولوالجیة:(۲/۱۳مکتبہ: فاروقیہ پشاور)

رجل قال لأ مرئته بعد الدخول بها انت طالق یقع ثنتان

الجواب صحیح:عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ واللہ اعلم بالصواب:سمیع الرحمٰن دیروی

۱۷محرم الحرام ۱۴۳۳ھ فتویٰ نمبر:

﴿بغیر ارادہ لفظ "طلاق" کہنے کا حکم﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ زید جو کہ اپنی بیوی ہندہ سے محو گفتگو تھا، دوران گفتگو بے ساختہ اسکی زبان سے یہ کلمات نکلے: طلاق، طلاق، طلاق دونوں میاں بیوی کا کہنا ہیکہ ہمارے درمیان معمول کی بات چیت ہو رہی تھی کوئی جھگڑا بھی نہیں ہوا اور نہ ہی زید غصہ میں تھا، کیا ایسی صورت میں زید کا ہندہ سے نکاح برقرار ہے؟ واضح رہے کہ زید کا یہ کہنا ہے کہ نا میرا ارادۂ طلاق تھا اور نا ہی نیتِ طلاق۔ مستفتی: محمد شعیب ایبٹ آباد

﴿جواب﴾ واضح رہے کہ مفتی غیب نہیں جانتا، سوال کے مطابق جواب دیتا ہے، سوال میں غلط بیانی سے کوئی کام لے تو وبال سوال کرنے والے پر ہوگا، لہذا زید کی زبان سے بے ساختہ طلاق، طلاق، طلاق کے محض یہی الفاظ نکلے ہیں اور ان الفاظ سے واقعی کوئی طلاق دینا مقصود نہ تھا اور نہ ہی کوئی نسبت جملہ میں موجود تھی تو ایسی صورت میں کوئی طلاق واقع نہیں ہوئی۔

لما فی الشامی:(۳/۲۴۸طبع سعید)

(قوله لتركه الاضافة)ای المعنوية فانها الشرط والخطاب من الاضافة المعنوية وكذا

الاشارة نحو هذه طالق وكذا نحو امرأتي طالق ...

أقول: ما ذكره الشارح من التعليل أصله لصاحب البحر أخذاً من قول البزازية في الأيمان: قال لها لا تخرجي من الدار إلا بإذني فإني حلفت بالطلاق فخرجت لا يقع لعدم ذكر حلفه بطلاقها ويحتمل الحلف بطلاق غيرها فالقول له اهـ ومثله في الخانية وفي هذا الأخذ نظر فإن مفهوم كلام البزازية أنه لو أراد الحلف بطلاقها يقع لأنه جعل القول له في صرفه إلى طلاق غيرها والمفهوم من تعليل الشارح تبعاً للبحر عدم الوقوع أصلاً لفقد شرط الإضافة مع أنه لو أراد طلاقها تكون الإضافة موجودة ويكون المعنى فإني حلفت بالطلاق منك أو بطلاقك، ولا يلزم كون الإضافة صريحة في كلامه لما في البحر لو قال: طالق فقيل له من عنيت؟ فقال امرأتي طلقت امرأته اهـ ... ويؤيده ما في البحر لو قال: امرأة طالق أو قال طلقت امرأة ثلاثاً وقال لم أعن امرأتي يصدق.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ　　　واللہ اعلم بالصواب: نعمان اقبال عفا اللہ عنہ

صفر الخیر ۱۴۳۱ھ　　　فتویٰ نمبر: ۲۴۳۳

﴿دورانِ گفتگو غلطی سے لفظ طلاق زبان سے نکلے تو ۔ ۔ ۔ ۔ ؟﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں مفتیانِ کرام اس مسئلے کے متعلق کہ زید اپنی بیوی کو کچھ اور کہنا چاہ رہا تھا لیکن غلطی سے لفظ طلاق نکل گیا، زید اس پر بہت نادم ہے اور اس کا ارادہ بھی نہیں تھا، کیا مذکورہ صورت میں طلاق واقع ہوگی؟

مستفتی: محمد عدنان

﴿جواب﴾ زید کی بیوی پر قضاءً تو ایک طلاق رجعی واقع ہوگئی ہے، البتہ دیانۃً طلاق واقع نہیں ہوئی بیوی طلاق کے معاملہ میں چونکہ قاضی کے حکم میں ہے اس لئے وہ طلاق شمار کرے۔

لما في التنوير مع الدر: (۲۲۸/۲، طبع امدادیہ)

(أو مخطئاً) بأن أراد التكلم بغير الطلاق فجرى على لسانه الطلاق.

وفي الشامية: بأن أراد أن يقول سبحان الله فجرى على لسانه أنت طالق تطلق، لأنه صريح لا يحتاج إلى النية لكن في القضاء، كطلاق الهازل واللاعب.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ　　　واللہ اعلم: محمد عزیز چترالی

۹ جمادی الاولیٰ ۱۴۲۷ھ　　　فتویٰ نمبر: ۲۷۹

﴿"میں نے تجھے طلاق دیدی" کئی مرتبہ بیوی سے کہنے کا حکم﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام کہ میری دو بیویاں ہیں بڑی بیوی اکثر مجھ سے تنگ

کلامی کرتی رہتی ہے، زیادہ تنگ آ کر میں نے اپنی بیوی کے بھائیوں کے سامنے جا کر کہا کہ میں نے اس کو طلاق دی اور پھر اپنی بیوی سے بھی آ کر کئی مرتبہ یہ لفظ کہا کہ میں نے تجھے طلاق دے دی، اب اس عورت کے بھائی دوبارہ میرے ساتھ اسکو بسانا چاہتے ہیں، اسکی کیا صورت ہو سکتی ہے؟

﴿جواب﴾ صورت مسئولہ میں تین طلاقیں واقع ہونے کی وجہ سے آپ کی بیوی آپ پر حرام ہو چکی ہے اور حلالہ شرعیہ کے بغیر دوبارہ بسانے کی کوئی صورت نہیں رہی، حلالہ شرعیہ کا مطلب یہ ہے کہ عدت کے بعد یہ عورت خود دوسری جگہ نکاح کر لے اور دوسرا شوہر باقاعدہ اس سے صحبت بھی کر لے پھر وہاں بھی اسے طلاق ہو جائے تو عدت گزارنے کے بعد دوبارہ نئے حق مہر کے ساتھ باہمی رضامندی سے نکاح ہو سکے گا۔

لمافی قولہ تعالی:(سورۃ البقرۃ،آیت ۲۲۹)

الطلاق مرتان فامساك بمعروف او تسريح باحسان — فان طلقها فلاتحل له من بعد حتى تنكح زوجاغيره — الآية.

ولمافی احکام القرآن للجصاص:(۱/۵۳۲،طبع قدیمی)

(حتى تنكح زوجاغيره)غاية التحريم الموقع بالثلاث فاذا وطئها الزوج الثاني ارتفع ذلك التحريم الموقع وبقي التحريم من جهة انهاتحت زوج كسائر النساء الاجنبيات فمتى فارقها الثاني وانقضت عدتهاحلت للاول.

ولمافی مشکاۃ المصابیح:(۲/۲۸۴،باب المطلقۃ ثلاثا،طبع سعید)

عن عائشة قالت جاءت امراة رفاعة القرظي الى رسول الله صلى الله عليه وسلم فقالت اني كنت عند رفاعة فطلقني فبت طلاقي فتزوجت بعده عبد الرحمن بن الزبير وما معه الامثل هدبة الثوب فقال اتريدين ان ترجعي الى رفاعة قالت نعم قال لا حتى تذوقي عسيلته ويذوق عسيلتك. متفق عليه.

ولمافی التنویر مع الدر:(۳/۴۰۹-۴۱۰،طبع سعید)

(لا)ينكح(مطلقة)من نكاح صحيح نافذ — (بها)اى بالثلاث — (حتى يطئها غيره)

ولمافی الهندیۃ:(۱/۴۷۳،طبع رشیدیہ)

وان كان الطلاق ثلاثا في الحرة وثنتين في الامة لم تحل له حتى تنكح زوجاغيره نكاحا صحيحا.

الجواب صحیح: عبدالرحمن عفا اللہ عنہ　　　　واللہ اعلم بالصواب: عبدالوہاب لقمانی عفا اللہ عنہ

۸ جمادی الثانی ۱۴۳۱ھ　　　　فتویٰ نمبر: ۲۷۰۸

﴿ایک، دو، تین تو مجھ سے آزاد ہے کا حکم﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک آدمی نے غصہ کی حالت میں اپنی بیوی سے پشتو میں کہا ''یو، دوہ، درے پہ ما خلاصہ ئے'' اسکی تعبیر یہ ہے ایک، دو، تین مجھ سے خلاصہ ہو (مجھ سے چھوٹی ہوئی ہو، مجھ سے آزاد ہو) یہ جملہ استعمال کیا۔ اور پہ ما خلاصہ ئے یہ متصل بولا ہے درمیان میں کوئی رکا نہیں۔ اب پوچھنا یہ ہے کہ اس آدمی کی کتنی طلاق واقع ہوئیں؟ قرآن وسنت کی روشنی میں تسلی بخش جواب دیکر ثواب دارین حاصل کریں۔

﴿جواب﴾ مذکورہ الفاظ ''ایک دو تین'' دراصل گنتی کیلئے موضوع ہیں طلاق کیلئے موضوع نہیں ہیں لیکن اس سے طلاق کی گنتی بھی مراد لی جاسکتی ہے، اور قرینہ مقام کے لحاظ سے بسا اوقات معدود کا ذکر کئے بغیر صرف عدد پر کفایت کیجاتی ہے، اور مخاطب باسانی سمجھ جاتا ہے، مذکورہ صورت میں خاوند نے بیوی کو یہ کہا ہے کہ ''یو، دوہ، درئے پہ ما خلاصہ ئے'' ایک دو تین مجھ سے خلاصہ ہو (مجھ سے آزاد ہو یا مجھ سے چھوٹی ہوئی ہو) یہ الفاظ خاوند نے غصہ کی حالت میں بول دیئے اور ''خلاصہ'' لفظ پشتو زبان میں طلاق کیلئے عام بولا جاتا ہے، لہٰذا اسکا کوئی اور مطلب نہیں ہے سوا اسکے کہ شوہر ایک دو تین سے طلاق ہی مراد لے رہا ہے، اس لئے تینوں طلاقیں واقع ہوگئی ہیں اب رجوع نہیں ہوسکتا اور حلالہ شرعیہ کے بغیر تجدید نکاح بھی نہیں ہوسکتا عورت عدت پوری کرنے کے بعد چاہے تو دوسری جگہ شادی کرسکتی ہے۔

لما فی الهندیه (۱/۵۷ رشیدیه)

ولو قال لامرأته انت منی ثلاثا ان نوی الطلاق طلقت وان قال لم انو الطلاق لم یصدق ان کان فی حال مذاکرة الطلاق۔

لما فی الشامی (۲/۲۷۵ سعید)

ورأیت بخط السائحانی: مقتضی ما فی الخانیه من قوله ولو قال لامرأته انت بثلاث قال ابن الفضل: اذا نوی یقع هنا اذا نوی وفیها ایضا اذا قال طالق فقیل من عنیت فقال امرأتی طلقت ولو قال انت منی ثلاثا طلقت ان نوی او کان فی مذکراة الطلاق والا فالو ـــ والظاهر ان قوله هکذا مثل قوله بثلاث ـــ والاسم المبهم مذکور فی مسالتنا: فیهذا العلم بعدد الطلاق المقدر الذی نواه المتکلم، کما ان قوله بثلاث دل علی عدد الطلاق مقدر نواه المتکلم ولا فرق بینهما الا من جهة ان العدد فی احدهما صریح وفی الاخری غیر صریح وهذا الفرق غیر مؤثر بدلیل انه لا فرق بین قوله انت طلاق

هكذا مشيرا الى الاصابع الثالث وبين قوله انت طلاق بثلاث، هذا ما ظهر لي فافهم لما في التاتارخانيه (۲۰۲/۳ قديمي كراچي)

واذقال لامرأته :تويكى متوسه اوقال ترايكى ،تراسه ___ قال الصدر الشهيد المختار عندي انه نوى يقع الطلاق وفي الحجة،تراسه المختار تقع الثلاث اذانوى ___ وقال غيرابي القاسم:ينبغي ان يكون الجواب على التفصيل:ان كان في حال مذاكرة الطلاق اوفي حال الغضب يقع،والافلايقع الابالنسبة وفي الغانيه ولوقال لامرأته" انت بثلاث"قال الشيخ الامام ابوبكر محمدبن الفضل اذانوى يقع وفي "الحجة"انت منى بثلاث تقع ثلاث ولايصدق على عدم النية، خصوصا عند مذاكرة الطلاق، (وايضاًوفي "الذخيره سالت المراة زوجهاان يطلقهاواحدة فقال الزوج دارم يكى دو سه فقالت طه يكى چه دو چه سه ؟ فلم يجبهابشي، فقد قيل اناتطلق ثلاثا ـ۲۰۲/۳)

ولما في الشامي :(۲۹۹/۴ طبع رشيديه)

ولاشيئ من الكنايات يقع به الطلاق بلانية ودلالة الحال كما صرح به البدائع ويدل على ذلك ماذكره البزازى عقب قوله في الجواب الماران المتعارف به ايقاع البائن لاالرجعي حيث قال مانصه بخلاف فارسية قوله سرحتك وهو "رهاكردم"لانه صار صريحا في العرف الخ.

الجواب صحیح: مفتی عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ   واللہ اعلم بالصواب: صفی اللہ غفر لہ ولوالدیہ

۱۳ صفر الخیر ۱۴۳۵ھ   فتویٰ نمبر: ۳۸۹۵

«''تو آزاد ہے'' سے طلاق کا حکم»

«سوال» کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان شرع اس مسئلہ کے بارے میں کہ شوہر نے بیوی کو کہا تم میری طرف سے آزاد ہو میں نے تمہیں آزادی دی جہاں جانا چاہتی ہو تمہیں کوئی نہیں روکے گا تو کیا اس سے طلاق واقع ہوگی یا نہیں؟ وضاحت فرمائیں۔

تنقیح: شوہر نے جہاں جانا چاہتی ہو جاسکتی ہو تمہیں کوئی نہیں روکے گا بولتے ہوئے کیا ارادہ کیا تھا، ان الفاظ سے الگ طلاق کا ارادہ کیا تھا یا تم میری طرف سے آزاد ہو، میں نے تجھے آزادی دی، اس جملہ کا اثر ونتیجہ واضح کرنا مقصود تھا، اس کی وضاحت شوہر خود کرے تا کہ جواب دے سکے۔

جواب تنقیح: ان الفاظ سے نئی طلاق کا ارادہ نہیں بلکہ پہلے جو کہا کہ میں نے تجھے آزادی دی اس کی وضاحت مقصود ہے۔

«جواب» شوہر کے یہ بولنے سے کہ تم میری طرف سے آزاد ہو میں نے تجھے آزادی دی

سے دو رجعی طلاقیں واقع ہوگئی ہیں جن کا حکم یہ ہے کہ شوہر کیلئے رجوع کا حق باقی ہے وہ چاہے تو عدت کے اندر رجوع کرسکتا ہے عدت گذرنے کے بعد رجوع نہیں ہوسکتا، البتہ باہمی رضامندی سے نئے حق مہر کے ساتھ دوبارہ نکاح ہوسکے گا۔

واضح رہے کہ رجوع کی صورت میں شوہر کے پاس صرف ایک طلاق کا اختیار رہے گا، زندگی میں کسی بھی وقت ایک طلاق مزید دیدی تو پھر حلالہ شرعیہ کے بغیر نکاح نہ ہوسکے گا۔

لما فی البحر الرائق: (۳۰۱/۳، طبع سعید)

ومشائخ خوارزم من المتقدمین ومن المتأخرین کانوا یفتون بان لفظ التسریح بمنزلة الصریح یقع به طلاق رجعی کذافی المجتبی (۱۸۹/۳ طبع رشیدیه)

ولما فی البزازیة علی هامش الهندیة: (۱۸۹/۱ طبع رشیدیه کوئٹه)

قوله سرحتک وهو بهایله کردم لانه صار صریحا علی ماصرح به نجم الزاهدی الخوارزمی فی شرح القدوری۔

ولما فی الشامی: (۲۹۹/۳ طبع سعید)

فاذا قال لها رها کردم ای سرحتک یقع به الرجعی مع ان اصله کنایة وماذاك الا لانه غلب فی عرف الناس استعماله فی الطلاق وقد مران الصریح مایستعمل الا فی الطلاق من ای لغة کانت.

الجواب صحیح: عبد الرحمن عفا اللہ عنہ | واللہ اعلم بالصواب: بلال احمد غفرہ الاحد

۲۱ محرم الحرام ۱۴۲۸ھ | فتویٰ نمبر: ۶۳۶

﴿"تجھے آزاد کرتا ہوں، تجھے طلاق دی" دو طلاق رجعی ہیں﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک آدمی نے اپنی بیوی سے کہا "میں تجھے ازاد کرتا ہوں، میں نے تجھے طلاق دی" اور کہتا ہے کہ میری طلاق کی نیت نہیں تھی بلکہ ڈرانا مقصود تھا، اس صورت میں کتنی طلاقیں واقع ہوں گی؟

﴿جواب﴾ لفظ "طلاق" تو اصالۃً صریح طلاق ہے بغیر نیت کے بھی اس سے طلاق واقع ہوجاتی ہے، اور اردو زبان میں بیوی سے یہ کہنا کہ "تجھے ازاد کرتا ہوں" بھی عرفاً صریح طلاق ہے اسلئے کہ اسطرح کہنے سے طلاق دینا ہی مراد ہوتا ہے، لہٰذا مذکورہ صورت میں دو طلاق رجعی واقع ہوگئی ہیں، اس سے پہلے شوہر نے اگر کوئی طلاق نہیں دی ہے تو دوران عدت شوہر اگر چاہے

تو رجوع کرسکتا ہے پھر آئندہ کیلئے شوہر کے پاس صرف ایک طلاق کا حق باقی رہے گا، زندگی میں کسی بھی وقت ایک طلاق مزید اگر دی تو طلاق مغلظہ واقع ہوگی اور پھر بغیر حلالہ شرعیہ کے دوبارہ نکاح سے بھی عورت حلال نہ ہوگی، لہذا احتیاط رہے۔

لمافی التنویر ج۳/۲۴۷تا۲۵۰ طبع سعید کراچی

صریحہ مالم یستعمل الافیہ کطلقتک وانت طالق ومطلقۃ ویقع بھا واحدۃ رجعیۃ وان نوی خلافھا اولم ینو شیئا

ولمافی البدائع ج۳/۲۲۰،۲۲۱ طبع دار الکتب العلمیۃ بیروت

اما الصریح فھو اللفظ الذی لایستعمل الافی حل قید النکاح وھو لفظ الطلاق او التطلیق مثل قولہ :انت طالق اوانت الطلاق اوطلقتک ۔۔وھذہ الالفاظ ظاھرۃ المراد لانھا لاتستعمل الا فی الطلاق عن قید النکاح فلایحتاج الی النیۃ لوقوع الطلاق ۔

ولمافی الشامی ج۳/۲۹۹ (طبع سعید)

فان سرحتک کنایۃ لکنہ فی عرف الفرس غلب استعمالہ فی الصریح فاذاقال :"رھا کردم "ای سرحتک یقع بہ الرجعی مع ان اصلہ کنایۃ ایضا وماذاك الا لانہ غلب فی عرف الفرس استعمالہ فی الطلاق وقدمران الصریح مالم یستعمل الافی الطلاق من ای لغۃ کان ۔

ولمافی التنویر مع الدر ج۳/۴۰۹،۴۱۰(طبع سعید)

(لا)ینکح (مطلقۃ)من نکاح صحیح نافذ کما سنحققہ (بھا)ای بالثلاث (لوحرۃ اوثنتین ولو قبل الدخول حتی لایطلھا غیرہ ...بنکاح

ولمافی البخاری ج۲/۸۱۱ طبع رحمانیۃ

عن عائشۃؓ ان رفاعۃ القرظی تزوج امرأۃ ثم طلقھا فتزوجت آخر فاتت النبی ﷺ فذکرت انہ لایأتیھا وانہ لیس معہ الامثل ھدبۃ :فقال لا ،حتی تذوقی عسیلتہ ویذوق عسیلتک ۔

الجواب صحیح: مفتی عبدالرحمن عفا اللہ عنہ — واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب: عاقل شاہ

۷ربیع الثانی ۱۴۳۵ھ — فتویٰ نمبر:۴۰۲۹

﴿ تیرا میرا رشتہ نہیں، تو مجھ سے آزاد ہے، سے کونسی طلاق واقع ہوگی؟ ﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ کے بارے میں۔ کہ اگر کسی آدمی نے غصے کے دوران لڑائی جھگڑے کی حالت میں اپنی بیوی سے یہ کہدیا۔ ’’تیرا میرا رشتہ نہیں، تو مجھ سے آزاد ہے‘‘ تو اس صورت میں کتنی طلاق واقع ہونگی؟ مستفتی: ایک سائل

﴿جواب﴾ تیرا میرا رشتہ نہیں' طلاق دینے کی غرض سے شوہر بول دے تو ایک طلاق بائن

واقع ہوجاتی ہے،اسی طرح"تو مجھ سے آزاد ہے" بھی اصالۃً طلاق کنائی کے الفاظ ہیں۔البتہ جہاں یہ الفاظ طلاق دینے کی غرض سے عام بولے جاتے ہوں اور عرف میں طلاق ہی کیلئے استعمال ہوتے ہوں تو وہاں ان سے ایک طلاق صریح واقع ہوتی ہے،شوہر کا تعلق ایسے علاقہ سے اگر ہے تو اس سے بلانیت بھی ایک طلاق واقع ہوگئی ہے،اور شوہر کے علاقہ میں یہ الفاظ طلاق کیلئے اگر عام نہیں بولے جاتے تو بغیر نیت کے اس سے طلاق واقع نہیں ہوتی۔طلاق کے ارادہ سے بول دیئے ہوں تو طلاق بائن واقع ہوئی ہے،لیکن طلاق بائن کنائی کے الفاظ متعدد ہوں اور ہر ایک سے مستقل طلاق دینے کا ارادہ ہو تب بھی ایک طلاق واقع ہوتی ہے،لہذا اس علاقہ میں آزاد لفظ کا استعمال طلاق کیلئے اگر عام رائج نہیں ہے اور دونوں جملے بولتے وقت طلاق کا ارادہ تھا تو ایک ہی طلاق بائن واقع ہوگئی ہے رجوع نہیں ہوسکتا،البتہ باہمی رضامندی سے نئے حق مہر کیساتھ دوبارہ نکاح ہوسکتا ہے تجدید نکاح کی صورت میں آئندہ کیلئے صرف دو طلاقیں باقی ہونگی۔

اور یہ لفظ آپ کے عرف میں اگر طلاق ہی کیلئے استعمال ہوتا ہے اور پہلا جملہ طلاق کے ارادہ سے بول دیا ہے تو ایک طلاق بائن اور ایک رجعی واقع ہوگئی ہے تجدید نکاح کی صورت میں صرف ایک طلاق کا حق باقی رہیگا۔اور دونوں جملے طلاق دینے کی غرض سے نہ بولے ہوں اور آزاد لفظ عرف میں بھی طلاق نہ ہو تو کوئی طلاق واقع نہیں ہوئی لہذا اس تفصیل کی روشنی میں شوہر خود ہی یا علاقہ کے علماء کرام سے رہنمائی حاصل کر کے اپنے ان الفاظ کا حکم معلوم کرے.

لما فی الشامی:(۲۹۹/۳،طبع سعید)

بخلاف فارسية قوله سرحتك وهو رهاكردم"لأنه صار صريحا في العرف على ماصرح به نجم الزاهدي الخوارزمي في شرح القدوري اھ.

ولما فی الشامی:(۳۲۸/۳ طبع سعید)

قال في الشرنبلالية وقع السؤال عن التطليق بلغة الترك هل هو رجعي باعتبار القصد أوبائن باعتبار مدلول "سن بوش" أو "بوش أول" لأن معناه خالية فلينظر اھ. قلت: و أفتى الرحيمي تلميذ الخير الرملي بانه رجعي وقال كما أفتى به شيخ الاسلام أبوسعود ونقل مثله شيخ مشائخنا التركماني عن فتاوى علي أفندي مفتي دار السلطنة وعن الحامدية.

ولمافی التنویر:(۳۰۶/۳،۳۰۷،۳۰۸،طبع سعید)

(الصريح يلحق الصريح والبائن' والبائن يلحق الصريح لاالبائن)

ولما فی الهندیة:(۳۷۶/۱طبع رشیدیه)

ولو قال لم یبق بینی وبینک شئی ونوی به الطلاق لا یقع وفی الفتاوی لم یبق بینی وبینک عمل ونوی یقع کذا فی العتابیة۔

أیضا فی الهندیة:(۳۷۵/۱طبع رشیدیه)

ولو قال لها لانکاح بینی وبینک أوقال لم یبق بینی وبینک نکاح یقع الطلاق اذا نوی

ولما فی فتاوی قاضی خان :(۲۱۲/۱طبع قدیمی)

ولو قال لها لا نکاح بینی وبینک أوقال لم یبق بینی وبینک أوقال فسخت نکاحک یقع الطلاق اذا نوی

الجواب صحیح: مفتی عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: عمران الحق سواتی

۱۲صفرالخیر ۱۴۳۵ھ — فتویٰ نمبر: ۳۹۱۰

﴿ایک طلاق میں تین کی نیت کا اعتبار کب ہے؟﴾

﴿سوال﴾ (۱) اگر کوئی اپنی بیوی کو صریح طلاق دے ان الفاظ کیساتھ "انت طالق" کہ تجھے طلاق ہے اور تین طلاق کی نیت کرے تو کیا تین طلاقیں واقع ہونگی یا ایک طلاق واقع ہوگی؟

(۲) اسی طرح اگر کوئی مرد اپنی بیوی کو طلاق بائن دے ان الفاظ کیساتھ "انت بائن" کہ تو مجھ سے جدا ہے اور تین طلاق کی نیت کرے تو اس صورت میں کتنی طلاقیں واقع ہونگی؟

﴿جواب﴾ طلاق صریح الفاظ کیساتھ کسی طرح قید یا صفت کے بغیر اگر دیدے تو اسکا حکم الفاظ پر منحصر ہے، لفظ ایک بولا ہے تو ایک طلاق ہوگی، زیادہ بولے ہیں تو زیادہ واقع ہونگی، ایک طلاق بول کر تین مراد لینے سے بھی صرف ایک ہی رجعی واقع ہوگی۔

لما فی الهدایة:(۳۸۷/۲،طبع رحمانیه)

فالصریح قوله انت طالق ومطلقة وطلقتک فهذا یقع به الطلاق الرجعی ولا یفتقر الی النیة ولا یقع به الا واحدة وان نوی أکثر من ذلک۔

ولما فی التنویر مع الدر:(۲۴۷/۳تا۲۵۰،طبع سعید)

(صریحه مالم یستعمل الا فیه کطلقتک وأنت طالق ومطلقة ویقع بها واحدة رجعیة وان نوی خلافها) من البائن أو أکثر۔

(۲) البتہ طلاق کنائی میں نیت کا اعتبار کیا جاتا ہے، چنانچہ اگر مرد یہ الفاظ "انت بائن" "تو مجھ سے جدا ہے" کہے اور تین طلاق کی نیت ہو تو تین طلاق واقع ہوں گی۔

لما فی الهدایة:(۲/۳۲۶-۳۲۷،طبع رحمانیه)

قال وبقية الكنايات اذانوى بها الطلاق كانت واحدة بائنة وان نوى ثلاثاكانت ثلاثاوان نوى ثنتين كانت واحدة بائنة — ولاتصح نية الثنتين عند ناخلافالزفرلانه عدد.

ولما فی الدرالمختار:(۲/۲۶۱-۲۷۷،طبع)

(و)يقع (ب)قوله(أنت طالق بائن أوالبتة)....(أوأفحش الطلاق — واحدةبائنة)فى الكل(ان لم ينو ثلاثا)فى الحرة وثنتين فى الأمة فيصح لمامر.

ولما فی الشامی:(۲/۲۷۷-۲۷۸،طبع سعید)

(قوله فيصح لمامر)أى فى اول هذاالباب من أنه مصدريحتمل الفرد الاعتبارى، وهو الثلاثة فى الحرة والثنتان فى الأمة فتصح نيته--أى فان نوى ماذكر صح أفاده.....ونظيره قولهم:لونوى الثلاث بأنت بائن أوحرام فهى ثلاث.

الجواب صحیح:عبدالرحمن عفااللہ عنہ والله اعلم بالصواب:عبداللہ عفااللہ عنہ

۲۳جمادی الثانی ۱۴۲۸ھ فتوی نمبر:۱۰۲۵

﴿طلاق صریح کے بعد طلاق بائن کاحکم﴾

﴿سوال﴾ کیافرماتے ہیں علماء کرام کہ زوجین کے درمیان ناچاقی کی وجہ سے زوج نے اپنی زوجہ کوایک طلاق صریح دیدی،اس کے بعداپنی زوجہ سے کہاکہ اگرتومیری بچی اپنی بہن کے پاس لے گئی توتیرے ساتھ میرانکاح ختم ہوجائے گا،چنانچہ اسکے بعدزوجہ بچی کواپنی بہن کے پاس لیکربھی گئی اوراس کے بعدکئی مرتبہ وہ اپنی زوجہ سے کہہ چکاہے کہ تیرے ساتھ میرانکاح ختم ہوگیاہے،پوچھنایہ ہے کہ مذکورہ صورت میں یہ عورت اسکی بیوی رہی ہے یانہیں؟اورکتنی طلاقیں واقع ہوئی ہیں؟تفصیل سے وضاحت فرمائیں۔ مستفتی:عالم زیب کراسنگ

﴿جواب﴾ مذکورہ صورت میں ایک طلاق صریح دینے کے بعدشوہرکورجوع کرنے کاحق حاصل تھا،ہوسکتاہے رجوع کیاہوگالیکن اس کے بعدشوہرکایہ جملہ''اگرتومیری بچی کواپنی بہن کے پاس لے گئی توتیرے ساتھ میرانکاح ختم ہوجائے گا''یہ طلاق بائن معلق ہے،اس کے بعدوہ خاتون اگربچی کوواقعی بہن کے پاس لے گئی ہےتواس سے ایک طلاق بائن واقع ہوگئی ہے،اس کے بعدشوہرکےاس جملہ سے''تیرے ساتھ میرانکاح ختم ہوگیاہے''مزیدکوئی طلاق واقع نہیں ہوئی،لہٰذاکل دوطلاقیں واقع ہوگئی ہیں اورنکاح ختم ہوگیاہے،دونوں کے لئے آپس میں میاں بیوی والاتعلق قائم رکھناحرام ہوگیاہے،مطلقہ چاہےتوعدت گزارنے کے بعددوسری جگہ

نکاح کر سکتی ہے شوہر اب رجوع نہیں کر سکتا، البتہ نئے حق مہر کے ساتھ باہمی رضامندی سے نیا نکاح ہو سکتا ہے جس کے بعد شوہر کے پاس صرف ایک طلاق کا حق باقی رہے گا۔

لما فی التنویر مع الدر:(۳۰۶/۲ تا ۳۰۸،طبع سعید)

والبائن یلحق الصریح لایلحق البائن البائن۔

وفی الشامیة:وان کان الطلاق رجعیا یلحقها الکنایات،لان ملک النکاح باق،فتتقییده بالرجعی دلیل علی أن الصریح البائن لایلحقه الکنایات

ولما فی الهدایة:(۲/۲۰۵،باب الرجعة،طبع رحمانیه)

واذاطلق الرجل امرأته تطلیقة رجعیة أوتطلیقتین فله أن یراجعها فی عدتها رضیت بذلک أولم ترض لقوله تعالی فامسکوهن بمعروف من غیر فصل۔

ولما فی الهندیة:(۱/۴۷۲،طبع رشیدیه کوئٹه)

اذاکان الطلاق بائنادون الثلاث فله ان یتزوجها فی العدة وبعدانقضائها۔

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: محمد اسلم چترالی غفرلہ

یکم جمادی الاولی ۱۴۲۹ھ — فتوی نمبر:۱۳۶۹

﴿"تجھے بالکل طلاق ہے تو مجھ پر میری بہن کی طرح ہے" الفاظ کا حکم﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک شخص نے اپنی بیوی کو غصہ کی حالت میں کہا "تجھے بالکل طلاق ہے تو مجھ پر میری بہن کی طرح ہے" ان الفاظ کے ساتھ کتنی طلاقیں واقع ہوئی ہیں اور کونسی اور انکا حکم کیا ہے؟ مستفتی: بتوسط قاری محمد دین

﴿جواب﴾ صورت مسئولہ میں شوہر نے اپنی بیوی کو مذاکرۂ طلاق اور غصہ کی حالت میں جن الفاظ کے ساتھ طلاق دی ہے، اس سے عورت کو ایک طلاقِ بائنہ واقع ہوئی ہے جسکا حکم یہ ہے کہ شوہر اور بیوی اپنی باہمی رضامندی سے نئے حق مہر کیساتھ اور گواہان کی موجودگی میں دوبارہ نکاح کرنا چاہیں تو کر سکتے ہیں، لہذا اس نکاح کے بعد یہ عورت اپنے شوہر کیلئے حلال ہوگی اور نکاح چاہے عدت میں ہو یا عدت کے گزرنے کے بعد۔

(نوٹ) یہاں پہلا جملہ "تجھے بالکل طلاق ہے" طلاقِ صریح بائن ہے اور دوسرا جملہ "تو مجھ پر میری بہن کی طرح ہے" طلاقِ بائن کنایہ ہے، یہ بظاہر اگرچہ دو طلاقیں ہیں لیکن حسب ضابطہ دوسری طلاق اگر بائن کنائی ہو تو پہلی طلاق صریح بائن کیساتھ اس کا الحاق نہ ہوگا یعنی مستقل

طلاق شمار نہ ہوگی، اسی طرح کا مسئلہ فتاویٰ عثمانی ۲/۳۷۸ میں بھی ہے۔

لما فی الهداية:(۲/۳۸۶،طبع رحمانيه)

واذا وصف الطلاق بضرب من الزيادة أو الشدة كان بائنا مثل أن يقول أنت طالق بائن أو البتة.

ولما فی التنوير مع الدر:(۳/۴۷۰،طبع سعيد)

(وان نوى بانت عليّ مثل أمي) أو كأمي وكذا لو حذف "عليّ" خانية (برًا أو ظهارًا أو طلاقًا صحت نيته) ووقع مانواه لأنه كناية.

وفي الشامية:(قوله لأنه كناية) أي من كنايات الظهار والطلاق، قال في البحر: واذا نوى به الطلاق كان بائنًا.

ولما فيه ايضا:(۳/۳۰۸-۳۱۰،طبع سعيد)

(لا) يلحق البائن (البائن) اذا أمكن جعله اخبارا عن الأول كأنت بائن بائن أو أبنتك بتطليقة فلا يقع لأنه اخبار فلا ضرورة في جعله انشاء، بخلاف أبنتك بأخرى أو انت طالق بائن ـــ لتعذر حمله على الاخبار فيجعله انشاء.

وفي الشامية:(قوله لا يلحق البائن البائن) المراد بالبائن الذي لا يلحق هو ما كان بلفظ الكناية لأنه هو الذي ليس ظاهرا في انشاء الطلاق كذا في الفتح، وقيد بقوله الذي لا يلحق اشارة الى أن البائن الموقع أولًا أعم من كونه بلفظ الكناية أو بلفظ الصريح المفيد للبينونة ـــ منها ما أطبقوا عليه من تعليلهم عدم لحوق البائن البائن بامكان جعل الثاني خبرا عن الأول ولا يخفى أن ذلك شامل لما اذا كان البائن الأول بلفظ الكناية أو بلفظ الصريح ـــ (أو أبنتك بتطليقة) عطف على بائن الثانية أي أنت بائن أبنتك بتطليقة اه وأشار الى أنه لا يشترط اتحاد اللفظين فشمل ما اذا كان الأول بلفظ الكناية البائنة أو الطلاق الصريح اذا كان على مال أو موصوفا بما ينبئ عن البينونة كما علم مما قدمناه بعد كون الثاني بلفظ الكناية البائنة كالخلع.... (قوله فلا يقع) أي وان نوى لما في البحر عن الحاوي.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: علی خان

۳ رجب المرجب ۱۴۳۶ھ — فتویٰ نمبر: ۲۶۹۸

﴿بیوی سے کہا ''میں نے تجھے طلاق دی اور میں نے تجھے چھوڑ دیا'' کا حکم﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک شخص نے اپنی بیوی کو طلاق دیتے وقت یہ الفاظ کہے ''میں نے تجھے طلاق دی اور میں نے تجھے چھوڑ دیا'' ان الفاظ سے کتنی طلاقیں واقع ہوئی ہیں اور کونسی اور ان کا کیا حکم ہے؟ مستفتی: بتوسط امام صاحب نبوی مسجد

﴿جواب﴾ صورت مسئولہ میں اس شخص نے جن الفاظ کیساتھ طلاق دی ہے ان سے دو

طلاقیں رجعی واقع ہوئی ہیں جنکا حکم یہ ہے کہ شوہر چاہے تو عدت کے دوران یعنی تین ماہواری گزرنے سے پہلے اگر رجوع کرلے تو نکاح بدستور قائم رہے گا، بہتر یہ ہے کہ گواہوں کے سامنے رجوع کا اقرار کریں تا کہ ضرورت پیش آنے کی صورت میں گواہوں کی مدد سے رجوع ثابت کرسکیں اور اگر عدت گزر چکی ہو تو رجوع نہیں ہوسکتا لیکن باہمی رضامندی سے نئے حق مہر کیساتھ بغیر حلالہ کے دوبارہ نکاح ہوسکتا ہے۔

لما في الهندية:(۱/۳۵۴ طبع رشيديه)

(الفصل الأول في الطلاق الصريح)وهو كانت طالق ومطلقة وطلقتك وتقع واحدة رجعية وان نوى الأكثر أو الابانة أو لم ينو شيئاً كذا في الكنز.

ولما في الشامي:(۳/۲۹۹ طبع سعيد)

بخلاف فارسية قوله سرحتك وهو "رهاء كردم" لأنه صار صريحا في العرف على ما صرّح به نجم الزاهدي الخوارزمي في شرح القدوري. وقد صرح البزازي ـــ فان سرحتك كناية لكن في عرف الفرس غلب استعماله في الصريح فاذا قال: "رهاء كردم" أي سرحتك يقع به الرجعي مع أن اصله كناية أيضاً وما ذاك الا لأنه غلب لكنه في عرف الفرس استعماله في الطلاق وقدمر أن الصريح مالم يستعمل الا في الطلاق من أي لغة كانت.... وأما اذا تعورف استعماله في مجرد الطلاق لا بقيد كونه بائنا يتعين وقوع الرجعي به كما في فارسية سرحتك.

ولما في التنوير مع الدر:(۳/۴۰۱ طبع سعيد)

(وندب اعلامها بها)لئلا تنكح غيره بعد العدة فان نكحت فرق بينهما وان دخل شمني (وندب الأشهاد)بعدلين ولو بعد الرجعة بالفعل.

ولما في التنوير مع الدر:(۳/۳۰۶ طبع سعيد)

(الصريح يلحق الصريح و)يلحق(البائن)بشرط العدة(والبائن يلحق الصريح) الصريح مالا يحتاج الى نية بائنا كان الواقع به أو رجعياً فتح.

ولما في رد المحتار:(۳/۳۹۸ طبع سعيد)

(قوله مع الكراهة)..... ويؤيده أيضا قوله في الفتح: والمستحب أن يراجعها بالقول فافهم.

ولما في الهداية:(۲/۴۰۱ طبع رحمانيه)

وان كان الطلاق بائنا دون الثلث فله أن يتزوجها في العدة وبعد انقضائها لأن حل المحلية باق لأن زواله معلق بالطلقة الثالثة.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: علی خان

۱۰ جمادی الثانی ۱۴۳۱ھ — فتویٰ نمبر: ۲۷۱۷

﴿خلوت صحیحہ سے پہلے تین طلاقوں کا حکم﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اور مفتیان عظام درج ذیل مسئلہ کے بارے میں کہ جو آدمی اپنی منکوحہ کو خلوت صحیحہ سے پہلے پہلے تین طلاقیں دیدے تو عدت گذرنے کے بعد بغیر حلالہ شرعیہ کے دوبارہ اس سے نکاح کرسکتا ہے یا نہیں؟ دلائل شرعیہ سے وضاحت مطلوب ہے۔

﴿جواب﴾ اپنی منکوحہ سے شوہر نے اگر صحبت نہیں کی ہے اور خلوت صحیحہ کی بھی نوبت نہیں آئی تو طلاق ہونے کی صورت میں اس پر کوئی عدت نہیں ہے عدت کے بغیر وہ دوسری جگہ شادی کرسکتی ہے اور طلاق اگر ایک واقع ہوگئی ہے تو اپنے اسی شوہر کے ساتھ بھی دوبارہ نیا حق مہر مقرر کر کے نکاح ہوسکتا ہے اور ایسی عورت چونکہ ایک ہی طلاق سے بائن ہوجاتی ہے نکاح ختم ہو جاتا ہے اس لئے دوسری، تیسری طلاق واقع نہیں ہوتی اس لئے کوئی الگ الگ الفاظ بول کر اگر طلاق دیدے مثلاً طلاق، طلاق، طلاق تو ایسی صورت میں صرف ایک ہی طلاق ہوجاتی ہے باقی لغو اور بے کار ہیں البتہ ایک ہی جملہ کے ذریعہ تینوں طلاق ایک ساتھ کوئی دیدے مثلاً یوں کہے کہ تجھے تین طلاق تو ایسی صورت میں تینوں طلاق واقع ہوجاتی ہیں عدت اس صورت میں بھی نہیں ہوتی لیکن اسی شوہر سے بغیر حلالہ شرعیہ کے دوبارہ نکاح نہیں ہوسکتا۔

(لمافی تنویر: ۲۸۶،۲۸۴/۳ طبع ایچ ایم سعید)

قال لزوجته غیر المدخول بها انت طالق ثلثاقبل الدخول بهاوقعن وان فرق بانت بالاولی ولم تقع الثانیة والثالثۃ وکذاانت طالق ثلثا متفرقات فواحدة

(ولمافی الهدایة: ۴۰۹/۲ طبع رحمانیة)

وان کان الطلاق بائنا دون الثلث فله ان یتزوجها فی العدة وبعدانقضائها لان حل المحلیة باق لان زواله معلق بالطلقة الثالثة فینعدم قبله ومنع الغیر فی العدة لاشتباه النسب ولااشتباه فی اطلاقه وان کان الطلاق فی الحرة ثلاثا اوثنتین فی الامة لم تحل له حتی تنکح زوجا غیره نکاحاصحیحا ویدخل بها ثم یطلقها اویموت عنها والاصل فیه قوله تعالی "فلاتحل له من بعدحتی تنکح زوجا غیره".

(ولما فی الهدایة ۳۸۸/۲ طبع رحمانیة)

واذاطلق الرجل امرأته ثلاثا قبل الدخول بها وقعن علیها لان الواقع مصدر محذوف لان معناه طلاقا ثلاثا علی مابینا، فلم یکن قوله انت طالق ایقاعا علی حدة فیقعن جملة، فان فرق الطلاق بانت ولم تقع الثانیة والثالثة وذلک مثل ان یقول انت طالق، طالق، طالق، لان کل واحد ایقاع علی حدة اذلم یذکر فی آخر کلامه مایغیر صدره

حتی یتوقف علیه فتقع الاولی فی الحال لانعدام الثانیة و هی مبانة

ولما فی فتح القدیر : ۲/ ۶۹ طبع رشیدیة

واذا طلق الرجل امرأته قبل الدخول بها وقعن علیها لان الواقع مصدر محذوف لان معناه طلاقا ثلاثا علی ما بیناه فلم یکن قوله انت طالق ایقاعا علی حدة فیقعن جملة فان فرق الطلاق بانت بالاولی ولم تقع الثانیة والثالثة وذلک مثل ان یقول انت طالق ، طالق ، طالق لان کل واحدة ایقاع علی حدة اذلم یذکر فی آخر کلامه مایغیر صدره حتی یتوقف علیه فتقع الاولی فی الحال فتصادفها الثانیة وهی مبانة .

(ولما فی فتح القدیر : ۲/ ۱۵۷ طبع رشیدیة)

واذاکان الطلاق بائنا دون الثلاث فله ان یتزوجها فی العدة وبعدانقضائها لان حل المحلیة باق لان زواله معلق بالطلقة الثالثة فینعدم قبله ،ومنع الغیر فی العدة لاشتباه النسب ولااشتباه فی اطلاقه وان کان الطلاق ثلثا فی الحرة او ثنتین فی الامة لم تحل له حتی تنکح زوجا غیره نکاحا صحیحا ویدخل بها ثم یطلقها او یموت عنها

(ولما فی فتح القدیر :۲/ ۲۶۱ طبع، رشیدیه)

لکنه اعتبر فیه الاطلاق المجازی ،اعنی اطلاق العدة علی نفس الشئ ثم لایخفی ان سبب العدة ماخوذ منه تاکده بالدخول او مایقوم مقامه کما ذکرنا وانما ترکه المصنفؒ لیبرز ان الطلاق قبل الدخول لاتجب فیه العدة قال الله تعالی (اذانکحتم المومنات ثم طلقتوهن من قبل ان تمسوهن فمالکم علیهن من عدة تعتدونها)

(ولمافی البحر الرائق: ۳/ ۲۹۱،۲۹۲ طبع ایچ ایم سعید)

قوله طلق غیر المدخول بها ثلثا وقعن سواء قال اوقعت علیک ثلث تطلیقات او انت طالق ثلثا ولا خلاف فی الاول کمافی فتح القدیر وفی الثانی خلاف قیل یقع واحدة والجمهور علی خلافه وقد صرح به محمد بن الحسنؒ وقال بلغنا ذلک عن رسول الله صلی الله علیه وسلم وعن علی وابن مسعود وابن عباس رضی الله عنهم قوله وان فرق بانت بواحدة ای وان فرق الطلاق بغیر حرف العطف ویمکن جمعه بعبارة واحدة فانها تبین بالاولی لاالی عدة فلایقع مابعده اذ لیس فی آخر کلامه ما یغیراوله لیتوقف علیه نحو انت طالق،طالق،طالق او انت طالق انت طالق

(ولمافی البحر الرائق:۳/ ۵۶ طبع ایچ ایم سعید)

قوله وینکح مبانته فی العدة وبعدها ای المبانة بمادون الثلث لان المحلیة باقیة لان زوالها معلق بالطلقة الثالثة فینعدم قبله ومنع الغیر لاشتباه النسب ولااشتباه فی الاطلاق له لقوله لاالمبانة بالثلث لو حرة وبالثنتین لو امة حتی یطأها غیره ولو مراهقا بنکاح صحیح وتمضی عدته لایملک یمین ای لاینکح مبانته بالبینونة الغلیظة اطلقه فشمل مااذاکان قبل الدخول او بعده کماصرح به فی الاصل

(ولما فی البحر الرائق: ۴/۱۲۸ طبع ایچ ایم سعید)

واما سبب وجوبها فلكل نوع منها سبب فعدة الاقراء لوجوبها اسباب منها الفرقة فی النكاح الصحيح سواء كانت بطلاق او بغير طلاق بعد وطء او خلوة

(ولما فی المحيط البرهانی: ۴/۶۰ طبع ادارة القرآن المجلس العلمی)

اذا قال لها قبل الدخول بها: انت طالق ثلثا يقع الثلث وكذلك اذا قال لها انت طالق ثنتين يقع ثنتان والوجه فی ذلك ان فی هذه الصورة اول الكلام يتوقف على الآخر لان فی آخر كلامه مايغير حكم اوله لان قوله: انت طالق لايحتمل العدد عندنا وبهذا لايصح نية العدد فيه واذا توقف اول الكلام على آخره كان الوقوع عند آخره فيصادفها آخر الكلام وهی منكوحة بخلاف ما اذا كرر لفظ الطلاق بحرف العطف او بغير حرف العطف فقال لها انت طالق وطالق او قال فطالق او قال ثم طالق او قال انت طالق طالق حيث يقع واحدة لان هناك ليس فی آخر كلامه مايغير حكم اوله فلم يتوقف اوله على آخره فطلقت باول الكلام وبانت لاالى عدة فيصادفها الكلام الثانی وهی مبانة فلغی

(ولما فی القرآن المجيد پاره ۲۲، سورة الاحزاب: ۴۹)

يايها الذين امنوا اذا نكحتم المومنات ثم طلقتموهن من قبل ان تمسوهن فما لكم عليهن من عدة تعتدونها فمتعوهن وسرحوهن سراحا جميلا.

الجواب صحیح: مفتی عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: محمد سلمان غفرلہ ولوالدیہ

۲۸ صفر الخیر ۱۴۳۵ھ — فتویٰ نمبر: ۳۸۹۸

﴿رخصتی سے پہلے طلاق صریح دینے کا حکم﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میری منگنی ہوئی ہے اور منگنی میں باقاعدہ ایجاب وقبول کے ساتھ نکاح ہوا تھا لیکن ابھی تک رخصتی نہیں ہوئی تھی کہ میں نے اپنی بیوی سے کہا کہ تو میرے نکاح سے آزاد ہے تو کیا ان الفاظ سے طلاق واقع ہوتی ہے یا نہیں؟ اگر ہوتی ہے تو کونسی طلاق واقع ہوتی ہے؟ اور دوبارہ نکاح کرنے کی کیا صورت ہوگی؟

﴿جواب﴾ ان الفاظ سے "کہ تو میرے نکاح سے آزاد ہے" ویسے تو طلاق رجعی واقع ہوتی ہے لیکن مذکورہ صورت میں چونکہ رخصتی سے پہلے یہ الفاظ بولے ہیں، اس لئے ان الفاظ سے ایک طلاق بائن واقع ہوگئی ہے اور نکاح ختم ہوگیا ہے، البتہ باہمی رضامندی سے نئے حق مہر کیساتھ دوبارہ نکاح ہوسکتا ہے۔

(یہ بھی معلوم ہونا چاہیے کہ یہ حکم تب ہے کہ شوہر اور بیوی کے درمیان خلوت صحیحہ نہ ہوئی ہو

ورنہ طلاق رجعی ہے) اور یہ بھی یاد رہے کہ نئے نکاح کی صورت میں شوہر کے پاس صرف دو طلاقوں کا حق باقی رہے گا یعنی زندگی میں کسی بھی وقت اگر مزید دو طلاق دے گا تو طلاق مغلظہ واقع ہوگی اور پھر حلالہ شرعیہ کے بغیر نکاح بھی نہیں ہو سکے گا۔

لمافی ردالمحتار:(۲/۲۹۹،طبع سعید)

وأما اذاتعورف استعماله فی مجرد الطلاق لابقيد كونه بائنا يتعين وقوع الرجعي به كما فی فارسية سرحتك.

ولمافی فتح القدير:(۴۹/۴،طبع رشيديه)

فصل فی الطلاق قبل الدخول ..... فان فرق الطلاق بانت بالاولی.

ولمافی التنوير مع الدر:(۲/۲۸۴،طبع سعيد)

(قال لزوجته غير المدخول بها أنت طالق)..... (وان فرق)..... (بانت بالأولی) لاالی عدة.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: عبداللہ عفا اللہ عنہ

۱۸ جمادی الثانی ۱۴۲۸ھ — فتویٰ نمبر: ۱۰۲۲

الفاظ کنایہ سے طلاق کا حکم

سوال: کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ زید نے بیوی کو کہا کہ تو میری منکوحہ نہیں، کیا ایسی صورت میں زید کی بیوی پر طلاق واقع ہوگی یا نہیں؟ مستفتی: محمد اکرم

جواب: مذکورہ صورت میں اگر زید نے یہ الفاظ طلاق کی نیت سے کہے ہوں تو ایک طلاق رجعی واقع ہو جائے گی ورنہ نہیں۔

لمافی الدرالمختار:(۲/۵۰۷،طبع امداديه)

لست لک بزوج أو لست لی بامرأة أو قالت له لست لی بزوج فقال صدقت طلاق ان نواه خلافا لهما.

وفی الشامية: قوله:(طلاق ان نواه) لان الجملة تصلح لانشاء الطلاق كما تصلح لانكاره فيتعين الاول بالنية، وقيد بالنية لانه لايقع بدونها اتفاقا لكونه من الكنايات، وأشار الی انه لايقوم مقامها دلالة الحال، لأن ذلك فيما يصلح جوابا فقط وهو ألفاظ ليس هذا منها، وأشار بقوله طلاق الی ان الواقع بهذه الكناية رجعی. كذا فی البحر من باب الكنايات.

ولمافی الهندية:(۱/۳۷۵،طبع رشيديه)

ولو قال لامرأته لست لی بامرأة أو قال لها ما أنا بزوجک أو سئل فقيل له هل لک امرأة فقال لا فان قال أردت به الكذب يصدق فی الرضا والغضب جميعا ولا يقع الطلاق وان

قال نويت الطلاق يقع الطلاق في قول أبي حنيفة رحمه الله تعالى.

ولما في الهندية:(۲۱۱/۱،طبع رشيديه)

ولوقال ماأنت لي بامرأة اولست لک بزوج ونوى الطلاق يقع عندابي حنيفة رحمه الله تعالى وعندهما لايقع ولوقال لها:لانكاح بيني وبينک أوقال لم يبق بيني وبينک نكاح يقع الطلاق اذانوى ولوقالت المرأة لزوجهالست لي بزوج فقال الزوج صدقت ونوى به الطلاق يقع في قول أبي حنيفة رحمه الله تعالى كذافي فتاوى قاضيخان ومثله في البحر الرائق:(۲۰۵/۳،طبع سعيد)

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ واللہ اعلم: صلاح الدین ڈیروی

۱۳ جمادی الاولیٰ ۱۴۲۷ھ فتویٰ نمبر: ۳۰۹

﴿اپنی بیوی سے کہے چادراوڑھ لواور چلی جاؤ﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کوئی آدمی اپنی بیوی سے کہے کہ چادراوڑھواوراپنے والدین کے گھر چلی جاو،تمہارے پیچھے کاغذات پہنچ جائیں گے تو کیا اس صورت میں طلاق واقع ہوگی یانہیں؟ اگر طلاق واقع ہوئی ہوتو کون سی طلاق ہوئی؟

﴿جواب﴾ شوہر نے مذکورہ جوالفاظ استعمال کیے ہیں یہ کنایہ کے الفاظ ہیں اور کنایہ الفاظ میں طلاق کی نیت کا اعتبار ہوتا ہے،اس لئے اگر یہ الفاظ استعمال کرتے وقت شوہر کی نیت طلاق کی تھی تو ایک طلاق بائن واقع ہوگئی ہے،دوبارہ رجوع کے لئے نئے مہر کے ساتھ تجدید نکاح ضروری ہوگا اور اگر طلاق کی نیت نہیں تھی تو طلاق واقع نہیں ہوئی۔

لمافي قاضيخان:(۲۱۱/۱،طبع قديمي)

وعن ابي يوسف رحمه الله في الاملاء انه الحق بهذه الخمسة،اربعة اخرى لاملک لي عليک لاسبيل لي عليک خليت سبيلک،الحقي باهلک لوقال في حال مذاكرة الطلاق اوفي الغضب وقال لم انوبه الطلاق يصدق قضاء في قول ابي حنيفة رحمه الله تعالى وقال ابويوسف :لايصدق..... استترى قومي اخرجي اذهبي انتقلي.....لا يقع الطلاق الابالنية واذاقال لم انو الطلاق مصدقا.

ولمافي الهندية:(۳۷۰/۱،طبع قديمي)

وانتقلي وانطلقي،كالحقي وفي البزازية وفي الحقي برفقتک لايقع الطلاق الابالنية كذا في فتاوى قاضيخان.

ولمافي شرح الوقاية:(۸۱/۲،طبع قديمي)

وكناية مالم يوضع له واحتمله وغيره لاتطلق الابالنية اودلالة الحال ومنها اعتدي

واستبرئی،الحقی باھلک،اخرجی اذھبی قومی ابتغی الازواج تقع واحدۃ بائنۃ ان نواھا.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: شاہد محمود عفا اللہ عنہ

۲۶ جمادی الثانی ۱۴۲۹ھ — فتویٰ نمبر: ۱۵۷۷

﴿''جاؤ دفع ہو تجھے دس میل لمبی طلاق ہے'' کا حکم﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ زید نے اپنی بیوی کو کہا ''جاؤ دفع ہو تجھے دس میل لمبی طلاق ہے جس سے چاہے شادی کرو میں تم کو نہیں رکھوں گا'' اسے کونسی اور کتنی طلاقیں واقع ہوگئیں؟

﴿جواب﴾ مذکورہ بالا صورت میں زید کی بیوی کو دو طلاق بائن واقع ہوگئیں ہیں اب رجوع نہیں ہوسکتا، البتہ عدت کے اندر یا عدت کے بعد زوجین باہمی رضامندی سے نئے حق مہر کے ساتھ نکاح کرنا چاہیں تو ہوسکتا ہے اور عدت کے بعد عورت اگر دوسری جگہ شادی کرنا چاہے تو کرسکتی ہے۔

واضح رہے کہ دوبارہ نکاح کی صورت میں خاوند کو صرف ایک طلاق کا اختیار ہوگا، زندگی میں کسی وقت بھی ایک طلاق دیدی تو پھر بغیر حلالہ کے دوبارہ نکاح نہیں ہوسکے گا۔

لمافی الجوھرۃ النیرۃ:(۲/۲۲،طبع میر محمد کراچی)

وقوله ابتغی الأزواج یحتمل لانی طلقتک ویحتمل ابعادھا منه ومن الکنایات ایضا اخرجی اذھبی وقومی..... فان ارادبه الطلاق کان طلاقا.

ولمافی الھندیۃ:(۱/۳۷۲،طبع رشیدیه کوئٹه)

ولوقال انت طالق طوله وعرضه کذافھی واحدۃ بائنۃ وان نوی الثلاث لایقع.

ولمافی التنویرمع الدر:(۲/۵۴۰،طبع امدادیه ملتان)

(الصریح یلحق الصریح)ویلحق (البائن)بشرط العدۃ(والبائن یلحق الصریح) الصریح مالایحتاج الی نیة بائنا کان الواقع به اورجعیا،فتح.فمنه الطلاق الثلاث فیلحقھا،وکذاالطلاق علی مال فیلحق الرجعی ویجب المال والبائن لایلزم المال کما فی الخلاصة،فالمعتبرفیه اللفظ لاالمعنی المشھور(لا)یلحق البائن(البائن)

وفی الشامیة:قوله:(لایلحق البائن البائن)المرادبالبائن الذی لایلحق ھوماکان بلفظ الکنایۃ لانه ھوالذی لیس ظاھرافی انشاء الطلاق،کذافی الفتح،وقیدبقوله "الذی لایلحق" اشارۃ الی ان البائن الموقع اولااعم من کونه بلفظ الکنایۃ اوبلفظ الصریح المفید للبینونۃ کالطلاق علی مال،وحینئذفیکون المراد بالصریح فی الجملۃ الثانیۃ: اعنی قولھم:"والبائن یلحق الصریح لاالبائن" ھوالصریح الرجعی فقط دون الصریح

للبائن وبه ظهران مانقله الشارح اولاً عن الفتح من الصريح مالا يحتاج الى نية بانناكان الواقع به اور جعيا خاص فى الجملة الاولى.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ
واللہ اعلم بالصواب: بلال احمد غفرہ الاحد

۱۱ جمادی الثانی ۱۴۲۸ھ
فتوی نمبر: ۹۷۵

﴿مذاکرہ طلاق میں بیوی کو "باپ کے گھر جاؤ" کہنے کا حکم﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں مفتیان کرام ذیل کے مسئلہ میں کہ میاں بیوی کے درمیان تذکرۂ طلاق چل رہا تھا، کہ شوہر نے اس کو یہ الفاظ کہدیئے (اپنے باپ کے گھر جاؤ) پوچھنا یہ ہے کہ بیوی کے اولیاء اس کو طلاق سمجھتے ہیں جبکہ شوہر کا کہنا ہے کہ اس سے میرا مقصد طلاق دینا نہیں تھا، شرعاً کس کی بات معتبر ہے؟

سائل: عازم

﴿جواب﴾ یہ لفظ عربی لفظ "اِلْحَقِیْ بِاَهْلِکِ" کے مشابہ ہے، شوہر کی نیت واقعی طلاق دینے کی اگر نہ تھی تو طلاق واقع نہیں ہوئی یعنی شوہر کی بات معتبر ہے۔

لمافی الخانية:(۱/۲۱۱، طبع قديمی)

وعن ابى يوسف فى الاملاانه الحق بهذه الخمسة اربعة اخرى الحقى باهلك لم قال ذلك فى حالة مُذاكرة الطلاق اوفى الغضب وقال لم انوبه الطلاق يصدق قضاء فى قول ابى حنيفة وقال ابى يوسف لا يصدق.

ولمافى الهداية:(۲/۳۹۰، طبع رحمانيه)

وفى حالة مُذاكرة الطلاق لم يصدق فيما يصلح جواباولا يصلح ردافى القضاء... ويُصدّق فيما يصلح جواباورداًمثل قوله اذهبى اخرجى قومى تقنعى تخمرى وما يجرى هذاالمجرى لانه يحتمل الردوهوالادنى فحمل عليه.

ولمافى البدائع:(۲/۱۰۵، طبع سعيد)

وقوله الحقى باهلك يحتمل الطلاق لان المرأةتلحق باهلهااذاصارت مطلقة ويحتمل الطردوالابعادعن نفسه مع بقاء النكاح واذااحتملت هذه الالفاظ الطلاق وغيرالطلاق فقد استترالمرادفافتقرت الى النية.

ولمافيه ايضا:(۲/۱۰۷، طبع سعيد)

واماالقسم الثالث فبقية الالفاظ التى ذكرناهالان تلك الالفاظ لاتصلح للشتم و تصلح للتبعيدوالطلاق لان الانسان قديُبعد الزوجة عن نفسه حال الغضب من غيرطلاق وكذلحال سؤال الطلاق فالحال لايدل على ارادة احدهمافاذاقال ماأردت به

الطلاق فقد نوی ما یحتمله لفظه والظاهر لا یخالفه فیصدق فی القضاء.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ　　　واللہ اعلم بالصواب: عبیداللہ عابد غفرلہ ولوالدیہ

۲۵ صفر الخیر ۱۴۳۰ھ　　　فتویٰ نمبر: ۱۹۳۱

﴿ ''تم اپنے والدین کے پاس چلی جاؤ الخ'' کہنے سے طلاق کا حکم ﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں مفتیان کرام اس مسئلہ کے متعلق کہ میری شادی اپنے سگے تایا کے گھر بمطابق ۲۴ اپریل ۲۰۰۹ کو ہوئی شادی کے بعد سے ہی میرے سسرال والوں کا رویہ میرے ساتھ اچھا نہیں رہا، میں ۳ نومبر ۲۰۰۹ سے اپنے والدین کے گھر ہوں کیونکہ میرا حمل نارمل نہیں تھا، پانچواں مہینہ مکمل ہونے پر میرا حمل ضائع ہوگیا، میرے شوہر کا رویہ بھی میرے ساتھ مناسب نہیں، اس لئے ہمارے درمیان حالات کشیدہ ہونا شروع ہوگئے۔

چنانچہ میرے شوہر چند مواقع پر شدید غصہ اور فیصلہ کن انداز میں بولے ہیں، ایک مرتبہ بمطابق ۶ ستمبر ۲۰۰۹ کو انہوں نے کہا ''تم اپنے والدین کے پاس چلی جاؤ شاید ہمارا گزارا نہیں الخ، شریعت کی روشنی میں بتائیں کہ مجھے طلاق ہوچکی ہے؟ یا باقاعدہ خلع کرنا ہوگا، نیز طلاق کی صورت میں عدت کی بھی وضاحت فرمادیں۔　　　مستفتیہ: بنت اعجاز

(نوٹ) مستفتیہ نے کافی تفصیلی تحریر ارسال کی تھی، غیر متعلقہ ہونے کی وجہ سے پوری تحریر نہیں لکھی گئی۔

﴿جواب﴾ آپکی تفصیلی تحریر کو ہم نے بغور پڑھا جس کا بڑا اثر بھی ہوا لیکن میاں بیوی کے معاملہ کی صحیح صورت حال تو تب واضح ہوتی ہے جب دونوں کا بیان سامنے ہو اس لئے زیادتی یا حق تلفی کے بارے میں ایک کا بیان سن کر مفتی کوئی فیصلہ نہیں کرسکتا، البتہ تحریر میں اصل مسئلہ کے بارے میں آپ نے جو لکھا ہے کہ مختلف مواقع پر آپ کے شوہر نے مختلف جملے استعمال کئے ہیں ان کا کیا حکم ہے؟ اس کے بارے میں عرض ہے کہ آپکی پوری تحریر سے ہم نے یہ نتیجہ لیا ہے کہ آپ کے اور آپکے شوہر کے درمیان ہونے والی گفتگو اور معاملہ کسی حتمی نتیجہ پر نہیں پہنچا، البتہ ۶ ستمبر ۲۰۰۹ کو بحالت غصہ اگر واقعۃً آپکے شوہر نے یہ الفاظ کہے ہیں ''تم اپنے والدین کے پاس چلی جاؤ کیونکہ شاید ہمارا گذارا نہیں، بہتر یہ ہے کہ ''تم فارغ ہوجاؤ'' اگر طلاق کی نیت سے

بولے گئے تھے (اور نیت کا علم صرف شوہر ہی کو ہے) تو ان الفاظ سے ایک طلاق بائن واقع ہو چکی ہے، آپ کا حمل اگر شوہر کے ان الفاظ کے بعد ساقط ہوا ہے اور ساقط شدہ حمل میں بچے کی خلقت کسی حد تک ظاہر ہو چکی تھی تو آپ کی عدت بچے کے ساقط ہونے کے ساتھ ہی مکمل ہو چکی ہے اور اگر شوہر نے یہ الفاظ حمل کے ضائع ہونے کے بعد استعمال کئے ہیں تو ایسی صورت میں تین ماہواریاں آپ کی عدت ہوگی۔

اگر شوہر کی ان الفاظ سے طلاق کی کوئی نیت نہیں تھی بلکہ یہ الفاظ بھی انہوں نے بطور مشورہ استعمال کئے ہوں تو ایسی صورت میں طلاق واقع نہیں ہوئی اور آپ بدستور ان کی منکوحہ ہیں۔

لہٰذا اگر ثالث یا منصفین کے ذریعہ مصالحت ممکن ہو تو اس کی کوشش کریں بصورت دیگر آپ اپنے شوہر سے اپنے حق مہر کے عوض یا جس پر باہمی رضامندی ہو جائے باقاعدہ خلع کر لیں خلع کے بعد تین ماہواریاں آپ کی عدت شمار ہوگی۔

لما فی شرح الوقایۃ:(۲/۸۲-۸۷،طبع امدادیہ)

وکنایتہ مالم یوضع لہ واحتملہ غیرہ فلاتطلق الابنیتہ اودلالۃ الحال وفیہ الحقی باھلک الخ تقع واحدۃ بائنۃ ان نواھاملخصا.

ولما فی الخانیۃ علیٰ ھامش الھندیۃ:(۱/۴۲۷،طبع رشیدیہ)

وعن ابی یوسف فی الاملاء انہ الحق بھذہ الخمسۃ اربعۃ اخری لاملک لی علیک الخ الحقی باھلک وفی التنویر مع الدر:(۳/۲۹۹،طبع سعید)وفی الشامی:(۳/۲۲۳،سعید)

ولما فی الھندیۃ:(۱/۴۸۸،طبع رشیدیہ)

الخلع ازالۃ ملک النکاح ببدل بلفظ الخلع کذا فی فتح القدیر.....اذاتشاقاالزوجان وخافاان لایقیماحدوداللہ فلاباس ان تفتدی نفسھابمال یخلعھابہ فاذافعلاذالک وقعت تطلیقۃ بائنۃ ولزمھاالمال کذافی الھدایۃ.

ولما فیہ ایضا:(۱/۵۲۶،الباب الثالث عشر فی العدۃ،طبع رشیدیہ)

ھی انتظار مدۃ معلومۃ یلزم المراۃ بعدزوال النکاح حقیقۃ اوشبھۃ المتاکدبالدخول وفیہ ایضا:اذا طلق الرجل امراتہ طلاقابائنااورجعیااوثلاثااووقعت الفرقۃ بینھمابغیر طلاق فعدتھاثلاثۃ اقراء.

ولما فی البحرالرائق:(۴/۱۳۵،طبع سعید)

واذااسقطت سقطااستبان بعض خلقہ انقضت بہ العدۃ لانہ ولدوان لم یستبن بعض خلقہ لم تنقض لان الحمل اسم لنطفۃ متغیرۃ بدلیل ان الساقط اذاکان علقۃاومضغۃ

لم تنتقض به العدة لانها لم تتغير فلا يعرف كونها متغيرة بهفين الاباستبانة بعض الخلق كذا في المحيط.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: عبدالوہاب لقمانی عفا اللہ عنہ

۳ جمادی الثانی ۱۴۳۱ھ — فتویٰ نمبر: ۲۷۵۸

«''میں تجھے چھوڑتا ہوں'' ان الفاظ سے طلاق واقع ہو جاتی ہے»

«سوال» ایک آدمی نے غصے میں اپنی بیوی کو کہا کہ ''میں تجھے چھوڑتا ہوں'' کیا اس جملے سے طلاق واقع ہوگی یا نہیں؟ اگر خاوند اس جملے سے ماضی کا معنی مراد لے تو پھر کیا حکم ہے؟

«جواب» ان الفاظ کا تعلق زمانہ حال سے ہے اور اردو میں صریح طلاق کیلئے استعمال ہوتے ہیں، لہٰذا یہ الفاظ اگر تین مرتبہ کہے ہوں تو بغیر حلالہ شرعیہ کے خاوند کیلئے جائز نہیں کہ اسکو اپنی بیوی بنا کر رکھے خاوند اس جملے سے ماضی کا معنی مراد لے تب بھی یہی حکم ہے اگر ایک یا دو مرتبہ یہی جملہ بولدیا ہے تو طلاق رجعی واقع ہوگئی ہے، عدت کے اندر اندر خاوند کو رجوع کرنے کا حق حاصل ہے اور عدت گزارنے کے بعد باہمی رضامندی سے نئے حق مہر کے ساتھ بغیر حلالہ شرعیہ کے دوبارہ نکاح ہو سکتا ہے لیکن آئندہ کیلئے شوہر کے پاس صرف باقی ماندہ طلاقوں کا حق باقی رہے گا۔

لما في تنقيح الحامدية: (۱/۳۸ طبع حقانيه)

صيغة المضارع لايقع بها الطلاق الأاذاغلب في الحال كما صرح به الكمال بن همام.

ولما في فتح القدير: (۴/۷، طبع رشيديه)

ولايقع باطلقك الأاذاغلب في الحال ولوقالت انت طالق فقال نعم طلقت.

ولما في البحر الرائق: (۳/۲۵۲، طبع سعيد)

وليس منه اطلقك بصيغة المضارع الأاذاغلب استعماله في الحال كما في فتح القدير وفي الصيرفية سئل الفقيه ابوليث عمن قال لجماعة كل من كان له امرأة مطلقة فليصلق بيديه فصفق وا طلقن وقيل لا وفيها قالت له طلقني فقال اطلقك وقع عند مشايخ سمرقند.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: اسلام بادشاہ بھیٹی

۵ ربیع الاول ۱۴۳۰ھ — فتویٰ نمبر: ۲۰۴۰

«طلاق بائن کی ایک صورت»

«سوال» کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ آج سے دس ماہ پہلے

میرے بھائی کا اپنی بیوی سے کسی بات پر تکرار ہوا اور غصہ میں کہہ دیا کہ تو نے ایسی بات کہی ،لہٰذا میں نے تجھے چھوڑ دیا، جا میرے گھر سے نکل، میں نے تمہیں طلاق دی، پھر عرصہ چھ مہینے تک کوئی رجوع نہیں کیا اور نہ کوئی نکاح کیا اور ایک بار پھر بول دیا کہ میں نے تمہیں طلاق دی ہے تو گھر سے نکلتی کیوں نہیں؟ اور اب بھی تقریباً ایک ماہ ہو گیا یہی کہہ دیا ہے کہ تو گھر سے نکلتی کیوں نہیں؟ جب کہ میں نے تجھے طلاق دی ہے، اس صورت میں کتنی طلاقیں واقع ہو گئی ہے اور شرعاً کیا حکم ہے، آپس میں رہ سکتے ہیں یا نہیں؟ مستفتی: محمد کلیم خان، آزاد کشمیر

﴿جواب﴾ آپ کے بھائی نے اپنی بیوی کو واقعی یہی الفاظ اگر بول دیے ہیں "میں نے تجھے چھوڑ دیا ہے جا میرے گھر سے نکل میں نے تمہیں طلاق دی" تو یہ جملہ تین طرح طلاق کے الفاظ پر مشتمل ہے، چنانچہ آخری الفاظ "میں نے تمہیں طلاق دی" یہ تو صریح طلاق ہے، اس سے بغیر نیت کے بھی طلاق واقع ہو جاتی ہے اور "میں نے تجھے چھوڑ دیا" اصالۃً یہ لفظ اگرچہ کنائی ہے، لیکن عرف میں طلاق ہی کے لئے رائج ہے، اس لئے عرفاً صریح طلاق ہے اور "جا میرے گھر سے نکل" یہ خاص کنائی طلاق ہے، طلاق کے ارادے سے کوئی بول دے تو اس سے طلاق بائن واقع ہو جاتی ہے۔

لیکن ایک ہی جملہ میں بلا فصل یہ تینوں الفاظ بول دیے ہیں اور اصالۃً یہ کنائی ہے صریح کے ساتھ ملحق ہو کر مستقل طلاق شمار ہوتی ہے لیکن یہاں "چھوڑ دیا ہے" کے لئے بظاہر تفریع واقع ہے، لہٰذا مستقل طلاق کی غرض سے آپ کے بھائی نے یہ الفاظ اگر بول دیے ہیں تو پھر تین طلاقیں واقع ہو گئی ہے اور حلالہ شرعیہ کے بغیر دوبارہ نکاح نہیں ہو سکتا۔

اور اگر مستقل طلاق کی غرض سے نہ بولے ہوں بلکہ "چھوڑ دیا ہے" کہنے کا نتیجہ اور اثر بتانا مقصود تھا اور بظاہر ایسا ہی معلوم ہوتا ہے تو ایسی صورت میں دو طلاقیں واقع ہو گئی ہیں، عدت چونکہ گزر چکی ہے، آپس میں میاں بیوی بن کر رہنا اگر چاہتے ہیں تو دونوں باہمی رضامندی سے نئے حق مہر کے ساتھ دوبارہ نکاح کر لیں، حلالہ کی ضرورت نہیں ہے، تاہم آئندہ کے لئے صرف ایک طلاق کا حق باقی رہے گا، زندگی میں کسی بھی وقت آپ کے بھائی نے نکاح کے بعد اگر ایک طلاق دیدی تو طلاق مغلظہ واقع ہو گی اور پھر حلالہ شرعیہ کے بغیر نکاح نہ ہو سکے گا، لہٰذا محتاط رہے۔

لمافی ردالمحتار،(۲۹۹/۳ طبع : سعید)

"قوله :سرحتک وهو رهاء کردم لان مسار صریحاً فی العرف علی ماصرح به نجم الزاهدی الخوارزمی فی شرح القدوری"

ولمافی ردالمحتار،(۳۰۱/۳)

والحاصل ان الاول (قومی واخرجی واذهبی)یتوقف علی نیة فی حالة الرضاوالغضب والمذاکرة"

ولمافی التنویر مع الدر،(۳۰۶/۳)

(الصریح یلحق الصریح و)یلحق (البائن)بشرط العدة (والبائن یلحق الصریح)"

ولمافی قول الله تبارک وتعالیٰ سورة البقرة ،آیت : ۲۳۰

فان طلقهافلاتحل من بعدحتی تنکح زوجاغیره ".

ولمافی العالمگیریة ،(۴۷۰/۱، ۴۷۱،طبع: رشیدیه)

واذاطلق الرجل امراة تطلیقة اوتطلیقتین فله ان یراجعهافی عدتها ___وتنقطع الرجعة ان حکم بخروجهامن الحیضة الثالثة ان کانت حرة"

ولمافی العالمگیریة ،(۴۷۳/۱)

"اذاکان الطلاق بائنادون الثلث فله ان یتزوجهافی العدة وبعدانقضائهاوان کان الطلاق ثلاثافی الحرة وثنتین فی الامة

لم تحل له من بعدحتی تنکح زوجاغیره نکاحاًصحیحاًویدخل بهاثم یطلق اویموت عنهاکذافی الهدایة ".

مزید تفصیل کے لئے دیکھیے : فتاویٰ محمودیہ، ۲۸۹/۱۸، ۲۸۳، کتاب الطلاق، طبع: دارالاشاعت کراچی)

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفااللہ عنہ　　　　واللہ اعلم بالصواب: کمیل الدین

۵ صفرالخیر ۱۴۳۴ھ　　　　فتویٰ نمبر: ۳۵۲۸

﴿لفظ حرام سے بلانیت طلاق بھی طلاق بائن واقع ہو جاتی ہے﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علمائے کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میرے شادی کو عرصہ اڑھائی سال ہوا، اہلیہ اور میرا آپس میں بنتا نہیں، ایک دو ماہ سے وہ میکے میں ہے، ہمارے بڑوں نے ہمیں آپس میں بٹھایا کہ معاملہ سدرجائے تو کسی بات پر میں نے کہا یہ اب میرے اوپر حرام ہوگئی، میں اس کو اب کیسے بساؤں؟ اس جملہ سے کیا طلاق واقع ہوگئی ہے یا نہیں؟

﴿جواب﴾ " یہ میرے اوپر حرام ہوگئی ہے" یہ لفظ اگر چہ اپنے لفظ کے اعتبار سے کنایہ ہے

مگر دلالت عرف کی بناء پر اس سے بلانیت طلاق بائنہ واقع ہو جاتی ہے، اس لئے صورت مسئولہ میں ایک طلاق بائن واقع ہو چکی ہے، اب رجوع نہیں ہو سکتا، عدت پوری گزار کر عورت دوسری جگہ چاہے تو شادی کر سکتی ہے، اور باہمی رضامندی سے دونوں آپس میں بغیر حلالہ کے تجدید نکاح بھی کر سکتے ہیں، جس کے لئے حق مہر نیا مقرر کرنا ہوگا اور آئندہ کے لئے اس شوہر کے پاس صرف دو طلاقوں کا حق باقی رہے گا، تجدید نکاح کی صورت میں کسی بھی وقت اس شوہر نے مزید اگر دو طلاقیں دیدیں تو پھر حلالہ شرعیہ کے بغیر نکاح نہ ہو سکے گا۔

لمافی الشامی (۲۹۹/۳ طبع سعید)

"وان کان الحرام فی الاصل کنایة یقع بها البائن، لانه لما غلب استعماله فی الطلاق لم یبق کنایة، ولذالم یتوقف علی النیة او دلالة الحال"

ولمافی الشامی: (۳۰۶/۳ طبع سعید)

"وقال ح: ولا یرد انت علی المفتی به من عدم توقفه علی النیة مع انه لایلحق البائن ولا یلحق البائن لکونه بائنا لما ان عدم توقفه علی النیة امر عرض له لا بحسب اصل وضعه"

ولمافی الهدایة (۴۰۵/۲ طبع رحمانیه)

"واذا کان الطلاق بائنا دون الثلث فله ان یتزوجها فی العدة وبعد انقضائها"

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ　　　　واللہ اعلم بالصواب: کمیل الدین کلکتی

۲۳ محرم الحرام ۱۴۳۲ھ　　　　فتویٰ نمبر: ۳۳۹۲

﴿طلاق رجعی کے بعد کنائی مستقل طلاق شمار ہوتی ہے﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میرا اپنی بیوی سے جھگڑا ہوا مجھے بہت زیادہ غصہ آ گیا میں نے اپنی بیوی کو ڈانٹنا شروع کر دیا میری بیوی نے مجھے کہا آپ مجھے روز ڈانٹتے رہتے ہیں اس سے بہتر ہے آپ مجھے چھوڑ دیں تو میں نے بہت زیادہ غصہ میں آ کر کہا "تجھے طلاق ہے، تجھے طلاق ہے" میں یہ کہہ کر چل پڑا جب میں گھر کے دروازہ پر پہنچا تو میں نے کہا بس اب تو اپنے "گھر چلی جا" مجھے فارغ کا لفظ یاد نہیں ہے۔ اس مسئلہ میں بعض علماء کی رائے یہ ہے کہ دو طلاقیں پہلے ہوئی، تیسری طلاق بائن ہو کر حرمت مغلظہ ثابت ہو گئی اور بعض علماء کرام کی رائے یہ ہے کہ دو طلاقیں ہوئیں اور اس کا یہ کہنا کہ "تو چلی جا" اپنی پہلی بات کی تصدیق اور بات کو پکا کرنا ہے آپ اس کے بارے میں حتمی رائے قائم کر کے فتویٰ جاری فرمائیں۔

وضاحت: مستفتی سے پوچھنے پر معلوم ہوا کہ ''تو چلی جا، تو فارغ ہے'' اس سے مستقل طلاق کی نیت نہیں تھی۔ مستفتی: عنایت اللہ

﴿جواب﴾ آپ کے اس جملہ سے ''تجھے طلاق ہے، تجھے طلاق ہے'' دو طلاقیں رجعی واقع ہوگئی ہیں مزید یہ کہنے سے ''بس اب تو اپنے گھر چلی جا'' یہ طلاق کنائی کے الفاظ ہیں اگر طلاق دینے کے ارادہ سے بول دیئے ہیں تو ان سے تیسری طلاق بھی واقع ہوگئی ہے اور طلاق دینے کے ارادے سے نہیں بولے بلکہ طلاق صریح کا نتیجہ اور اثر واضح کرنے کے ارادہ سے بول دیئے ہیں تو تیسری طلاق واقع نہیں ہوئی۔ لہذا یہ فیصلہ آپ خود ہی کر سکتے ہیں کہ دو طلاقیں واقع ہوگئی ہیں یا تین، دو طلاقیں واقع ہونے کی صورت میں آپ کو عدت گزرنے سے پہلے پہلے رجوع کا حق حاصل ہے۔ دوران عدت اگر رجوع نہیں کیا تو بعد میں بغیر حلالہ کے باہمی رضامندی سے نئے حق مہر کیساتھ نکاح ہو سکے گا اور رجوع ہو یا تجدید نکاح ہر دونوں صورتوں میں اب ایک ہی طلاق باقی ہے۔ احتیاط کریں کسی بھی موقع پر ایک مزید طلاق دینے سے حرمت مغلظہ ثابت ہوگی پھر حلالہ شرعیہ کے بغیر یہ بیوی کبھی حلال نہ ہوگی۔ اور اگر تینوں طلاقیں واقع ہوگئیں ہیں تو اس صورت میں حرمت مغلظہ ثابت ہوگئی ہے۔ بغیر حلالہ کے تجدید نکاح بھی نہیں ہو سکتا عدت گزارنے کے بعد یہ عورت چاہے تو دوسری جگہ شادی کر سکتی ہے۔

لما فی العالمگیریہ: (۱/۴۷۰، طبع رشیدیہ)

واذا طلق الرجل امراته تطليقة او تطليقتين فله ان يراجعها في عدتها رضيت بذلك او لم ترض كذا في الهداية.

ولما في الهداية: (۲/۳۱۹، طبع سعيد)

الكنايات لايقع بها الطلاق الابالنيته او بدلالة الحال لانها غير موضوعة للطلاق بل تحتمله و غيره فلا بد من التعين او دلالته.

ولما في شرح الوقاية: (۲/۸۶، طبع امداديه)

و كنايته مالم يوضع له و احتمله و غيره فلا تطلق الابنيته او دلالة الحال.

و لما في تحفة الفقهاء: (ص ۳۰۵، مكتبة المعروفية)

اذا ذكر لفظا يصلح للطلاق في غير حال مذاكرة الطلاق و حال الغضب، كهما كان فاذا نوى به الطلاق يقع وان لم يكن له نية لا يقع لانه كما يصلح للفرقة لامر آخر فان قوله "بائن" يحتمل بينونة الطلاق و يحتمل البينونة عن الخير او عن الشر و كذلك

قولہ "اذھبی" "اغربی" "الحقی باھلک" فانہ کما یصلح للطلاق یصلح للابعاد عن نفسہ و التغریب من غیر طلاق محتمل و المحتمل لا یقع بدون النیۃ.

ولما فی تنویر الابصار مع درالمختار: (۲۹۶/۳، ۲۹۷، طبع سعید)

(و کنایتہ) عند الفقہاء (ما لم یوضع لہ) ای الطلاق (واحتملہ) و غیرہ (و) الکنایات (لاتطلق بہا) قضاء (الا بنیۃ او دلالۃ الحال) و ھی حالۃ المذاکرۃ الطلاق او الغضب فالحالات ثلاث رضاء غضب و مذاکرۃ و الکنایات ثلاث ما یحتمل الرد او ما یصلح للسب اولا و لا فنحو اخرجی و اذھبی وقومی)........ (یحتمل ردا)

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفااللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: محمد حامد یاسین، بھکر

۱۰ ربیع الثانی ۱۴۳۴ھ — فتویٰ نمبر: ۳۶۸۱

﴿الفاظ کنایات کہہ دینے سے بغیر نیت کے طلاق واقع نہیں ہوتی﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ شوہر نے غصہ کی حالت میں اپنی بیوی سے یہ الفاظ کہہ دیے کہ "تم نے میری زندگی خراب کردی ہے اپنے والدین سے کہو کہ آکر تمہیں لے جائیں" مذکورہ جملے طلاق کی نیت سے ہرگز نہیں کہے گئے تھے تو کیا شوہر کے اس طرح کہہ دینے سے طلاق واقع ہوئی یا نہیں؟ مستفتی: رانا صلاح الدین کورنگی

﴿جواب﴾ مذکورہ صورت میں شوہر نے واقعی صرف یہی الفاظ "تم نے میری زندگی خراب کردی ہے اپنے والدین سے کہو کہ آکر تمہیں لیجائیں" بولے ہوں اسکے علاوہ کچھ اور نہ بولا ہو تو یہ طلاق کنایہ کے الفاظ ہیں جنکا حکم یہ ہے کہ طلاق کی نیت ہو تو ان الفاظ سے طلاق واقع ہو جاتی ہے، نیت نہ ہو تو واقع نہیں ہوتی، شوہر کا کہنا ہے کہ طلاق کی نیت نہیں تھی، اس بارے میں شوہر اپنی بیوی کو مطمئن کرنے کے لئے اللہ تعالیٰ کی قسم کھالے کہ ان الفاظ سے میری طلاق کی کوئی نیت نہیں تھی تو اس صورت میں کوئی طلاق واقع نہیں ہوگی، بیوی اپنے شوہر کے نکاح میں بدستور رہے گی۔

لما فی الشامی: (۲۹۸/۳، طبع سعید)

والکنایات ثلاث مایحتمل الرد او مایصلح للسب اولا و لا (فنحو اخرجی واذھبی وقومی)

وفی الشامیۃ: (قولہ فنحو اخرجی واذھبی وقومی) ای من ھذا المکان لینقطع الشر فیکون ردا اولانہ طلقھا فیکون جوابا۔ رحمتی.

ولما فی التنویر مع الدر: (۳۰۰/۳-۳۰۱، طبع سعید)

(ففی حالۃ الرضاء) ای غیر الغضب والمذاکرۃ (تتوقف الاقسام) الثلاثۃ تاثیرا (علی نیۃ)

للاحتمال والقول له بيمينه في عدم النية يكفي تحليفها له في منزله فان ابى رفعته للحاكم فان نكل فرق بينهما مجتبى.(وفي الغضب)توقف الاولان ان نوى وقع والا لا.

وفي الشامية:(قوله بيمينه)فاليمين لازمة له سواء ادعت الطلاق ام لا حقالله تعالى ط عن البحر(قوله توقف الاولان)اى مايصلح رداوجوابا ومايصلح سبا وجوابا ولايتوقف مايتعين للجواب،بيان ذلك ان حالة الغضب تصلح للرد والتبعيد وللسب والشتم كماتصلح للطلاق والالفاظ الاولين يحتملان ذلك ايضا فصار الحال في نفسه محتملا للطلاق وغيره،فاذاعنى به غيره فقدنوى مايحتمله كلامه ولايكذبه الظاهر فيصدق في القضاء.

ولمافي الهندية:(۳۷۴/۱،طبع رشيديه)

(ومايصلح جوابا وردا لا غير)اخرجي اذهبي اغربي قومي تقنعي استتري تخمري وفي حالة الغضب يصدق في جميع ذلك لاحتمال الرد والسب الا مافيما يصلح لطلاق ولا يصلح للرد والشتم كقوله اعتدى واختاري وامرك بيدك فانه لايصدق فيها كذافي الهداية.

الجواب صحیح:عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ والله اعلم بالصواب:نعیم اقبال عفا اللہ عنہ

۲۴ ربیع الثانی ۱۴۳۱ھ فتویٰ نمبر:۲۶۴۰

﴿''جاؤ تو میری بیوی نہیں''ان الفاظ سے طلاق واقع ہو جاتی ہے﴾

﴿سوال﴾ایک آدمی نے اپنی بیوی کو بدفعلی کے شبہ کی وجہ سے کہا کہ''جاؤ تو میری بیوی نہیں''ہے اور گھر سے نکال دیا،کیا ان الفاظ سے طلاق واقع ہوگی یا نہیں؟اگر واقع ہوگی تو کونسی طلاق واقع ہوگی؟ مستفتی:حاجی نورالرحمٰن

﴿جواب﴾مذکورہ صورت میں شوہر کی نیت کا اعتبار ہوگا شوہر نے اگر یہ الفاظ طلاق دینے کی غرض سے بولے ہیں تو ایک طلاق بائن واقع ہوگی،اب رجوع نہیں ہوسکتا،البتہ باہمی رضامندی سے نئے حق مہر کے ساتھ دوبارہ نکاح ہوسکتا ہے،نکاح کی صورت میں آئندہ کیلئے شوہر کے پاس دو(۲)طلاقوں کا حق باقی رہے گا اور عورت چاہے تو عدت گذارنے کے بعد دوسری جگہ شادی کرسکتی ہے اور شوہر کہے کہ طلاق کی نیت نہیں تھی تو بیوی کو باور کرانے کے لئے قسم کھالے تو کوئی طلاق واقع نہیں ہوئی۔

لمافي الهداية:(۳۹۰/۲،طبع رحمانيه)

واخرجي واذهبي وقومي وابتغي الازواج لانها تحتمل الطلاق وغيره فلابدمن النية.

ولمافي الهندية:(۳۷۵/۱،طبع رشيديه)

وفي حالة مذاكرة الطلاق يقع الطلاق في سائر الاقسام قضاء الا فيما يصلح

جوابا،وردا،لانه لایحمل طلاقا.

ولما فی الشامی:(٢١٨/٣،طبع سعید)

(قوله فنحو اخرجی واذهبی وقومی)ای من کان هذا المکان لینقطع الشر فیکون ردا،اولانه طلبها فیکون جوابا.

ولما فی التنویر مع الدر:(٣٠٠/٣،طبع سعید)

(وتتوقف الأقسام)الثلاثة تاثیر(علی النیة)للاحتمال والقول له بیمینه فی عدم النیة.

وفی الشامیة:(قوله بیمینه)فالیمین لازمة له سواء ادعت الطلاق أم لا حتالله تعالی.

ولما فی فتاوی قاضی خان:(٢١١/١،طبع قدیمی)

قومی اخرجی اذهبی انتقلی انطلقی تزوجی اعزبی لانکاح لی علیک......لایقع الطلاق الابالنیة.واذاقال لم انوالطلاق کان مصدقاً.

الجواب صحیح:عبدالرحمٰن عفااللہ عنہ | واللہ اعلم بالصواب:اسلام بادشاہ ہنگی

۲۴صفرالخیر ۱۴۳۰ھ | فتوی نمبر:۱۹۹۴

﴿کیا یہ اپنے آپ کو مجھ پر حرام سمجھتی ہے الفاظ کا حکم﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام شوہر کی بیوی سے لڑائی ہوئی تو شوہر اپنی ساس سے باتیں کر رہا تھا،شوہر نے اپنی ساس سے کہا"کیا یہ اپنے آپ کو مجھ پر حرام سمجھتی ہے حرام سمجھتی ہے حرام سمجھتی ہے"اب ساس کا کہنا ہے کہ شوہر نے میری بچی کو طلاق دی ہے جبکہ شوہر منکر ہے کہ میں نے طلاق نہیں دی ہے،قرآن وحدیث کی روشنی میں جواب دیں۔ مستفتی:منظور عرفات ٹاؤن

﴿جواب﴾ بیان کردہ صورت میں مذکورہ الفاظ سے اگر آپکی ساس وقوع طلاق مراد لے رہی ہے تو یہ درست نہیں،اسلئے کہ ان الفاظ سے کوئی طلاق واقع نہیں ہوتی۔

لما فی الدرمع الرد:(٢٣٠/٣،طبع سعید)ورکنه لفظ مخصوص.

وفی الشامیة:(قوله ورکنه لفظ مخصوص)هوماجعل دلالة علی معنی الطلاق من صریح اوکنایة فخرج الفسوخ علی ما مر،واراد اللفظ ولو حکماً الخ.

الجواب صحیح:عبدالرحمٰن عفااللہ عنہ | واللہ اعلم بالصواب:محمد طیب حسن زکی

۲۸جمادی الاولی ۱۴۳۰ھ | فتوی نمبر:۲۱۹۳

﴿بیوی سے کہنا کہ"آج کے بعد تو میرے اوپر حرام ہے"ایک طلاق بائن ہے﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک آدمی نے اپنی بیوی

سے کہا'' آج کے بعد بلکہ ابھی سے تم میرے اوپر بالکل حرام ہو'' اسکے بعد کہا'' اسکے بعد اگر میں نے تجھے ہاتھ بھی لگایا تو مجھ پر خداتعالیٰ کی مار'' واضح رہے کہ یہ الفاظ اس نے کئی بار بولے ہیں، اب وضاحت طلب امر یہ ہے اس سے کتنی طلاقیں واقع ہوں گی؟ برائے کرم وضاحت فرمائیں.

﴿جواب﴾ ''تو مجھ پر حرام ہے'' اگر چہ اپنی اصل وضع کے اعتبار سے الفاظ کنایہ ہیں لیکن چونکہ آجکل اسکا استعمال طلاق کیلئے عام ہے اسلئے صریح کے حکم میں ہے، لہذا بغیر نیت طلاق کے بھی اس سے طلاق واقع ہو جاتی ہے، پھر لفظ کے اندر چونکہ حرمت والا معنی پایا جاتا ہے اسلئے اس سے واقع ہونے والی طلاق بائن ہوگی، لہذا صورت مسئولہ میں ایک طلاق بائن واقع ہوگئی ہے، الفاظ اگر چہ کئی بار بولدئے ہوں لیکن طلاق بائن مکرر دینے سے بھی ایک ہی شمار ہوتی ہے اسلئے ایک ہی طلاق واقع ہوگئی ہے، عورت عدت گزارنے کے بعد دوسری جگہ شادی کرسکتی ہے۔

لمافی الدر مع الرد: ج۳/۳۲۲،۳۲۵(طبع سعید)

(وتطليقة بائنة)(اى قوله لامرأته انت على حرام)ان نوى الطلاق وثلاث ان نواهايفتى بانه طلاق بائن وان لم ينو ه لغلبة العرف (قوله لغلبة العرف)اشارة الى مافى البحر حيث قال :فان قلت اذاوقع الطلاق بلانية فينبغى ان يكون كالصريح فيكون الواقع به رجعياقلت :المتعارف به ايقاع البائن ،اقول وفى هذالجواب نظرفانه يقتضى انه لولم يتعارف به ايقاع البائن يقع به الرجعى كمافى زماننافان المتعارف الآن استعمال الحرام فى الطلاق ولايميزون بين الرجعى والبائن فضلاعن ان يكون عرفهم فيه البائن واماكونه باننافلانه مقتضى لفظ الحرام لان الرجعى لايحرم الزوجة مادامت فى العدة وانمايصح وصفهابالحرام بالبائن .

ولمافى البحر: ج۳/۲۹۱(طبع سعید)

وفى الفتاوى اذاقال لامرأته انت على حرام والحرام عنده طلاق ولكن لم ينو طلاقا وقع الطلاق يعنى قضاء لماظهر من العرف .

ولمافى الشامى: ج۳/۳۰۶(طبع سعید)

ولايرد انت على حرام على المفتى به من عدم توقفه مع انه لايلحق البائن ولايلحقه البائن لكونه بائنا وايضا قال نقلا عن الكافى للحاكم الشهيد رح:واذاطلقهاتطليقة بائنة ثم قال لهافى عدتهاانت على حرام أوخلية أوبرية وهو يريد به الطلاق لم يقع عليهاشئى لانه صادق فى قوله هى على حرام وهى منى بائن لانه يمكن جعل الثانى خبراعن الاول .

الجواب صحیح: مفتی عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ واللہ اعلم بالصواب: عاقل شاہ

۲۳ ربیع الثانی ۱۴۳۵ فتویٰ نمبر: ۴۰۹۹

﴿خاوند کہے کہ تو مجھ پر حرام ہے﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ:

(۱) اگر کوئی شوہر اپنی بیوی کو گھریلو نا چاقی کی وجہ سے کہے کہ "تو مجھ پر حرام ہے" تجھے میری طرف سے پکی چھٹی ہے، تجھے میری طرف سے پکا ریسٹ ہے، یہ الفاظ بار بار کہے کیا مذکورہ شخص کا نکاح باقی ہے یا اس کی بیوی کو طلاق واقع ہوگئی ہے؟ اگر طلاق واقع ہوئی ہو تو کون سی طلاق واقع ہوئی ہے؟ اور کیا دوبارہ نکاح کی کوئی صورت نکل سکتی ہے یا نہیں؟

(۲) اگر یہی شخص مذکور اپنی بیوی سے اپنی دو بچیوں کے بارے میں کہے کہ یہ میری نہیں ہیں، میں ثابت کروں گا، یہ الفاظ بار بار کہے تو شرعاً اس کا کیا حکم ہے؟

(۳) اگر مذکورہ جملوں کی وجہ سے طلاق واقع ہوگئی ہے تو اس عورت کو بصورت مہر زیور دے کر بعد میں فروخت کر دیا گیا ہے، کیا اب خاوند کے ذمہ اس مہر کی ادائیگی ضروری ہے یا نہیں؟

﴿جواب﴾ (۱) مذکورہ صورت میں جب شوہر نے پہلی مرتبہ اپنی بیوی کو کہا کہ "تو مجھ پر حرام ہے" تو اس سے بیوی پر ایک طلاق بائن واقع ہوگئی ہے اور دونوں کے درمیان زوجیت کا تعلق اسی ایک جملے سے ختم ہو گیا ہے، اسکے بعد مذکورہ الفاظ کا بار بار تکرار لغو ہے۔

لہٰذا عورت چاہے تو عدت گزار کر دوسری جگہ نکاح کر سکتی ہے، البتہ فریقین میں اگر صلح کی کوئی صورت بن جائے تو دونوں کی رضامندی سے نئے مہر کے ساتھ صرف تجدید نکاح ضروری ہے، حلالہ ضروری نہیں ہے اور آئندہ کے لئے شوہر کے پاس صرف دو طلاقوں کا حق باقی رہے گا۔

(۲) بغیر کسی شرعی ثبوت کے اپنی بچیوں کے نسب کی نفی کرنا بیوی پر بہتان ہے جو گناہ کبیرہ ہے، قرآن پاک میں ایسا کرنے والوں پر سخت وعید آئی ہے، لہٰذا توبہ واستغفار کے علاوہ شوہر کو چاہیے کہ عورت سے معافی بھی مانگ لے اور آئندہ ایسا جملہ بولنے سے اجتناب کرے۔

(۳) مہر عورت کا حق ہے جس کی ادائیگی شرعاً شوہر پر لازم ہے، مہر ادا نہ کرنے پر حدیث میں سخت وعید آئی ہے، لہٰذا طلاق کے بعد عورت کو مہر کے مطالبہ کا حق ہے، عدم ادائیگی کی صورت میں عورت مہر وصول کرنے کے لئے عدالت سے بھی رجوع کر سکتی ہے۔

ولما فی قولہ تعالٰی:(سورۃ النور،آیت ۲۳)

﴿ان الذین یرمون المحصنت الغفلت المؤمنات لعنوا فی الدنیا والاخرۃ ولھم عذاب عظیم.....الآیۃ﴾

لما فی الدر مع الرد:(۲/۲۲۳-۲۲۵،طبع سعید)

(ولو قال لامرأتہ انت علی حرام)......ویفتی بانہ طلاق بائن وان لم ینوہ لغلبۃ العرف.
وفی الشامیۃ:وعلی ھذا التعلیل بغلبۃ العرف لوقوع الطلاق بہ بلانیۃ وأما کونہ بائنا فلانہ مقتضی لفظ الحرام لان الرجعی لا یحرم الزوجۃ ما دامت فی العدۃ وانما یصح وصفھا بالحرام بالبائن.

ولما فی الھندیۃ:(۱/۳۷۷،طبع رشیدیہ)

ولا یلحق البائن البائن بان قال لھا انت بائن ثم قال لھا انت بائن لا یقع الا طلقۃ واحدۃ بائنۃ.

ولما فی التاتارخانیۃ:(۲/۲۲۳،طبع قدیمی)

رجل قال لامرأتہ "انت علی حرام علی" والحرام عندہ طلاق لکن لم ینو طلاقا وقع الطلاق.

ولما فی التنویر مع الدر:(۳/۱۰۲،طبع سعید)ویتاکد(عند وطی اوخلوۃ صحت)من الزوج.
وفی الشامیۃ:وافاد ان المھر وجب بنفس العقد لکن مع احتمال سقوطہ بردتھا او تقبیلھا ابنہ او تنصفہ بطلاقھا قبل الدخول وانما یتاکد لزوم تمامہ بالوطی ونحوہ.

الجواب صحیح:عبدالرحمٰن عفااللہ عنہ　　　　واللہ اعلم بالصواب:عبدالحکیم کشمیری عفااللہ عنہ

۹ رجب ۱۴۲۹ھ　　　　فتوی نمبر:۱۶۷۰

﴿طلاق کے جھوٹے اقرار کا حکم﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک شخص نے صرف ایک پتھر اپنی بیوی کیطرف پھینکا حالت غصہ میں طلاق کا کوئی لفظ نہیں بولا پھر کچھ دیر بعد اس کا بھائی گھر آیا اور چھوٹے بھائی سے پوچھا،کیا تو نے اپنی بیوی کو تین طلاقیں دی؟ تو اس نے کہا"ہاں" وضاحت کرنے پر بتا رہا ہے کہ طلاق کا کوئی ارادہ نہیں تھا،بھائی کیساتھ ناچاقی ہے،اسلئے زیادہ بات کرنا نہیں چاہا،اس کے علاوہ بھائی کے سوال کا مطلب بھی صرف پتھر پھینکنے کیوجہ سے وقوع طلاق تھا،اس لئے کہ اس علاقہ میں پتھر پھینکنا طلاق شمار ہوتا ہے؟　　　　مستفتی:ضیاء الدین ٹانک

﴿جواب﴾ زبان سے کچھ کہے بغیر صرف پتھر پھینکنے سے کوئی طلاق واقع نہیں ہوتی لیکن جس وقت بھائی نے پوچھا کہ تو نے طلاق دی؟ اس کے جواب میں آپ نے "ہاں" یعنی جھوٹا اقرار کرلیا اور جھوٹے اقرار سے طلاق قضاءً واقع ہوجاتی ہے یعنی معاملہ اگر کسی حاکم یا عدالت

تک پہنچا تو وقوع طلاق کا فیصلہ کیا جائیگا اسلئے کہ قاضی ظاہر پر فیصلہ کرنے کا پابند ہے، البتہ دیانۃً (عند اللہ) طلاق واقع نہ ہوگی، اللہ تعالیٰ دلوں کے بیدوں سے باخبر ہے، لہٰذا عورت کو اپنے شوہر پر اگر اعتماد ہے کہ بھائی کو "ہاں" کہنے سے کوئی نئی طلاق دینا مقصود نہیں تھا تو کوئی طلاق واقع نہیں ہوئی اور اعتماد نہیں ہے تو شوہر سے قسم لینا ضروری ہے۔

لما فی الشامی:(۲۳۶/۳،طبع سعید)

ولو اقر بالطلاق کاذبا او هازلاً وقع قضاءً لا دیانۃ.

ولما فیه ایضا:(۲۳۸/۳،طبع سعید)

(قوله أو هازلا) ثم نقل عن البزازیة والقنیة لو اراد به الخبر عن الماضی کذبا لا یقع دیانۃً وان اشهد قبل ذلک لا یقع قضاءً ایضا اه.

ولما فی الدر المختار:(۲۹۲/۳،طبع سعید)

قال: انت طالق او انت حر وعنی الاخبار کذبا وقع قضاءً الا اذا اشهد علی ذلک.

ولما فی الدر المختار:(۱۲۶/۵،طبع سعید)

اقر بشیء ثم ادعی الخطأ لم یقبل الا اذا اقر بالطلاق بناءً علی افتاء المفتی ثم تبین عدم الوقوع لم یقع یعنی دیانۃ قنیة.

ولما فی الشامی:(۲۳۰/۳،طبع سعید)

(قوله ورکنه لفظ مخصوص) هو ما جعل دلالة علی معنی الطلاق من صریح او کنایة ـــ وبه ظهر ان من تشاجر مع زوجته فاعطاها ثلاثة احجار ینوی الطلاق ولم یذکر لفظا لا صریحا ولا کنایة لا یقع علیه کما افتی به الخیر الرملی وغیره.

الجواب صحیح: عبد الرحمٰن عفا اللہ عنہ | واللہ اعلم بالصواب: عقیل احمد حقانی عفی عنہ

۳ رجب المرجب ۱۴۳۱ھ | فتوی نمبر: ۲۷۲۹

﴿طلاق پر شہادت کا حکم﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں مفتیان کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک شخص نے شراب کے نشے کی حالت میں اپنے گھر میں داخل ہو کر بچوں اور بیوی کو مارنا شروع کر دیا اور اول فول بکنے لگا شور کی آواز سن کر پڑوس کے کچھ لوگ جمع ہوئے اور معاملے کو رفع دفع کیا، نشہ اترنے کے بعد لوگوں نے بتایا کہ تم نے اپنی بیوی کو طلاق دی ہے، مذکورہ شخص منکر ہے اور بیوی بچے بھی کہتے ہیں، آپ نے ایسی کوئی بات نہیں کی۔ شریعت کی رو سے بتائیں کہ اس شخص کی بیوی ان لوگوں

کے کہنے سے اس پر حرام ہوگی؟ یا زوجیت کا تعلق برقرار رہے گا؟ مستفتی: عزیز احمد مختار

﴿جواب﴾ مذکورہ صورت میں جو لوگ طلاق کے دعویدار ہیں وہ قاضی کے پاس یا پنچائیت کے روبرو آکر یہ گواہی دیں کہ اس شخص نے ہماری موجودگی میں اپنی بیوی کو طلاق دی ہے اور لفظ ''طلاق'' سنا بیان کریں تو طلاق واقع ہو جائے گی۔

لما في الهندية:(۲/۲۵۱،طبع رشيديه)

ومنها الشهادة بغير الحدود والقصاص ومايطلع عليه الرجال وشرط فيها شهادة رجلين أورجل وامرأتين سواء كان الحق مالا أوغيرمال كالنكاح والطلاق والعتاق والوكالة والوصاية ونحوذلك مماليس بمال.

تاہم قاضی اگر اُن شہود میں عدالت کے اوصاف کو مفقود پائے یا شہود علیہ کے ساتھ اُن کی عداوت ثابت ہو جائے تو اُن کی گواہی قبول نہیں کی جائے گی اور میاں بیوی کے درمیان رشتہ زوجیت برقرار رہے گا۔

لما في البحرالرائق:(۷/۵۶،طبع سعيد)

ومن الشرائط:أن لايكون بينه وبين المشهودله قرابة الولادولازوجية وأن لايدفع عن نفسه مغرماوان لايجلب لنفسه مغنماوأن لايكون بينه وبين المشهودعليه عداوة دنيوية.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم: محمد عزیز چترالی

۱۹ ربیع الاول ۱۴۲۷ھ — فتویٰ نمبر: ۵۶۳

﴿محض ارادہ کرنے سے طلاق واقع نہیں ہوتی﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک مرد سے اس کی بیوی بار بار طلاق کا مطالبہ کرتی رہی، ایک دن بیوی نے کہا کہ مجھے طلاق دو طلاق دو، مجھے چھوڑتے کیوں نہیں؟ شوہر نے کہا کہ چلو کاغذات بھیج دو، میں سائن (دستخط) کرونگا۔

عرض یہ ہے کہ اس گفتگو سے طلاق واقع ہوئی یا نہیں؟ مستفتی: قاری نصیر صاحب

﴿جواب﴾ شوہر کا یہ کہنا کہ ''چلو کاغذات بھیج دو، میں دستخط کرونگا'' ارادہ طلاق ہے یا زیادہ سے زیادہ وعدہ طلاق ہے سو ارادۂ طلاق یا وعدۂ طلاق سے کوئی طلاق واقع نہیں ہوتی، لہٰذا مذکورہ صورت میں کوئی طلاق واقع نہیں ہوئی۔

لما في البحر:(۳/۲۵۱،طبع سعيد)

ولوقال ارد ت طلاقك لايقع.

ولما فی تنقیح الحامدیۃ:(۳۸/۲،طبع حقانیہ)

المضارع لایقع بھا الطلاق الا اذا غلب فی الحال کما صرح بہ الکمال ابن الھمام۔

ولما فی الشامی:(۲۴۸/۳،طبع سعید)

(قولہ ومابمعناھا من الصریح)......وکذا المضارع اذا غلب فی الحال مثل أطلقک۔

الجواب صحیح عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ   واللہ اعلم بالصواب: عبداللہ غفرلہ ولوالدیہ

۱۰ ربیع الثانی ۱۴۲۸ھ   فتویٰ نمبر:۷۵۰

﴿طلاق منجز کی ایک مخصوص صورت کا حکم﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک شخص نے اپنی بیوی سے کہا ''اس وقت تک تجھے طلاق ہے جب تک میری والدہ کو راضی نہ کرلے'' اس کلام کے بعد عورت شوہر کے پاس گئی تو شوہر نے دوبارہ یہی الفاظ دہرائے، کئی دفعہ ایسا ہوا لیکن شوہر برابر پہلے والے الفاظ دہراتا رہا، اب شوہر کہتا ہے کہ میں نے دوبارہ جو الفاظ دہرائے ہیں میرا مقصد اس سے پہلی بات کی یاددہانی تھی نہ کہ دوسری طلاق، نیز اسکی بیوی بھی قرینہ سے یہی سمجھی ہے تو کیا تین طلاق واقع ہوئی یا ایک؟   مستفتی: محمد حلیم عبدل خیل

﴿جواب﴾ مذکورہ صورت میں بظاہر یہ شخص اپنی بیوی کو دھمکی دے رہا تھا کہ اگر آپ نے میری والدہ کو راضی نہ کیا تو آپ کو طلاق دونگا لیکن الفاظ ایسے استعمال کئے کہ جن سے فی الحال طلاق واقع ہوگئی، البتہ دوسری تیسری دفعہ الفاظ طلاق دہرانے سے دیانۃً طلاق نہیں ہوگی قضاءً دوسری اور تیسری طلاق واقع ہوگی، عورت کیلئے شوہر کیساتھ بحیثیت بیوی کے رہنا دیانۃً جائز ہے، چنانچہ تنقیح الحامدیۃ کی عبارت میں "المرأۃ کالقاضی" کی تفصیل میں فرماتے ہیں کہ عورت قاضی کیطرح ظاہر پر عمل کرے گی کیونکہ وہ قاضی کیطرح ظاہر ہی کو جانتی ہے جبکہ مذکورہ صورت میں عورت قرائن خارجیہ کیوجہ سے شوہر کی نیت کو غالب گمان کے درجہ میں جانتی ہے کہ دوسری اور تیسری مرتبہ الفاظ طلاق دہرانے سے مقصود پہلے والے الفاظ یاد دلانا تھا۔

لما فی التنویر مع الدر:(۲۶۹/۳،طبع سعید)

(انت طالق مالم اطلقک اومتی لم اطلقک اومتی مالم اطلقک وسکت طلقت) للحال بسکوتہ

ولما فی الھندیۃ:(۳۶۹/۱،طبع رشیدیہ)

ولو قال انت طالق مالم اطلقک اومتی لم اطلقک اومتی مالم اطلقک وسکت

طلقت باتفاق العلماء.

ولما فی الشامی:(۲۹۳/۳،طبع سعید)

(قوله کرر لفظ الطلاق)بان قال للمدخولة:انت طالق انت طالق ارقدطلقتک قد طلقتک أوانت طالق قدطلقتک اوانت طالق وانت طالق،واذاقال:أنت طالق ثم قیل له ماقلت؟فقال:قدطلقتهااوقلت هی طالق فهی طالق واحدة لانه جواب،کذافی کافی الحاکم(قوله وان نوی التاکیددین)ای وقع الکل قضاء.

ولمافی الهندیة:(۳۵۴/۱،طبع رشیدیه)

ولوقال لهاانت طالق ونوی به الطلاق عن وثاق لم یصدق قضاء ویدین فیمابینه وبین الله تعالی والمرأة کالقاضی لایحل لهاان تمکنه اذاسمعت منه ذلک اوشهدبه شاهدعدل عندها.

ولمافی تنقیح الحامدیة:(۳۷/۱،طبع حقانیه)

وقال فی الخانیة لوقال انت طالق انت طالق انت طالق وقال اردت به التکرار صدق دیانةوفی القضاء طلقت ثلثاومثله فی الاشباه والحدادی وزادالزیلعی ان المرأة کالقاضی فلایحل لهاان تمکنه اذاسمعت منه ذلک اوعلمت به لانهالاتعلم الا الظاهر.

الجواب صحیح:عبدالرحمٰن عفااللہ عنہ　　　　واللہ اعلم بالصواب:سلمان احمد

۱۳ربیع الاول ۱۴۳۰ھ　　　　فتویٰ نمبر:۲۰۱۳

﴿ایک طلاق رجعی کے بعد دوطلاقوں کا اختیار ہے﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میں نے ہاتھ میں تین پتھر لیکر اپنی حاملہ بیوی سے کہا کہ تجھے طلاق ہے،اب اس کا حمل (جو کہ تقریباً پانچ مہینہ کا تھا) ساقط ہوگیا تو کیا میری بیوی پر طلاق واقع ہوگئی؟اوراب میں دوبارہ اسکو بیوی بنا کر رکھ سکتا ہوں یا نہیں؟

﴿جواب﴾ واضح رہے کہ طلاق کا معاملہ بڑا نازک ہے،مفتی صرف سوال کے مطابق جواب دینے کا پابند ہے،اس لئے کہ وہ غیب نہیں جانتا،لہٰذا شوہر نے واقعی صرف ایک ہی بار "تجھے طلاق ہے" کہا ہے تو صرف ایک طلاق رجعی واقع ہوگئی ہے اوراب چونکہ وضع حمل کی وجہ سے عدت بھی گذر گئی ہے۔

لہٰذا شوہر کا حق رجوع باقی نہ رہا،عورت چاہے تو دوسری جگہ شادی کرسکتی ہے اوراسی شوہر کیساتھ بھی چاہے تو باہمی رضامندی سے نئے حق مہر کیساتھ دوبارہ نکاح کرسکتی ہے،حلالہ کی کوئی ضرورت نہیں ہے،اسی شوہر کیساتھ دوبارہ نکاح کرنے کی صورت میں صرف دوطلاقوں کا حق شوہر کے پاس رہیگا،کسی بھی موقع پر مزید دوطلاقیں اگر دیں تو پھر حلالہ شرعیہ کے بغیر نکاح نہ

ہو سکے گا، لہٰذا احتیاط رہے۔

لما فی الهندية:(۱/ ۴۷۰،طبع رشيديه)

واذا طلق الرجل امرأته تطليقة رجعية او تطليقتين فله ان يراجعها في عدتها رضيت بذلك اولم ترض وايضا في ص/ ۳۵۵ وان قال انت الطلاق او انت طالق الطلاق اوانت طالق طلاقا فان لم تكن له نية اونوى واحدة او ثنتين فهي واحدة رجعية وان نوى ثلاثا فثلاث وايضا في ص/ ۳۵۷ ولو قالت لزوجها طلقني فاشار بثلاث اصابع واراد بذلك ثلاث تطليقات لايقع مالم يقل بلسانه.

ولما في ردالمحتار:(۲/ ۵۱۱،طبع سعيد)

(قوله وضع حملها)اى بلاتقدير بمدة سواء ولدت بعدالطلاق اوالموت بيوم او اقل جوهرة،والمراد به الحمل الذى استبان بعض خلقه او كله،فان لم يستبن بعضه لم تنقض العدة،لان الحمل اسم لنطفة متغيرة،فاذاكان مضغة او علقة لم تتغير فلا يعرف كونها متغيرة بيقين الا باستبانة بعض الخلق بحرعن المحيط.

ولما في الهداية:(۲/ ۲۲،طبع حقانيه)

(ولانه)اى ايقاع الواحدة(ابعدمن الندامة)حيث ابقى بنفسه التدارك بان يراجعها في العدة وبعدها بتجديد النكاح من غير تزوج اخر.

ولما في البحر:(۳/ ۳۳۵،طبع سعيد)

وان كان رجعيا وقف على انقضاء العدة اى لم يزل الملك الابعد انقضائها.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: سلمان احمد

۱۰ رجب ۱۴۳۰ھ — فتویٰ نمبر: ۲۳۶۰

﴿طلاق معلق کا بیان﴾

﴿طلاق معلق میں خلاف ظاہر کی نیت کرے تو کیا حکم ہے؟﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام کہ ایک شخص نے دوسرے کو باور کرانے کیلئے کہا کہ اگر بیس مارچ تک میں نے فلاں کام نہیں کیا تو میری بیوی کو طلاق جبکہ دل میں اس نے بیس مارچ سے مستقبل بعید کے بیس مارچ کی نیت کی مثلاً 2090 وغیرہ کی، پوچھنا یہ ہے کہ اگر اس شخص نے اسی سال کے 20 مارچ تک وہ کام نہیں کیا تو اسکی بیوی کو اسی وقت طلاق ہوگی یا اس کی نیت کے مطابق مستقبل بعید کے 20 مارچ میں طلاق واقع ہوگی؟ — قاری سجاد سعد اللہ

﴿جواب﴾ صورت مسئولہ میں اگر اس شخص نے اسی رواں سال کے 20 مارچ تک وہ

کام نہیں کیا تو اسکی بیوی پر ایک طلاق واقع ہوگی، باقی رہا اسکا مستقبل بعید کے کسی سال کے 20 مارچ کی نیت کرنا تو اسکا اعتبار عند اللہ تو ہوسکتا ہے کہ اپنی نیت کے مطابق بیوی کو طلاق کے بارے میں بتائے بغیر اسکو نکاح قدیم کیساتھ برقرار رکھے لیکن معاملہ اگر اسلامی عدالت میں جائے تو اسلامی جج (قاضی) الفاظ کے ظاہر کو دیکھ کر فیصلہ کرے گا اور الفاظ کا ظاہر یہی ہے کہ اسی سال کے 20 مارچ مراد ہو۔

لما فی المبسوط للسرخسی: (۱۱۶/۶، طبع دار المعرفة)

"وان قال انت طالق فی رمضان فهو علی اول رمضان يجئ هو الظاهر المعلوم بالعادة من كلامه، كما لو ذكر الأجل فی اليمين الی رمضان أو اجر داره الی رمضان، فان قال عنيت الثانی لم يصدق فی القضاء لأنه خلاف الظاهر ولانه فی معنی تخصيص العموم لأن موجب كلامه أن تكون موصوفة بالطلاق فی كل رمضان يجئ بعد يمينه فاذا عين البعض دون البعض كان هذا تخصيصا للعموم وتخصيص العموم بالنية صحيح فيما بينه وبين الله تعالی دون القضاء".

ولما فی تبيين الحقائق: (۲۱/۲، طبع سعيد)

"ولو قال لها انت طالق ونوى به الطلاق عن وثاق لم يصدق قضاء فيما بينه وبين الله تعالى لأنه خلاف الظاهر والمرأة كالقاضي لا يحل لها أن تمكنه اذا سمعت منه ذلك أو شهد به شاهد عدل عندها".

ولما فی الهندية: (۴۲۰/۱، طبع رشيديه) "واذا أضافه الی الشرط وقع عقيب الشرط اتفاقا".

الجواب صحیح: عبد الرحمٰن عفا اللہ عنہ واللہ اعلم بالصواب: عبد الباری چشتی

۱۳ ربیع الثانی ۱۴۳۲ھ فتوی نمبر:

﴿طلاق ثلاثہ کو کسی چیز پر معلق کرنے کا حکم﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام کہ زید نے دوران جھگڑا اپنی بیوی سے کہا کہ تو اگر گھر سے باہر نکلی تو تجھے تین طلاق اور اگر تمہارے فلاں رشتہ دار آئے تو تجھے تین طلاق پھر اسی مجلس میں اس کی بیوی جانے لگی تو زید نے پیچھے سے آواز دی کہ "چل ٹھیک ہے تمہاری مرضی" یعنی جانے اور نہ جانے کا اختیار ہے پھر فلاں رشتہ دار جس کے بارے میں زید نے کہا تھا وہ بھی نمودار ہوگیا، کیا شریعت کی رو سے زید کی بیوی پر طلاقیں واقع ہوئیں؟ اگر ہوئیں تو کتنی؟

﴿جواب﴾ صورت مذکورہ میں جن دو شرطوں کے ساتھ طلاق کو معلق کیا گیا تھا چونکہ وہ پائی

گئیں، لہٰذا اس سے طلاق مغلظہ بائنہ واقع ہوگئی ہے اور بیوی زید پر حرام ہوچکی ہے عدت گزرنے کے بعد عورت دوسری جگہ شادی کرسکتی ہے۔

لما فی خلاصۃ الفتاویٰ:(۱۲۱/۲ مطبع رشیدیہ)

رجل حلف وقال لامراتہ ان خرجت من بیتی فانت طالق فخرجت من البیت الی الدار یحنث ولوحلف لایخرج لایحنث الابالخروج الی السکۃ. قال الامام النسفی فی شرح الشافی ھذافی عرفھم امافی الفارسیۃ لایحنث مالم یخرج الی السکۃ فی الوجھین وعلیہ الفتوی.

ولمافی التنویرمع الدر:(۲/۲۰۵ طبع امدادیہ)

(تنحل)ای تبطل(الیمین)ببطلان التعلیق(اذاوجدالشرط مرۃ الافی کلمافانہ ینحل بعد الثلاث)

وفی الشامیۃ:(ای تبطل الیمین)ای تنتھی وتتم،واذاتمت حنث فلایتصورالحنث ثانیاًالابیمین اخری لانھاغیرمقتضیۃ للعموم والتکرار.

زید کا اپنی بیوی کو پیچھے سے آواز دینا کہ "ٹھیک ہے تمہاری مرضی ہے" اس سے زید کی نیت اگر تعلیق کو ختم کرنے کی بھی ہو یعنی رجوع عن التعلیق کی بھی ہو تب بھی اس کا اعتبار نہیں کیونکہ تعلیق رجوع سے ختم نہیں ہوا کرتی، اس طرح اس کے نکلنے سے تین طلاقیں واقع ہوگئیں اور مذکورہ میاں بیوی کا باہمی تعلق ختم ہو چکا۔

لمافی الدرالمختار:(۳/۲۸۳ طبع سعید)

(دبرعبدہ ثم ذھب عقلہ فالتدبیرعلی حالہ)لماامرأنہ تعلیق وھولایبطل بجنون ولارجوع.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفااللہ عنہ　　　واللہ اعلم: محمد عزیز چترالی

۸ جمادی الاولیٰ ۱۴۲۷ھ　　　فتویٰ نمبر: ۲۷۲

﴿دوران نکاح طلاق معلق کرنے کا حکم﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں مفتیان کرام اس مسئلہ کے متعلق کہ غلام نامی شخص نے نکاح کے وقت یہ کہا تھا کہ اگر میں اپنی بیوی کو ماروں یا برا بھلا کہوں یا نفقہ میں تنگی کروں تو اس کو طلاق ہے اور اس نے اس بات کی اضافت نکاح کی طرف نہیں کی مطلق کہہ دیا، بعد میں ان امور میں سے کوئی امر اس سے سرزد ہوا تو کیا اس کی زوجہ کو طلاق ہوگی؟　　　مستفتی: اکرام الدین

﴿جواب﴾ صورت مذکورہ میں اگر اس شخص نے نکاح سے پہلے شرط لگائی ہو اور اس کی

اضافت بھی نکاح کی طرف نہ کی ہو تو اس صورت میں وہ شروط لغو ہیں، بعد نکاح ان کا کوئی اثر نہ ہوگا، نکاح کے بعد اگر شرط لگائی ہو یا اس کی اضافت نکاح کی طرف کی ہو تو اس صورت میں یہ شروط معتبر ہوں گی۔

لما في التنوير مع الدر: (۲/۵۹۳، طبع امدادیه): وشرطه (الملك) حقيقة أو حكماً (أو الاضافة اليه)

الجواب صحیح: عبد الرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم: محمد عزیز چترالی

۹ جمادی الاولیٰ ۱۴۲۷ھ — فتویٰ نمبر: ۲۷۷

﴿طلاق معلق کی ایک صورت کا حکم﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ اگر کسی شخص نے اپنی بیوی سے کہا کہ اگر تو نے میرے اور اپنے بھائیوں کے علاوہ کسی اور شخص سے سلام کے جواب کے علاوہ مزید بات کی یا کسی کی بات کے جواب میں ہاں یا ناں سے زیادہ کوئی بات کہی تو تجھے طلاق ہے، پوچھنا یہ ہے کہ اگر اس شخص کی بیوی نے اپنے اور شوہر کے بھائیوں کے علاوہ کسی کو سلام کے جواب سے زیادہ بات کی یا پھر کسی کی بات کے جواب میں ہاں یا ناں سے زیادہ کوئی بات کہی تو طلاق واقع ہوگی یا نہیں؟ اگر ہوگی تو کونسی؟ مستفتی: قاری محمد دین گزری

﴿جواب﴾ بیوی نے شوہر کی طرف سے عائد پابندی کے خلاف اگر کیا یعنی اپنے اور اپنے شوہر کے بھائیوں کے علاوہ کسی سے سلام، جواب سے زیادہ بات کی، یا سوال کے جواب میں فقط ہاں یا ناں پر اکتفاء نہیں کیا اور کچھ مزید بات کہی تو طلاق رجعی واقع ہو جائیگی۔

جسکا حکم یہ ہے کہ شوہر کو دوران عدت رجوع کرنے کا حق حاصل ہوگا، دوران عدت اگر رجوع نہیں کیا تو عورت دوسری جگہ شادی کر سکے گی اور باہمی رضامندی سے اسی شوہر سے بھی بغیر حلالہ کے نئے حق مہر کے ساتھ نکاح ہو سکے گا لیکن یہ یاد رہے کہ طلاق واقع ہونے کی صورت میں آئندہ کے لئے صرف دو طلاقیں باقی رہینگی، کسی بھی وقت دو طلاقیں مزید اگر واقع ہو گئیں تو حرمت مغلظہ ثابت ہو جائیگی اور پھر حلالہ کے بغیر نکاح بھی نہ ہو سکے گا۔

لما في الهندية: (۱/۴۲۰، طبع رشيديه)

وإذا أضافه إلى شرط وقع عقيب الشرط اتفاقاً مثل أن يقول لامرأته إن دخلت الدار فأنت طالق — الخ

ولما فی الشامی:(۵۲/۴،طبع سعید)

(قوله ای تبطل الیمین)ای تنتهی وتتم،واذاتمت حنث فلایتصور الحنث ثانیاالا بیمین اخری لانهاغیر مقتضیة للعموم والتکرار لغۃنہر.

ولمافی البحرالرائق:(۸/۴،طبع ایچ ایم سعید)

وکذلک لوقال ان کلمت فلانا فانت طالق،وان کلمت انسانا فانت طالق تطلق تطلیقتین بحکم الیمین—الخ.

ولمافی البحرالرائق:(۱۴/۴،طبع سعید)

(قوله ففیهاان وجدالشرط انتهت الیمین)ای فی الفاظ الشرط ان وجدالمعلق انحلت الیمین وحنث وانتهت لانهاغیرمقتضیة للعموم والتکرارلغة فبوجودالفعل مرة یتم الشرط ولایتم بقاء الیمین بدونه واذاتم وقع الحنث فلایتصور الحنث مرة اخری الا بیمین اخری اوبعموم لتلک الیمین.....الخ.

الجواب صحیح:عبدالرحمٰن عفااللہ عنہ واللہ اعلم بالصواب:نعیم اقبال عفااللہ عنہ

۱۲جمادی الثانی ۱۴۳۶ھ فتویٰ نمبر:۱۹۰/۴۲

﴿طلاق کو بات نہ کرنے کے ساتھ معلق کرنا﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام دریں مسئلہ کہ مجلس میں بیٹھے آدمی نے کہا کہ اس کے بعد کسی نے بات کی تو اسکی بیوی کو طلاق، اس کے بعد کسی نے مجلس میں بات کی تو کیا اسکی بیوی کو طلاق پڑجائیگی؟ مستفتی:عنایت الرحمٰن اورکزی

﴿جواب﴾ صورت مسئولہ میں متکلم "کہنے والے" نے اگر بات کرلی تو اسکی بیوی کو طلاق ہوجائے گی طلاق بائن کے ساتھ، اس لئے کہ اس نے طلاق کو عدم تکلم کے ساتھ معلق کیا ہے۔

مجلس کے باقی لوگوں کے بات کرنے سے کسی کی بیوی کو طلاق واقع نہ ہوگی کیونکہ متکلم کی تعلیق کا حکم دوسروں کی طرف تعدی نہیں کرتا، البتہ دوسروں نے بھی اسکی تعلیق کی تائید کرلی مثلاً کہا "صحیح" ہے تو اسکی بات سے بھی انکی بیویوں کو طلاق واقع ہوگی۔

لمافی الدرمع الرد:(۷۹۵/۳،طبع ایچ ایم سعید)

جماعة یتحدثون فی مجلس فقال رجل منهم: من تکلم بعدهذافامرأته طالق ثم تکلم الحالف طلقت امرأته لأن کلمة من للتعمیم.

وفی الشامیة:(قوله ثم تکلم الحالف)سکت عمااذاتکلم غیره والظاهرانه لایقع لأن

تعليق المتكلم لايسرى حكمه الى غيره الااذاقال الغير واناكذالك مثلاً.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفااللہ عنہ　　　　واللہ اعلم بالصواب: ظہور احمد شمس

۲۰ جمادی الاولیٰ ۱۴۲۹ھ　　　　فتویٰ نمبر: ۱۴۵۸

﴿ ''اللہ کی قسم اگر دوبارہ میں نے چرس پی لی تو میری بیوی کو طلاق'' الفاظ کا حکم ﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اور مفتیان شرع متین اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک شخص چرس کا عادی ہے، اس نے یہ قسم کھائی کہ ''اللہ کی قسم اگر دوبارہ میں نے چرس پی لی تو میری بیوی کو طلاق ہوگی'' اسطرح قسم کھانے کے بعد حسب عادت دوبارہ چرس پی لی، اب پوچھنا یہ ہے کہ اس کی بیوی پر طلاق پڑ گئی یا نہیں؟ نیز اس شخص پر اپنی قسم میں حانث ہونے کی بناء پر کفارہ بھی لازم ہے یا نہیں؟ از راہ کرم تسلی بخش جواب عنایت فرمائیں۔　　مستفتی محمد منظور کشمیری

﴿جواب﴾ مذکورہ صورت میں بیوی پر ایک طلاق رجعی واقع ہوگئی ہے، جس کا حکم یہ ہے کہ شوہر کے لئے دوبارہ رجوع کرنے کی گنجائش ہے بشرطیکہ طلاق کے بعد اب تک عدت نہ گزری ہو، عدت اگر گزر گئی تو میاں بیوی دونوں کی باہمی رضامندی سے نئے حق مہر کے ساتھ دوبارہ نکاح ہوسکتا ہے۔

واضح رہے کہ رجوع کی صورت میں اسی طرح تجدید نکاح کی صورت میں بھی شوہر کے پاس اب صرف دو طلاقوں کا حق باقی رہیگا یعنی کسی بھی موقع پر اگر مزید دو طلاقیں دیں تو طلاق مغلظہ واقع ہوگی اور بدون حلالہ شرعیہ کے حلال ہونے کی کوئی صورت نہ ہوگی، لہٰذا احتیاط رہے، نیز چونکہ یہ الفاظ قسم کے بھی ہیں اسلئے حانث ہونے کی بناء پر شوہر کے ذمہ کفارہ ادا کرنا بھی ضروری ہے یعنی دس مسکینوں کو کھانا کھلانا یا ان کو کپڑا پہنانا یا غلام آزاد کرنا اور عدم استطاعت کی صورت میں تین دن مسلسل روزے رکھنا ضروری ہے۔

لمافی التاتارخانية:(۲/۲۸۹-۲۹۰ طبع قدیمی)

وركن اليمين بالله تعالى ذكراسم الله تعالى.....وفى الاجناس انقال والله ان دخلت الدار كان يميناً.

ولمافى الهندية:(۲/۹۴ طبع رشيديه)

حلف بطلاق امرأته ان لايشرب المسكر فصب فى حلقه ودخل جوفه ان دخل جوفه بغير صنعه لايحنث ولوامسكه فى فيه ثم شربه بعد ذلك يحنث.

والمافی التنویر مع الدر:(۲/۷۲۵،طبع سعید)

(وكفارته تحرير رقبة أواطعام عشرة مساكين اوكسوتهم بما)يصلح للاوساط (وان عجز عنها وقت الاداء صام ثلاثة ايام ولاء)

وفی الشامية:حتى لواعطى مسكيناواحدا فی عشرة ايام كل يوم نصف صاع يجوزالی قوله واذا غدی مسكيناوعشی غيره عشرة ايام لم يجزه لانه لافرق طعام العشرة على عشرين.

الجواب صحیح:عبدالرحمٰن عفااللہ عنہ واللہ اعلم:محمد اسلم چترالی غفرلہ

۹ ربیع الثانی ۱۴۲۹ھ فتویٰ نمبر:۱۳۰۴

﴿بیوی کیطرف نسبت کیے بغیر الفاظ طلاق کہنا﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میں نے گاؤں میں لکڑیاں لانے کیلئے ایک گدھا کسی سے مانگا تھا.جب اس گدھے پر لکڑیاں لادی تو ایک جگہ جاکر گدھے کا پاؤں ریت میں دھنس گیا جس کیوجہ سے وہ زمین پر گر گیا، میں نے اسپر سے لکڑیاں کم کرکے اسے کھڑا کردیا اور دوبارہ وہ لکڑیاں اسپر لادی کچھ دور جاکر پھر وہ گر گیا میں نے پھر لکڑیاں کم کرکے اسے کھڑا کیا اور اسپر لکڑیاں ڈال کر گھر پہنچادی،اسی دوران گدھے کے مالک کا بھتیجا بھی ہمارے ساتھ تھا،اس نے جاکر گدھے کے مالک کو گدھے کے گرنے کا بتایا،سات آٹھ دن بعد جب میں مالک سے ملا تو اس نے گلہ شکوہ کرتے ہوئے کہا کہ تم نے ہمارے گدھے کو گرایا ہے، اس وقت میرے ذہن میں گدھے کے گرنے کا بالکل خیال نہیں تھا،اچانک میرے منہ سے یہ الفاظ نکلے''ثلاثا طلاق می دی چہ مانہ نہ دی گذارشوی''میری تین طلاق ہیں مجھ سے نہیں گرا، حالانکہ گدھا گر گیا تھا لیکن یہ الفاظ بولتے وقت میرے ذہن میں گدھے کے گرنے کا خیال نہیں تھا،اب کیا ان الفاظ سے میری بیوی پر طلاق واقع ہوگئی؟

تنقیح:کیا یہ الفاظ بولتے وقت آپ کے ذہن میں بیوی کا کچھ خیال تھا اور یہ جملہ بیوی کو طلاق دینے کے قصد وارادے سے بولا تھا؟

جواب تنقیح:یہ الفاظ بولتے وقت مجھے بیوی کا خیال تک نہیں تھا اور نہ بعد میں بلکہ کافی عرصہ گذرنے کے بعد خواب میں کچھ ایسا اشارہ ملا جس کی وجہ سے مذکورہ واقعہ یاد آیا اور بیوی کے بارے میں وہم ہونے لگا۔ مستفتی:معین الدین بلال کالونی

﴿جواب﴾ ''ثلاثا طلاق می دی''یعنی میری تین طلاق ہیں اس جملہ میں بیوی کی طرف

طلاق کی ظاہری کوئی نسبت موجود نہیں ہے، اور بولتے وقت اپنی بیوی کی طرف طلاق منسوب کرنے کا کوئی قصد وارادہ نہیں تھا تو معنوی نسبت بھی موجود نہیں ہے، اس لئے کوئی طلاق واقع نہیں ہوئی۔

آپ کی بیوی کو اگر اس بات کی خبر ہے جس کی وجہ سے وہ طلاق واقع ہونا سمجھ رہی ہے تو اعتماد دلانے کیلئے اس کے سامنے قسم کھالے کہ ان الفاظ سے میرا آپ کو طلاق دینے کا کوئی قصد وارادہ نہیں تھا پھر اُسے بھروسہ کرنا چاہئے، زیادہ وہم ووسواس میں نہ رہے۔

لما فی الشامی (ج۳/ص۲۴۸)سعید

(قوله لتركه الاضافة)أی المعنوية فانها الشرط والخطاب من الاضافة المعنوية وكذاالاشارة نحوهذه طلاق ،اقول ما ذكره الشارح من التعليل اصله لصاحب البحر اخذاً من قول البزازية فی الايمان قال لها :لا تخرجی من الدار الا باذنی فانی حلفت بالطلاق فخرجت لا يقع لعدم ذكر حلفه بطلاقها ويحتمل الحلف بطلاق غيرها فالقول له .ه ومثله فی الخانية :وفی هذاالاخذ نظر فان مفهوم كلام البزازية انه لو اراد الحلف بطلاقها يقع لانه جعل القول له فی صرفه الی طلاق وغيرها ،والمفهوم من تعليل الشارح تبعاً للبحر عدم الوقوع اصلا لفقد شرط الاضافة مع انه لو اراد طلاقها تكون الاضافة موجودة ويكون المعنی فانی حلفت بالطلاق منك او بطلاقك ولا يلزم كون الاضافة صريحة فی كلامه ،لما فی البحر لو قال :طالق فقيل له :من عنيت ؟فقال امرتی طلقت امرأته ويؤيده ما فی البحر لوقال :امرأة طالق اوقال طلقت امرأة ثلاثا وقال لم اعن امرأتی يصدق

ولما فی الخانية (ج۱/ص۴۶۵)رشيديه

امرأة قالت لزوجها طلقنی ثلاثا فقال الزوج ابنك بزار طلاق لاتطلق لانه كلام محتمل

تائید دیکھئے کفایت المفتی جلد نمبر ۶ صفحہ نمبر ۳۸ اور صفحہ ۴۲

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ
واللہ اعلم بالصواب: سیف اللہ

۲۰ ربیع الاول ۱۴۳۲ھ
فتوی نمبر: ۳۱۸۶

﴿تکرار طلاق سے تاکید مراد ہو تو دیانۃً معتبر ہے قضاءً نہیں﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میرا ایک داماد ہے، بیوی بچوں کا کوئی خیال نہیں کرتا، اسکو اپنی ذمہ داریوں کا کوئی احساس نہیں ہے، میں خود بوڑھا ہوں کئی سالوں سے اپنی لڑکی کے علاوہ اس کے بچوں کے خرچے بھی خود برداشت کرنے پڑتے ہیں، کئی طریقے اختیار کر لئے کہ کسی طرح یہ شخص اپنے پیروں پر کھڑا ہو، ہر طرح تعاون کیا لیکن یہ احسان

فراموش بالکل لا پرواہ ہے، آخر تنگ آکر فون پر میں نے اس کو کہا کہ اس بار اگر تین ماہ کے اندر تو نے بیوی بچوں کا خرچہ نہیں بھیجا تو تیری بیوی کو طلاق ہوگی، اس نے شروع میں نہیں مانا، پھر میں نے سخت لہجہ استعمال کیا تو اس نے حامی بھر لی، اس طرح میں نے تین بار اس سے واضح لفظوں میں وعدہ لیا کہ اگر تو نے تین ماہ کے اندر اندر بیوی بچوں کا خرچہ نہیں بھیجا تو تیرے بیوی کو طلاق ہوگی اور اس نے تین بار حامی بھرلی، لیکن اب دو سال ہوگئے ہیں کہ اس کے بعد بھی نہ کوئی خرچہ بھیجا اور نہ وہ خود حاضر ہوا، اس صورت میں کیا میری لڑکی اس کے نکاح میں ہے یا طلاق ہوگئی ہے؟

﴿جواب﴾ مذکورہ صورت میں آپ کے داماد نے آپ کی بات کی حامی بھرتے ہوئے ہر بار طلاق سے مستقل طلاق کا اگر ارادہ کیا تھا اور بظاہر یہی معلوم ہو رہا ہے تو ایسی صورت میں تینوں طلاقیں واقع ہوگئی ہیں، بیوی اس شوہر کے لئے حرام ہوگئی ہے، اب حلالہ شرعیہ کے بغیر نکاح بھی نہیں ہوسکتا۔

ہاں البتہ آپ کا داماد اگر یہ کہے کہ ہر مرتبہ طلاق کے لفظ سے مستقل طلاق کا ارادہ نہیں تھا، صرف تاکید اور تائید کے لئے تین بار حامی بھردی تھی، تو اس صورت میں دیانۃً ایک طلاق واقع ہوگئی ہے، چونکہ دوران عدت اس نے کوئی رجوع نہیں کیا اور اب رجوع کی مدت گذر گئی ہے اس لئے لڑکی آزاد ہے، دوسری جگہ شادی کرسکتی ہے، اور چاہے تو دونوں کی باہمی رضامندی سے بغیر حلالہ کے نئے حق مہر کے ساتھ نکاح کے بھی ہوسکتا ہے، لیکن شوہر کے پاس تجدید نکاح کی صورت میں صرف دو طلاقیں باقی ہونگی، کسی بھی موقع پر مزید دو طلاقیں دینے سے حرمت مغلظہ ثابت ہوگی اور پھر حلالہ شرعیہ کے بغیر تجدید نکاح بھی نہ ہوسکے گا۔

لما فی الدر المختار:(۲۹۳/۳ طبع سعید) كرّر لفظ الطلاق وقع الكلّ وان نوى التاكيد دیّن.

ولما فی الهندية:(۴۲۰/۱ طبع: رشيدية كوئٹه) واذا اضافه الى الشرط وقع عقيب الشرط اجماعاً.

ولما فی الشامی:(۸۴۹/۳، طبع: سعيد)

قال فی الخانية: ولو قال والله لتفعلن كذا فقال الآخر نعم، فهو على خمسة اوجه احدها ...... الثانی ان يريد المبتدی الاستحلاف والمجيب اليمين على نفسه فالحالف هو المجيب فقط

ولما فی فتاوى قاضيخان:(۵۲۹/۱، طبع بلدیمی)

رجل قال لغريمه: امرأتك طالق ان لم تقض حقى فقال الغريم نعام ولم يرد جوابه فقال

المطالب قل نعم فقال نعم واراد به جوابه قال محمد رحمه الله تعالى الغريم حالف، لان الكلام واحد سالم يأخذ في كلام آخر او يطول ذالك، لا ينقطع و يكون موصولاً.

ولما في العالمكيرية: (۱/۴۴۳، طبع رشيديه)

رجل قال لمديونه امرتك طالق ان لم تقض ديني فقال المديون نعم فقال له الرجل قل نعم فقال نعم واراد جوابه فاليمين لازمة وان دخل بينهما انقطاع كذا في خزانة المفتين.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ واللہ اعلم بالصواب: محمد ابرار غفرلہ ولوالدیہ

۱۳ جمادی الاولی ۱۴۳۲ھ فتوی نمبر: ۳۷۳۹

﴿بیوی سے کہا "اگر تو نے فلاں شخص سے بات کی یا ہاتھ ملایا تو تجھے تین طلاق"﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ اگر کوئی شخص اپنی بیوی سے یوں کہے کہ اگر فلاں شخص سے بات کی یا ہاتھ ملایا تو تین طلاق اور اس کے بعد سے تو میری بہن ہے تو ایسی صورت میں اگر بات کر لی یا ہاتھ ملا لیا تو شریعت میں اس کا کیا حکم ہے؟

﴿جواب﴾ اس عورت نے فلاں شخص سے اگر بات کر لی یا ہاتھ ملایا تو اس پر تینوں طلاقیں واقع ہو جائیں گی اور حرمت مغلظہ ثابت ہو جائیگی پھر حلالہ شرعیہ کے بغیر میاں بیوی کا آپس میں تجدید نکاح بھی نہ ہو سکے گا، لہٰذا اس عورت کو پوری طرح محتاط رہنا چاہیے۔

لما في التنوير مع الدر: (۳/۳۵۲، طبع سعيد)

(تنحل) اى تبطل (اليمين) ببطلان التعليق (اذا وجد الشرط مرة) الا في كلما..... الخ.

وفي الشامية: تبطل اليمين اى تنتهي وتتم، واذا تمت حنث..... الخ.

ولما في الهندية: (۱/۴۲۰، طبع رشيديه)

واذا اضافه الى الشرط وقع عقيب الشرط اتفاقا، مثل ان يقول لامرأته ان دخلت الدار فانت طالق الخ.

ولما في البحر: (۴/۸، طبع ايچ ايم سعيد)

وكذلك لو قال ان كلمت فلانا فانت طالق، وان كلمت انسانا فانت طالق تطلق تطليقتين بحكم اليمين..... الخ.

ولما فيه ايضا: (۴/۱۴ طبع سعيد)

قوله فنيها ان وجد الشرط انتهت اليمين اى في الفاظ الشرط ان وجد المعلق انحلت اليمين وحنث

ولما فيه ايضا: (۴/۲۱ طبع سعيد) فان وجد الشرط في الملك طلقت وانحلت اليمين..... الخ.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ واللہ اعلم بالصواب: انیس طالب غفر اللہ لہ

۲۸ صفر ۱۴۳۱ھ فتوی نمبر: ۲۳۶۵

﴿طلاق بائن معلق کی ایک صورت﴾

﴿سوال﴾ جناب مفتی صاحب: السلام علیکم ورحمۃ اللہ علیہ وبرکاتہ جیسا کہ آپ کے علم میں ہے کہ میں نے اپنی بیٹی کی شادی اپنے بھانجے منور سے کرائی تھی، شاید اللہ تعالیٰ کیطرف سے اس میں کوئی بڑی حکمت ہوگی کہ وہ رشتہ کامیاب نہ ہوسکا، منور صاحب نے کچھ الفاظ بولے تھے اور اس سے متعلق دار العلوم سے فتویٰ بھی حاصل کیا جس کی کاپی منسلک ہے اس فتوی میں وقوع طلاق کو منور صاحب کی نیت وارادہ پر موقوف کردیا ہے، منور صاحب نے تو اب شادی بھی کرلی اور ہمارے اوپر واضح کردیا ہے کہ انہوں نے ہماری لڑکی کو طلاق دی ہے، اور شاید آپ نے بھی اس سے وضاحت طلب کی تھی تو اس نے مذکورہ الفاظ کا مطلب واضح کردیا تھا کہ اس کا ارادہ مستقل چھوڑنے اور طلاق ہی کا تھا۔

ایسی صورت میں ہمیں واضح فتوی عنایت فرمادیں تاکہ ہمارے پاس بطور ثبوت رہے اور ہم اپنی لڑکی کا رشتہ کسی دوسری جگہ کرسکیں، عنایت ہوگی۔ مستفتی: محمد اقبال مدنی مسجد کورنگی نمبرا

﴿جواب﴾ منور صاحب نے ایک موقع پر اپنی رشتہ دار خاتون کے ذریعے اپنی بیوی کو پیغام بھیجا کہ آج کی شب وہ ہمارے گھر آجاتی ہے تو ٹھیک ورنہ پھر میری طرف سے یہ رشتہ ختم، منور صاحب سے مفتی صاحب نے بذات خود ان الفاظ کی وضاحت طلب کی تھی، منور صاحب نے واضح کردیا تھا کہ "ان الفاظ کا مطلب تو مخفی نہیں ہے کہ پھر وہ میری بیوی نہیں رہیگی یعنی طلاق ہوگی" چونکہ یہ طلاق معلق کے الفاظ ہیں اسی رات بیوی منور صاحب کے گھر چلی جاتی تو طلاق واقع نہ ہوتی لیکن وہ منور صاحب کے گھر اسی رات گئی نہیں ہے اس لئے طلاق بائن واقع ہوگئی ہے، نکاح ختم ہوگیا ہے البتہ باہمی رضامندی سے بغیر حلالہ کے نئے حق مہر کے ساتھ دوبارہ نکاح ہوسکتا ہے، اور لڑکی چاہے تو دوسری جگہ بھی شادی کرسکتی ہے منور صاحب کو روکنے کا حق باقی نہیں رہا۔

لما فی فتاوی العالمگیریہ: (۱/ ۳۷۴،۳۷۵، طبع: رشیدیہ)

(الفصل الخامس فی الکنایات) لا یقع بہ الطلاق الا بالنیۃ أو بدلالۃ الحال ـــ ولو قال فسخت النکاح ونوی الطلاق یقع وعن ابی حنیفہ رحمہ اللہ تعالی ان نوی ثلاثا فثلاثا کذا فی معراج الدرایۃ........ ولو قال ما أنت لی بامرأۃ أو لست لک بزوج ونوی الطلاق یقع عند ابی حنیفہ رحمہ اللہ تعالی وعندھما لا یقع ولو قال انا منک بائن أو انا علیک حرام ونوی الطلاق یقع ...... ولو قال لھا لا نکاح بینی وبینک او

قال لم يبقى بيني وبينك نكاح يقع الطلاق

لما في فتاوى التاتار خانية :(۲/۲۲۱،طبع قديمی)

واما مدلولات الطلاق فهو مثل قوله ....لا سبيل لي عليك ولا نكاح بيني وبينك لا ملك لي عليك "وما شاكلها اذا نوى الطلاق بهذه الالفاظ يقع بائنا وان نوى الثلاث يقع ثلاثا .

الجواب صحیح: عبدالرحمن عفا اللہ عنہ واللہ اعلم بالصواب: سمیع الرحمن دیروی

۱۸ جمادی الثانیہ ۱۴۳۳ھ فتوی نمبر:

﴿تونے فلاں سے تعلقات قائم رکھے تو میری بیوی کو ہزار طلاق﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان عظام درج ذیل مسئلہ کے بارے میں کہ اگر کسی آدمی نے اپنے کسی دوست سے یہ کہا کہ اگر آپ نے فلاں آدمی مثلاً زید سے دوستی اور تعلقات قائم رکھے تو میری بیوی کو ہزار طلاقیں ہوں اب اس شخص نے زید کے ساتھ دوستی بھی لگائی رکھی اور تعلقات بھی قائم رکھے تو مذکورہ صورت میں شریعت کا کیا حکم ہے یعنی طلاق مغلظہ واقع ہوگی یا نہیں شریعت کی روشنی میں وضاحت مطلوب ہے۔ مستفتی: مولوی عبدالرزاق بنوں

﴿جواب﴾ صورت مسئولہ میں شریعت کا حکم یہ ہے کہ اس آدمی نے جب اپنے دوست سے کہا کہ آپ نے اگر زید سے دوستی لگائی اور تعلقات قائم رکھے تو میری بیوی کو ہزار طلاقیں ہوں اس کے بعد اس دوست نے واقعی زید کیساتھ تعلقات قائم رکھے اور دوستی لگائی رکھی تو کہنے والے شخص کی بیوی کو طلاق مغلظہ ہوگئی یعنی تینوں طلاقیں واقع ہوگئی ہیں دونوں کا آپس میں نکاح ختم ہو چکا ہے اب رجوع نہیں ہوسکتا اور حلالہ شرعیہ کے بغیر دوبارہ نکاح بھی نہیں ہوسکتا عورت عدت پوری گذارنے کے بعد چاہے تو دوسری جگہ نکاح کرسکتی ہے۔

لما في مشكوة المصابيح كتاب النكاح: (۲۸۴ طبع ایچ ایم سعید)

وعن مالك بلغه ان رجلا قال لعبدالله بن عباس انى طلقت امراتى مائة تطليقة فماذا ترى على فقال ابن عباس طلقت منك بثلث وسبع وتسعون اتخذتها ايات الله هزوا رواه فى الموطا .

ولما في تنوير باب التعليق، ۳۴۱ طبع ایچ ایم سعید)

هو ربط حصول مضمون جملة بحصول مضمون جملة اخرى شرطه الملك كقوله لمنكوحته ان ذهبت فانت طالق اوالاضافة اليه كان نكحتك فانت طالق

ولما فی الهداية، ۲/۹۸۲، طبع ایچ ایم سعید)
واذااضافه الیٰ شرط وقع عقيب الشرط مثل ان يقول لامرأته ان دخلت الدار فانت طالق وهذا بالاتفاق لان الملک قائم فی الحال والظاهر بقاء ه الی وقت وجود الشرط فيصح يمينا وايقاعا

ولمافی الخانيه علی الهنديه:(۱/۴۷۶، طبع رشيديه)
رجل قال لغيره زن وی ازوی بسه طلاق اگر تو مهمان من نيانی قال الفقيه ابو جعفر رحمه الله تعالی هذاتعليق صحيح كانه قال ان لم تجئنی الی ضيفافامرأتی طالق۔

ولما فی البدائع:۔ ۳/۲۷۰، طبع دار الكتب العلميه بيروت)
ولو قال لهاانت طالق ان شاء فلان يتقيد بمجلس علم فلان ان شاء فی مجلس علمه وقع الطلاق وكذلک اذا كان غائبا وبلغه الخبر يقتصر علی مجلس علمه لان هذاتمليک الطلاق فيتقيد بالمجلس بخلاف ما اذا قال لها :انت طالق ان دخل فلان الدار انه يقع الطلاق اذا وجد الشرط فی ای وقت وجد ولا يتقيدبالمجلس لان ذلک تعليق الطلاق بالشرط والتعليق لا يتقيد بالمجلس لان معناه ايقاع الطلاق فی زمان ما بعد الشرط فيقف الوقوع علی وقت وجودالشرط فی ای وقت وجد يقع۔

واللہ اعلم بالصواب: محمد سلمان غفرلہ ولوالدیہ
الجواب صحیح: مفتی عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ

فتویٰ نمبر:۳۸۸۲
۵صفر الخیر ۱۴۳۵ھ

منکوحہ کی رخصتی سے پہلے طلاق معلق کا حکم

سوال: کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک علاقے کا رواج یہ ہے کہ وہاں منگنی میں نکاح پڑھایا جاتا ہے اور رخصتی کے وقت تجدید نکاح ہوتی ہے تو ایک آدمی کی بھی اس طریقے سے منگنی ہوئی ہے، اس نے دوسرے آدمی سے کہا کہ اگر میں تجھ سے سلام کروں تو میری بیوی کو طلاق کیا اس صورت میں سلام کرنے سے اسکی بیوی کو طلاق ہوگی یا نہیں؟

جواب: گواہوں کی موجودگی میں باقاعدہ ایجاب وقبول کیساتھ یہ منگنی اگر ہوئی ہے تو یہ منگنی نہیں بلکہ نکاح ہے اور مذکورہ تعلیق صحیح ہے، لہٰذا یہ شخص دوسرے آدمی سے اگر سلام کریگا تو طلاق واقع ہو جائیگی، ابھی تک اسکی رخصتی اگر نہیں ہوئی اور خلوت صحیحہ بھی نہیں ہوئی تو ایک طلاق واقع ہونے کی صورت میں نکاح ختم ہو جائیگا اور بغیر عدت گذارے عورت دوسری جگہ شادی کر سکے گی، البتہ اس شخص کیساتھ بھی باہمی رضامندی سے بغیر حلالہ کے نکاح ہو سکے گا پھر اس شخص کے پاس صرف دو طلاقوں کا اختیار رہے گا۔

لمافی ردالمحتار:(۳/۲۵۳،طبع ایچ ایم سعید)

وقد تعورف فی عرفنا فی الحلف الطلاق یلزمنی لاافعل کذا یرید ان فعلته لزم الطلاق ووقع فیجب ان یجری علیهم لانه صار بمنزلة قوله ان فعلت فانت طالق.

ولمافی الهندیة:(۱/۴۲۰،طبع رشیدیه) واذا اضافه الی شرط وقع عقیب الشرط اتفاقا.

ولمافی بدائع والصنائع:(۳/۳۰،طبع سعید)

فالما وجد رکن الایقاع مع شرائطه لابد من الوقوع عند الشرط.

ولمافی الهدایة:(۲/۳۸۸،طبع رحمانیه) واذا اضافه الی شرط وقع عقیب الشرط.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: احمد علی عفی عنہ

در ربیع الاول ۱۴۳۱ھ — فتویٰ نمبر:۲۰۸۸

﴿طلاق کو فعل حرام کے ساتھ معلق کرنا﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علمائے کرام اس مسئلے کے بارے میں کہ ایک آدمی نے اپنی محرم سے کہا کہ اگر میں تجھ سے فعل حرام نہ کروں تو میری بیوی کو تین طلاق، کیا اس صورت میں طلاق واقع ہوگی یا نہیں؟ مستفتی: محمد نواز صوابی

﴿جواب﴾ حرام کام کی قسم کھانا بھی حرام ہے اور سخت گناہ ہے شریعت نے ایسی قسموں سے سختی کے ساتھ منع فرمایا ہے، تاہم قسم منعقد ہوجاتی ہے اور خلاف کرنے کی صورت میں آدمی حانث بھی ہوجاتا ہے، غلطی سے کوئی اس طرح قسم کھائے تو اس کے خلاف کرنا واجب ہے اور ساتھ ساتھ کفارہ کا بھی حکم ہے۔

اس شخص کا یہ جملہ تعلیق طلاق ہے جو کہ غالباً قسم کے حکم میں ہے، لہٰذا اس سے توبہ واستغفار کرے تاہم طلاق معلق ہوگئی ہے جس کا اثر عمر کے آخری حصہ میں ظاہر ہوگا یعنی محرم یا خود اس شخص کی موت کے وقت طلاق واقع ہوگی اس وقت اگر بیوی زندہ ہوگی تو طلاق واقع ہوجائیگی۔

البتہ اس شخص کی موت کے واقع ہونے کی صورت میں بیوی پر اگرچہ طلاق واقع ہوگی لیکن ایسی طلاق میراث پر اثر انداز نہیں ہوتی، طلاق کے باوجود بیوی کو میراث سے حصہ ملے گا۔

لمافی ردالمحتار:(۳/۸۲۲،طبع ایچ ایم سعید)

(ولو حلف لیفعلنه بر مرة) لان الملتزم فعل واحد غیر عین اذ المقام للاثبات فیبر بای فعل..... واذا لم یفعل لایحکم بوقوع الحنث حتی یقع الیأس عن الفعل وذلک بموت الحالف قبل الفعل اوبفوت محل الفعل.

ولما فی الهندیۃ:(۲/۱۲۹،طبع رشیدیه)

وان حلف لیفعلن کذا ابدا او بالفعل مرة فاذا لم یفعل لا یحکم بوقوع الحنث حتی یقع الیاس عن الفعل وذلک بموت الحالف او بفوت محل الفعل

ولما فی رد المحتار:(۳/۲۱۱،طبع ایچ ایم سعید)

(قوله منه) ای من الطلاق وهو من قسم التعلیق بفعل نفسه والمراد لکنه لانه وجد الشرط وهو عدم التطلیق او عدم التزوج قبیل موته وهو وقت مرض فکان فارا وان کان التعلیق فی الصحة.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: احمد علی عفی عنہ

۱۷ صفر ۱۴۳۱ھ — فتویٰ نمبر: ۴۳۳۹

﴿بیوی سے کہا ”تو اگر ماں کے گھر گئی تو تجھے طلاق ہے“ کا حکم﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں مفتیان عظام دریں مسئلہ کہ ایک آدمی نے اپنی بیوی سے کہا کہ ”تو اگر ماں کے گھر گئی تو تجھے طلاق ہے“، قسم میں جس گھر کا ذکر ہے، وہ ماں کی ملکیت ہے، اب اس سے بچنے کا کیا طریقہ ہو سکتا ہے؟ جبکہ اس آدمی نے اس بیوی کو اس سے پہلے بھی دو طلاقیں دی ہیں، ماں اگر اپنا مکان تبدیل کر کے مثلاً شوہر کسی مکان کا انتظام کرے پھر وہ اپنے شوہر کے ساتھ رہنا شروع کرے تو بیٹی کا وہاں جانے سے طلاق واقع ہوگی یا نہیں؟ سائل: سید ذوالفقار علی

﴿جواب﴾ شوہر نے قسم کھاتے وقت جس گھر کا ذکر کیا ہے چونکہ وہ ماں کا مملوکہ گھر ہے اگر وہ اس گھر کو تبدیل کر کے شوہر یا کسی بیٹے کے ساتھ رہنا شروع کر دے تو ماں کے ایسے گھر میں بیٹی کے جانے سے طلاق واقع نہیں ہوگی۔

لما فی الدر مع الرد:(۳/۸۲۸ طبع سعید)

لو حلف لا یدخل فی دار فلانة فدخل دارها وزوجها ساکن بها لم یحنث لان الدار انما تنسب الی الساکن وهو الزوج نهر عن الواقعات وهو لما فی الخانیة: لو حلف لا یدخل دار ابنته أو امه او ابنته وهی تسکن فی بیت زوجها فدخل الحالف حنث. ویمکن الجواب: بان الدار فی مسئلة الخانیة السابقة لما لم تکن للمرأة انعقدت یمینه علی دار السکنی بالتبعیة فحنث اما فی مسئلة الواقعات المذکورة هنا فالدار فیها ملک المرأة فانصرفت الیمین الیها بما ینسب الیها اصالة فلما سکنها زوجها نسبت الیه وانقطعت نسبتها الیها فلم یحنث الحالف بدخولها ما لم ینوها.

ولسالی لفتاوی النوازل للسمرقندیؒ:(ص ۲۰۴،طبع حقانیہ پشاور)

رجل حلف ان لا یدخل دار امرءته فباعت الدار ثم استأجرتها فدخلها لم یحنث.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ   واللہ اعلم: عبیداللہ عابد غفرلہ ولوالدیہ

۶ رجب المرجب ۱۴۳۰ھ   فتویٰ نمبر: ۲۳۵۷

﴿شرکت کے وکیل کا ہر فعل مؤکل کی طرف منسوب نہیں ہوتا﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلے کے بارے میں کہ زید (باپ) اور خالد (بیٹے) کا ایک مشترکہ ٹرک ہے، اب بکر (زید کا دوسرا بیٹا) اس میں شریک ہونا چاہتا ہے لیکن خالد نے انکار کر دیا اور قسم بھی کھالی کہ اگر میں نے تیری رقم اس ٹرک میں شریک کی تو میری بیوی کو طلاق، لیکن زید اپنے دوسرے بیٹے بکر کی رقم اس ٹرک میں لگانا چاہتا ہے۔

غرض مسئلہ یہ ہے کہ شرکت میں ہر شریک دوسرے کا وکیل بھی ہوتا ہے تو اگر زید نے بکر کی رقم ٹرک میں لگالی تو چونکہ زید کا عمل شرکت کی وجہ سے خالد کا بھی شمار ہوتا ہے، تو کیا اس سے طلاق واقع ہو جائیگی؟   مستفتی: ایک سائل فون پر

﴿جواب﴾ یہ بات صحیح ہے کہ شرکت میں ہر ایک شریک دوسرے کا وکیل بھی ہوتا ہے لیکن یہ بات کہ وکیل کا ہر عمل مؤکل کا بھی شمار ہوتا ہے صحیح نہیں ہے اس بارے میں فقہاء کرام نے ایک ضابطہ بیان فرمایا ہے کہ بعض عقود کے حقوق مباشر یعنی براہ راست کرنے والے سے متعلق ہوتے ہیں اور اسی کی طرف ان کی نسبت ہوتی ہے وہی مسئول ہوتا ہے جیسے خرید وفروخت، اجارہ، اور صلح عن مال اور بعض عقود کے حقوق کا تعلق مباشر کے ساتھ نہیں بلکہ جس کے لئے وہ عقد کیا گیا ہو حقوق بھی اسی سے متعلق ہوتے ہیں جیسے نکاح، طلاق، غلام کا آزاد کرنا وغیرہ کہ ان میں وکیل کی حیثیت سفیر محض کی ہوتی ہے، تو پہلی قسم کے عقود کی اگر کوئی قسم کھالے مثلاً کوئی کہدے کہ میں نے اگر بیع کی یا میں نے مکان کرایہ پر دیدیا، یا کرایہ پر لیا تو میری بیوی کو طلاق پھر خود اس نے نہیں بلکہ اس کے وکیل نے بیع کی یا کرایہ پر اس کا مکان دیا وغیرہ تو کوئی طلاق واقع نہیں ہوگی اس لئے کہ عقد بیع واجارہ جس نے کیا ہے وہی مسئول ہے عقد کے تمام حقوق کا تعلق وکیل کے ساتھ ہے مؤکل بیع کرنے والا یا کرایہ پر مکان دینے والا شمار نہیں ہوتا اس لئے اس کی بیوی پر کوئی طلاق واقع نہیں ہوتی۔

لہٰذا صورت مسئولہ میں اگر خالد خود اپنے بھائی کو شریک نہیں کرتا اس کے والد صاحب اپنے دوسرے بیٹے کو شریک کر لیتے ہیں تو خالد کی بیوی پر کوئی طلاق واقع نہ ہوگی۔

لما فی الشامی:(۸۱۲/۳،طبع:سعید کراچی)

(قوله الاصل فيه الخ)ذكر في الفتح اصلا اظهر من هذا وهوان كل عقدترجع حقوقه الى المباشرويستغنى الوكيل فيه عن نسبة العقدالى المؤكل لايحنث الحالف على عدم فعله بمباشرة المامورلوجوده من المامور حقيقة وحكما فلايحنث بفعل غيره لذالك وذالك كالبيع والشراء والايجاروالاستئجاروالصلح عن مال وكذاالفعل الذى يستناب فيه ويحتاج للوكيل الى نسبته للمؤكل كالمخاصمة فان الوكيل يقول ادعى لمؤكل ـــ وكل عقد لاترجع حقوقه الى المباشربل هو سفير وناقل عبارة يحنث فيه بمباشرة المامور كما يحنث بفعله بنفسه كالتزوج ـــ الخ.

ولما فی الهندیه :(۱۱۲/۲،باب اليمين فى البيع طبع رشيديه كوئٹه)

لو حلف لايشترى او لايبيع او لايواجر فوكل من فعل ذالك لم يحنث الا ان ينوى ان لايامر غيره فحينئذ شدد الامر على نفسه بنيته او يكون الحالف ممن لا يباشر هذه العقود بنفسه فحينئذ بالتفويض فان كان يباشر تارة ويفوض اخرى يعتبر الغالب كذافى الكافى.

ولما فی البحر الرائق :(۳۲۱/۴،طبع:سعید کراچی)

واعلم ان العقود انواع ثلاثة منها ما يترلق حقوقه بمن وقع له العقدلابالعاقد كالنكاح ومنها مايتعلق حقوقه بالعاقد لذا كان العاقداهلا لتعلق الحقوق به كالبيع والشراء ـــ فما تتعلق حقوقه بالعاقدفان كان الحالف لايحنث بماشرتوكيله لوجودالفعل من الوكيل حقيقة وحكماً.

ولما فی الهدایه اولین :(ص:۲۰۹،طبع رحمانیه لاهور)

واما شركة العنان فتنعقدعلى الوكالة دون الكفالة ......قال وما اشتراه كل واحد منهما للشركة طولب بثمنه دون الآخرلما بينا انه يتضمن الوكالة دون الكفالة والوكيل هو الاصل فى الحقوق.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ　　　　واللہ اعلم بالصواب: محمد اویس غفر اللہ لہ ولوالدیہ

۱۳ جمادی الاولیٰ ۱۴۳۳ھ　　　　فتویٰ نمبر: ۲۷۳۶

﴿میں نے اگر دوسری شادی نہیں کی تو تجھے طلاق ہے﴾

﴿سوال﴾ ایک شخص بار بار اپنی بیوی کے سامنے یوں کہتا رہا کہ دوسری شادی کرونگا، بیوی اسکو منع کرتی رہی، ایک دفعہ وہ غصہ میں آکر کہنے لگا کہ اگر میں نے دوسری شادی نہیں کی تو پھر تجھے طلاق ہو، حال یہ ہے کہ ابھی تک اس شخص نے دوسری شادی نہیں کی ہے جبکہ اسکے بعد تقریبا

۳،۴ سال ہو گئے، اب پوچھنا یہ ہے کہ مذکورہ صورت میں بیوی پر طلاق واقع ہو گی یا نہیں؟ اگر واقع ہو گی تو کب؟ اور کونسی؟ اور اسکا اثر کیا ہو گا؟

مستفتی محمد رحیم شانگلہ

﴿جواب﴾ مذکورہ صورت میں شوہر نے چونکہ طلاق عدم نکاح کے ساتھ معلق کیا ہے، لہٰذا فی الحال واقع نہیں ہو گی، البتہ جب شوہر دوسری شادی کرنے سے مایوس ہو جائے اور دوسری شادی اس کیلئے ممکن نہ رہے اور یہ موت کی صورت میں ہی ہو سکتا ہے تو اس وقت اس پر طلاق رجعی واقع ہو جائیگی۔

لمافی الهداية:(۲/۳۶۸،طبع رحمانيه)

الطلاق على ضربين صريح وكناية فالصريح قوله انت طالق ومطلقة....فهذا يقع به الطلاق الرجعي.....الخ.

ولمافيهاايضا:(۲/۳۸۰،طبع رحمانيه)

وان حلف ليفعلن كذافعله مرة واحدة بر.....وانمايحنث لوقوع اليأس عنه وذلكبموته أوبفوت محل الفعل.....الخ.

ولمافيهاايضا:(۲/۳۹۸،طبع رحمانيه)

وألفاظ الشرط ان واذاواذاما.....قال:ففي هذه الالفاظ اذاوجدالشرط انحلت وانتهت اليمين.

ولمافي كنزالدقائق:(ص۱۲۶،طبع قديمي)

والفاظ الشرط ان واذا..... ففيهاان وجدالشرط انتهت اليمين الخ،وهكذافي النهر الفائق:(ص۳۸۹)

اور موت کے وقت طلاق کا دنیا میں کوئی اثر ظاہر نہیں ہو سکے گا اس خاتون کو وراثت میں سے حصہ ملے گا، اس لئے کہ مطلقہ عورت کی جب تک عدت پوری نہ ہو تعلق زوجیت باقی رہتی ہے اور میراث کیلئے موت کے وقت تعلق زوجیت کا باقی ہونا کافی ہے۔

لمافي الشامي:(۳/۳۸۸،طبع ايچ ايم سعيد)

(وكذا) ترث (طالبة رجعية)أوطلاق فقط(طلقت)بائنا(اوثلاثا)لان الرجعي لايزيل النكاح حتى حل وطؤها،ويتوارثان في العدة مطلقاوتكفي أهليتهاللارث وقت الموت، الخ قال العلامة ابن عابدينؒ تحت هذا(قوله:وكذاترث طالبة رجعية)(قوله:أوطلاق فقط)(قوله:ويتوارثان في العدة مطلقا)أي سواء كان طلاقه لهافي صحته أومرضه برضاهاأوبدونه كمافي البدائع فأيهمامات وهي في العدة يرثه الآخر.....الخ.

الجواب صحیح: عبد الرحمٰن عفا اللہ عنہ　　　　واللہ اعلم بالصواب: محمد احمد عفا اللہ عنہ

۵ ربیع الثانی ۱۴۲۹ھ　　　　فتوی نمبر: ۱۲۸۶

﴿طلاق کو بہن کے گھر میں داخل ہونے پر معلق کرنا﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء حضرات ایک آدمی نے اپنی بیوی سے کہا "میں تمہیں طلاق دیتا ہوں" پھر کچھ عرصہ گزرنے کے بعد دوسری مرتبہ بیوی سے کہا "اگر تم اپنی بہن کے گھر گئی تو میری تمہاری ختم" نیت طلاق کی تھی اور پھر تیسری مرتبہ کسی موقع پر بیوی سے کہا میں تمہیں طلاق دیتا ہوں، اس شخص کی دو سالیاں ہیں ایک کراچی میں رہتی ہے اور دوسری حیدرآباد میں اس شخص کا کہنا ہے کہ جب میں نے یہ الفاظ کہے تھے "اگر تم اپنی بہن کے گھر گئی تو میری تمہاری ختم" تو میری نیت طلاق کی تھی اور میری مراد کراچی میں رہنے والی سالی تھی۔

اب مسئلہ یہ ہے کہ مذکورہ صورت میں شوہر اپنی بیوی کو اپنی اس سالی کے گھر جو کراچی میں رہتی ہے لیجانا چاہتا ہے کیونکہ اسکی سالی کو عمرہ پر جانا ہے اور طلاق والی بات شوہر اور بیوی ہی کو معلوم ہے کسی اور کو خبر تک نہیں اگر یہ بیوی کو نہیں لیجاتا تو پورے خاندان کو پتہ چل سکتا ہے اور بڑے مسائل کھڑے ہو سکتے ہیں، کیا یہ ممکن ہے کہ اس شخص کی بیوی اپنی والدہ کے گھر میں اپنی بہن سے ملاقات کرلے؟ یا یہ ممکن ہے کہ مذکورہ بیوی اپنی بہن سے اسکے سسرال کے گھر میں ملاقات کرلے؟ جبکہ اسکی بہن اور اسکا شوہر اس گھر میں اوپر والی منزل میں رہتے ہیں یا اس مسئلہ کا کوئی حل ہے؟ تو قرآن وحدیث کی روشنی میں بتائیں۔ مستفتی: عمران خواجہ نارتھ ناظم آباد کراچی

﴿جواب﴾ بیان کردہ صورت میں آپکی بیوی کو دو طلاقیں واقع ہو چکی ہیں اور تیسری طلاق بہن کے گھر میں داخل ہونے کے ساتھ معلق ہے، آپ کی بیوی جب بھی بہن کے گھر میں داخل ہوگی تو تیسری طلاق واقع ہو کر حرمت مغلظہ ثابت ہو جائے گی، اسلئے اسمیں خوب احتیاط رہے، البتہ اگر آپ کی بیوی بہن کے گھر کے علاوہ کہیں اور ملاقات کرلے تو طلاق واقع نہیں ہوگی۔

لما فی قوله تعالیٰ: (سورة البقرة، آیت ۲۲۹): ﴿الطلاق مرتان ---الآية﴾

ولما فی الهداية: (۲/۳۹۸، طبع رحمانیه)

واذا اضافه الی شرط وقع عقيب الشرط مثل ان يقول لامراته ان دخلت الدار فانت طالق.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: محمد طیب حسن زکی

۱۷ جمادالاولیٰ ۱۴۳۰ھ — فتویٰ نمبر: ۲۱۷۵

﴿طلاق معلق کی ایک صورت﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علمائے کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ بھتیجا چچا کی گاڑی چلا رہا تھا کسی بات پر وہ ناراض ہوگیا اور کہا پشتو میں ''کہ ما ترہ گاڈے پہ پخہ او چلولو نو حماسے تہ دری طلاقہ'' یعنی اگر میں نے چچا کی گاڑی مستقل چلائی تو میری بیوی کو تین طلاق اس کے بعد اس نے چند روز یا کچھ عرصہ کے لیے گاڑی چلائی تو آیا اس کی بیوی کو تین طلاق واقع ہوجائے گی یا نہیں؟

واضح رہے کہ مذکورہ الفاظ (پہ پخہ) بولنے والے کے عرف میں تاحیات کسی کام کے کرنے کے لیے استعمال ہوتے ہیں۔

وضاحت: مذکورہ الفاظ سے آپ کی مراد کتنی مدت گاڑی چلانا تھی؟

جواب: میری مراد مستقل تاحیات گاڑی چلانے کی تھی چند مہینے یا کچھ عرصہ کی نہیں؟

﴿جواب﴾ مذکورہ الفاظ سے واقعی اگر حالف کے عرف میں تاحیات چلانا مراد لیا جاتا ہے اور اس کی نیت بھی تاحیات نہ چلانے کی تھی تو اس صورت میں چند روز یا کچھ عرصہ گاڑی چلانے سے طلاق واقع نہیں ہوئی، البتہ احتیاط کا تقاضا تو یہی ہے کہ یہ شخص اس کے بعد چچا کی گاڑی نہ چلائے۔

لما فی فتح القدیر: (۹۱/۵، طبع رشیدیہ)

ان الایمان مبنیۃ علی العرف عندنا۔لان المتکلم انما یتکلم بالکلام العرفی أعنی الالفاظ التی یراد بہا معانیہا التی وضعت لہا فی العرف۔

ولما فی المحیط البرھانی: (۲۲۹/۶، طبع بیروت)

الفعل اذا اضیفت الی وقت کان ذکر الوقت لتقدیر الفعل بہ لالکونہ ظرفاً فیشترط الوجود فی جمیع المدۃ۔

وفیہ ایضاً(ص:۲۲۵، الفصل الثالث وعشرون، طبع بیروت)

فصل فی الحنث ما یقع علی الابد وما یقع علی الساعۃ۔اذا قال الرجل ان صمت الابد فعبدی حرّ لایحنث فی یمینہ ما لم یصم العمر کلہ حتی یموت واذا مات ولم یفطر یوما حنث فی یمینہ۔ثم فی قولہ ان صمت الابد لایحکم بالحنث مادام حیاً لان شرط البرّ موھوم مادام حیاً بان یفطر یوماً فان انتھی الی آخر جزء من اجزاء حیاتہ وھو صائم وقع الیأس عن البرّ فیتحقق شرط الحنث فیحنث ویعتق العبد فی آخر جزء من اجزاء حیاتہ۔

ولما فی الهندیه:(۱/۴۲۰،طبع رشیدیه)

واذا اضافه الی الشرط وقع عقیب الشرط اتفاقاً.

الجواب صحیح:عبدالرحمٰن عفااللہ عنہ　　واللہ اعلم بالصواب:محمد تنویر عفااللہ عنہ

یکم رجب ۱۴۳۴ھ　　فتویٰ نمبر:۳۸۲۲

﴿وقوع طلاق کو گھر میں داخلہ کیساتھ مشروط کرنا﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک شخص نے اپنی بہن سے کہا کہ اگر تو میرے گھر میں آئی تو میری بیوی کو طلاق ہے پھر اسکی بہن اس شخص کی عدم موجودگی میں اسکے گھر آئی، کیا اس صورت میں اس شخص کی بیوی پر طلاق واقع ہوئی یا نہیں؟ واضح رہے کہ گھر اس شخص کا اپنا ذاتی ہے، بہن یا والد وغیرہ کا حصہ نہیں ہے۔ مستفتی: قاری ساجد احمد

﴿جواب﴾ تعلیق طلاق کے بعد واقعی اس شخص کی یہی بہن بھائی کے گھر میں اگر داخل ہوگئی ہے تو اس شخص کی بیوی پر طلاق واقع ہوگئی ہے، طلاق واقع ہونے کیلئے اس شخص کا گھر میں موجود ہونا ضروری نہیں ہے، لہٰذا اس شخص نے ایسا ہی اگر بولا تھا جس طرح سوال میں ذکر ہے تو صرف ایک طلاق رجعی واقع ہوگئی ہے، عدت گذرنے سے پہلے پہلے شوہر رجوع کرسکتا ہے اور عدت گذرنے کی صورت میں باہمی رضامندی سے نئے حق مہر کے ساتھ بغیر حلالہ کے تجدید نکاح کرسکتے ہیں۔

رجوع اسی طرح تجدید نکاح کی صورت میں بھی شوہر کے پاس اب صرف دو طلاق کا حق باقی رہیگا، زندگی بھر کسی بھی وقت مزید دو طلاقیں اگر دیدی تو طلاق مغلظہ واقع ہوگی اور بغیر حلالہ شرعیہ کے تجدید نکاح بھی نہ ہوسکے گا، لہٰذا احتیاط رہے۔

لما فی الهدایة:(۲/۳۹۸،طبع رحمانیه لاهور)

واذا اضافه الی الشرط وقع عقیب الشرط مثل ان یقول لامرأته ان دخلت الدار فانت طالق وهذا بالاتفاق.

ولما فی الهندیة:(۱/۴۲۰،طبع رشیدیه)

اذا اضافه الی الشرط وقع عقیب الشرط اتفاقا مثل ان یقول لامرأته ان دخلت الدار فانت طالق.

الجواب صحیح:عبدالرحمٰن عفااللہ عنہ　　واللہ اعلم بالصواب:عقیل احمد حقانی عفی عنہ

۱۰ ربیع الاول ۱۴۳۱ھ　　فتویٰ نمبر:۲۵۱۵

﴿پردے پر طلاق معلق کیا تو اعتبار عرفی پردہ کا ہے﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک شخص نے اپنی بیوی سے کہا کہ اگر تو بغیر پردے کے گھر سے نکلی تو تجھے تین طلاق ہیں پھر وہ اس طرح چادر اوڑھ کر نکل گئی کہ اگر سامنے سے کوئی دیکھے تو اس کا چہرہ نظر آئے پوچھنا یہ ہے کہ آیا چہرہ شرعی پردے میں داخل ہے یا نہیں اگر داخل ہے تو اس کو طلاق ہوئی ہے یا نہیں؟

﴿جواب﴾ چہرہ شرعی پردہ میں داخل ہے اور چادر اوڑھنے سے بھی ایک حد تک پردہ ہو جاتا ہے بشرطیکہ متعارف طریقہ سے چادر اوڑھ کر نکلے اگرچہ برقعہ کی طرح پردہ نہیں ہوتا آپ کے علاقے میں چادر اوڑھنا پردہ کیلئے اگر رائج ہے اور لوگ ایسے نکلنے کو باپردہ نکلنا شمار کرتے ہیں تو کوئی طلاق واقع نہیں ہوئی اس لئے کہ ایمان اور طلاق میں عرف کا اعتبار ہوتا ہے بشرطیکہ کہنے والے نے اسکے خلاف نیت نہ کی ہو۔

اور اگر اس طرح نکلنا آپ کے علاقے میں بے پردہ شمار ہوتا ہے تو ایسی صورت میں تینوں طلاق واقع ہو گئی ہیں اب رجوع نہیں ہو سکتا اور حلالہ شرعیہ کے بغیر دوبارہ نکاح بھی نہیں ہو سکتا۔

لما فی تفسیر ابن کثیر (۵/۲۲۱ طبع رشیدیه)

وقال محمد بن سیرین سالت عبیدة السلمانی عن قول الله تعالٰی (یدنین علیهن من جلٰبیبهن) فغطی وجهه وراسه وابرز عینه الیسری.

ولما فی احکام القرآن للتهانوی (۳/۲۱۶ طبع ادارة القرآن والعلوم الاسلامیه)

(الثانیه) وجوب ستر الوجه للنسآء اذا خیف الفتنه،

ولما فی الشامی (۲/۷۹ طبع امدادیه)

(تمنع المرأة الخ) أی تنهی عنه وان لم یکن عورة وقوله: (بل لخوف الفتنه) أی الفجور بها. قاموس. أو الشهوة والمعنی تمنع من الکشف لخوف أن یری الرجال وجهها فتقع الفتنة، لانه مع الکشف قد یقع النظر الیها بشهوة.

ولما فی الدر المختار (۵/۵۲۷ طبع امدادیه)

الاصل أن الأیمان مبنیة عند الشافعیؒ علی الحقیقة، وعند مالکؒ علی الاستعمال القرآنی وعند احمدؒ علی النیة، وعندنا علی العرف، مالم ینو ما یحتمله اللفظ فلا حنث فی لا یهدم الا بالنیة.

ولما فی الشامی (۵/۵۲۸ امدادیه)

فاما الفرع المذکور فالوجه فیه: ان کان نواه فی عموم قوله بیتاً حنث وان کان لم یخطر

لہ فلا لانصراف الکلام الی المتعارف عند اطلاق لفظ بیت فظھر ان مرادنا بانصراف الکلام الی العرف اذا لم تکن لہ نیۃ،وان کان لہ نیۃ شئی و اللفظ یحتملہ انعقد الیمین باعتبارہ۔

وکما فی بحر الرائق (۲۹۸/۴، طبع ایچ ایم سعید)

واما الفرع المذکور فالوجہ فیہ انہ ان کان نواہ فی عموم بیتاً حنث وان لم یحظر لہ وجب ان لا یحنث لانصراف الکلام الی المتعارف عند اطلاق لفظ بیت و ظھر ان مرادنا بانصراف الکلام الی العرف انہ واذا لم یکن لہ نیۃ کان موجب الکلام ما ھو معنی عرفیا ، لہ وان کان لہ نیۃ شئی واللفظ یحتملہ انعقد الیمین باعتبارہ۔

الجواب صحیح: مفتی عبدالرحمٰن صاحب عفا اللہ عنہ　　　واللہ اعلم بالصواب: دوست محمد دیروی

۶ صفر ۱۴۳۵ھ　　　فتویٰ نمبر ۱۳۸۸

﴿"میری بیوی میرے باپ کی" کہنے سے طلاق واقع نہیں ہوتی﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ بیٹے نے کہا میں لاہور جارہا ہوں والد نے کہا آپ لاہور نہیں جاؤ گے بیٹے نے کہا اگر میں لاہور نہیں گیا تو میری بیوی آپکی۔اب پوچھنا یہ ہے کہ مذکورہ الفاظ سے طلاق واقع ہوگئی یا نہیں؟اگر طلاق واقع ہوگئی تو کونسی طلاق واقع ہوگی؟برائے کرم وضاحت فرماکر ممنون فرمائیں۔　　　مستفتی:ایک سائل

﴿جواب﴾ بیٹے کا والد سے یوں کہنا کہ "اگر آج میں لاہور نہیں گیا تو میری بیوی آپکی" بے ہودہ جملہ اور لغو الفاظ ہیں ان سے طلاق واقع نہیں ہوگی اگرچہ طلاق کے ارادے سے بولدئے ہوں، ہاں اسطرح بولنا گناہ ہے آئندہ کیلئے احتیاط کرے۔

دراصل طلاق دو طرح کے الفاظ سے واقع ہوتی ہے:

(۱) صریح الفاظ سے جن میں طلاق ہی کا معنی ہو یا عرف میں طلاق کیلئے استعمال ہوں اور لوگ طلاق ہی ان الفاظ سے مراد لیتے ہوں.

(۲) کنائی الفاظ سے جو کہ طلاق کیلئے خاص نہ ہوں البتہ دیگر معانی کے ساتھ انشاء طلاق یا اسکی خبر دینا بھی مراد لیا جاسکتا ہو پھر شوہر کی نیت سے جسکی وہ خود وضاحت کرے یا قرائن سے طلاق مراد لینا متعین ہو، مذکورہ الفاظ نہ صریح ہیں اور نہ کنائی، اس لئے ان الفاظ سے کوئی طلاق واقع نہیں ہوگی البتہ ایسا کرنا غلط ہے آئندہ گریز کرے۔

لمافی التنویر مع الدر ج ۳/۲۲۶،۲۲۷ طبع سعید

(هو) لغة رفع القيد لكن جعلوه في المرأة طلاقا وفي غيرها اطلاقا فلذا كان انت مطلقة بالسكون كناية ،وشرعا (رفع قيد النكاح في الحال) بالبائن (او المآل) بالرجعي (بلفظ مخصوص) هو ما اشتمل على الطلاق فخرج الفسوخ كخيار عتق وبلوغ وردة فانه فسخ لا طلاق وبهذا علم ان عبارة الكنز والملتقى منقوضة طرداوعكسا .

ولمافی البدائع :ج ۴/۲۱۲،۲۱۵ طبع دار الكتب العلمية

واما بيان ركن الطلاق : فركن الطلاق هو اللفظ الذى جعل دلالة على معنى الطلاق لغة وهو التخلية والارسال ورفع القيد في الصريح ،وقطع الوصلة ونحوه في الكناية ، او شرعا وهو ازالة حل المحلية في النوعين اومايقوم مقام اللفظ فمثل ان يقول في الكناية انت بائن اوابنتك ،اويقول في الصريح : انت طالق اوطلقتك .

ولمافی الرد :ج ۳/۲۹۶ طبع سعید د

لان ماذكروه في تعريف الكناية ليس على اطلاقه بل هو مقيد بلفظ يصح خطابها به ويصلح لانشاء الطلاق الذى اضمره اوللاخبار بانه اوقعه كانت حرام ---حتى لوقال انت يمين لانى طلقتك لايصح فليس كل مااحتمل الطلاق من كنايته بل بهذين القيدين ولابد من ثالث هو كون اللفظ مسببا عن الطلاق وناشئا عنه كالحرمة في انت حرام

الجواب صحیح: مفتی عبدالرحمٰن عفااللہ عنہ — واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب: عاقل شاہ

۲۲ صفر الخیر ۱۴۳۵ھ — فتویٰ نمبر: ۳۹۲۱

«''اگر میں نے یہ باتیں کی ہوں تو مجھ پر طلاق'' کے الفاظ کا حکم»

«سوال» کیا فرماتے ہیں مفتیان کرام اس مسئلہ کے متعلق کہ میں نے ایک دوست کے متعلق کچھ باتیں کی تھی، اس نے مجھ سے کہا کہ تم نے میرے خلاف باتیں کی ہیں، میں نے جواب میں کہا کہ اگر میں نے یہ باتیں کی ہوں تو مجھ پر طلاق، پشتو کہ الفاظ یہ تھے'' پہ ما باندے طلاقہ شوہ'' اس کے بعد میں نے ایک مولوی صاحب سے مسئلہ دریافت کیا تو انہوں نے فرمایا کہ ایک طلاق ہو چکی ہے اور ساتھ ہی فرمایا کہ آپ نے '' یو پہ درے'' تو نہیں کہا یعنی تین کے الفاظ تو نہیں کہے؟ بس ان کے بعد سے مجھے شک اور وسوسہ شروع ہوگیا کہ کہیں یہ الفاظ بولے نہ ہوں، کئی مفتیان کرام سے مسئلہ دریافت کرنے کے باوجود شک اور وسوسہ زائل نہیں ہو رہا۔

«جواب» آپ کو کئی مفتیان کرام نے جواب دیدیا ہے، لہٰذا آپ کو اطمینان ہونا چاہیے، لگتا ہے شیطان وہم کے مرض کے ذریعہ آپ کو تنگ کر رہا ہے، شریعت کا صاف ضابطہ ہے کہ

احکام کا مدار یقین پر ہے شک پر نہیں ہے، بلاشبہ آپ کا اصل واقعہ صرف ایک طلاق کا ہے۔

چنانچہ مولوی صاحب کے پاس جانے سے پہلے آپ کو اس طرح کا کوئی وسوسہ اور شک نہیں تھا، مفتی صاحب نے اپنی ذمہ داری کو پورا کرتے ہوئے آپ سے دریافت کیا کہ آپنے ''یو په درے'' تو نہیں بولا اس کے بعد سے آپ کو اس کا وہم شروع ہوگیا جو کہ خالص شک ہی ہے، لہٰذا اس کا کوئی اعتبار نہیں۔

لمافي الهندية:(۴۲۰/۱، طبع رشيديه) واذا اضافه الى شرط وقع عقيبه اتفاقا...الخ.

ولمافي الدر المختار:(۲۸۳/۳، طبع سعيد) لو شک أطلق واحدة او أكثر بنى على الأقل.

ولمافي الشامي:(۲۸۳/۳، طبع سعيد)

(قوله بنى على الأقل) أي كما ذكره الاسبيجابي، الا أن يستيقن بالأكثر أو يكون اكبر ظنه.

ولمافي الهندية:(۳۶۳/۱، طبع رشيديه)

في نوادر ابن سماعة عن محمد اذا شک في انه طلق واحدة او ثلاثا فهي واحدة حتى يستيقن أو يكون أكبر ظنه على خلافه.

ولمافي الاشباه والنظائر:(ص ۶۰ طبع قديمي) القاعدة الثالثة: اليقين لا يزول بالشک.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ　　　　واللہ اعلم: عبدالوہاب لغمانی عفا اللہ عنہ

یکم رجب المرجب ۱۴۳۱ھ　　　　فتویٰ نمبر: ۲۷۴۸

﴿طلاق معلق کا ایک مسئلہ﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں، کہ زید نے شریف کو 50,00 روپے قرض دیا، شریف نے کہا پورے نہیں دوں گا کچھ کم دوں گا، زید نے کہا پورے دوگے یا میں کچھ بھی نہیں لوں گا، ورنہ پھر میری بیوی کو تین طلاق۔ اسکے بعد زید نے 35,00 روپے لئے، اور شریف کی بیوی کہہ رہی ہے کہ مزید میں دوں گی، اب زید کہہ رہا ہے کہ میں پیسے واپس کروں یا کیا صورت اختیار کروں تاکہ میری بیوی کو طلاق نہ ہو، کیا یہ پیسے لینے سے طلاق ہوئی یا نہیں؟ برائے کرم شریعت کی روشنی میں رہنمائی فرمائیں۔ مستفتی: حبیب الوہاب

﴿جواب﴾ صورت مسئولہ میں زید نے اپنا پورا قرض وصول نہ ہونے پر طلاق کو معلق کیا ہے، اور الفاظ میں بظاہر یکمشت یا متفرق طور پر وصولی کا کوئی ذکر نہیں ہے، اور نہ کسی خاص وقت کو وصولی کے لئے متعین کیا ہے، لہٰذا زید کو اپنا پورا حق وصول ہونا چاہئے یکمشت ہو خواہ متفرق

طور پر، جلدی ہو یا دیر سے، تو کوئی طلاق واقع نہ ہوگی۔ البتہ زید کو اپنا پورا حق اسکی موت تک وصول نہ ہوا تو موت کے وقت اسکی بیوی پر تینوں طلاق واقع ہوں گی۔ تاہم اپنے شوہر کے ترکہ میں وہ اس طلاق کی وجہ سے میراث سے محروم نہیں ہوگی۔

لما فی الهداية: ۲۹۸/۲ طبع رحمانیه

واذا اضافه الى شرط وقع عقيب الشرط مثل ان يقول لأمرء ته ان دخلت الدار فانت طالق وهذا بالاتفاق،لأن الملك قائم فى الحال والظاهر بقاء ه الى وقت وجود الشرط فيصح يميناً أو ايقاعاً.

ولما فى تنوير الأبصار: ۲۹۸/۳ طبع سعيد

الايمان مبنية على الالفاظ لا على الأغراض .وفى الشامية تحته:فصار الحاصل ان المعتبر انما هو اللفظ العرفى المسمّى،وأما غرض الحالف فان كان مدلول اللفظ المسمّى اعتبر،وان كان زائدا على اللفظ فلا يعتبر۔۔۔الأولى:حلف لا يشتريه بعشرة فا شتراه بأحد عشر حنث،لأنه اشتراه بعشرة وزيادة،والزيادة على شرط الحنث لا تمنع الحنث۔۔۔لو اشترى بتسعة لم يحنث لانه لم توجد العشرة بنوعيها مع انه وجد الغرض أيضاً،لانه مستنقص.

ولما فى رسائل ابن عابدين ۳۰۲/۱ طبع عثمانيه

وان المراد بالغرض ما قصده المتكلم من كلامه سواء كان هو المعنى العرفى الذى استعمل فيه اللفظ اوكان معنى عرفياً خارجاً عن اللفظ زائدا عليه وانه بالمعنى الاول يصلح مخصّصاً،وبالمعنى الثانى لا يعتبر وهوا لمعنى بقولهم لا على الاغراض.

ولما فى التنوير مع الدرّ: ۷۵۷/۳ طبع سعيد

حلف ليأتينه فهو أن يأتى منزله ۔۔۔فلو لم يأته حتى مات أحدهما حنث فى آخر حياته وكذا كل يمين مطلقة.وفى الشامية تحته:وأصل هذا ان الحالف فى اليمين المطلقة لا يحنث ما دام الحالف والمحلوف عليه قائمين لتصور البر فاذا مات احدهما فانه يحنث.

ولما فى التنوير مع الدرّ أيضاً: ۳۹۱،۳۹۰/۳ طبع سعيد

والحال ان التعليق والشرط فى مرضه أو علّق طلاقها بفعل نفسه وهما فى المرض أو الشرط فقط فيه۔۔۔ورثت لفراره،وعنه مافى البدئع :ان لم أطلقك او ان لم أتزوج عليك فانت طالق ثلاثاً فلم يفعل حتى مات ورثته،ولو ماتت هى لم يرثها.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: محمد زبیر غفرلہ ولوالدیہ

۲۵ صفر ۱۴۲۰ھ — فتویٰ نمبر: ۳۵۵۶

﴿کلما کیساتھ قسم میں نکاح کا طریقہ کیا ہوگا؟﴾

﴿سوال﴾ من حلف كلما تزوجت امراة فهى طالق قال الفقهاء ان اجاز نكاح

الفضولی بالفعل لایحنث ولکن ان طلقھابعد ذالک ثم ارادان ینکحھافھل یحتاج الی الحیلة المذکورة ثانیاام لا؟ مستفتی :عبداللہ التاجکستانی

﴿جواب﴾نعم یحتاج الی اجازة نکاح الفضولی بالفعل ثانیافی ھذہ الصورة لان کلمة کلماتقتضی عموم الافعال فاذادخلت علی التزویج لاینحل الیمین ولو کان بعدزوج آخرلدخولہ علی سبب الملک وھو غیرمتناہ وان کان الحالف من ابناء الفارس فقولہ"ھربار"یکون بمعنی کلماوفی غیرھامثلاًھر گاہ ھرزمان وھمیشہ یکون للمرة الواحدة.

لمافی التنویرمع الدر:(۲/۲۰۵،طبع امدادیہ)

(وفیھا)کلھا(تنحل)ای:تبطل(الیمین)ببطلان التعلیق(اذاوجدالشرط مرة الافی کلما فانہ ینحل بعدالثلاث)لاقتضائھاعموم الافعال کاقتضاء کل عموم الاسماء(فلایقع ان نکحھابعدزوج آخرالااذادخلت)کلما(علی التزویج نحوکلماتزوجت فانت کذا) لدخولھاعلی سبب الملک وھوغیرمتناہ.

ولمافی الھندیة:(۱/۴۱۹،طبع رشیدیہ)

ولوتزوجھامن غیران یأمراحدالاتطلق وان امربعدذلک فقال زوجنی فلانة وھی امرأتہ علی حالھاطلقت.

ولمافی خلاصة الفتاوی:(۲/۱۳۰،طبع رشیدیہ)

ھھناستة الفاظ اگروھمی وھمیشہ وھرگاہ وھرزمان وھربارفالاول وھوقولہ اگر فارسیة ان فلایحنث الامرة وھمی ای ھی وھمیشہ بمنزلة متیماولایحنث فیھاالا مرة وھرگاہ وھرزمان المختارانہ یحنث مرة وفی قولہ ھرباریحنث بکل مرة.

الجواب صحیح :عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ واللہ اعلم بالصواب:معراج الدین غفراللہ لہ

۲۶جمادی الاولی ۱۴۲۹ھ فتوی نمبر:۱۳۹۷

﴿تکرار طلاق سے تاکید مراد لینادیانۃً معتبر ہے قضاءً نہیں﴾

﴿سوال﴾ کیافرماتے ہیں مفتیانِ کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک شخص نے دومرتبہ اپنی بیوی سے کہا کہ اگرتو چھت پر چڑھی تو تجھے طلاق ہے اوردومرتبہ عورت کے رشتہ داروں کے سامنے کہا کہ تم سن لواگر یہ چھت پر چڑھی تو اسے طلاق ہے پھروہ شخص کسی کام سے باہر چلا گیااور عورت کسی ضرورت سے چھت پر چڑھ گئی تواس صورت میں کتنی طلاقیں واقع ہوں گی؟

﴿جواب﴾ صورتِ مسئولہ میں دوسری مرتبہ اپنی بیوی سے اورتیسری باررشتہ داروں کے

سامنے یہ الفاظ کہنے سے اگر اس شخص کی مراد پہلے جملہ کی تاکید ہے تو دیانۃً صرف ایک طلاق واقع ہوئی ہے دورانِ عدت شوہر کو رجوع کا حق حاصل ہے اور مزید دو طلاقوں کا حق باقی رہے گا اور اگر تاکید مراد نہیں ہے بلکہ ہر بار الگ اور مستقل طلاق کا ارادہ تھا تو وقوعِ شرط کے بعد تین طلاقیں واقع ہوگئی ہیں اس صورت میں بغیر حلالہ شرعیہ کے پہلے شوہر سے تجدید نکاح بھی جائز نہیں ہے۔

لما فی الدر مع الرد: ۲۵۲/۳، طبع: سعید)

(تنحل) ای تبطل (الیمین) ببطلان التعلیق (اذا وجد الشرط مرة الا فی کلما فانه ینحل (قوله ای تبطل الیمین) ای تنتهی وتتم واذا تمت حنث فلا یتصور الحنث ثانیا الا بیمین اخری لانها غیر مقتضیة للعموم والتکرار لغة نهر۔

ولما فی الهندیة: ۴۲۰/۱، طبع رشیدیة) واذا اضافه الی شرط وقع عقیبه اتفاقا۔

ولما فی البحر الرائق: ۱۴/۴، طبع سعید)

(قوله ففیها ان وجد الشرط انتهت الیمین) ای فی الفاظ الشرط ان وجد المعلق انحلت الیمین وحنث وانتهت لانها غیر مقتضیة للعموم والتکرار لغة فبوجود الفعل مرة یتم الشرط ولا یتم بقاء الیمین بدونه واذا تم وقع الحنث فلا یتصور الحنث مرة اخری الا بیمین اخری او بعموم تلک الیمین۔

ولما فی تنقیح الحامدیة: ۳۷/۱، طبع حقانیة)

وقال فی الخانیة لو قال انت طالق انت طالق انت طالق وقال اردت به التکرار صدق دیانةً وفی القضاء طلقت ثلاثا ومثله فی الاشباه والحدادی وزاد الزیلعی ان المرأة کالقاضی فلا یحل لها ان تمکنه اذا سمعت منه ذلک او علمت به لانها لا تعلم الا الظاهر۔

ولما فی التنویر مع الرد: ۷۴۳/۳، طبع سعید)

الأیمان مبنیة علی الالفاظ لا علی الاغراض ای المقاصد والنیات۔

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: عمر فاروق لاہوری

۷ر رجب المرجب ۱۴۳۳ھ — فتویٰ نمبر: ۳۸۳۹

﴿معلق طلاق مغلظہ سے بچنے کی ایک تدبیر﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک شخص نے یہ الفاظ کہے کہ اگر میں فلاں شخص کے ساتھ کاروبار کروں تو میری بیوی کو تین طلاق، اب وہ شخص اس کے ساتھ کاروبار کرنا چاہتا ہے، ایک مولوی صاحب نے یہ صورت بتائی کہ ایک طلاق بائن دو، اس کے بعد عدت میں باقی طلاقیں بھی دیدو، اس سے طلاقیں ختم ہوجائے گی اور اس کے بعد آپ

اس شخص کے ساتھ کاروبار کرسکتے ہیں۔ اس شخص نے پہلے ایک طلاق رجعی دی ہے، اس کے بعد رجوع بھی کرلیا ہے، ایسے شخص کے بارے میں کیا حکم ہے؟ وضاحت فرمائیں۔

﴿جواب﴾ صورت مسئولہ میں تین طلاقوں کو کاروبار کے ساتھ معلق کیا ہے، لہٰذا بیوی کے نکاح میں ہوتے ہوئے یہ شخص اگر کاروبار کرلیتا ہے تو تینوں طلاقیں واقع ہوکر طلاق مغلظہ واقع ہوجائے گی۔

تین طلاقوں کے وقوع سے بچنے کی یہ صورت ہوسکتی ہے کہ کام شروع کرنے سے پہلے طلاق بائن دیدے اور عورت پوری عدت گزار لے، اس کے بعد یہ شخص کاروبار کرلے، اس سے وہ شرط تو پوری ہوجائے گی، لیکن طلاقیں (جو باقی بچیں ہیں) وہ واقع نہیں ہوں گی؛ اس لئے کہ اب وہ اس کے نکاح سے نکل چکی ہے اور عدت ختم ہوجانے کی وجہ سے طلاق واقع ہونے کے لئے محل باقی نہیں رہا، اس کے بعد نئے حق مہر کے ساتھ تجدید نکاح کرے۔

باقی مولوی صاحب کا یہ کہنا کہ عدت کے اندر ہی وہ کام (کاروبار) کرلے، یہ غلط ہے؛ اس لئے کہ دوران عدت نکاح من وجہ باقی رہتا ہے، طلاق واقع ہوسکتی ہے اس لئے عدت کے بعد ہی اس شخص کے ساتھ کاروبار کرے، ورنہ طلاقیں واقع ہوجائیں گی۔

اب چونکہ وہ شخص ایک طلاق رجعی دیکر رجوع کرچکا ہے؛ اس لئے مذکورہ بالا صورت اختیار کرنے کی صورت میں صرف ایک طلاق کا مالک رہے گا، اس لئے کہ اس صورت کو اختیار کرنے سے ایک طلاق بائن واقع ہوجائے گی اور ایک وہ پہلے بھی دے چکا ہے؛ لہٰذا ایک طلاق جو باقی تھی صرف اسی کا مالک رہے گا، زندگی میں کبھی بھی اس نے ایک طلاق مزید اگر دیدی تو طلاق مغلظہ واقع جائے گی، پھر وہ رجوع نہیں کرسکے گا اور حلالہ شرعیہ کے بغیر دوبارہ نکاح بھی نہیں کرسکے گا، لہٰذا احتیاط رہے۔

لما فی الدر المختار، (باب التعليق، ۳/۳۵۵ طبع: سعيد)

"فحيلة من علق الثلاث بدخول الدار ان يطلقها واحدة ثم بعد العدة تدخلها فتنحل اليمين فينكحها".

ولما فی الدر المختار: (۳/۱۳۲ طبع: سعيد)

"(وكل فرقة هي طلاق يقع) الطلاق (في عدتها) ــــ فروع: انما يلحق الطلاق لمعتدة

الطلاق". قال ابن عابدين رحمه الله : فصار الحاصل ان الطلاق يلحق في عدة فرقة عن طلاق اوإباء اوردة بدون لحاق بدار الحرب".

ولما في الشامي :(۳۰۶/۳، طبع سعید)

"(الصريح يلحق الصريح) ويلحق البائن (بشرط العدة) هذا الشرط لابد منه في جميع صور اللحاق فالاولیٰ تاخیره عنها".

الجواب صحیح: عبدالرحمن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: کمیل الدین کلکتی

۱۹ صفر الخیر ۱۴۳۴ھ — فتوی نمبر: ۳۵۳۸

﴿طلاق مکرہ کا بیان﴾

﴿زبردستی دلوائی گئی طلاق کا حکم﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ہمارے ایک دوست کو ان کے سسرال والوں نے ڈرادھمکا کر اس سے زبردستی طلاق مغلظہ دلوائی، کیا اس طرح طلاق واقع ہوجاتی ہے؟

مستفتی رئیس احمد کورنگی ا

﴿جواب﴾ ہوش وحواس میں ہوتے ہوئے زبان سے طلاق دینے کی صورت میں طلاق واقع ہوجاتی ہے خواہ اپنی مرضی وخوشی شامل نہ ہو، لہٰذا مذکورہ صورت میں اگرچہ زبردستی طلاق دلوائی ہے طلاق واقع ہوگئی ہے، اب رجوع نہیں ہوسکتا اور حلالہ شرعیہ کے بغیر دوبارہ نکاح بھی نہیں ہوسکتا، عدت گزار کر مطلقہ خاتون دوسری جگہ چاہے تو نکاح کرسکتی ہے۔

لما في سنن ابي داؤد:(۳۱۶/۱،طبع رحمانیه)

عن ابي هريرة ان رسول الله ﷺ قال ثلث جدهن جد وهزلهن جد النكاح والطلاق والرجعة.

ولما في التنوير مع الدر:(۲۳۵/۲،طبع امدادیه)

(ويقع طلاق كل زوج بالغ عاقل) ولو تقديرا بدائع ،ليدخل السكران (ولو عبدا أو مكرها) فان طلاقه صحيح لا اقراره بالطلاق.

ولما في البحر:(۲۴۵/۳،طبع سعید)

(قوله ولو مكرها) اى ولو كان الزوج مكرها على انشاء الطلاق لفظا.

الجواب صحیح: عبدالرحمن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: خلیل اللہ دیروی عفا اللہ عنہ

۲۹ ربیع الثانی ۱۴۲۹ھ — فتوی نمبر: ۱۳۷۸

﴿ کچھ کہے بغیر زبردستی طلاق نامہ پر انگوٹھا لگوانے سے طلاق واقع نہیں ہوتی ﴾

﴿سوال﴾ ایک آدمی کا اپنی بیوی سے معمولی نوعیت کا جھگڑا ہوا، بیوی ناراض ہوکر اپنے والدین کے گھر چلی گئی، اب لڑکی کے والدین اسے واپس اپنے شوہر کے گھر نہیں جانے دے رہے، یہ آدمی خود اسے لینے گیا تو لڑکی کے والدین نے زبردستی اس سے طلاق نامہ پر انگوٹھا لگوالیا اور دستخط وغیرہ کروالئے، پوچھنا یہ ہے کہ کیا اسطرح طلاق واقع ہو جائے گی؟ حالانکہ اس آدمی نے زبان سے طلاق کے الفاظ نہیں کہے اور نہ وہ اس پر راضی ہے۔

﴿جواب﴾ مذکورہ صورت میں اس آدمی کی بیوی پر طلاق واقع نہیں ہوئی کیونکہ اس آدمی نے زبان سے طلاق نہیں دی اور زبردستی اس سے طلاق نامہ پر دستخط وغیرہ لئے گئے ہیں اور زبردستی کی صورت میں طلاق نامہ لکھنے یا اس پر دستخط کرنے سے طلاق واقع نہیں ہوتی کیونکہ تحریر ضرورت کے وقت قائم مقام عبارت کے ہوتی ہے اور یہاں کوئی ضرورت نہیں ہے شامی میں طلاق مکرہ کے بیان میں ہے:

لما في الدر المختار:(۲۳۶/۳ طبع سعید)

وفي البحر أن المراد الاكراه على التلفظ بالطلاق،فلو أكره على أن يكتب طلاق امرأته فكتب لاتطلق،لأن الكتابة أقيمت مقام العبارة باعتبار الحاجة ولا حاجة هنا كذا في الخانية.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم: شاہد اسحاق عفا اللہ عنہ

۳۰ جمادی الثانی ۱۴۲۷ھ — فتوی نمبر: ۵۰۱

﴿ زبردستی طلاق لینے کا حکم ﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک شخص نے اپنی بیٹی کا نکاح بچپن ہی میں کروادیا تھا، لڑکی کے بالغ ہونے کے بعد والد نے رخصتی سے انکار کردیا تو اس مرد نے دوسری جگہ شادی کرلی، اس وقت اس کے آٹھ بچے ہیں، اب وہ لڑکی اس مرد کے پاس جانے کے لئے تیار نہیں ہے اور طلاق لینا چاہتی ہے تو کیا شرعاً اس لڑکی کو طلاق لینے کا حق حاصل ہے یا نہیں؟ اور اگر مرد سے زبردستی طلاق لی جائے تو طلاق اس صورت میں واقع ہوگی یا نہیں؟

﴿جواب﴾ باپ، دادا اپنی نابالغ لڑکی کا نکاح کسی سے کردیں جس میں والد یا دادا کی ذاتی

لالچ یا سوء اختیار بھی نہ ہو تو بالغ ہونے کے بعد لڑکی اگر چہ راضی نہ ہو تو بھی یہ نکاح قائم رہتا ہے، شوہر سے طلاق یا خلع لئے بغیر ختم نہیں ہوسکتا، لڑکی کے والد نے رخصتی سے انکار کر دیا تھا جس کی وجہ سے شوہر نے دوسری جگہ شادی کر لی تو یہ زیادتی لڑکی کے والد کی طرف سے ہے، لڑکی کو چاہیے کہ رخصتی کے لئے آمادہ ہو جائے اگر چہ شوہر نے دوسری شادی کر لی ہے، البتہ شوہر کو اب اس کی طرف اگر رغبت نہیں ہے یا دونوں کا ایک ساتھ بوجھ برداشت نہیں کر سکتا یا مساوات قائم نہیں کر سکتا تو ایسی صورت میں شوہر کو چاہیے کہ اس کو فارغ کر دے یا کم از کم خلع کر لے ورنہ تو ظلم ہوگا اور ظلم کی صورت میں لڑکی عدالت سے رجوع کرے تاکہ عدالت کے ذریعے حق زوجیت حاصل کر سکے یا قید نکاح سے خلاصی حاصل کر سکے، زبردستی طلاق لینے کی دین اسلام ہرگز اجازت نہیں دیتا اگر چہ بعض صورتوں میں زبردستی لی ہوئی طلاق واقع ہو جاتی ہے۔

لما فی التنویر:(۳/ص۶۶ طبع سعید)

وللولی انکاح الصغیر والصغیرۃ ولو ثیباً ولزم النکاح ولو بغبن فاحش او بغیر کفء ان کان الولی اباً او جداً لم یعرف منهما سوء الاختیار.

ولما فی الهدایة:(۲/۲۵۸ طبع رحمانیه)

فان زوجها الأب أو الجد یعنی الصغیر والصغیرۃ فلاخیار لهما بعد بلوغهما.

ولما فی تکملة فتح الملهم:(۱/۱۳۲ طبع دار العلوم کراچی)

ولکنها لم تسد باب الفرقة من جهة المرأۃ بالکلیة واذا اباحت لها ذلک فی ظروف خاصة، فیمکن لها مثلاً ان تعقد النکاح بشرط تفویض الطلاق الیها ولو لم تشترط ذلک فی العقد فلها أن تختلع من زوجها برضاه وان لم یکن ذلک فلها أن تطلب من القاضی فسخ النکاح اذا کان زوجها عنیناً او مجنوناً او متعنتاً او مفقوداً.

ولما فی قوله تعالیٰ:(سورۃ آل عمران،آیت ۲۲۹)

فان خفتم أن لا یقیما حدود الله فلاجناح علیهما فیما افتدت به ...... الأیة.

ولما فی تنویر الابصار:(۳/۲۳۵ طبع سعید)

ویقع طلاق کل زوج بالغ عاقل ولو عبداً او مکرهاً.

الجواب صحیح: عبد الرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: محمد کاشف عزیز

۷ ربیع الاول ۱۴۳۰ھ — فتویٰ نمبر: ۲۱۲۷

﴿مجنون، معتوہ، نابالغ اور بے ہوش کی طلاق کا بیان﴾

بسم الله الرحمن الرحيم

ما رايكم ارحمكم الله

فى الجواب الذى كتبه الشيخ ابو بكر الجزائرى المدرس بالمسجد النبوى الشريف. عن حكم طلاق الغضبان والى حضرتكم نص تلك الفتوى برفق هذه الورقة. والشيخ استدل بالحديث المشهور. فالرجاء من تكرمكم ان تفيدونا بما هو الراجح عندكم بناءً على الادلة الشرعية من القران والحديث والاجماع مع شرح معنى الحديث الذى ذكره الشيخ فى هذه المسئلة.

ولكم منا جزيل الشكر وعظيم المنه

المستفتى: عبدالنصير عفى عنه القدير المسجد البخارى. سهراب گوٹھ کراچی ۳۸

(بسم الله الرحمن الرحيم)

الحمد لله و الصلاة والسلام على رسول الله

و بعد

ان طلاق الغضبان انما اشتد به الغضب فاصبح لا يميز بحيث لا يشعر بما قال فهذا بالاجماع ان طلاقه لايقع لقول الرسول صلى الله عليه وآله و صحبه وسلم "لا طلاق ولا عتاق فى اغلاق" والاغلاق هو الغضب الشديد. والحديث صحيح رواه غير واحد من اصحاب السنن والمسانيد.

ابو بكر جابر الجزائرى المدرس بالمسجدالنبوى الشريف

الجواب احامداً ومصلياً

ورد هذا الحديث بلفظ "لا طلاق و لا عتاق فى اغلاق "فى غير واحد من كتب الحديث واسناده صحيح، و لفظ ابى داود "فى غلاق" بدون الف و فى سنده محمد بن عبيد بن ابى صلاح قال الحافظ فى التقريب : هو ضعيف

الحديث الخ وعنى الائمة الثلاثة سوى الامام الاعظم رحمهم الله "باغلاق و غلاق " الكره فلا يقع طلاق المكره عندهم ،و قال الامام ابو داود رحمه الله "الغلاق " اظنه في الغضب و قال الشيخ زكريا رحمه الله في تعليقه على "بذل المجهود " ...."جزم الحافظ ان روايةابى داود بلفظ غلاق بدون الف بمعنى الغضب و حكى البيهقى انه روى على الوجهين و عند ابن ماجه بلفظ اغلاق بمعنى الكره و غلط من قال :الاغلاق الغضب :٢٨٣ ج ١٠ فالانسب فى هذالمقام للشيخ ابو بكر جابر الجزائرى ان يستشهد برواية ابى داود بلفظ غلاق ليطابق الدليل المدلول.

اما الكلام فى طلاق الغضبان ففيه تفصيل والغضب كيفية تطرء العبد ولها مراتب فيختلف حكمه باعتبار شدتهاوضعفها و المرء لا يطلق عادة الا فى الغضب فلو افتى بعدم وقوعه مطلقافى حالة الغضب لم يقع طلاق كما ياتى فى كلام ابن السيد فالحكم على عدم وقوع الطلاق فى حالة الغضب مطلقاً ليس بمدلول الحديث و لم يذهب اليه واحدمن الائمة المقتدى بهم رحهم الله تعالى.

ثم قسم اهل العلم الغضب الى ثلثة اقسام .الاول:ان يحصل له مبادى الغضب بحيث لم يتغيرعقله فيعلم ما يقول و يقصد فاتفقوا على وقوع طلاقه فى هذه الصورة.والثانى:ان يبلغ النهاية فلا يعلم ما يقوله و لايريد فاتفقوا على عدم وقوع الطلاق فى هذه الصورة ،و اشكل الحكم فى الثالث اى الدائر بين المرتبتين بحيث لم يصر كالمجنون فيعلم ما يقول من الفاظ الطلاق ولكن لا يقصدبها طلاق زوجته بل جرت الفاظ الطلاق على لسانه من شدة الغضب لا عن روية و فكر كالمخطى جرى على لسانه لفظ الطلاق فهو يعلم ما يتلفظ به و لكن لم يكن اراده و الفتوى فى هذه الصورة عندالحنفية رحمهم الله انه يصدق ديانة فلايقع طلاقه فيمابينه و بين الله تعالى ولو رفع الى القاضى يحكم بوقوعه والمراة فى حكم الطلاق كالقاضى عندنا فلو سمعت الفاظ الطلاق لم يسع لها ان تعامله معاملة الزوجة مع الزوج بل وجب عليها التجنب منه.

لمافى بذل المجهود:(٢٨٣/١٠)

قال الشيخ خليل احمدؒ فى بذل المجهود شرح السنن للامام ابى داؤد :وقال الشوكانى

فى الذيل بقوله فى اغلاق ـــ فسره علماء الغريب بالاكراه روى ذلك فى التلخيص عن ابن قتيبة والخطابى وابن السيد وغيره وقيل الجنون واستبعده المطرزى وقيل الغضب وقع ذلك فى سنن ابى داؤد وفى رواية ابن الاعرابى وكذا فسره احمد ورده ابن السيد فقال: لو كان كذلك لم يقع على احد طلاق لان احدا لا يطلق حتى يغضب ــــ الى ان قال قال ابو داود "الغلاق اظنه فى الغضب" ولعله عند المصنف للطلاق الموقع فى حالة الغضب الذى يغلق العقل لا يقع.

لما فى الشاميه ۲/۲۲۲)

قال ابن عابدين رحمه الله تعالى: والذى يظهر لى ان كلا من المدهوش والغضبان لا يلزم فيه ان يكون بحيث لا يعلم ما يقول بل يكتفى فيه بغلبة الهذيان و اختلاط الجد بالهزل كما هو المفتى به فى السكران على ما مر ـــــ فالذى ينبغى التعويل عليه فى المدهوش و نحوه اناطة الحكم بغلبة الخلل فى اقواله و افعاله الخارجة عن عادته و كذا يقال فيمن اختل عقله لكبر أو لمرض أو لمصيبة فاجأته: فما دام فى حال غلبة الخلل فى الاقوال والافعال لا تعتبر اقواله و ان كان يعلمها و يريدها لان هذه المعرفة و الارادة غير معتبرة لعدم حصولها عن ادراك صحيح كما لا تعتبر من الصبى العاقل

ولما فى الاشباه والنظائر ۱/۳۸)

و فى " الاشباه و النظائر "تحت "القاعدة الاولى" وفى عبارة بعض الكتب ان طلاق المخطى واقع قضاء لا ديانة، فظهر بهذا ان الصريح لا يحتاج اليها قضاء و يحتاج اليها ديانة ـــــ

ولما فى فتح القدير ۳/۳۵۲)

و قال الامام ابن الهمام رحمه الله: والذى يظهر من الشرع ان لا يقع بلا قصد لفظ الطلاق عند الله تعالى وقوله فيمن سبق لسانه واقع اى قضاء ـــــ وسيذكر فى انت طالق اذا نوى به الطلاق من الوثاق يدين فيما بينه وبين الله تعالى مع انه اصرح صريح فى الباب ثم لم يعارض ذالك قوله ولايحتاج الى النية لان المعنى لايحتاج الى النية بمعنى اللفظ بعد القصد الى اللفظ، والحاصل انه اذا قصد السبب عالماً بانه سبب رتب الشرع حكمه عليه اراده او لم يرده الا ان اراده ما يحتمله واما انه اذا لم يقصده او لم يدر ما هو فيثبت الحكم عليه شرعاً و هو غير راض بحكم اللفظ ولا باللفظ فما ينبو عنه قواعد الشرع وقد قال تعالى: لا يؤاخذكم الله باللغو فى ايمانكم و فسر بامرين ـــــ واما ما روى عنهما نصير من ان من اراد ان يتكلم فجرى على لسانه الطلاق يقع ديانة و قضاء فلا يعول عليه

وفيه: وكل ما لا يدينه القاضى اذا سمعته منه المرأة أو شهد به عندها عدل لا يسعها ان تدينه لا نها كالقاضى لا تعرف منه الا الظاهر (۳/۳۵۳)

و فى " العقود الدرية فى تنقيح الفتاوى الحامديه "وزاد الزيلعى ان المرأة كالقاضى

فلا یحل لها ان تمکنه اذا سمعت منه ذالک أو علمت به لانها لا تعلم الا الظاهر (تنقیح الفتاوی الحامدیه ص۴۰)

الجواب صحیح: بندہ محمد اسماعیل عفی عنہ
الجواب صحیح: واصف علی ربانی عفی عنہ
مفتی جامعہ قاسم العلوم ملتان دارالافتاء دارالعلوم کراچی
دارالافتاء دارالعلوم کراچی ۱۴

واللہ اعلم بالصواب: اعبدالرحمٰن ڈیروی
۲۲ رجب المرجب ۱۴۱۲ھ
۱۷ رجب المرجب ۱۴۱۲ھ
۸ رجب المرجب ۱۴۱۲ھ

حالت جنون میں طلاق کا اعتبار نہیں ہے

سوال کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ زید نفسیاتی مریض ہے، باقاعدہ علاج بھی جاری ہے، بے جوڑ باتیں کرتا ہے، عام لوگوں کی طرح سوچ نہیں رکھتا اس کا کہنا ہے کہ نماز میں میری سوچ صحیح رہتی ہے، نماز سے باہر میری سوچ صحیح نہیں ہوتی، محلہ کے لوگ بھی جانتے ہیں کہ وہ نفسیاتی مریض ہے، عقل صحیح کام نہیں کرتی، بیوی کے ساتھ کسی بات پر تکرار کرتے ہوئے اس نے دو طلاقیں دیدیں اور یہ بات اب بھی اس کو یاد ہے اور مانتا بھی ہے لیکن اس کے ایک رشتہ دار کا کہنا ہے کہ میں نے اس بارے میں جب اس سے دریافت کیا کہ آپ نے اپنی بیوی کو طلاق دی ہے تو بتایا کہ میں نے اسے تین طلاقیں دی ہے لیکن زید خود اس اقرار کا انکار کرتا ہے اور کہتا ہے کہ مجھے اس طرح کی کوئی بات یاد نہیں ہے، اس صورت میں طلاق واقع ہوئی یا نہیں؟ اگر ہوئی تو کتنی؟

مستفتی: شہاب الدین ڈیروی

جواب یہ بات اگر درست ہے کہ زید نفسیاتی مریض ہے، اسکی عقل صحیح کام نہیں کرتی اور بے جوڑ باتیں کرتا ہے، نہ ٹھیک سوچ سکتا ہے، نہ ٹھیک کام کرسکتا ہے تو ایسے شخص کی طلاق کا کوئی اعتبار نہیں ہوتا بشرطیکہ طلاق دیتے وقت بھی اس طرح کی کیفیت طاری ہو چونکہ اس طرح کا مریض بعض اوقات صحیح آدمی کی کیفیت میں بھی آجاتا ہے تو عین ایسی حالت میں اگر طلاق دیدی تو اس کا اعتبار ہوگا۔

لہٰذا زید نے اگر دو طلاقیں پوری طرح صحیح کیفیت کی حالت میں دی ہیں، تو دو طلاقیں واقع ہوگئی ہیں، البتہ عدت گزرنے سے پہلے اگر رجوع کرنا چاہے تو صرف رجوع کرنے سے نکاح برقرار رہیگا لیکن آئندہ کسی موقع پر زید نے اگر ایک طلاق مزید دیدی تو طلاق مغلظہ واقع ہوگی

اور پھر بغیر حلالہ شرعیہ کے نکاح بھی نہیں ہو سکے گا، لہٰذا ازید احتیاط سے رہے۔

لیکن طلاق دیتے وقت اگر بیماری کی کیفیت تھی ہوش وحواس صحیح کام نہیں کر رہے تھے تو کوئی طلاق واقع نہیں ہوئی اور رشتہ دار کے سامنے تین طلاقوں کا اقرار اور پھر اس سے لاعلمی کا اظہار بیماری پر محمول ہے، اس کا کوئی اعتبار نہیں ہے۔

لمافی الهندية:(۱/۳۵۳،طبع رشيديه)

ولايقع طلاق الصبی وان كان يعقل والمجنون الخ،. وكذالك المعتوه لايقع طلاقه ايضا وهذا اذاكان فی حالة المعته واما فی حالة الافاقة فالصحيح انه واقع.هكذافی جوهرة النيرة.

ولمافی التنوير:(۲/۲۴۹-۲۵۰-۲۵۱،طبع امداديه)

ولايقع طلاق المولی علی امرءة عبده والمجنون والصبی والمعتوه والمبرسم.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ واللہ اعلم بالصواب: عبیداللہ عابد

۱۸ ذیقعدہ ۱۴۲۹ھ فتویٰ نمبر: ۱۷۷۴

﴿مجنون کی طلاق کا اعتبار نہیں﴾

﴿سوال﴾ السلام علیکم! جناب عالی عرض گزارش یہ ہے کہ میں معلمہ ہوں، میرے شوہر نے مجھے کہا میں تجھے طلاق دیتا ہوں طلاق، طلاق، طلاق کہا لیکن میرے شوہر کے بڑے بھائی کہتے ہیں، ان کا ذہنی توازن ٹھیک نہیں ہے تم انکی بات پر توجہ نہ دو جبکہ مجھے مہینہ کا حمل ہے، اس کے علاوہ وہ اکثر مجھے کہتے رہتے ہیں، طلاق دے دوں گا، طلاق، طلاق، طلاق کہتے رہتے ہیں اور اکثر رات کو بڑبڑاتے ہیں اور ایسا لگتا ہے کسی سے بات کر رہے ہیں اور گالی بکتے رہتے ہیں بہت زیادہ انکی ذہنی حالت خراب ہے اور اکثر رات کو ہی ایسی باتیں کرتے ہیں اور دن کو بالکل صحیح رہتے ہیں مگر میں چاہتی ہوں کہ ہمارے حق میں کوئی بہتری ہو، لہٰذا آپ سے درخواست ہے کہ قرآن وحدیث کی روشنی میں اس مسئلہ کا کوئی حل بتائیں۔ جزاک اللہ خیرا۔ فقط آپکی بیٹی

﴿جواب﴾ واضح رہے کہ مفتی غیب نہیں جانتا، سوال کے مطابق جواب دیتا ہے، سو سوال میں مذکور بیان کے صحیح یا غلط ہونے کی ذمہ داری سائل پر ہے، لہٰذا سوال میں بیان کردہ واقعہ اگر حقیقت پر مبنی ہے یعنی سچ ہے تو ایسی صورت میں کوئی طلاق واقع نہیں ہوئی، شہناز بدستور صلاح الدین کی بیوی ہے، اس لئے کہ صلاح الدین مذکورہ بالا بیان کے مطابق مجنون ہے اور شرعاً

مجنون کی طلاق کا اعتبار نہیں ہے۔

لمافی تنویر الابصار:(۳/۲۲۲-۲۲۳،طبع سعید)

(لایقع طلاق المولی علی امرأۃ عبدہ والمجنون والصبی والمعتوہ والمدھوش)

ولمافی فتح القدیر:(۳/۴۶۸،طبع رشیدیہ)

(قولہ ولایقع طلاق الصبی وان کان یعقل والمجنون والنائم)والمعتوہ کالمجنون والمدھوش کذلک وھذاالقولہ ﷺ کل طلاق جائزالاطلاق الصبی والمجنون)

ولمافی الفقہ الاسلامی وادلتہ:(۷/۳۶۲،طبع دارالفکر)

طلاق المجنون والمدھوش: ولایصح طلاق المجنون،ومثلہ المغمی علیہ لقولہ ﷺ: "لاطلاق فی اغلاق" والاغلاق:کل مایسدباب الادراک والقصدوالوعی لجنون لان الطلاق تصرف یحتاج الی ادراک کامل وعقل والروھذالایتوافرفی الصبی والمجنون.

الجواب صحیح:عبدالرحمٰن عفااللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب:ریاض الرحمٰن عفااللہ عنہ

۱۸/۱/۱۴۲۹ھ — فتوی نمبر:۱۱۰۸

﴿مدہوشی کی حالت میں طلاق کا حکم﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام کہ ایک آدمی نے خودکشی کی غرض سے کچھ گولیاں (زہریلی) کھالیں جسکی وجہ سے مذکورہ شخص بے ہوش ہوگیا،ہسپتال میں جاکر علاج وغیرہ کے بعد کچھ ہی ہوش آیا تھا (پوری طرح ہوش میں نہیں تھا) کہ اس نے اپنی بیوی کو طلاق دے دی، پوچھنا یہ ہے کہ آیا ایسی حالت میں طلاق دینے سے طلاق واقع ہوتی ہے یا نہیں؟

﴿جواب﴾ واضح رہے کہ مفتی غیب نہیں جانتا،حقائق تک پہنچنا اس کی ذمہ داری نہیں ہے، سوال کے مطابق جواب دینے کا پابند ہے،لہٰذا صورت مسئولہ میں اس شخص کو طلاق کے الفاظ کہتے وقت اگر ہوش تھا اور اپنی بات کے نفع ونقصان کو سمجھتا تھا تو ایسی صورت میں طلاق واقع ہوچکی ہے اور اگر مدہوشی میں تھا اپنی بات کے فائدہ ونقصان کو نہیں سمجھ رہا تھا تو ایسی صورت میں کوئی طلاق واقع نہیں ہوئی۔

لمافی الشامی:(۳/۲۴۴،مطلب فی طلاق المدھوش،طبع سعید)

والذی یظھرلی ان کلامن المدھوش والغضبان لایلزم فیہ ان یکون بحیث لایعلم ما یقول بل یکتفی فیہ بغلبۃ الھذیان واختلاط الجدبالھزل کماھوالمفتی بہ فی السکران علی مامرولاینافیہ تعریف الدھش بذھاب العقل فان الجنون فنون ولذافسرہ فی

البحر باختلال العقل وادخل فيه العته والبرسام والاغماء والدهش.

ولما في فتح القدير:(۴/۴۶۸،طبع رشيديه)

قوله(ولا يقع طلاق الصبي)وان كان يعقل(والمجنون والنائم)والمعتوه كالمجنون ، قيل هو القليل الفهم المختلط الكلام الفاسد التدبير لكن لا يضرب ولا يشتم بخلاف المجنون وقيل العاقل من يستقيم كلامه وافعاله الا النادر والمجنون ضده والمبرسم والمغمى عليه والمدهوش كذلك وهذا لقوله صلى الله عليه وسلم كل طلاق جائز الا طلاق الصبي والمجنون.

ولما في الهندية:(۱/۳۵۳،طبع رشيديه)

ولا يقع طلاق الصبي وان كان يعقل والمجنون والنائم والمبرسم والمغمى عليه والمدهوش هكذا في فتح القدير.وكذلك المعتوه لا يقع طلاقه ايضا وهذا اذا كان في حالة العته اما في حالة الافاقة فالصحيح انه واقع هكذا في الجوهرة النيرة.

الجواب صحیح:عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ ‏ ‏ ‏ واللہ اعلم بالصواب:نعیم اقبال عفا اللہ عنہ

۳رجب۱۴۳۱ھ ‏ ‏ ‏ فتویٰ نمبر:۲۷۲۹

﴿مدہوش کی طلاق کا حکم﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام کہ میرا بڑا بھائی منور خان غوری دو سال سے نفسیاتی مریض ہے، پہلے اچھے تھے گھریلو اور کاروباری حالات کیوجہ سے اس کا ذھن بالکل کام نہیں کرتا، محلے کے اکثر لوگ اور دوست جانتے ہیں، اس سے بات کرنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ نارمل آدمی نہیں ہے، میرے دوسرے بھائی محی الدین اور میرے ماموں معلوم نہیں کس وجہ سے چاہتے ہیں کہ منور کی بیوی جو کہ باہر خاندان سے ہے کسی طرح اس سے جدا ہو جائے اسلئے طلاق کی کوشش کی، طلاق سے چندروز پہلے منور کا جھگڑا ہوا جسمیں خوب پیٹا، زخمی بھی ہوا اور ہاتھ بھی ٹوٹ گیا جس کا اسکو احساس بھی نہیں رہتا چونکہ پہلے سے نفسیاتی مریض ہے، اب تو ڈر اور خوف دل میں بیٹھ گیا، روتا رہتا ہے، اس حالت میں وثیقہ نویس کے پاس لے جا کر اس سے طلاق کہلوائی گئی اور طلاق نامہ پر دستخط بھی لئے گئے ہیں اس موقع پر موجود گواہ اس بات کی گواہی دے رہے ہیں کہ اس وقت بھی یہ صحیح کیفیت میں نہیں تھا، مدہوشی میں تھا، دارالعلوم کراچی سے اسکا فتویٰ لیا لیکن شاید ان حضرات کو منور کی بیماری کا علم نہیں تھا یا کسی نے بتایا نہیں، بہرحال مہربانی فرما کر اس فتویٰ پر نظر ثانی فرمائیں۔ ‏ ‏ ‏ مستفتی: نادر خان غوری ڈیفنس فیز۲

﴿جواب﴾ واضح رہے مفتی غیب نہیں جانتا، مسئلہ معلوم کرنے والا جس طرح سوال کرتا

ہے اسی کے مطابق جواب دیتا ہے، واقعہ کی صحیح صورت ظاہر کرنا سوال کرنے والے کی ذمہ داری ہے، لہٰذا منور خان کی ذہنی کیفیت طلاق دیتے وقت بھی اگر یہی تھی جس طرح سوال میں بیان ہوئی ہے تو ایسی صورت میں کوئی طلاق واقع نہیں ہوئی، حلیمہ بیگم بنت ارشد ندیم قریشی بدستور منور خان کے نکاح میں ہے۔

دارالعلوم کے مفتیان کرام نے سوال کے مطابق صحیح جواب دیا ہے لیکن منور خان کی ذہنی کیفیت کے بارے میں انکو پتہ نہ چل سکا نہ کسی نے ان پر واضح کیا ورنہ دارالعلوم سے بھی طلاق واقع نہ ہونے کا فتویٰ ملتا۔

لمافی التاتارخانیة:(۱۸۶/۲،طبع قدیمی)

طلاق صبی غیرواقع وکذالک طلاق المجنون والمعتوہ وفی شرح الطحاوی وکذلک المغمیٰ علیه والمدھوش.

ولمافی ردالمحتار:(۲۴۴/۲،طبع سعید)

وکذایقال فی من اختل عقله لکبراولمرض اولمصیبة فاجأته:فمادام فی حال غلبة الخلل فی الاقوال والافعال لاتعتبراقواله وان کان یعلمھاویریدھا.لان ھذہ المعرفة والارادۃ غیرمعتبرۃ لعدم حصولھاعن ادراك صحیح کمالاتعتبرمن الصبی العاقل.

الجواب صحیح:عبدالرحمٰن عفااللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب:حبیب الرحمٰن سواتی

۱۹ذی الحجہ ۱۴۲۹ھ — فتویٰ نمبر:۱۷۸۰

﴿مراہق حلالہ کرسکتا ہے لیکن طلاق نہیں دے سکتا﴾

﴿سوال﴾ کیافرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلے کے بارے میں کہ کہ قریب البلوغ لڑکا جس کی عمر ۱۴ سال ہے لیکن جماع کرنے پر قادر ہے تو کیا اس لڑکے کے جماع (حلالہ) کرنے سے عورت پہلے شوہر کیلئے حلال ہوسکتی ہے یا نہیں؟

﴿جواب﴾ حلالہ کے لیے حلالہ کرنے والے کا بالغ ہونا شرط نہیں ہے جماع پر قادر ہونا ضروری ہے اور ایسا قریب البلوغ لڑکا جو جماع پر قادر ہو بالغ کے حکم میں داخل ہے، لہٰذا مراہق حلالہ کرسکتا ہے لیکن طلاق بالغ ہونے کے بعد ہی دے سکے گا اس سے پہلے اس کی طلاق معتبر نہیں ہے بالغ ہونے کے بعد وہ طلاق دے گا تو وہ عورت شوہر اول کے لیے حلال ہوگی ورنہ نہیں۔

لما فی الهندیه:(۱/۲۷۳،باب التعلیق ،طبع رشیدیه)

وفی "الانفع "الصبی المراهق فی التحلیل کالبالغ ـ فسر المراهق فی الجامع الصغیر فقال غلام لم یبلغ ومثله یجامع جامع امرأته وجب الغسل علیها واحلها للزوج الاول ومعنی هذاالکلام ان تتحرك آلته ویشتهی

ولما فی البدائع الصنائع :(۱۸۹/۳،طبع سعید)

سواء کان الزوج الثانی بالغا او صبیا یجامع فجامعها او مجنوناً لقوله تعالی حتی تنکح زوجا غیره من غیر فصل بین زوج وزوج ولان وطی الصبی والمجنون یتعلق به احکام النکاح من المهر والتحریم کوطء البالغ العاقل۔

ولما فی تنویر الابصار مع الشامی:(۴۱۰/۳،طبع سعید)

لاینکح مطلقة بها ای بالثلاث حتی یطاء ها غیره ولو الغیر مراهقاً یجامع مثله وفی الشامیة قوله ولو مراهقا) هو الدانی من البلوغ ولابد ان یطلقها بعد البلوغ لان طلاقه غیر واقع

الجواب صحیح :عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ　　واللہ اعلم بالصواب :محمد تنویر عفا اللہ عنہ

۷ جمادی الثانی ۱۴۳۳ھ　　فتوی نمبر:۲۷۵۶

﴿اہلیت طلاق کیلئے بلوغت شرط ہے﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ اہلیت طلاق کیلئے بلوغت شرط ہے؟ بینوا توجروا۔

مستفتی :محمد امین شاہ حسن خیل ڈیرہ اسمٰعیل خان

﴿جواب﴾ جی ہاں اہلیت طلاق کیلئے بلوغت شرط ہے، نابالغ کی طلاق معتبر نہیں ہے۔

لمافی حاشیة الهدایة عن شرحها العنایة:(ص ۳۷۳،طبع رحمانیه)

قوله: کتاب الطلاق وشرطه کون المطلق عاقلا بالغا.....الخ.

ولمافی الشامی:(۲۳۱/۴،طبع امدادیه) واهله زوج عاقل بالغ مستیقظ.....الخ.

الجواب صحیح :عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ　　واللہ اعلم بالصواب :محمد احمد عفا اللہ عنہ

۱۸ جمادی الثانی ۱۴۲۹ھ　　فتوی نمبر:۱۶۰۰

﴿نشے کی حالت میں دی ہوئی طلاق کا حکم﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک آدمی نے اپنی بیوی کو طلاق دے دی اور پھر کہنے لگا کہ میں نشے کی حالت میں تھا اب لوگوں میں سخت خلفشار ہے بعض کہتے ہیں طلاق ہوگئی ہے اور بعض کہتے ہیں طلاق نہیں ہوئی آپ حضرات شریعت کی روشنی میں

مسئلہ کی وضاحت فرمائیں؟ جزاکم اللہ فی الدارین
مستفتی: احمد سعید

﴿جواب﴾ شراب اور کوئی بھی نشہ آور چیز استعمال کرنا حرام اور گناہ ہے اور گناہ کر کے انسان معذور قرار نہیں پاتا اس لیے نشہ کی حالت میں دی ہوئی طلاق واقع ہو جاتی ہے البتہ کسی دوا کے کھانے سے یا بیماری کی وجہ سے ہوش وحواس قائم نہ رہیں تو یہ عذر غیر اختیاری ہے ایسی حالت میں طلاق وغیرہ واقع نہیں ہوتی۔

لما فی التنویر والدر ۲/۲۳۹ طبع سعید)

(أو سکران) ولو بنبیذ أو حشیش أو افیون أو بنج زجرا به یفتی تصحیح القدوری

(ولما فی الرد المحتار ۲/۲۳۹ طبع سعید)

وبین فی التحریر حکمه انه ان کان سکره بطریق محرم لا یبطل تکلیفه فتلزمه الاحکام وتصح عباراته من الطلاق والعتاق لان العقل قائم وانما عرض فهم الخطاب بمعصیة فبقی فی حق الاثم ووجوب القضاء. وبعد اسطر قال فی الفتح وبقوله یفتی لان السکر من کل شراب محرم وفی البحر عن البزازیة المختار فی زماننا لزوم الحد ووقوع الطلاق.

(ولما فی التاتار خانیه ۲/۱۸۷ قدیمی کتب خانه)

وطلاق السکران واقع اذا سکر من الخمر أو النبیذ وهو مذهب اصحابنا وکان الشیخ ابو الحسن الکرخیؒ یختار انه لا یقع شیء وهو قول الطحاویؒ وأحد قول الشافعیؒ وفی التجرید والفتوی علیه

(ولما فی فتح القدیر ۲/۷۲ طبع رشیدیه)

(وطلاق السکران واقع) واختیار الکرخیؒ والطحاویؒ انه لا یقع وهو احد قولی الشافعیؒ لان صحة القصد بالعقل وهو زائل العقل فصار کزواله بالبنج والدواء ولنا انه زال (بسبب معصیة فجعل باقیا حکما زجرا له) حتی لو شرب فصدع وزال عقله بالصداع نقول انه لا یقع طلاقه.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفی اللہ عنہ　　　　واللہ اعلم بالصواب:: ضیاء الحق انکی

۱۴ محرم الحرام ۱۴۳۳ھ　　　　فتویٰ نمبر: ۳۲۰۸

﴿مدہوشی کی حالت میں طلاق کا حکم﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء دین اس مسئلہ کے بارے میں کہ زید کا شدید ا کسیڈنٹ ہوا تھا جسکی وجہ سے تقریبا عرصہ چار سال سے مریض ہے، چار پائی پہ پڑا ہے جبکہ بسا اوقات اس کو غصہ آتا ہے اور وہ الفاظ بولتا ہے جسکے کہنے پر بعد میں وہ خود نادم ہوتا ہے اور کہنا مناسب نہیں سمجھتا کیونکہ موصوف شرع محمدی کا پیروکار ہے، موصوف نے بیوی سے نماز پڑھنے کے لئے جائے نماز

مانگا، بیوی کی تاخیر سے موصوف کو غصہ آیا، زبان پہ مختلف قسم کی باتیں آئیں، اب اس موصوف (زید کی بیوی) کہتی ہے کہ زید نے مجھے غصہ میں کہا کہ تم میری ماں، بہن اور پھوپھی ہو اور طلاق ہو جبکہ زید کے والدین کہتے ہیں کہ اس نے صرف یہ کہا کہ تجھ کو طلاق ہے جبکہ شوہر پہلے انکار کر رہا تھا کہ میں نے کچھ نہیں کہا ہے، اب کہتا ہے کہ میں نے طلاق کے الفاظ کہے ہونگے لیکن مجھے پتہ نہیں ہے کہ میں نے کیا الفاظ کہے ہیں؟ اب یہ عورت مطلقہ ہوگی یا نہیں؟ سائل: محمد دین وعبدالکریم ا

﴿جواب﴾ بیماری کی وجہ سے کسی کا ذہن اگر صحیح کام نہ کرتا ہو اور غصہ کی کیفیت اس قدر تیز ہو جاتی ہو کہ سوچ وسمجھ متاثر ہو کر اقوال وافعال میں عام لوگوں کی طرح احتیاط کا پہلو نہ رہتا ہو تو ایسی صورت میں طلاق واقع نہیں ہوتی۔

لہٰذا موصوف کی اس وقت واقعی ایسی کیفیت تھی تو کوئی طلاق واقع نہیں ہوئی اور ایسی کیفیت نہیں تھی بلکہ غصہ کے ساتھ ساتھ احتیاط کا پہلو بھی باقی تھا اپنی بات کے نقصان ونتیجہ کو بھی جانتا تھا تو ایسی صورت میں ''طلاق ہو'' کہنے کی وجہ سے صرف ایک طلاق رجعی واقع ہوگئی ہے، عدت کے اندر رجوع کرنے سے نکاح بحال رہے گا، البتہ آئندہ کے لئے صرف دو طلاقوں کا حق باقی رہے گا، علاوہ ازیں مذکورہ دیگر الفاظ ''تم میری ماں، بہن اور پھوپھی ہو'' سے نکاح پر کوئی اثر نہیں پڑتا، بیوی کو اسطرح بولنا اگرچہ منع ہے لیکن حروف تشبیہ وغیرہ نہ ہونے کی وجہ سے طلاق یا ظہار کے الفاظ نہیں قرار دیئے جاسکتے۔

لما في الشامي:(۲/۲۲۲،طبع سعيد)

والذي يظهر لي ان كلام المدهوش والغضبان لايلزمه فيه ان يكون بحيث لايعلم ما يقول بل يكتفى فيه بغلبة الهذيان واختلاط الجد بالهزل.

ولما في فتح القدير:(۳/۲۱۸،طبع رشيديه)

قوله ولايقع طلاق الصبي وان كان يعقل والمجنون والنائم والمعتوه كالمجنون قيل هو القليل الفهم المختلط الكلام الفاسد التدبير لكن لايضرب ولايشتم بخلاف المجنون وقيل العاقل من يستقيم كلامه وافعاله واقواله والمبرسم والمغمى عليه والمدهوش كذلك وهذا لقوله صلى الله عليه وسلم كل طلاق جائز الا طلاق الصبي والمجنون.

ولما في الفقه الاسلامي وادلته:(۷/۳۶۵،طبع دار الفكر)

طلاق الغضبان يفهم مما ذكران طلاق الغضبان لايقع اذا اشتد الغضب بان وصل الى درجة لايدري فيها ما يقول ويفعل ولايقصده او وصل به الغضب الى درجة يغلب فيها الي

الاضطراب فی اقواله وافعاله وهذه حالة نادرة.

ولما فی التنویر مع الدر:(۲۵۱/۳،طبع سعید)

وفی أنت الطلاق اوطلاق..... واحدة رجعية ان لم ينوشيئا اونوى... لومدخولا بها وفی الشامی:(۲۷۰/۳،طبع سعید)

الجواب صحیح:عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب:ریاض الرحمٰن کوھائی

۲ صفر المظفر ۱۴۲۹ھ — فتویٰ نمبر:۱۱۳۶

﴿معتوہ کی طلاق کا حکم﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں مفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ معتوہ یعنی وہ شخص جس کی سمجھ بوجہ عام لوگوں کی طرح نہیں ہے کی طلاق کا شرعاً کوئی اعتبار ہے؟ مستفتیہ:ضلع بونیر

﴿جواب﴾ معتوہ یعنی وہ شخص جس کی سمجھ بوجہ عام لوگوں کی طرح نہیں ہے کی طلاق کا شرعاً کوئی اعتبار نہیں ہے۔

لما فی فقه السنة:(۲۲۲/۲،طبع دار الکتب محله جنگی پشاور)

كما لايقع طلاق المجنون والمعتوه والمغمى عليه.

ولما فی حاشية القدوری:(ص۱۷۲،طبع قدیمی)

ولايقع طلاق الصبی الخ الاصل فيه حديث كل طلاق جائز الاطلاق المعتوه المغلوب على عقله اخرجه الترمذی.

ولما فی كنز الدقائق وحاشيته:(ص۱۱۵،طبع قدیمی)

لا(يقع)طلاق الصبی والمجنون والنائم والسيد على امرأة عبده.

وفی حاشيته:والمجنون لقوله عليه السلام كل طلاق جائز الاطلاق الصبی وحكم المعتوه والمغمیٰ عليه كالمجنون وكذالايقع طلاق النائم والمعتوه من كان قليل الفهم مختلط الكلام فاسد التدبير الاانه لايضرب ولايشتم.

ولما فی التنوير مع الدر:(۲۴۳/۳،طبع سعید)

(لايقع طلاق المولى على امرأة عبده والمجنون والصبی والمعتوه)من فعته وهو اختلال فی العقل.

الجواب صحیح:عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب:محمد وارث خان

۸ رجب ۱۴۲۹ھ — فتویٰ نمبر:۱۷۳۵

﴿نابالغ کی طلاق کا کوئی اعتبار نہیں ہے﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں مفتیان کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک نابالغ لڑکے کا

نکاح بالغ لڑکی سے ہوا، دونوں کا آپس میں شدید اختلاف ہے، لڑکا طلاق دینے پر آمادہ ہے اور اس کے والدین بھی راضی ہیں تو کیا نابالغ لڑکے کی طلاق واقع ہو جائے گی؟ واضح رہے کہ لڑکا نابالغ ہونے کے باوجود سمجھدار ہے۔ مستفتی: اکرام الحق ہزاروی

﴿جواب﴾ طلاق دینے کے لئے خاوند کا عاقل بالغ ہونا ضروری ہے، نابالغ کی طلاق کا کوئی اعتبار نہیں ہے، اس لئے مذکورہ صورت میں اس نابالغ کی طلاق واقع نہیں ہوگی اگرچہ وہ سمجھدار ہے۔

لما في الهداية: (۲/۳۷٦-۳۷۷، طبع رحمانيه)

ويقع طلاق كل زوج اذا كان عاقلا بالغا ولا يقع طلاق الصبي والمجنون والنائم.

ولما في فتح القدير: (۳/۳٦۸، طبع رشيديه) (قوله ولا يقع طلاق الصبي) وان كان يعقل.

ولما في الشامي: (۳/۲۳۰، طبع سعيد)

(قوله واهله زوج عاقل) احترز بالزوج عن سيد العبد ووالد الصغير — وبالبالغ عن الصبي ولو مراهقا.

ولما في الهندية: (۱/۳۵۳، طبع رشيديه) ولا يقع طلاق الصبي وان كان يعقل.

الجواب صحیح: عبد الرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: محمد سجاد کشمیری

یکم ربیع الثانی ۱۴۳۰ھ — فتویٰ نمبر: ۲۱۴۷

﴿بیوی کو طلاق کا اختیار دینے کا بیان﴾

﴿تفویض طلاق کے متفرق مسائل﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام درج ذیل سوالات کے بارے میں کہ: (۱) طلاق کا حق صرف مرد ہی کو ہوتا ہے؟ (۲) اگر مرد طلاق کا حق عورت کو دیدے تو عورت اس حق کے ذریعے سے طلاق لے سکتی ہے؟ (۳) اگر عورت اپنے حق کے ذریعے سے اپنے اوپر طلاق کا حق جاری کرلے تو اس سے وہ اپنے مرد سے ویسے ہی الگ ہو جائیگی جیسا کہ مرد کے طلاق دینے سے؟ (۴) گواہوں کے سامنے عورت طلاق کا حق نافذ کرے گی؟ (۵) طلاق کا حق استعمال کر کے عورت عدت گذارنے کے بعد دوسرا نکاح کر سکتی ہے؟ (٦) یہ حق استعمال کرنے کے بعد مرد اپنی بیوی پر کسی قسم کی روک ٹوک کر سکتا ہے یا نہیں؟ مستفتی: قاری محمد جنید صاحب

﴿جواب﴾ (۱-۲) طلاق کا حق اللہ تعالیٰ نے مرد ہی کو سپرد کیا ہے، عورت کو دراصل یہ حق

حاصل نہیں ہے، البتہ شوہر اپنی بیوی کو یہ حق تفویض کردے تو بیوی بھی خود کو طلاق دے سکتی ہے۔

(۳) شوہر نے بیوی کو طلاق کا یہ حق ایسا تفویض کردیا ہو جس طرح اسکو خود یہ حق حاصل ہے مثلاً رجعی طلاق دے یا بائن ایک دے یا ایک سے زائد جب چاہے دے یا خاص محدود وقت کے لئے یا خاص شرائط کے ساتھ یہ حق مشروط کردیا ہو، اسی نوعیت کا حق وہ استعمال کرسکتی ہے اور نتائج بھی وہی مرتب ہونگے جس نوعیت کی طلاق ہوگی۔

(۴) طلاق واقع ہونے کے لئے گواہوں کی موجودگی ضروری نہیں ہے، اکیلے میں بھی طلاق واقع ہوجاتی ہے لیکن اختلاف کی صورت میں قاضی کے ہاں ثابت کرنے کے لئے گواہوں کی ضرورت پیش آسکتی ہے۔

(۵) رخصتی ہوئی ہو تو عدت گذارنا ضروری ہے، طلاق شوہر دے یا اس کی طرف سے حاصل شدہ حق بیوی استعمال کرکے طلاق واقع کرے، ہر دو صورت میں عدت گذارنا ضروری ہے، عدت سے فارغ ہونے کے بعد مطلقہ چاہے تو دوسری جگہ شادی کرسکتی ہے۔

(۶) ایک بار حق طلاق کھلے طور پر تفویض کرنے کے بعد شوہر یہ حق واپس نہیں لے سکتا، نہ بیوی کو حق استعمال کرنے سے روک سکتا ہے۔

لمافی البحر الرائق:(۲/۳۱۰،طبع سعید)

لما فرغ من بيان مايوقعه الزوج بنفسه صريحاً وكناية شرع فيما يوقعه غيره باذنه وهو ثلاثة انواع تفويض وتوكيل ورسالة الخ (ولوقال لها اختاري ينوي الطلاق فاختارت في مجلسها بانت بواحدة) لان المخيرة لها خيار المجلس باجماع الصحابة اجماعاً سكوتياً عند تصريح بعضهم.

ولمافی البدائع:(۳/۱۱۳،طبع سعید)

أما بيان صفته فهو انه لازم من جانب الزوج حتىٰ لايملك الرجوع عنه ولا نهي المرأة عما جعل اليها ولا الفسخ ذلك لانه ملكها الطلاق ومن ملك غيره شيئاً فقد زالت ولايته من الملك فلا يملك ابطاله بالرجوع والنهي والفسخ كسائر التعليقات المطلقة بخلاف البيع الخ.....(وينكح مبانته في العدة وبعدها) اى المبانة بمادون الثلاث لان المحلية باقية لان زوالها معلق بالطلقة الثالثة فينعدم قبلها ومنع الغير في العدة لاشتباه النسب ولا اشتباه في الاطلاق له.(قوله لاالمبانة بالثلاث لو حرة وبالثنتين لو امة حتىٰ يطأها غيره ولو مراهقاً بنكاح صحيح وتمضىٰ عدته لا بملك يمين) أى لاينكح مبانته بالبينونة الغليظة أطلقه فشمل ما اذا كان قبل الدخول اوبعده الخ.

ولما فی البدائع:(۱۱۷/۳،طبع سعید)

ولان قوله امرک بیدک جعل امرها نفسها بیدها فتصیر عند اختیار ها نفسها وانما تصیر مالکة نفسها بالبائن لا بالرجعی وان قرن به ذکر الطلاق بان قال امرک بیدک فی تطلیقة فاختارت نفسها فهی واحدة یملک الرجعة لانه فوض الیها الصریح حیث نص علیه.

ولما فیه ایضاً:(۱۱۹/۳،طبع سعید)

(واما)الواقع بهذه الالفاظ فان التخییر واحدا ولم یذکر الثلاث فی التخییر فلا یقع الا طلاق واحد ولن نوی الثلاث فی التخییر یکون بائناً عندنا وان کان التفویض مطلقاً عن قرینة الطلاق،وان کان التفویض مقروناً بذکر الطلاق بان قال لها اختاری الطلاق فقالت اخترت الطلاق فهی واحدة رجعیة.

الجواب صحیح:عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب:محمد کاشف عزیز

۲صفر الخیر ۱۴۳۰ھ — فتویٰ نمبر:۱۸۸۵

﴿زوجہ کو طلاق دینے کا اختیار دینا﴾

﴿سوال﴾ اگر کوئی ولی لڑکی کے نکاح میں دولہا سے یہ الفاظ کہہ کر ایجاب وقبول کرالے کہ اگر شوہر سے زوجہ کا اتفاق نہ رہا تو زوجہ مختار ہوگی کہ اپنے نفس کو طلاق دیدے اور دولہا کہے کہ میں نے اس شرط کے ساتھ مسماۃ کو اپنے نکاح میں قبول کرلیا،اب پوچھنا یہ ہے کہ اس طرح کرنا درست ہے یا نہیں؟ مستفتی:محمد یوسف بگرام

﴿جواب﴾ لڑکی خود یا اس کا وکیل ایجاب وقبول کے موقع پر یہ شرط لگائے کہ لڑکی کو اختیار ہوگا جب چاہے وہ اپنے کو طلاق دے سکے گی اور شوہر اس کو قبول کرلے تو لڑکی کا اختیار باقی رہے گا،وہ جب چاہے اپنے کو طلاق دے سکے گی،عورتیں عموماً تنگ ظرف ہوتی ہیں،جذبات کی وجہ سے عجلت میں ایسا خطرناک فیصلہ کرنے کا اس سے اندیشہ ہے،اس لئے بہتر یہ ہے کہ اس کو بھی کسی درجہ میں پابند کریں مثلاً لڑکی کو اختیار ہوگا بشرطیکہ لڑکی کی برادری کے کم از کم دو عمر رسیدہ نمازی آدمی بھی لڑکی کے ساتھ اتفاق کریں۔

لما فی الدر مع الرد:(۲۱۵/۳،طبع سعید)

ولو خافت ان لا یطلقها تقول زوجتک نفسی علی ان امری بیدی زیلعی،وتمامه فی العمادیة.

وفی الشامیة:(قوله وتمامه فی العمادیة)حیث قال،ولو قال لها تزوجتک علی ان امرک بیدک فقبلت جاز النکاح ولغا الشرط،لان الامر انما یصح فی الملک اومضافا الیه ولم یوجد احدهما بخلاف ما مر فان الامر صار بیدها مقارنا لصیرورتها منکوحة.

ولما فی العالمگیریۃ:(۲۷۳/۱،طبع رشیدیہ)

رجل تزوج امرأۃ علی انہا طالق او علی ان امرھا فی الطلاق بیدھا ذکر محمد فی الجامع انہ یجوز النکاح والطلاق باطل ولا یکون الامر بیدھا وقال الفقیہ ابو اللیثؒ ھذا اذا بدأ الزوج فقال تزوجتک علی انک طالق وان ابتدأت المرأۃ فقالت زوجت نفسی منک علی انی طالق او علی ان یکون الامر بیدی اطلق نفسی کلما شئت فقال الزوج قبلت جاز النکاح ویقع الطلاق ویکون الامر بیدہ وھکذا فی الخانیۃ علی ھامش الھندیۃ:(۳۲۱/۱،طبع رشیدیہ) وفی البحر:(۲۱۸/۳،طبع سعید)

الجواب صحیح:عبد الرحمن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب:ظہور احمد شمس

۹ ربیع الثانی ۱۴۲۹ھ — فتویٰ نمبر:۱۳۰۳

﴿فسخ نکاح اور خلع کا بیان﴾

﴿جب تک شوہر طلاق نہ دے محض تفریق موجب طلاق نہیں﴾

﴿سوال﴾ جناب مفتی صاحب السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ! ایک خاتون کو اسکے شوہر نے آٹھ سال قبل گھر سے نکال دیا تھا، اسکے بعد دونوں میں کوئی تعلق باقی نہیں رہا لیکن باپ نے بچوں کی وجہ سے طلاق نہیں دی کہ بڑے ہونے پر واپس لے سکے، ایک ماہ کے بچے کو باپ نے اپنے پاس روک لیا تھا، جواب بھی اسکے پاس ہے، خاتون نے اسکے بعد شہر تبدیل کر دیا۔

پوچھنا یہ ہے کہ کیا اب بھی دونوں کے درمیان نکاح باقی ہے جبکہ آٹھ سال کا عرصہ گذر چکا ہے اور کیا خاتون بغیر طلاق اور عدت کے کسی دوسرے شخص سے نکاح کر سکتی ہے یا نہیں؟

﴿جواب﴾ مذکورہ صورت میں اس پورے عرصہ میں اگر واقعتاً شوہر نے صراحۃً یا دلالۃً ایسے الفاظ استعمال نہیں کئے جن سے طلاق واقع ہو جاتی ہے تو مذکورہ نکاح برقرار ہے اور عورت شرعاً اسی کی منکوحہ ہے، لہٰذا جب تک عورت اپنے شوہر سے طلاق حاصل نہیں کرتی اور عدت نہیں گزارتی، کسی دوسرے شخص سے نکاح نہیں کر سکتی۔

لما فی التنویر مع الدر:(۲۲۶/۳،طبع سعید)

وشرعا(رفع قید النکاح فی الحال)بالبائن(او المآل)بالرجعی(بلفظ مخصوص)ھو ما اشتمل علی الطلاق.

ولما فی التاتارخانیۃ:(۱۷۸/۳،طبع قدیمی)

فی الکنز ھو رفع القید الثابت شرعا بالنکاح وفی السغناقی امارکن الطلاق فھو ھذہ

الملفظة الصادرة من الزوج.

ولما في التنوير مع الدر:(۲/۵۰۲-۵۰۳،طبع سعيد)

(تربص يلزم المرأة)...(عند زوال النكاح)...(اوشبهته)...(وسبب وجوبها)عقد (النكاح المتأكد بالتسليم وما جرى مجراه)...وشرطها الفرقة وركنها حرمات ثابتة بها كحرمة تزوج وخروج (وصحة الطلاق فيها)اى في العدة.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: عبدالحکیم کشمیری

۶ جمادی الاولیٰ ۱۴۲۹ھ — فتویٰ نمبر: ۱۴۲۰

﴿سوءِ اختیار کی صورت میں قاضی فسخ نکاح کرسکتا ہے﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں مفتیان کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ہمارے گاؤں میں یہ عام رواج ہے کہ جب کوئی شخص کسی کو قتل کردے یا کسی لڑکی کیساتھ زنا کرے یا کسی کو اغواء کرے تو جرگہ والے جب ان کے درمیان صلح کراتے ہیں تو قاتل، زانی اور اغواء کرنے والے کی نابالغ لڑکی مقتول کے ورثاء یا مزنیہ کے ورثاء میں سے کسی کو نکاح میں دے دیتے ہیں اور اسی پر صلح کرتے ہیں حالانکہ قاتل، زانی یا اغواء کرنے والا مجبوری سے اپنی نابالغ لڑکی دیتا ہے تو کیا اس طرح لڑکی پر صلح کرنا جائز ہے یا نہیں؟ اور اس طرح کرنے سے نکاح منعقد ہوجاتا ہے یا نہیں؟ اور اگر منعقد ہوجاتا ہے تو لڑکی کو بلوغت کے بعد نکاح فسخ کرنے کا حق حاصل ہے یا نہیں؟

﴿جواب﴾ آپکے گاؤں کا رواج بلاشبہ خلاف شرع ہے، علماء کو چاہیے کہ اس طرح کے فیصلوں کی مذمت کریں اور بدلنے کی کوشش کریں، لڑکی کا نکاح اس کے والد یا دادا نے اگر کرلیا ہے تو نکاح منعقد ہوگیا ہے، بلوغت کے فوراً بعد لڑکی اس نکاح کی نامنظوری کا اظہار کرے پھر خود نکاح کو فسخ نہیں کرسکتی ہے، البتہ وہ شرعی قاضی یا مسلمان حاکم مجاز کی عدالت میں دعویٰ کرکے شرائط شرعیہ کے مطابق ثبوت پیش کرے تو وہ اپنا نکاح مسلمان حاکم سے فسخ کرا سکتی ہے۔

لما في الدر المختار:(۲/۶۶-۶۷،طبع سعيد)

(أو)....(بغير كفء ان كان الولي أبا أوجدا)...(لم يعرف منهما سوء الاختيار)مجانة وفسقا(وان عرف لا)يصح النكاح اتفاقا.

وفي الشامية:حتى لو عرف من الأب سوء الاختيار لسفهه أو لطمعه لايجوز عقده اجماعا.

ولما في فتاوى الخيرية على هامش تنقيح الحامدية:(۱/۳۰-۳۱،طبع حقانيه)

(سئل) في الأب اذا علم منه سوء الاختيار وعدم النظر في العواقب اذا زوج ابنته القابلة

للتخلق بالخير والشر بغير كفوء هل يصح النكاح ام لا(أجاب)قال ابن فرشته فى شرح المجمع لو عرف من الأب سوء الاختيار لسفهه اولطمعه لا يجوز عقده اتفاقاً ومثله فى الدرر والغرر وقال فى البحر ولو زوج طفله غير كفوء اوبغبن فاحش صح ولم يجز ذالك لغير الأب والجد اطلق فى الأب والجد وقيده الشارحون وغيرهم بان لا يكون الاب معروفاً بسوء الاختيار حتى لو كان معروفاً بذالك مجانة وفسقاً فالعقد باطل على الصحيح قال فى فتح القدير ومن زوج ابنته الصغيرة القابلة للتخلق بالخير والشر ممن يعلم انه شرير فاسق فهو ظاهر سوء اختياره ولان ترك النظر ههنا مقطوع به فلا يعارضه ظهور ارادة مصلحة تفوق ذالك نظر الى شفقة الأبوة ثم قال وقد وقع فى اكثر الفتاوى فى هذه المسئلة ان النكاح باطل فظاهره انه لم ينعقد وفى الظهيرية يفرق بينهما ولم يقل انه باطل وهو الحق ولذا قال فى الذخيرة فى قولهم فالنكاح باطل اى يبطل انتهى كلام البحر والمسئلة شهيرة.

الجواب صحیح عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: رضوان اللہ حقانی

۱۴ جمادالاولیٰ ۱۴۳۰ھ — فتویٰ نمبر: ۲۱۶۶

﴿قادیانی ہوجانے والے شخص کا نکاح فسخ ہوجاتا ہے﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میرا نکاح منور کرامت احمد کے ساتھ تاریخ یکم ستمبر ۲۰۰۰ء کو مسجد ابوبکر صدیق میں ہوا تھا، اور سنی طریقے پر منی تھا، منور کرامت ایک قادیانی خاندان سے تعلق رکھتے تھے، اور نکاح سے پہلے مسجد بنوریہ میں بیعت کرکے سنی ہوئے، ۱۰ سال کے بعد وہ اپنے دین میں واپس چلے گئے، اور ہم ایک باہمی فیصلے کے نتیجے میں الگ رہنے لگے۔ کیونکہ میں اور میرے بچے سنی تھے۔ تو کیا میرا یہ عمل صحیح ہے؟ اور کیا میرا نکاح منور کرامت احمد قادیانی کے ساتھ باقی رہا یا نہیں؟ برائے کرم شریعت کی روشنی میں رہنمائی فرمائیں نوازش ہوگی۔ مستفتیہ: حلیمہ احمد

﴿جواب﴾ عقیدۂ ختم نبوت دین اسلام میں بنیادی عقیدہ ہے، اس کا منکر دین اسلام سے خارج ہے، قادیانی لوگ ختم نبوت کے منکر ہیں، اسکے باوجود دین اسلام کا بھی دعوی کرتے ہیں، اس لئے یہ لوگ نہ صرف کافر بلکہ مرتد اور دنیا کے بدترین کافر شمار ہوتے ہیں۔

منور کرامت واقعی قادیانی عقیدہ اگر رکھتا ہے، جس کا وہ خود اقرار کرتا ہے یا آپکو اسکے بارے میں یہ یقین ہے، تو آپکا نکاح بغیر طلاق کے فسخ یعنی ختم ہوچکا ہے، اس کے بعد عدت بھی

اگر گذر گئی ہے، تو آپ دوسری جگہ چاہے تو شادی کر سکتی ہے۔ اسکے ساتھ کسی بھی درجہ میں تعلق قائم رکھنا بڑا گناہ ہے، لہذا اس سے خود دور رہیں، اور اپنی اولاد کو بھی اس سے دور رکھیں۔

ولما فی التنویر مع الدر:۳/۱۹۳،۱۹۲ طبع: سعید)

(وارتداد أحدهما)ای الزوجین (فسخ)فلا ینقص عددا(عاجل)بلا قضاء." وفی الشامی تحت(قوله بلا قضاء)ای بلا توقف علی قضاء القاضی وکذا بلا توقف علی مضی مدۃ فی المدخول بها کما فی البحر.

ولما فی التنویر مع الدر:۴/۲۵۲ طبع: سعید)

"أخبرت بارتداد زوجها فلها التزوج بآخر بعد العدۃ استحساناً".

ولما فی احکام القرآن للجصّاص :(۳/۲۲۳ سورۂ ھود آیت ۱۱۲، طبع: قدیمی)

قوله تعالیٰ:"ولا ترکنوا الی الذین ظلموا فتمسکم النار"والرکون الی الشیئ هو السکون الیه بالأنس والمحبۃ فاقتضیٰ ذلک النهی عن مجالسۃ الظالمین ومؤانستهم والانصات الیهم وهومثل قوله تعالیٰ:"فلا تقعد بعد الذکریٰ مع القوم الظالمین".

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفااللہ عنہ　　　واللہ اعلم بالصواب: محمد زبیر غفرلہ ولوالدیہ

۸ ربیع الثانی ۱۴۳۴ھ　　　فتویٰ نمبر: ۳۶۶۵

﴿غیر مسلم عورت مسلمان ہو جائے تو غیر مسلم شوہر کا نکاح باقی نہیں رہتا﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک شخص نے امریکہ سے ایک شادی شدہ عیسائی عورت کو مسلمان کرا کے لے آیا، اس عورت نے نہ کوئی عدت گزاری ہے اور نہ اس کے عیسائی شوہر پر اسلام پیش کیا گیا ہے اور اس مسلمان نے اس کے ساتھ نکاح بھی نہیں کیا ہے، اب اس عورت کے بارے میں کیا حکم ہے، وہ نکاح کر سکتی ہے؟ یا پہلے عدت گزارنا اور اس کے سابقہ شوہر کو اسلام کی دعوت دینا ضروری ہوگا؟

﴿جواب﴾ جب کوئی غیر مسلمہ شادی شدہ عورت اسلام قبول کر لے اور اس کا شوہر غیر مسلم ہو تو اس کا نکاح از خود ختم ہو جاتا ہے، اب وہ عورت اگر دارالحرب میں ہے تو صرف تین حیض گزار کر کسی مسلمان مرد سے نکاح کر سکتی ہے اور اگر دارالاسلام میں ہے تو تفریق قاضی کے بعد دوبارہ نکاح کے لئے تین حیض گزارنا لازمی ہے۔ لیکن اس میں اختلاف ہے کہ اس بینونت کے بعد عدت اس عورت پر لازم ہے یا نہیں؟ صاحبین وجوب عدت کے قائل ہیں جیسا کہ شامی میں مذکور ہے اور اسی کو امام طحاوی لازمی قرار دیتے ہیں، لہذا صاحبین کی رائے کے موافق تین

حیض گزارنے کے بعد نکاح کرسکتی ہے اور یہی احوط ہے، جب کہ امام صاحب تین ماہواری مزید گزارنے کو ضروری نہیں جانتے۔

لہٰذا امام صاحب کی رائے کے موافق تین ماہواری یا تین مہینے گزر جانے کے بعد مذکورہ عورت نکاح کرسکتی ہے، جب کہ صاحبین کے قول کے مطابق کل چھ ماہواری یا چھ مہینے گزر جانے کے بعد نکاح کرسکتی ہے، اس سے پہلے نہیں اور حاملہ ہو تو بالاتفاق عدت وضع حمل ہے۔

سابقہ شوہر چونکہ دار الحرب میں ہے، اس لئے اس پر عرض اسلام (اسلام کی دعوت دینا) ضروری نہیں ہے؛ اس لئے کہ ان پر ہماری کوئی ولایت نہیں ہے، دار الاسلام میں ہوتا تو اس کو اسلام کی دعوت دینا ضروری ہوتا۔

لما في الشامي: (باب: نكاح الكافر، ۳/۱۹۱ طبع: سعيد)

"(ولو اسلم احدهما) اى احد المجوسيين او امرأة الكتابى (ثمة) اى فى دار الحرب وملحق بها كالبحر الملح (لم تبن حتى تحيض ثلثا) او تمضى ثلاثة اشهر (قبل اسلام الآخر) اقامة شرط الفرقة مقام السبب وليس بعدة لدخول غير المدخول بها".

ولما في الشامي: (۳/۱۹۱ طبع: سعيد)

"قوله: (ليست بعدة) اى ليست هذه المدة عدة، لان غير المدخول بها داخلة تحت هذا الحكم ولو كانت عدة لاختص ذالك بالمدخول بها، وهل تجب العدة بعد مضى هذى المدة فان كانت المرأة حربية فلا، لانه لا عدة على الحربية.

وان كانت هى المسلمة فخرجت الينا فتمت الحيض هنا فكذالك عند ابى حنيفة خلافا لهما، لان المهاجرة لا عدة عليها عنده خلافا لهما كما سيأتى بدائع وهداية وجزم الطحاوى بوجوبها، قال فى البحر: وينبغى حمله على اختيار قولهما".

ولما في الهداية: (۲/۳٦٦ طبع: رحمانيه)

"واذا اسلمت المرأة فى دار الحرب وزوجها كافر او اسلم الحربى وتحته مجوسية لم يقع الفرقة عليها حتى تحيض ثلاث حيض ثم تبين من زوجها وهذا لان الاسلام ليس سببا للفرقة والعرض على الاسلام متعذر لقصور الولاية ولابد من الفرقة رفعا للفساد فاقمنا شرطها وهو مضى الحيض مقام السبب كما فى الحفر واذا وقعت الفرقة والمرأة حربية فلا عدة عليها وان كانت هى المسلمة فكذالك عند ابى حنيفة خلافا لهما وان كانت حاملا لم تتزوج حتى تضع حملها".

والله اعلم بالصواب: کمیل الدین قاسمی — الجواب صحیح: عبد الرحمٰن عفا اللہ عنہ

فتویٰ نمبر: ۳۵۳٦ — ۱۹ صفر الخیر ۱۴۳۴ھ

﴿خلع کیلئے میاں بیوی دونوں کی رضامندی شرط ہے﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام کہ خلع کی حقیقت کیا ہے؟ کوئی شوہر بیوی کے تمام حقوق بجالا رہا ہے خود دین پر چلنے کی کوشش کرتا ہے اور بیوی بچوں سے بھی چاہتا ہے کہ دین اسلام کے مطابق زندگی گذارنے کی کوشش کریں۔ لیکن بیوی کسی معقول وجہ کے بغیر ساتھ بسنا نہیں چاہتی حالانکہ بچے بھی ہیں، وہ بضد ہے کہ کسی طرح میں اس کو چھوڑ دوں، اب ہمارا مسئلہ پنچائیت کے پاس ہے بالفرض اگر پنچائیت والے میری مرضی کے بغیر خلع کا فیصلہ دیدیں تو شریعت کی رو سے ایسا خلع معتبر ہے؟ حالانکہ میں کسی طرح خلع دینے کیلئے تیار نہیں ہوں۔

﴿جواب﴾ حق مہر وغیرہ واپس لینے کی شرط کیساتھ شوہر حقوق زوجیت سے دست بردار ہونے کیلئے تیار ہو اور بیوی کو بھی منظور ہو تو یہ خلع کی صورت ہے۔ دونوں میں سے کسی ایک کو بھی اگر منظور نہیں ہے تو خلع نہیں کہلائیگا۔ دونوں کو منظور ہو تو بیوی کے ذمہ حق مہر وغیرہ واپس کرنا لازم ہو جاتا ہے اور اس کے بدلے شوہر کے نکاح سے اس کو خلاصی مل جاتی ہے۔ اس کے بعد بیوی عدت گذار کر دوسری جگہ چاہے تو نکاح کر سکتی ہے، خلع حکماً ایک طلاق بائن سے عبارت ہے۔ لہذا آپ کو اگر منظور نہیں ہے اس کے باوجود پنچائیت والے یا کوئی بھی یکطرفہ خلع کا فیصلہ دیدیں تو شرعاً ایسے خلع کا کوئی اعتبار نہیں ہے، نکاح برقرار رہیگا، عورت کا کسی دوسری جگہ نکاح نہیں ہو سکے گا۔

بیوی کے پاس کوئی معقول وجہ اگر نہیں ہے تو طلاق یا خلع کا مطالبہ کرنا سخت گناہ ہے اس کو چاہئے کہ اللہ تعالیٰ کی خوشنودی حاصل کرنے کیلئے اور اولاد پر شفقت کی خاطر صبر کرے اور اپنا گھر بسائے امید ہے خوشیاں دیکھیں گی۔

شوہر کو بھی چاہئے کہ بیوی کیساتھ ایسا رویہ رکھے جس سے نبھانے میں آسانی ہو اور ہر ایک دوسرے کیلئے راحت وسکون کا باعث بنے اور یہ گھر آباد رہے اور اگر تمام تر کوششیں کارگر ثابت نہ ہوں اور کافی عرصہ سے یہ مسئلے چل رہے ہیں اور ہر ایک دوسرے کیلئے دردسر بنا ہوا ہے اور زندگی مزید تلخ ہوتی جارہی ہے تو ایسی صورت میں بہتر یہی ہے کہ کسی بڑے نقصان کی نوبت پیش آنے سے پہلے یہ روز کی پریشانی دور ہو۔ برادری کے بڑوں کے فیصلہ کا احترام کریں اور خلع

منظور کرلیں، اسی میں امید ہے خیر ہوگی۔

لما فی البحر: ۷۰/۴ (طبع سعید)

الخلع لغة النزع يقال خلعت النعل وغيره نزعته وخالعت المرأة زوجها مخالعة اذا افتدت منه وطلقها على الفدية فخلعها هو خلعا والاسم الخلع بالضم وهو استعارة من خلع اللباس لان كل واحد منهما لباس للآخر فاذا فعلا ذالك فكان كل واحد نزع لباسه عنه كذا في المصباح وشرعا على مااخترناه ازالة ملك النكاح المتوقفة على قبولها بلفظ الخلع أو مافي معناه

لما فی المبسوط السرخسی: (۱۷۳/۶ طبع دار المعرفه بیروت)

قال شمس الائمه السرخسیؒ والخلع جائز عند السلطان وغيره لانه عقد يعتمد التراضی كسائر العقود وهو بمنزلة الطلاق بعوض وللزوج ولاية ايقاع الطلاق ولها ولاية التزام العوض فلامعنى لاشتراط حضرة السلطان في هذا العقد.

لما فی بدائع الصنائع: (۱۴۵/۳ طبع سعید کراچی)

واما ركنه فهو الايجاب والقبول لانه عقد على الطلاق بعوض فلاتقع الفرقة ولايستحق العوض بدون القبول.

لما فی الشامی: ۴۴۹/۳ (طبع ایچ، ایم سعید کراچی)

قال الزيلعیؒ: ولابد من قبولها لانه عقد معاوضة أو تعليق بشرط فلاتنعقد بدون القبول ولاينزل المعلق بدون الشرط اذ لاولاية لاحدهما في الزام صاحبه بدون رضاه۔

والله اعلم بالصواب: عزیز احمد خضداری غفرلہ ولوالدیہ

الجواب صحیح: مفتی عبد الرحمٰن عفا اللہ عنہ

فتویٰ نمبر: ۳۰۱۱

۱۷ ربیع الاول ۱۴۳۵ھ

﴿صرف حامی بھرنے سے خلع نہیں ہوتا جب تک باقاعدہ ایجاب وقبول نہ کرے﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میاں بیوی کے آپس میں ناچاقیاں تھیں، تنگ آکر انہوں نے اپنے رشتہ داروں کا جرگا بلوایا لیکن صلح کارگر نہیں ہوئی، بات چلتی رہی کہ فریقین نے خلع اختیار کرنے پر حامی بھردی، ابھی کاغذات تیار ہونے والے تھے کہ میاں بیوی پھر سے زندگی بھر ساتھ نبھانے کے لئے تیار ہوگئے، پوچھنا یہ ہے کہ شروع میں صرف حامی بھرنے سے خلع واقع ہوا ہے یا نہیں؟ جبکہ ابھی تک باقاعدہ ایجاب وقبول نہیں ہوا تھا، البتہ بیوی کی طرف سے ستر ہزار (70,000) روپے کی ادائیگی پر اتفاق ہوا تھا، نیز اگر باقاعدہ

ایجاب وقبول کرلیتے ہیں پھر بیوی کی طرف سے وہ رقم ادا نہ ہو تو کیا واپس نکاح قائم تصور ہوگا۔

﴿جواب﴾ صرف حامی بھرنے سے خلع نہیں ہوتا جب تک باقاعدہ میاں بیوی خود یا ان کی طرف سے وکیل باقاعدہ ایجاب وقبول نہ کرے اور ایجاب وقبول کرنے کی صورت میں طلاق بائن واقع ہوجاتی ہے پھر باہمی رضامندی کے بغیر نکاح نہیں ہوسکتا۔

لما فی تنویر الابصار:(۴۳۹/۳،طبع سعید)

وازالة الملک المتوقفة علی قبولها بلفظ الخلع أو فی معناه.

ولما فی الشامی:(۴۴۱/۳،طبع سعید)

وأما رکنه کما فی البدائع فاذا کان بعوض الایجاب والقبول، لأنه عقد علی الطلاق بعوض فلا تقع الفرقة فلا یستحق العوض بدون القبول.

ولما فی العنایة فی شرح الهدایة:(۱۶۸/۷ طبع حقانیه)

وأما معناه الشرعی: فهو عبارة عن أخذ مال من المرأة بازاء النکاح بلفظ الخلع وشرطه شرط الطلاق وحکمه حکم الطلاق البائن وصفته أنه من جانب المرأة معاوضة علی قول أبی حنیفةؒ ویمین من الجانبین عندهما.

ولما فی الشامی:(۴۴۰/۳،طبع سعید)

بخلاف ما اذا ذکر معه المال أو کان بلفظ المفاعلة أو الأمر فانه لابد من قبولها کما مر، لأنه معاوضة من جانبها کما یأتی.

ولما فی الهندیة:(۴۸۸/۱،طبع رشیدیه)

اذا تشاق الزوجان وخافا أن لا یقیما حدود الله فلا بأس بأن تفتدی نفسها منه بمال یخلعها به فاذا فعلا ذلک وقعت تطلیقة بائنة ولزمها المال کذا فی الهدایة.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ واللہ اعلم بالصواب: صادق محمد سواتی غفر لہ ولوالدیہ

۱۸ ربیع الاول ۱۴۳۲ھ فتوی نمبر: ۳۰۶۴

﴿زیادتی شوہر کی ہو تو خلع کی صورت میں حق مہر سے زیادہ لینا ظلم ہے﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علمائے کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ لڑکی کے والدین شادی سے پہلے لڑکے والوں سے ستر ہزار روپے لیتے ہیں، لڑکی کے جہیز کے لئے اور رخصتی کے وقت باقاعدہ نکاح ہوتا ہے، اور اس موقع پر مہر علیحدہ سے مقرر ہوتا ہے، مثلاً پانچ ہزار روپے۔

عرض مسئلہ یہ ہے کہ مطلقاً خلع (مال مقرر کئے بغیر) کرنے سے 70000 ہزار روپے خلع میں شمار ہونگے یا صرف 5000 ہزار روپے مہر کے شمار ہونگے؟ اور یہ بھی واضح فرمائیں کہ شوہر

اگر اس شرط پر خلع کرنے کو تیار ہو کہ مہر کے علاوہ بھی پیسے وغیرہ لوں گا تو کیا یہ جائز ہوگا؟ بعض شوہر ایسے بھی ہوتے ہیں کہ نہ بیوی بنا کر رکھتا ہے اور نہ طلاق دیتا ہے سونے یا نقد روپوں کی لالچ رکھتا ہے تو شرعاً اس کا کیا حکم ہے؟ مستفتی: نور الوحید وزیرستانی

﴿جواب﴾ خلع میں حق مہر کے علاوہ کسی اور چیز کا اگر ذکر نہ ہو یعنی صرف حق مہر کے عوض اگر خلع کر لیا ہے تو ایسی صورت میں حق مہر جو نکاح کے موقع پر باقاعدہ مقرر ہوا تھا صرف وہی شمار ہوگا 70000 روپے یا وہ سامان جو اس پیسے سے خریدا گیا ہے شوہر کو لینے کا حق حاصل نہیں ہے۔

اگر کوئی شوہر نہ بیوی بنا کر رکھتا اور نہ ہی طلاق دیتا ہے اور دنیاوی لالچ رکھتے ہوئے خلع کی شرط پر بیوی کو آزاد کرنے کے لئے تیار ہے۔ تو ایسی صورت میں خلع کے ذریعہ کچھ بھی لینا یا اپنے ذمہ سے ساقط کرانا حرام ہے قرآن کریم میں واضح طور پر اس سے منع فرمایا ہے۔

خلع صرف اس صورت میں بلا کراہت جائز ہے اگر نشوز عورت کی طرف سے ہو یعنی عورت شوہر سے بلا وجہ جدائی چاہتی ہو تو حق مہر کی حد تک لینا جائز ہے شوہر بیوی کو نہیں رکھنا چاہتا یا ایسے حالات پیدا کرنے پر تلا ہوا ہے کہ کسی طرح بیوی جدائی کا مطالبہ کرے تو ایسی صورت میں بیوی سے کچھ لینا ہرگز جائز نہیں ہے ظلم اور رشوت ہے۔ تاہم بیوی کو ایسے ظالم شوہر کی قید و بند سے آزادی حاصل کرنے کیلئے مال دینا جائز ہے گناہ صرف شوہر کو ہوگا۔

لما فی الدر مع الرد:(۱۵۸/۳ طبع سعید کراچی)

(فرع) لو زفت الیہ بلا جہاز یلیق بہ فلہ مطالبۃ الاب بالنقدتنیۃ، زاد فی البحر عن المبتغی الا اذا سکت طویلا فلا خصومۃ لہ، لکن فی النہر عن البزازیۃ الصحیح انہ لا یرجع علی الاب بشیء، لان المال فی النکاح غیر مقصود ....

وحاصلہ ان ذالک المعجل لا یلزم کونہ ہو المہر المعجل دائما کما یوہمہ کلام الکافی حتی یرد انہ مقابل لنفسہا لا بجہاز ہابل فیہ تفصیل وہو انہ ان جعل من جملۃ المہر المعقود علیہ فہو المہر المعجل وہو مقابل بنفس المرأۃ والا فہو مقابل بالجہاز عادۃ، حتی لو سکت بعد الزفاف ولم یطلب جہازا علم انہ دفعہ تبرعا بلا طلب عوض وہو فی غایۃ الحسن وبہ یحصل التوفیق، واللہ الموفق، لکن الظاہر جریان الخلاف فی صورۃ ما اذا کان معقودا علیہ لانہ وان ذکر علی انہ مہر لکن من المعلوم عادۃ ان کثرتہ لاجل کثرۃ الجہاز فہو فی المعنی بدل لہ ایضا، ولہذا کان مہر من لا جہاز لہا

الل من مهر ذات الجهاز وان كانت اجمل منها.

يجاب بانه لما صرح بكونه مهرا وهو ما يكون بدل البضع.......

ولما في رد المحتار مع الدر:(۲۵/۳، ۲۶سعید)

(وكره)تحريما(اخذشئ)ويلحق به الابراء عمالها عليه (ان نشزوان نشزت لا) ولو منه نشوز ايضا ولو باكثر مما اعطاها على الاوجه فتح وصحح الشمنى كراهة الزيادة ،وتعبير الملتقى لاباس به يفيد انها تنزيهية،وبه يحصل التوفيق

(قوله وكره تحريما اخذ شئ)اى قليلا كان اوكثيرا: والحق ان الاخذ اذا كان النشوز منه حرام قطعاً لقوله تعالى فلاتأخذوا منه شيأ۔

(قوله وبه يحصل التوفيق) اى بين مارجحه فى الفتح من نفى كراهة أخذالأكثر وهو رواية الجامع الصغير، وبين مارجحه الشمنى من اثباتها وهو رواية الأصل.فيحمل الاول على نفى التحريمة والثانى على اثبات التنزيهية ، وهذاالتوفيق مصرح به فى الفتح ، فانه ذكر ان المسالة مختلفة بين الصحابة وذكر النصوص من الجانبين ثم حقق ثم قال :وعلى هذايظهر كون رواية الجامع أوجه، نعم يكون اخذالزيادة خلاف الاولى والمنع محمول على الأولى ومشى عليه فى البحر ايضاً .

وما فى التنوير مع الرد ۳/۴۵۲، ۴۵۳طبع سعید

ويسقط الخلع والمبارأة كل حق لكل منهما على الأخر مما يتعلق بذلك النكاح .

ولما فى الشاميه:(۳/۴۶۰طبع سعید)

فى شرح جامع الصغير لقاضيخان :خلعها ولم يذكرا العوض عندهما لايبرأ احدهما عن صاحبه عن المال الواجب بالنكاح وعن ابى حنيفة روايتان والصحيح برأة كل منهما عن صاحبه .وفى متن المختار: والمبارأة كالخلع يسقطان كل حق لكل منهما على لأخر مما يتعلق بالنكاح حتى لوكان قبل الدخول وقد قبضت المهر لا يرجع عليها بشئ ولولم تقبض شيأ لاترجع عليه بشئ ومثله فى متن الملتقى وفى شرح درر البحار وشرح المجمع ان لم يسميا شيأ برئى كل منهما من الأخر قبضت المهر ام لا دخل بها ام لا .

لما فى الهنديه:(۱/۴۹۰طبع سعید)

رجل خالع امرأته على ان ترد على الزوج جميع ما قبضت منه وكانت المرأة باعت ماقبضت منه أووهبت من انسان ودفعت اليه حتى تعذر عليها رد ذالك على الزوج كان عليها قيمة المقبوض ان كان من ذوات الامثال كان عليها مثل ذالك كذا فى فتاوى قاضيخان.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ   واللہ اعلم بالصواب: نصرت اللہ بنوی غفرلہ ولوالدیہ

۱۹صفر المظفر ۱۴۳۳ھ   فتویٰ نمبر: ۲۵۳۶

﴿تعنت کی بنیاد پر عدالت تنسیخ نکاح کا یکطرفہ فیصلہ دے سکتی ہے﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میں..... بنت سلیم احمد کی

شادی ندیم احمد ولد خلیل احمد کے ساتھ ہوئی تھی شادی سے پہلے یہ شخص بڑے بڑے دعوے کرتا تھا لیکن کچھ عرصہ بعد پتہ چلا کہ یہ شخص ایک نمبر کا جھوٹا اور فریبی ہے، بات بات پر مجھے مارتا پیٹتا تھا، گھر کی ملازمہ جیسے سلوک کرتا تھا، مختلف قسم کے ظلم مجھ پر ڈھاتا تھا، نان نفقہ بالکل نہیں دیتا تھا اور نہ ہی طلاق یا خلع کیلئے تیار تھا، بالآخر تنگ آکر میں نے عدالت میں نان نفقہ نہ دینے کیوجہ سے تنسیخ نکاح کیلئے اپنے شوہر کیخلاف درخواست دائر کیا عدالت نے اسکے پاس کئی نوٹس بھیجے اور اسکو عدالت میں طلب کیا لیکن یہ شخص عدالت میں پیش نہ ہوا، پھر عدالت نے اخبار میں اشتہار کے ذریعے اسکو آخری بار اطلاع دی کہ اگر حاضر نہ ہوا تو ہم نکاح فسخ کردیں گے (اخباری اشتہار کی کاپی ساتھ منسلک ہے) لیکن یہ شخص اطلاع کے باوجود حاضر نہ ہوا جس پر عدالت میں جج نے بحیثیت مسلمان کلمہ پڑھ کر گواہی لی اور گواہوں کی موجودگی میں میرا نکاح اس شخص سے فسخ کردیا، اب یہ شخص عدالت کی کاروائی کے کاغذات مجھ سے مانگ رہا ہے اور کہتا ہے کہ تم میرے رشتے سے نکل چکی ہو، جلد از جلد نادرہ کے ادارے سے قانونی کاغذات دکھا کر نکالنا چاہتا ہوں، عدالت کے تمام دستاویز میرے پاس موجود ہیں (جنکی کاپی استفتاء کے ساتھ لف کی گئی ہے)

اب میں شریعت کی نظر میں رہنمائی چاہتی ہوں کہ عنداللہ میری علیحدگی ہوگئی ہے یا نہیں؟ برائے کرم وضاحت فرمائیں۔ مستفتیہ: بنت سلیم احمد

﴿جواب﴾ میاں بیوی کے باہمی تعلق کو رب تعالیٰ نے چین اور سکون کا ذریعہ قرار دیا ہے لیکن یہ اسوقت باعث چین اور سکون ہوگا جب طرفین سے ایک دوسرے کے حقوق کا خیال ہو، ورنہ زندگی اجیرن ہو جاتی ہے، گھروں کے گھر اجڑ جاتے ہیں۔ ایسی صورت میں چند اہل دانش کو جمع کرکے باہمی صلح ومصالحت کی کوشش کرنی چاہئے اگر یہ صورت بھی کارگر نہ ہو اور کسی طرح نباہ نہ ہوسکے تو شوہر کو چاہئے کہ سنت طریقے کے مطابق طلاق دیدے یا عورت کچھ مال وغیرہ دیکر خلع کرلے، لیکن اگر شوہر ان سب کیلئے تیار نہ ہو اور نہ ہی نان نفقہ دیتا ہو بلکہ بلاوجہ عورت کو اذیت میں رکھتا ہو تو عورت کو یہ حق حاصل ہے کہ مذہب مالکیہ پر عمل کرتے ہوئے اپنا نکاح فسخ کرنے کیلئے شوہر کیخلاف درخواست دائر کرے پھر عدالت شوہر کو بلائیگی اس کو اس بات پر

امادہ کریگی کہ یا تو بیوی کو معروف طریقہ کے مطابق نان نفقہ دیا کرے اور یا طلاق وخلع کیلئے تیار ہو جائے اگر وہ ان میں سے کسی ایک کیلئے بھی تیار نہ ہو تو عدالت نکاح فسخ کردے، عورت عدت گزارنے کے بعد دوسری جگہ نکاح کرسکتی ہے۔ صورت مسئولہ میں جب شوہر نان نفقہ نہیں دے رہا اور نہ طلاق وخلع کیلئے تیار تھا پھر عدالت کے کئی بار بلانے اور اخبار میں اشتہار شائع ہونے کے باوجود حاضر نہ ہوا تو یہ (حمتت ضدی اور ہٹ دھرم) ہے، لہذا عدالت نے یکطرفہ فیصلہ دیتے ہوئے جب نکاح فسخ کردیا تو نکاح فسخ ہوگیا اب عورت عدت گزارنے کے بعد جہاں چاہے نکاح کرسکتی ہے۔

لمافی فتاوی عثمانی ج۲/ ۲۶۲ (مکتبۃ معارف القرآن

ولمافی للحیلۃ الناجزۃ ص ۶۲،۴۳ اطبع دارالاشاعت کراچی۔

الجواب صحیح: مفتی عبدالرحمٰن عفااللہ عنہ — واللہ تعالی اعلم بالصواب: عاقل شاہ

۲۲ ربیع الثانی ۱۴۳۵ھ — فتوی نمبر: ۳۰۴۳

﴿شوہر اگر متعنت ہو تو قاضی کو نکاح فسخ کرنے کا اختیار ہے﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک عورت کی شادی کو چھ سال ہوئے ہیں، اس عرصہ میں اس کے خاوند نے اس کے حقوق کا خیال نہ رکھا، آئے دن جھگڑے ہوتے رہے، شوہر اسکو نہ ہی بساتے ہیں اور نہ ہی اپنے پاس چھوڑتے ہیں، وہ عورت اب اپنی ماں کے گھر میں ہے اور وہ ہر طرح سے یہ چاہتی ہے کہ ان کا گھر بنا رہے لیکن مذکورہ حالات اور شوہر کا رویہ انہیں اس طرح کرنے نہیں دیتا، اب وہ عورت خلع لینا چاہتی ہے، جس کے لئے اس نے عدالت میں مقدمہ دائر کیا ہے، چنانچہ عدالت میں پیشی کے لیے پہلی تاریخ میں خاوند غیر حاضر رہا، اب اگر مزید تین تاریخوں میں وہ نہ آیا تو کیا عدالت کے خلع دینے سے خلع واقع ہو جائیگا یا نہیں؟

سائلہ: متعلمہ مدرسہ یوسفیہ بنوریہ شرف آباد کراچی

﴿جواب﴾ اللہ تعالی نے شوہر اور بیوی کے باہمی تعلق کو ایک دوسرے کے لئے محبت اور سکون کا ذریعہ بنایا ہے اور یہ محبت اور سکون اس صورت میں حاصل ہوسکتا ہے جبکہ زوجین ایک دوسرے کے حقوق بجالاتے ہوں لیکن جب زوجین کے درمیان وہ تعلقات نہ رہیں جو ایک

مسلمان خاوند بیوی کے درمیان ہونے چاہئیں اور دونوں کے درمیان صلح کا بھی کوئی طریقہ کارآمد نہ رہے تو ایسی صورت میں اللہ تعالیٰ نے طلاق کو مستحب قرار دیا ہے یعنی خاوند کو چاہیے کہ اپنی بیوی کو سنت طریقے کیساتھ طلاق دیکر علیحدہ کردے لیکن اگر شوہر طلاق دینے پر راضی نہ ہو اور حقوق واجبہ سے بھی بدستور کوتاہی برتتا رہے تو ایسے حالات میں شریعت کی جانب سے عورت کو یہ حق حاصل ہے کہ شوہر کو اپنی طرف سے کچھ مال دیکر اس کے بدلے میں اس سے علیحدگی کا مطالبہ کرے جسکو فقہی اصطلاح میں خلع کہتے ہیں۔

اور اسکا اصل طریقہ یہ ہے کہ میاں بیوی باہمی رضامندی سے خلع کریں لیکن کوئی درندہ صفت آدمی اس کے لئے بھی تیار نہ ہو اور بیوی کو بلاوجہ قید میں رکھتا ہو تو ایسی صورت میں مظلوم بیوی عدالت سے رجوع کرنے اور مسلمان قاضی (جج) کے ہاں درخواست دائر کرے، قاضی پر شرعاً لازم ہے کہ وہ مدعیہ کی شکایات کی تحقیق کرے، اب شوہر نے اگر صفائی پیش کی یا شکایات دور کرنے کا وعدہ کیا تو قاضی عورت کو گھر بسانے کا حکم دیگا اور اگر شوہر قاضی کے بلانے پر پیش نہیں ہوتا تو ایسی صورت میں شرعاً یہ شوہر متعنت ہے، لہٰذا قاضی کو یکطرفہ طور پر نکاح فسخ کرنے کا اختیار حاصل ہے۔

لما في قوله تعالى: (سورة البقرة،آيت ۲۲۹)

فان خفتم الا يقيما حدود الله فلا جناح عليهما فيما افتدت به۔۔۔الأية.

ولما في الشامي: (۵/۸۷-۸۸،طبع امداديه)

(لا بأس به عند الحاجة) للشقاق بعدم الوفاق اي لوجود الشقاق وهو الاختلاف والتخاصم. وفي القهستاني عن شرح الطحاوي. السنة اذا وقع بين الزوجين اختلاف ان يجتمع اهلهما ليصلحوا بينهما فان لم يصطلحا جاز الطلاق والخلع. وهذا هو الحكم المذكور في الأية۔۔۔۔وامار كنه فهو كما في البدائع اذا كان بعوض الايجاب والقبول لأنه عقد على الطلاق بعوض فلا تقع الفرقة ولا يستحق العوض بدون القبول.

ولما في زاد المعاد لابن قيمؒ: (۲/۲۳۸،طبع المنار الاسلاميه بيروت)

وفي تسمية صلى الله عليه وسلم الخلع الفدية دليل على ان فيه معنى المعاوضة ولهذا اعتبر فيه رضاء الزوجين.

ولما ايضاً في المحلىٰ بالأثار لابن حزمؒ: (۹/۲۳۸،طبع دار الفكر بيروت)

ليس في الأية ولا في شيء من السنن للحكمين ان يفرقا ولا ان ذالك للحاكم.

ولما فی المبسوط السرخسیؒ:(۱۷۳/۶،طبع دار المعرفۃ بیروت لبنان)

والخلع جائز عند السلطان وغیرہ لانہ عقد یعتمد التراضی.

ولما فی المغنی لابن قدامۃؒ:(۹۷/۱۰،طبع القاہرۃ بیروت)

فان امتنع (المدعی علیہ) من الحضور او تواری لظاہر کلام احمد: جواز القضاء علیہ لما ذکرنا عنہ فی روایۃ حرب.

ولما فی الانصاف فی معرفۃ الراجح من الخلاف:(۲۰۲/۱۱،طبع دار احیاء التراث العربی)

فان امتنع من الحضور سمعت البینۃ وحکم بہا فی احدی الروایتین وھو المذھب.

الجواب صحیح: عبد الرحمٰن عفا اللہ عنہ واللہ اعلم بالصواب: ابو خزیمہ محمد کفایت اللہ

۱۹ ربیع الاول ۱۴۳۰ھ فتویٰ نمبر: ۲۰۵۷

﴿زوجہ معنت کا حکم﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میں.... بنت سلیم احمد کی شادی ندیم احمد ولد خلیل احمد کے ساتھ ہوئی تھی شادی سے پہلے یہ شخص بڑے بڑے دعوے کرتا تھا لیکن کچھ عرصہ بعد پتہ چلا کہ یہ شخص ایک نمبر کا جھوٹا اور فریبی ہے، بات بات پر مجھے مارتا پیٹتا تھا، گھر کی ملازمہ جیسے سلوک کرتا تھا، مختلف قسم کے ظلم مجھ پر ڈھاتا تھا، نان نفقہ بالکل نہیں دیتا تھا اور نہ ہی طلاق یا خلع کیلئے تیار تھا، بالآخر تنگ آ کر میں نے عدالت میں نان نفقہ نہ دینے کیوجہ سے تنسیخ نکاح کیلئے اپنے شوہر کیخلاف درخواست دائر کیا عدالت نے اسکے پاس کئی نوٹس بھیجے اور اسکو عدالت میں طلب کیا لیکن یہ شخص عدالت میں پیش نہ ہوا، پھر عدالت نے اخبار میں اشتہار کے ذریعے اسکو آخری بار اطلاع دی کہ اگر حاضر نہ ہوا تو ہم نکاح فسخ کر دیں گے (اخباری اشتہار کی کاپی ساتھ منسلک ہے) لیکن یہ شخص اطلاع کے باوجود حاضر نہ ہوا جس پر عدالت میں جج نے بحیثیت مسلمان کلمہ پڑھ کر گواہی لی اور گواہوں کی موجودگی میں میرا نکاح اس شخص سے فسخ کر دیا، اب یہ شخص عدالت کی کاروائی کے کاغذات مجھ سے مانگ رہا ہے اور کہتا ہے کہ تم میرے رشتے سے نکل چکی ہو، جلد از جلد نادرہ کے ادارے سے قانونی کاغذات دکھا کر نکالنا چاہتا ہوں، عدالت کے تمام دستاویز میرے پاس موجود ہیں (جنکی کاپی استفتاء کے ساتھ لف کی گئی ہے)۔

اب میں شریعت کی نظر میں رہنمائی چاہتی ہوں کہ عنداللہ میری علیحدگی ہوگئی ہے یا نہیں؟ برائے کرم وضاحت فرمائیں۔ مستفتیہ:........بنت سلیم احمد

﴿جواب﴾ میاں بیوی کے باہمی تعلق کو رب تعالیٰ نے چین اور سکون کا ذریعہ قرار دیا ہے لیکن یہ اسوقت باعث چین اور سکون ہوگا جب طرفین سے ایک دوسرے کے حقوق کا خیال ہو، ورنہ زندگی اجیرن ہوجاتی ہے، گھروں کے گھر اجڑ جاتے ہیں۔ ایسی صورت میں چند اہل دانش کو جمع کر کے باہمی صلح ومصالحت کی کوشش کرنی چاہئے اگر یہ صورت بھی کارگر نہ ہو اور کسی طرح نباہ نہ ہوسکے تو شوہر کو چاہئے کہ سنت طریقے کے مطابق طلاق دیدے یا عورت کچھ مال وغیرہ دیکر خلع کر لے، لیکن اگر شوہر ان سب کیلئے تیار نہ ہو اور نہ ہی نان نفقہ دیتا ہو بلکہ بلاوجہ عورت کو اذیت میں رکھتا ہو تو عورت کو یہ حق حاصل ہے کہ مذہب مالکیہ پر عمل کرتے ہوئے اپنا نکاح فسخ کرنے کیلئے شوہر کیخلاف درخواست دائر کرے پھر عدالت شوہر کو بلائیگی اس کو اس بات پر امادہ کریگی کہ یا تو بیوی کو معروف طریقہ کے مطابق نان نفقہ دیا کرے اور یا طلاق وخلع کیلئے تیار ہوجائے اگر وہ ان میں سے کسی ایک کیلئے بھی تیار نہ ہو تو عدالت نکاح فسخ کردے، عورت عدت گزارنے کے بعد دوسری جگہ نکاح کرسکتی ہے۔ صورت مسئولہ میں جب شوہر نان نفقہ نہیں دے رہا اور نہ طلاق وخلع کیلئے تیار تھا پھر عدالت کے کئی بار بلانے اور اخبار میں اشتہار شائع ہونے کے باوجود حاضر نہ ہوا تو یہ (متعنت ضدی اورہٹ دھرم) ہے، لہذا عدالت نے یکطرفہ فیصلہ دیتے ہوئے جب نکاح فسخ کردیا تو نکاح فسخ ہوگیا اب عورت عدت گزارنے کے بعد جہاں چاہے نکاح کرسکتی ہے۔

لما في فتاوی عثماني ج۲/ ۳۶۲ (مكتبة معارف القرآن

ولما في الحيلة الناجزة ص ۷۳،۱۲۴ طبع دار الاشاعت کراچی۔

الجواب صحیح مفتی عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: عاقل شاہ

۲۲ ربیع الثانی ۱۴۲۵ھ — فتویٰ نمبر: ۲۰۴۳

﴿متعنت کے خلاف خلع ڈگری شرعاً بھی معتبر ہے﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علمائے کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میری ہمشیرہ مسماۃ نر

نرگس کا نکاح مسمی دلفراز ہوا تھا میری ہمشیرہ دلفراز کی زیادتیوں اور مظالم سے تنگ آکر عدالت گئی، عدالت نے تحقیقات کرنے کے بعد بالآخر لڑکی کے حق میں فیصلہ کر دیا، ہم نے اس کے بعد اس فیصلہ کی کاپی لیکر دار العلوم کراچی سے رجوع کیا کہ شریعت میں اس فیصلہ کا اعتبار ہے یا نہیں، فتوی منسلک ہے۔

اب دلفراز پنچائیت اور جرگہ کے ذریعہ ہم سے مطالبہ کر رہا ہے کہ نرگس میری بیوی ہے تم لوگ میرے حوالے کرو، براہ کرم آپ دار العلوم کراچی کے فتوی اور عدالتی فیصلہ کو ملحوظ رکھتے ہوئے ہماری راہنمائی فرمائیں کہ ہم لوگ زبردستی اپنی بہن دیدیں؟ جرگہ والوں کے لئے شریعت کیا حکم دیتی ہے ایسی صورت میں دلفراز کی حمایت کرنا شرعاً مناسب ہے یا نہیں؟ مستفتی: حافظ بالقیاس

﴿جواب﴾ جیسا کہ جامعہ دار العلوم کراچی کے مفتیان کرام نے فتوی دے دیا ہے، کہ آپکی بہن "نرگس" دلفراز کے نکاح سے خارج ہوگئی ہے اور اب چونکہ عدت بھی گزر گئی ہے اس لئے دلفراز کے لئے رجوع کا کوئی حق نہ رہا، اب بیوی ہونے کا دعوی غلط ہے یہ لڑکی آزاد ہے دوسری جگہ نکاح کرنا چاہے تو کر سکتی ہے، دلفراز کو اعتراض کرنے کا کوئی حق حاصل نہیں ہے۔

البتہ لڑکی خوشی ورضامندی سے تجدید نکاح کے لئے اگر آمادہ ہے تو بغیر حلالہ شرعیہ کے دلفراز سے نئے حق مہر کے ساتھ نکاح ہو سکتا ہے، لیکن یہ اختیار صرف نرگس کو حاصل ہے آپ کو یا جرگہ والوں کو کوئی اختیار حاصل نہیں ہے اور زبردستی نکاح کرنا یا دھمکانا ہرگز جائز نہیں ہے اور لڑکی اگر چاہتی ہے کہ دلفراز سے دوبارہ نکاح کرے تو گھر والوں کے لئے منع کرنا جائز نہیں ہے۔

البتہ لڑکی کے حق میں جو بہتر نظر آئے تو گھر والے اور جرگہ والے اس کا مشورہ نرگس کو دے سکتے ہیں، تجدید نکاح کی صورت میں دلفراز کے پاس صرف دو طلاقوں کا حق باقی رہیگا کسی بھی موقع پر اگر دو طلاقیں دیدی تو بغیر حلالہ شرعیہ کے نکاح بھی نہ ہو سکے گا۔

لما فی "حیلہ ناجزہ" ۷۲، طبع دار الاشاعت کراچی)

ھمت اگر اپنی حرکت سے اس وقت باز آئے جبکہ حاکم اسکی زوجہ پر طلاق واقع کر چکے اور عدت بھی گزر چکے تو اب اس کا کوئی اختیار زوجہ پر نہیں رہتا (کیونکہ عدت گزرنے کے بعد رجوع کا حق نہیں رہتا گو طلاق رجعی ہی ہوا البتہ تراضی طرفین سے نکاح ہو سکتا ہے)

وایضا فی ابی داؤد:(۱/۲۰۲ طبع رحمانیة)

عن خنسأ بنت خدام الانصارية ان اباها زوجها وهی ثيب فكرهت ذالک فجاءت رسول الله صلى الله عليه وسلم فذكرت ذالک فرد نكاحها.

ولما فی الهندية:(۱/۲۸۷ طبع رشيدية)

لايجوز نكاح احد على بالغة صحيحة العقل من اب أو سلطان بغير اذنها بكرا كانت أو ثيبا فان فعل ذالک فالنكاح موقوف على اجازتها فان اجازته جاز وان ردته بطل.

ولما فی الهنديه:(۱/۲۸۹ طبع رشيدية)

ولو استأذن الثيب فلا بد من رضاها بالقول وكذا انبلغها الخبر هكذا فی الكافی۔

ولما فی البناية:(۶/۳۲۲ طبع حقانية)

(ولانه)ای ولأن ايقاع الواحدة(ابعد من الندامة)حيث ابقى لنفسه التدارک بان يراجعها فی العدة وبعدها بتجديد النكاح من غير تزوج اخر.

الجواب صحیح: مفتی عبدالرحمٰن عفااللہ عنہ واللہ اعلم بالصواب: نصرت اللہ بنوی غفرلہ ولوالدیہ

۴ جمادی الاولیٰ ۱۴۳۲ھ فتویٰ نمبر:۳۶۹۸

﴿گناہ کے ڈر کیوجہ سے مرد سے خلع لینا﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک آدمی اپنی بیوی سے پچھلے حصہ میں مباشرت کرتا ہے، وہ گناہ سے بہت ڈرتی ہے اور گناہ کے ڈر کی وجہ سے شوہر سے طلاق مانگتی ہے تو اس سے طلاق مانگنا جائز ہے یا نہیں؟ بینوا توجروا۔

﴿جواب﴾ پچھلے حصہ میں مباشرت حرام ہے، ایسے شخص کیطرف اللہ تعالیٰ نظر رحمت نہیں فرماتے، سمجھانے کے باوجود یہ شخص اس غیر فطری گندے عمل سے باز نہیں آتا تو اسکی بیوی کو خلع لینا جائز ہے۔

لما فی قوله تعالیٰ:(سورة البقرة، آیت ۲۲۳)فأتوحرثكم انى شئتم ..... الأية.

ولما فی جامع الترمذی:(۱/۱۳۹ طبع فاروقی ملتان)

قال رسول الله ﷺ لاينظر الله الى رجل اتى رجلا او امراة فی الدبر قال هذا حديث حسن غريب.

ولما فی مشكوة المصابيح:(۲/۳۲۱ طبع سعيد)لاطاعة لمخلوق فی معصية الخالق.

ولما فی التنوير مع الرد:(۳/۴۴۱ طبع سعيد)(ولا بأس به عند الحاجة)

وفی الشامية:(قوله للشقاق)ای لوجود الشقاق وهو الاختلاف والتخاصم وفی القهستانی عن شرح الطحاوی:السنة اذا وقع بين الزوجين اختلاف أن يجتمع أهلهما ليصلحوا بينهما فان لم يصطلحا جاز الطلاق والخلع ..... الخ.

ولما فی الهدایة:(۲/۴۱۳،طبع رحمانیه)

واذا تشاق الزوجان وخافا ان لا یقیما حدود الله فلا باس بان تفتدی نفسها منه بمال یخلعها به لقوله تعالی فلا جناح علیهما فیما افتدت به.

ولما فی فتاوی العصر:(ص۲۲۷)

وللزوجة طلب الفسخ الزوج ان فعل ذلک (اللواطة) وجهامعها......الخ.

الجواب صحیح:عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب:انیس طالب کان اللہ لہ

۲۱ربیع الاول ۱۴۳۱ھ — فتویٰ نمبر:۲۵۳۸

﴿خلع اور مصاہرت کا حکم﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام کہ میرا شوہر غلط کاریوں میں مبتلا ہے کئی عورتوں کیساتھ اس کے ناجائز تعلقات ہیں، مزید یہ کہ میری والدہ کو بلا حائل شہوت کیساتھ چھو بھی چکا ہے میری والدہ پورے وثوق کیساتھ یہ بات کہتی ہیں، مجھے اپنی والدہ کی اس بات پر پورا یقین ہے لیکن میرا شوہر اس بات کو نہیں مانتا ہے، میں اب تقریباً تین سال سے اسکے ساتھ نہیں رہتی اور عدالت سے خلع لے چکی ہوں، کیا ایسے شوہر سے میرا نکاح باقی ہے؟ مستفتیہ:ایک سائلہ کراچی

﴿جواب﴾ واضح رہے کہ داماد اپنی ساس کو اگر شہوت کیساتھ چھولے تو یہ نہ صرف خطرناک گناہ بلکہ اس گھناؤنی حرکت سے ساس کی بیٹی (بیوی) ہمیشہ کے لے حرام ہوجاتی ہے لیکن معاملے کا تعلق چونکہ حقوق سے ہے، اس لئے محض ساس یا بیوی کے دعوی سے حرمت مصاہرت ثابت نہیں ہوتی بلکہ اس کے لئے حجت تامہ کا ہونا ضروری ہے، مسئولہ صورت میں شوہر چونکہ (لمس) چھونے سے انکار کررہا ہے، اس لئے شوہر ہی کا قول قسم کیساتھ معتبر ہے۔

لما فی الدر مع الرد:(۳/۳۷ طبع سعید)

(قوله وان ادعت الشهوة)فی تقبیله أو تقبیلها ابنه (وانکرها الرجل فهو مصدق)لاهی.

وفی الشامیة:(قوله وان ادعت الشهوة فی تقبیله)ای ادعت الزوجة أنه قبل أحد اصولها أو فروعها قبلها بشهوة(قوله فهو مصدق)لأنه ینکر ثبوت الحرمة والقول للمنکر وهذا ذکره فی الذخیرة فی المس لا فی التقبیل کما فعل الشارح فانه مخالف لما مشی علیه المصنف اولا من أنه فی التقبیل یفتی بالحرمة مالم یظهر عدم الشهوة وقدمناه عن الذخیرة نقل الخلاف فی ذلک فما هنا مبنی علی ما فی بیوع العیون.

ولما فی المحیط:(۲/۲۹طبع ادارة القرآن)

اذا قبلها ثم قال:لم یکن عن شهوة ولمسها،أو نظر الی وجهها ثم قال لم یکن بشهوة فقد

ذکر الصدر الشہید أن فی القبلة یفتی بثبوت الحرمة مالم یتبین له أن قبل بغیره شہوة وفی المس والنظر الی الفرج لا یفتی بالحرمة الا اذا تبین أنه فعل بشہوة ثم ذکر بعد صفحتین وان اختلفا فالقول قول الزوج لانه ینکر ثبوت الحرمة القول قول المنکر.

لوگ خلع اور فسخ نکاح میں عام طور پر فرق نہیں کرتے، معلوم نہیں آپکو خلع کی ڈگری ملی ہے یا فسخ نکاح کی، حقیقت یہ ہے کہ خلع بھی دیگر عقود بیع اجارہ وغیرہ کیطرح ایک عقد ہے جسمیں جانبین کی رضامندی شرط ہے، اسلئے عدالتی خلع شوہر کی رضامندی کے بغیر درست نہیں، البتہ قاضی ان صورتوں میں نکاح فسخ کرسکتا ہے:

(۱) شوہر نامرد ہو یعنی وظیفہ زوجیت سے عاجز ہو (۲) نان نفقہ نہ دیتا ہو یعنی خرچ وغیرہ سے عاجز ہو (۳) پاگل ہو (۴) بالکل لاپتہ ہو گیا ہو (۵) بالکل لاپتہ تو نہ ہو لیکن غائب ہو گیا ہو۔

ان صورتوں میں سے کسی صورت کے پائے جانے کیوجہ سے قاضی نکاح فسخ کرسکتا ہے لیکن خلع کے ذریعے سے شوہر کی رضامندی کے بغیر قاضی کی تفریق معتبر نہیں۔

لمافی المبسوط:(۱۷۳/۶،طبع:دار المعرفة بیروت)

(قال) والخلع جائز عند السلطان وغیره لأنه عقد یعتمد التراضی کسائر العقود وهو بمنزلة الطلاق بعوض وللزوج ولایة ایقاع الطلاق ولها ولایة التزام العوض فلامعنی لاشتراط حضرة السلطان فی هذا العقد.

ولما فی بدائع الصنائع:(۱۴۵/۳،طبع سعید)

واما رکنه فهو الایجاب والقبول لأنه عقد علی الطلاق بعوض فلا تقع الفرقة ولا یستحق العوض بدون القبول (ثم قال بعد سطرین) وحضرة السلطان لیست بشرط لجواز الخلع عند عامة العلماء فیجوز عند غیر السلطان والصحیح قول العامة.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفااللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: طاہر زمان راولپنڈی

۱۱ ربیع الاول ۱۴۳۲ھ — فتویٰ نمبر: ۳۰۰۰

﴿طلاق علی المال کا حکم﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں اس مسئلہ کے بارے میں علماء کرام کہ مورخہ 26 مارچ 2006ء بروز اتوار بندہ کی رخصتی ہوئی اور ایک رات بھی ساتھ گزاری لیکن لڑکی کے والد نے رخصتی کے غالباً تین چار دن کے بعد طلاق کا مطالبہ کردیا، بندہ نے طلاق دینے سے انکار کیا، لڑکی کے والد نے جب بہت اصرار کیا تو بندہ اس شرط پر راضی ہوا کہ میں طلاق دیتا ہوں مگر مجھے مہر

معاف کیا جائے، کیا اس صورت میں مہر معاف ہو جائے گا یا نہیں؟ مستفتی: محمد عطاء اللہ

﴿جواب﴾ مذکورہ صورت میں اگر شوہر بیوی سے یہ کہے کہ میں تمہیں اس شرط پر طلاق دیتا ہوں کہ تم مہر چھوڑ دو اور عورت قبول کر لے تو ایسا کرنے سے مہر معاف ہو جائے گا اور طلاق بائن واقع ہو جائے گی اور عورت پر عدت گزارنا بھی لازم ہوگا، شریعت کی اصطلاح میں اس کو خلع کہتے ہیں جس کا ذکر قرآن مجید میں پارہ نمبر ۲ کے اندر آیا ہے:

لما فی قوله تعالیٰ (سورة البقرة، آیت ۲۲۹)

فان خفتم الا یقیما حدود الله فلا جناح علیهما فیما افتدت به۔۔۔۔الآية.

خلع یا طلاق بائن واقع ہونے کی صورت میں شوہر کو رجوع کا حق حاصل نہیں ہوتا اور نہ خلع واپس لینے کا اختیار، ہاں دونوں کی رضامندی سے بغیر حلالہ دوبارہ نکاح ہو سکے گا لیکن آئندہ کے لئے شوہر کے پاس صرف دو طلاقوں کا حق رہے گا۔

لما فی الهندية: (۱/۴۸۹، طبع رشيديه)

ان خالعها على مهرها فان كانت المرأة مدخولا بها وقد قبضت مهرها يرجع الزوج عليها بمهرها وان لم يكن مقبوضا سقط عن الزوج جميع المهر ولا يتبع احدهما صاحبه بشئي. وهكذا فی الغاية على الهندية: (۱/۵۲۹، طبع رشيديه)

ولما فی التنوير مع الدر: (۵/۹۱، طبع امداديه)

(و) حكمه أن (الواقع به) ولو بلا مال (وبالطلاق) الصريح (على مال طلاق بائن).

ولما فی التنوير مع الدر: (۵/۱۰۳-۱۰۴-۱۰۵، طبع امداديه)

(ويسقط الخلع)۔۔۔(والمبارأة)۔۔۔۔(كل حق)۔۔۔۔(لكل منهما على الآخر مما يتعلق بذلك النكاح) حتى لو أبانها ثم نكحها ثانيا بمهر آخر فاختلعت منه على مهرها برئ عن الثاني لا الأول.

وفی الشامية: وان كان بكل المهر فان كان مقبوضا رجع بجميعه والا سقط عنه كله مطلقا: أی قبل الدخول أو بعده.

ولما فی البحر الرائق: (۴/۶۹، طبع سعيد)

وقد قال فی الجوهرة وان وقع الخلع على المهر صح فان لم تقبضه المرأة سقط عنه وان قبضته استرده منها.

الجواب صحیح: عبد الرحمٰن عفا اللہ عنہ | واللہ اعلم: صلاح الدین ڈیروی

۱۴۲۷ھ | فتویٰ نمبر:

﴿باب الظہار و الایلاء﴾

﴿بیوی کو یہ الفاظ کہنا کہ ”تو دنیا وآخرت میں مجھ پر ماں ہے“ کا حکم﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں مفتیان عظام دریں مسئلہ کہ ایک آدمی نے اپنی بیوی کو حالت غصہ میں طلاق کی نیت سے یہ الفاظ کہے ”تو دنیا وآخرت میں مجھ پر ماں ہے“ اسکے بعد بیوی اس کے ساتھ رہی کہ ایک دوسرے موقع پر شوہر نے اسے تین طلاقیں دیں، مذکورہ صورت میں شوہر کیلئے کیا حکم ہے؟ سائل: محمد اسلم شیخ

﴿جواب﴾ شوہر نے پہلی مرتبہ یہی الفاظ بولے ہوں ”تو دنیا وآخرت میں مجھ پر ماں ہے“ یعنی تشبیہ کے حروف پر جملہ مشتمل نہ ہو تو یہ الفاظ لغو ہے، ان سے کوئی طلاق واقع نہیں ہوئی اور نہ ظہار ہوا، البتہ دوسرے موقع پر شوہر نے تین طلاقیں دیں تو اب تین طلاقیں واقع ہوگئی ہیں۔

اب رجوع نہیں ہوسکتا اور حلالہ شرعیہ کے بغیر دوبارہ نکاح بھی نہیں ہوسکتا، عدت گزرنے کے بعد مطلقہ خاتون چاہے تو دوسری جگہ نکاح کرسکتی ہے۔

لمافی التنویر:(۴۶۶/۳،طبع سعید)

وشرعاتشبيه المسلم زوجته اوجزء شائع منهابمحرم عليه تابيدا.

ولمافی التنویرمع الدر:(۴۷۰/۳،طبع سعید)

(وان نوى بـانـت عـلـيّ مثل أميّ)اوكأمي وكذالوحذف على خانية(براوظهاراأوطلاقا صـحـت نيته)ووقع،مانواه لانه كناية(والا)ينوشيأاوحذف الكاف(لغا)وتعين الادنى اى البربمعنى الكرامة ويكره قوله انت امي وياابنتي وياختي ونحوه قلت:ويدل عليه ما نذكره عن الفتح من انه لابدمن التصريح بالأداة قوله:(لغا)لأنه مجمل في حق التشبيه فما لم يتبين مرادمخصوص لايحكم بشئ......فعلم انه لابدفي كونه ظهارامن التصريح بأداة التشبيه شرعا.

ولمافی تنویرالابصارمع الرد المحتار:(۲۳۲/۳،طبع سعید)

والبدعي ثلاث متفرقة اوثنتان بمرة اومرتين في طهرواحدقوله ثلاث متفرقة وكذا بكلمة واحدة بالأولى.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم: عبیداللہ عابد غفرلہ ولوالدیہ

۶ رجب المرجب ۱۴۳۰ھ — فتویٰ نمبر: ۲۳۵۶

﴿ظہار کے الفاظ میں حرف تشبیہ ہونا ضروری ہے﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علمائے کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک شخص نے غصہ میں

اپنے دوست سے کہا کہ اگر آئندہ میں آپکی دوکان پہ آیا تو "مجھ پہ میری بیوی بہن ہو" کہنے والے کو کچھ نیت معلوم نہیں ہے تو اس کا کیا حکم ہے؟ یہ الفاظ ظہار کے ہیں یا طلاق کے ہیں؟

﴿جواب﴾ یہ الفاظ نہ ظہار کے ہیں اور نہ طلاق کے۔ اس لیے کہ ظہار کے الفاظ میں اولی لفظ تشبیہ کا ہونا ضروری ہے، اور اس جملہ میں تشبیہ کا کوئی لفظ نہیں ہے، اور جو الفاظ ظہار کے نہیں بنتے تو طلاق کے بطریق اولی نہیں بنتے، البتہ تشبیہ کے الفاظ جملہ میں ہوتے تو طلاق کی نیت سے طلاق بائن واقع ہو جاتی، لہذا یہ الفاظ لغو ہیں ان سے نہ ظہار واقع ہے اور نہ طلاق، البتہ آئندہ کے لیے ایسا بولنے سے گریز کریں فقہائے کرام نے مکروہ لکھا ہے۔

لما في تنوير الابصار:(۳/۴۶۶: طبع سعيد)

وشرعاً تشبيه المسلم زوجته اوجزء شائع منها بمحرم عليه تابيداً.

ولما في البحر الرائق:(۴/۹۸ باب الظهار)

قال العلامه ابن نجيمؒ: فعلم انه لا بد في كونه ظهاراً من التصريح باداة التشبيه شرعاً.

ولما في تنوير الابصار مع الدر:(۳/۴۷۰ طبع سعيد).

(وان نوى بانت على مثل امى) او كامى وكذا لو حذف على خانيه (براًو ظهاراً) او طلاقاً صحت نيته زوقع ما نواه لانه كناية(والا) ينو شيئا او حذف الكاف (لغا) وتعين الادنى اى البر يعنى الكرامة ويكره قوله انت امى ويا ابنتى ويا اختى ونحوه— قلت: ويدل عليه ما نذكره عن الفتح من انه لا بد من التصريح بالاداة(قوله لغا) لانه مجمل فى حق التشبيه مالم يتبين مراد مخصوص لا يحكم بشئى...... فعلم انه لابد فى كونه ظهارا من التصريح باداة التشبيه شرعاً.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفااللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: محمد تنویر عفااللہ عنہ

۱۶ ربیع الاول ۱۴۳۲ھ — فتوی نمبر: ۳۶۰۸

﴿بیوی کو "تو میری بہن ہے" کہنے سے طلاق واقع نہیں ہوتی﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ زید نے اپنی بیوی کو غصہ کی حالت میں بغیر نیت طلاق کے تین بار یہ کہا کہ "آج سے تو میری بہن ہے" اس جملہ سے طلاق واقع ہوگئی یا نہیں کیا حکم ہے؟ مستفتی: قاری ارشد علی کورنگی اقصیٰ مسجد

﴿جواب﴾ زید کا اپنی بیوی کو یہ کہنا کہ "آج سے تو میری بہن ہے" مکروہ ہے اس سے

احتراز لازم ہے، تاہم اس جملے سے کوئی طلاق واقع نہیں ہوتی، نکاح برقرار ہے۔

لما في الشامي:(۴۷۰/۳،طبع ایچ ایم سعید)

والذي في الفتح:وفي أنت أمي لايكون مظاهراًوينبغي أن يكون مكروهاًفقدصرحوا بان قوله لزوجته ياأخية مكروه ......ومثله أن يقول لهايابنتي أوياأختي ونحوه.

ولمافي البحر:(۱۸/۴،طبع ایچ ایم سعید)

وقيدبالتشبيه لانه لوخلاعنه بان قال أنت أمي لايكون مظاهرالكنه مكروه لقربه من التشبيه وقياساعلى قوله ياأخية المنهي عنه في حديث أبي داؤدالمصرح بالكراهة ولولاالتصريح بهالامكن القول بالظهارفعلم أنه لابدفي كونه ظهارامن التصريح بأداة التشبيه شرعاومثله قوله يابنتي وياأختي ونحوه.

ولمافي الهندية:(۵۰۷/۱،طبع رشيديه)

ولوقال لهاأنت أمي لايكون مظاهراوينبغي أن يكون مكروها.....ولوقال أنت علي مثل أمي أوكأمي ينوي فان نوى الطلاق وقع بائناوان نوى الكرامة أوالظهارفكمانوى هكذا في فتح القدير وان لم تكن له نية فعلى قول أبي حنيفة لايلزمه شيء حملاللفظ على معنى الكرامة كذافي الجامع الصغيروالصحيح قوله.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ واللہ اعلم بالصواب: عباد اللہ غفر لہ ولوالدیہ

۱۴ صفر الخیر ۱۴۳۲ھ فتویٰ نمبر: ۲۸۵۹

﴿بیوی کو بہن کہنا جھوٹ ہے ظہار نہیں﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک لڑکی کالج میں پڑھتی ہے اور ہوسٹل میں رہتی ہے۔ لڑکی شادی شدہ ہے۔ جب اس کا شوہر اس کو لینے کے لئے گیا تو چوکیدار نے پوچھا آپ لڑکی کے کیا لگتے ہو، لڑکا اس ڈر سے کہ کالج والوں کو معلوم نہ ہو جائے کہ لڑکی شادی شدہ ہے، لڑکے نے کہہ دیا کہ میں اس کا بھائی ہوں کیا اس صورت میں ظہار ہوگا یا نہیں؟

﴿جواب﴾ یہ الفاظ ظہار کے نہیں ہیں۔ ان سے کوئی ظہار نہیں ہوتا، البتہ جھوٹ ہے لیکن دونوں کا آپس میں دینی رشتہ بھی ہے۔ اس اعتبار سے تمام مسلمان بہن بھائی ہیں اگر اس طرح سوچ کر کہتے تو جھوٹ نہ ہوتا اور مقصد بھی پورا ہو جاتا بہر حال ان الفاظ سے نکاح پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔

ولما في العالمگيريه: (۵۰۷/۱،طبع رشيديه)

لو قال لها انت امي لا يكون مظاهراً و ينبغي ان يكون مكروهاً و مثله ان يقول يا ابنتي و يا اختي ......وان لم تكن له نية فعلى قول ابي حنيفة رحمه الله تعالى لا يلزمه شي

حملاً للفظ علی معنی الکرامة کذا فی الجامع الصغیر والصحیح قوله هکذا فی غایة البیان وان نوی التحریم اختلف الروایات فیه والصحیح انه یکون ظهاراً عندالکل قال لها انت مثل امی و لم ینو شیئا لا یلزمه شئی فی قولهم کذا فی فتاوی قاضیخان۔

ولما فی ردالمحتار: (۴۷۰/۳، طبع سعید)

و یکره قوله انت امی و یا ابنتی و یا اختی و نحوه ــــ والذی فی الفتح: و فی انت امی لا یکون مظاهراً و ینبغی ان یکون مکروهاً فقد صرحوا بان قوله لزوجته یا اخیة مکروه۔ و فیه حدیث رواه ابو داؤد ان رسول الله ﷺ "سمع رجلاً یقول لامرأته یا اخیة فکره ذلک و نهی عنه" و معنی النهی قربة من لفظ التشبیه و لولا هذا الحدیث لامکن ان یقال هو ظهار، لان التشبیه فی انت امی اقوی منه مع ذکر الاداة، و لفظ یا اخیة استعارة بلاشک، و هی مبنیة علی التشبیه، ولکن الحدیث افاد کونه لیس ظهاراً حیث لم یبین فیه حکماً من التصریح باداة التشبیه شرعا و مثله ان یقول لها یا ابنتی او یا اختی و نحوه۔

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: محمد حامد یاسین بھکر

۱۴ جمادی الثانی ۱۴۳۳ھ — فتویٰ نمبر: ۳۷۹۱

﴿آج کے بعد تو میرے لئے بہن ہے سے طلاق واقع نہیں ہوتی﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسألہ کے بارے میں کہ بندہ ایک دن اپنی بیوی کو کہہ دیا [ازیں بعد تو برائے من خوارم باشی] آج کے بعد آپ میرے واسطے بہن ہو۔ اور مجھے ایسا یاد ہے کہ یہ بات میں نے غصہ میں کہی تھی۔ لیکن اس سے طلاق کا ارادہ نہیں تھا۔ کیونکہ ہمارے یہاں طلاق دینے کا طریقہ اور رواج یہ ہے کہ دینے سے پہلے بہت مشورے اور جرگے ہوتے ہیں اور بڑوں کی طرف سے طلاق دینے یا نہ دینے میں دباؤ ہوتا ہے۔ اس واقعہ کو پیش آئے ہوئے سات یا آٹھ سال گزر چکے ہیں اب مجھے یہ فکر لاحق ہوئی ہے۔ کہ ایسا تو نہیں کہ میری بیوی مجھ پر حرام ہوگئی ہو۔ عرض یہ ہے کہ مذکورہ صورت میں بیوی مجھ پر حرام ہے یا نہیں؟

﴿جواب﴾ اپنی بیوی کو اسطرح مخاطب کر کے کہنا " ازیں بعد تو برائے من خوارم باشی" یعنی آج کے بعد تو میرے واسطے بہن ہے مکروہ ہے ایسا نہیں کہنا چاہئے لہذا یہ لغو ہے اور آئندہ کیلئے احتیاط کریں۔

ولما فی الدر المختار: (۴۷۰/۳، سعید کراچی)

(وان نوی بانت علی مثل امی) او کامی، و کذا لو حذف علی خانیه (برا او ظهارا او طلاقا صحت نیته) و وقع مانواه لانه

کنایۃ (والا) فہو شیئا او حذف الکاف (لغا) وتعین الادنیٰ البر یعنی الکرامۃ. ویکرہ قولہ انت امی ویا ابنتی ویا اختی ونحوہ

ولما فی الشامی. (ج۳، ۴۷۰/۳سعید)

والذی فی الفتح. وفی انت امی لایکون مظاہرا وینبغی ان یکون مکروھا. فقد صرحوا بان قولہ لزوجتہ یااخیہ مکروہ. وفیہ

حدیث رواہ ابوداود "ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سمع رجلا یقول لامرأتہ یااخیۃ فکرہ ذالک ونہی عنہ"

لمافی الھندیۃ (ج۱/۵۰۷) کوئیٹہ

لو قال لھا انت امی لایکون مظاہرا وینبغی ان یکون مکروھا ومثلہ ان یقول یاابنتی یا اختی ونحوہ ولو قال لھا أنت علی مثل امی او کامی ینوی فان نوی الطلاق وقع بائنا وان نوی الکرامۃ او الظھار فکما نوی ھکذافی فتح القدیر وان لم تکن لہ نیتہ فعلی قول ابی حنیفہ رحمہ اللہ تعالی لایلزمہ شئی حملاً للفظ علی معنی الکرامۃ کذا فی جامع الصغیر

ولما فی البحر (ج ۴/ ۹۸طبع:سعید)

وقید بالتشبیہ لانہ لوخلا عنہ بان قال انت امی لایکون مظاھرا لکنہ مکروہ لقربہ من التشبیہ وقیاسا علی قولہ یااخیہ المنہی عنہ فی الحدیث ابی داود الصرح بالکرامۃ ولو لا التصریح بھا لامکن القول بالظاھر فعلم انہ لابد فی کونہ ظھارا من التصریح باداۃ التشبہ شرعا ومثلہ قولہ یاابنتی یا اختی ونحوہ.

الجواب صحیح: مفتی عبدالرحمٰن عفااللہ عنہ واللہ اعلم بالصواب: صفی اللہ

۱۷ ذی القعدہ ۱۴۳۴ھ فتویٰ نمبر: ۳۸۸۹

﴿اللہ کی قسم میں تیرے قریب نہیں آؤنگا" "تو مجھ پر حرام ہے" بولنے کا حکم﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام درج ذیل مسئلہ کے بارے میں کہ ایک شخص نے اپنی بیوی سے کہا کہ "اللہ کی قسم میں تیرے قریب نہیں آؤنگا" "اور اللہ کی قسم تو مجھ پر حرام ہے" اسکا کیا حکم ہے؟ مذکورہ جملوں کی آدائیگی کے بعد اس مرد کا نکاح اس عورت سے برقرار ہے یا نہیں؟

﴿جواب﴾ صورت مسؤلہ میں پہلا جملہ یعنی "اللہ کی قسم میں تیرے قریب نہیں آؤنگا" ایلاء کا ہے، یہ جملہ ادا کرنے کے بعد اگر شوہر چار ماہ تک اپنی بیوی سے قربت نہ کرے تو اسکی بیوی کو خود بخود طلاق بائنہ ہو جاتی ہے اور اگر چار ماہ کے اندر قربت کرلے تو قسم توڑنے کی وجہ سے کفارہ ادا کرنا ہوتا ہے اور طلاق واقع نہیں ہوتی۔

اور دوسرا جملہ یعنی "تو مجھ پر حرام ہے" یہ بھی بظاہر پہلے جملے کی تاکید کے لئے ہے اور ایلاء

ہی کا حکم ہوگا، البتہ شوہر نے اس سے مستقل طلاق کی نیت کی ہو تو اس نیت کا اعتبار ہوگا۔

لمافی التنویر مع الدر:(۲/۲۲۵-۲۲۶،طبع سعید)

والفاظه صریح وکنایة(ف)من الصریح(لوقال واللّٰه)......(لااقربک)....(اربعة اشهر)....الخ

ولمافی التنویر مع الدر:(۲/۲۲۶،طبع سعید)

(ففی الحلف باللّٰه وجبت الکفارة،وفی غیره وجب الجزاء وسقط الایلاء لانتهاء الیمین (والا)یقربها(بانت بواحدة)بمضیها.

ولمافی الشامی:(۲/۲۲۲،طبع سعید)

وفیه انهما ایلاء ان یجب بالحنث فی احدهما الکفارة وفی الآخر الجزاء وان وقع عند البر طلاق واحد بدلیل ماقالوافی:واللّٰه لااقربک اذاکرره ثلاثاً ولم ینو التاکید انه ایمان ثلاثة یجب لکل کفارة ویقع بها طلقة واحدة—قال لامرأته انت علیّ حرام ایلاء ان نوی التحریم اولم ینو شیئاً وهدر ان نوی الکذب وتطلیقة بائنة ان نوی الطلاق ثلاث ان نوها ویفتی بانه طلاق بائنة وان لم ینوه لغلبة العرف.

ولمافی الشامی:(۲/۲۳۵،طبع سعید)

هذافی القضاء،وامافی الدیانة فلایقع مالم ینو،وعدم نیة الطلاق صادق بعدم نیة شیء اصلاً وبنیة الظهار اوالایلاء فانه لایصدق قضاء کماصرح به الزیلعی،قلت الظاهر انه اذالم ینو شیئاً اصلاً یقع دیانة ایضاً.

ولمافی التنویر مع الدر:(۲/۲۰۸-۲۱۰،طبع سعید)

(لا)یلحق البائن(البائن)—(الااذاکان)البائن(معلقابشرط)

وفی الشامیة:(قوله الااذاکان البائن معلقا)یشمل مااذاآلیٰ من زوجته ثم أبانها قبل مضی اربعة اشهر ثم مضت قبل ان یقربها وهی فی العدة فانه یقع خلافاًلزفر.

الجواب صحیح:عبدالرحمن عفااللہ عنہ　　　واللہ اعلم بالصواب:محمد کاشف عزیز

۱۹ربیع الاول ۱۴۳۰ھ　　　فتویٰ نمبر:۲۰۵۹

''اللہ کی قسم میں ایک سال تک تیرے قریب نہیں آؤنگا اگر آیا تو تجھے طلاق ہے''

سوال کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ زید نے اپنی بیوی سے کہا ''اللہ کی قسم میں ایک سال تک تیرے قریب نہیں آؤنگا، اگر آیا تو تمہیں طلاق ہے'' تو اب شریعت میں زید کیلئے کیا حکم ہے کیونکہ اگر وہ سال گزرنے سے پہلے اپنی بیوی کے پاس جاتا ہے تو طلاق واقع ہوتی ہے، کیا وہ ایک سال تک بیوی سے دور رہے تو سال گزرنے کے بعد بھی انکا نکاح برقرار رہے گا یا نہیں؟

مستفتی:عبداللہ ٹانکوی

جواب مذکورہ صورت ایلاء کی ہے۔ ایلاء کا مطلب شریعت میں یہ ہے کہ

شوہر چار مہینے یا اس سے زیادہ مدت تک اپنی بیوی کے پاس نہ جانے کی قسم کھالے، اور زید نے بھی چونکہ اسطرح کی قسم کھائی ہے لہٰذا اب اگر وہ اپنی بیوی کے پاس چار مہینے تک نہیں گیا تو اس کی بیوی پر ایک طلاق بائن واقع ہو جائیگی پھر زید اپنی بیوی کے ساتھ اگر ازدواجی تعلق قائم رکھنا چاہے گا تو باہمی رضامندی سے نئے حق مہر کے ساتھ تجدید نکاح کی ضرورت ہوگی.

لیکن اگر زید اپنی قسم پر قائم نہیں رہتا اور چار ماہ گزرنے سے پہلے پہلے اپنی بیوی سے جماع کر لیتا ہے تو قسم توڑنے کی وجہ سے اسکی بیوی پر ایک طلاق رجعی واقع ہوگی اور یہ بہ نسبت پہلی صورت کے بہتر ہے کیونکہ اس صورت میں تجدید نکاح کی ضرورت نہیں ہوگی بلکہ عدت کے اندر اندر رجوع کرنے کا اسے حق حاصل ہوگا اور ہر دونوں صورتوں میں آئندہ کیلئے شوہر کے پاس صرف دو طلاقوں کا حق باقی رہے گا.

لما في التنوير مع الدر والرد (۴۲۲/۳، ۴۲۴، طبع سعید)

(هو) لغة اليمين، وشرعا (الحلف على ترك قربانها) مدة ولو ذمياً...... (وحكمه وقوع طلقة بائنة إن بر) ولم يطأ (و) لزم (الكفارة أو الجزاء) المعلق (إن حنث) بالقربان.

(و) المدة (أقلها للحرة أربعة أشهر وللأمة شهران).

وفي الشامي: (قولها إن حنث بالقربان) أي الوطء حقيقة، فلا يحنث بالفئ باللسان عند العجز عن الوطء لأنه غير المحلوف عليه.

ولما في التنوير مع الدر والرد (۴۲۵/۳، ۴۲۶، طبع سعید)

(و) من الصريح (لو قال والله) وكل ما ينعقد به اليمين (لا أقربك)......(أو) والله (لا أقربك)......(أو إن قربتك فعلي حج أو نحوه) مما يشق...... (أو فأنت طالق أو عبده حر)

وفي الشامي: (قوله فأنت طالق أو عبده حر) كان ينبغي ذكره قبل قوله أو نحوه فإن قربها تطلق رجعية ويعتق العبد.

ولما في التنوير مع الدر (۳۹۷/۳، ۳۹۸ طبع سعید)

باب الرجعة: بالفتح وتكسر يتعدى ولا يتعدى. (هي استدامة الملك القائم) بلا عوض ما دامت (في العدة)

ولما في فتاوى قاضي خان (۳۴۲/۱ طبع قديمي)

المهر يتكرر بالعقد مرة وبالوطء أخرى ومرة يتكرر بهما.

الجواب صحیح: عبد الرحمن عفا اللہ عنہ   واللہ اعلم بالصواب: صدیق انور

۱۰ رجب المرجب ۱۴۳۳ھ   فتوی نمبر ۳۳۵۰

﴿بیوی کو غصہ میں یہ کہنا کہ ''تو مجھ پر میری ماں کی طرح ہے''﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں مفتیان کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک شخص نے اپنی بیوی سے کسی کام کے بارے میں کہا کہ فلاں کام کرو تو اس نے آگے سے انکار کر دیا، اس پر اس شخص کو غصہ آیا اور کہا کہ تو مجھ پر میری ماں کی طرح ہے، مذکورہ الفاظ بولتے وقت کوئی بھی نیت نہیں تھی تو کیا مذکورہ صورت میں بیوی حرام ہوگئی یا نہیں؟　مستفتی: عبدالرحیم صاحب

﴿جواب﴾ مذکورہ جملہ بولتے ہوئے اس شخص کی واقعی اگر کچھ بھی نیت نہیں تھی تو کوئی طلاق واقع نہیں ہوئی۔

لما في الشامي: (۲/۴۷۰ طبع سعید)

(وإن نوى بأنت عليّ مثل أمي) أو كأمي (برا أو ظهارا أو طلاقا صحت نيته) ووقع مانواه لأنه كناية (وإلا) ينوشيأ (لغا) وتعيين الأدنى اى البر يعني الكرامة وكذافي البحر: (۴/۱۸ سعید)

ولما في قاضي خان: (۱/۵۲۲ طبع قديمي)

ان يقول لها أنت مثل أمي ولم يقل عليّ ولم ينوشيأ لا يلزمه شئى في قولهم ولو قال أنت على كأمي أومثل أمي ونوى به البر والكرامة لا يلزمه شئى وان نوى الظهار كان ظهارا وان لم ينوشيأ لا يلزمه شئى في قول أبي حنيفةؒ. بهامش الهندية.

ولما في الهندية: (۱/۵۰۷ طبع رشيديه)

ولو قال لها أنت على مثل أمي أوكأمي ينوى فان نوى الطلاق وقع بائنا وان نوى الكرامة أو الظهار فكما نوى وان لم تكن له نية فعلى قول أبي حنيفةؒ لا يلزمه شئى حملا للفظ على معنى الكرامة.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ　واللہ اعلم بالصواب: رضوان اللہ حقانی

۱۶ ربیع الثانی ۱۴۳۰ھ　فتویٰ نمبر: ۲۶۶۲

﴿''اگر تو فلاں جگہ گئی تو تو مجھ پر میری بہن کی طرح ہے'' کے الفاظ کا حکم﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں مفتیان کرام اس مسئلہ کے متعلق کہ ایک شخص نے اپنی بیوی سے کہا کہ اگر تو فلاں جگہ گئی تو تو مجھ پر میری بہن کی طرح ہے اور پھر اس کی بیوی وہاں چلی بھی گئی، شوہر نے بتایا کہ میرا ارادہ ان الفاظ سے صرف حرمت کا تھا، طلاق کا ارادہ نہیں تھا، اب سوال یہ ہے کہ ان الفاظ سے طلاق ہوگی یا ظہار ہوگا؟　مستفتی از لورلائی بلوچستان

﴿جواب﴾ سوال میں ذکر کردہ الفاظ اگر شوہر نے حرمت کے نیت سے بولے تھے تو ان

الفاظ سے ظہار ہوگا جس کا حکم یہ ہے کہ بیوی اس وقت تک شوہر پر حرام ہو جاتی ہے جبتک وہ کفارہ ادا نہ کرے، کفارہ ظہار یہ ہے کہ دو ماہ مسلسل روزے رکھے یا پھر عدم استطاعت کی صورت میں ساٹھ مساکین اور فقراء کو دو وقت کا کھانا کھلائے۔

لمافی التنویر مع الدر:(۳/۴۷۰،طبع سعید)

(وان نوی بانت علی مثل امی)اوکامی وکذالوحذف علی خانیة(برا اوظهارا اوطلاقا صحت نیته)ووقع مانواه لانه کنایة......الخ.

وفی الشامیة:(قوله وان نوی الخ)بیان لکنایات الظهارواشارالیٰ انه صریحه لابدفیه من ذکرالعضو.بحر.....والکلام فی مجردانت کامی ای بدون لفظ حرام قلت:وقدیجاب بان الحرمة مرادة وان لم تذکرصریحا وکذالو نوی الحرمة المجردة ینبغی ان یکون ظهارا وینبغی ان لایصدق قضاء فی ارادة البر اذاکان فی حال المشاجرة وذکرالطلاق اه.وفی التاتارخانیة عن المحیط وان نوی التحریم لاغیر صحت نیته.....قلت وفی کافی الحاکم وان ارادالتحریم ولم یذکر الطلاق فهوظهار.

ولمافی الهندیة:(۱/۵۰۶،طبع رشیدیه)وحکم الظهارحرمة الوطء والدواعی الیٰ غایة الکفارة.

ولمافی فقه الاسلامی وادلته:(۷/۶۰۱طبع دارالفکربیروت)

تحریم الوطء بالاتفاق قبل التکفیر کذاعندالجمهور.

الجواب صحیح:عبدالرحمٰن عفااللہ عنہ　　　　واللہ اعلم:عبدالوہاب لقمانی عفااللہ عنہ

۱۴ رجب المرجب ۱۴۳۱ھ　　　　فتویٰ نمبر:۲۷۵

﴿کفارہ ظہار میں کان کٹا غلام آزاد کرنا﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ کفارۂ ظہار میں ایسا غلام آزاد کیا جاسکتا ہے جو کانا ہو یا اس کا کان کٹا ہوا؟　　　　مستفتی:اعجاز صاحب

﴿جواب﴾ جی ہاں کفارۂ ظہار میں کان کٹا ہوا غلام آزاد کیا جاسکتا ہے۔

لمافی الهندیة:(۱/۵۱۰،طبع رشیدیه)

اذااختلت المنفعة فهو غیرمانع حتی تجوزالعوراء ومقطوعة احدی الیدین واحدی الرجلین من خلاف بخلاف ما اذاکانتامقطوعتین من جانب واحدحیث لایجوز.....ویجزئ الخصی ومقطوع الاذنین ومقطوع المذاکیرعندنا.

ولمافی التنویرمع الرد:(۳/۴۷۳،طبع سعید)

تحریر رقبة ولوصغیرا أوکافرا أو أصم أوخصیا أومجبوبا أومقطوع الاذنین.

وفی الشامیة ای الأکان السمع بالإشارة لأن الدلالات فی هذه المسائل الإشارة، فهو مقصود فی الرقیق.

الجواب صحیح: عبد الرحمن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: اسرار الحق

۹ جمادی الثانی ۱۴۲۸ھ — فتویٰ نمبر: ۹۶۳

﴿رجوع کے مسائل﴾

﴿دوران عدت طلاق رجعی کا حکم﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک عورت نے کہا کہ میرے شوہر نے مجھے صاف الفاظ میں دو طلاق دی ہیں یعنی مجھے کہا: "تجھے طلاق ہے، تجھے طلاق ہے" اسکے بعد وہ عورت اپنے میکے چلی گئی اور وہاں جا کر بتایا کہ میرے شوہر نے مجھے طلاق دی ہے، گھر والوں نے شوہر سے طلاق کے بارے میں پوچھا تو شوہر نے کہا میں نے تو کوئی طلاق نہیں دی اسکے تین ماہ بعد شوہر دوبارہ بیوی کو گھر لے آیا جبکہ بیوی اس دوران حمل سے تھی۔ اب اس عورت کو شوہر کے پاس رہتے ہوئے دس سال ہو گئے ہیں، اور بچے بھی پیدا ہو گئے ہیں، لیکن وہ عورت پریشان ہے کہ کہیں مذکورہ صورت میں اسے طلاق تو واقع نہیں ہوئی تھی جسکی وجہ سے اسکا شوہر کے ساتھ رہنا صحیح نہ ہو؟

﴿جواب﴾ یاد رہے کہ مفتی غیب کا علم نہیں جانتا جو سوال ہوتا ہے اسکے مطابق جواب دیتا ہے لہذا صورت مسئولہ میں اگر شوہر نے واقعی صاف لفظوں میں دو ہی مرتبہ یہ الفاظ زبان سے ادا کیے ہوں (تجھے طلاق ہے، تجھے طلاق ہے) تو اس سے بیوی پر دو طلاق رجعی واقع ہوئی ہیں، طلاق رجعی کی صورت میں چونکہ نکاح بالکل ختم نہیں ہوتا، بلکہ اگر شوہر بیوی کو بسانا چاہے تو وہ عدت کے اندر بیوی سے رجوع کر سکتا ہے۔ لہذا صورت مسئولہ میں اگر شوہر نے حالت حمل میں بیوی کو گھر لا کر اس سے رجوع کیا ہے تو انکا نکاح پہلے کی طرح برقرار ہے اور انکا آپس میں میاں بیوی کی طرح رہنا صحیح ہے لیکن آئندہ کیلئے شوہر کے پاس صرف ایک طلاق کا حق باقی رہیگا، کسی بھی موقع پر شوہر نے اگر ایک طلاق دیدی تو حلالہ شرعیہ کے بغیر پھر نکاح نہیں ہو سکے گا لہذا احتیاط لازم ہے۔

لما فی الهدایة شرح القدوری (۲/۴۰۵) رحمانیه

اذا طلق الرجل امرأته تطلیقة رجعیة أو تطلیقتین فله أن یراجعها فی عدتها رضیت بذلک أو لم ترض لقوله تعالى "فامسکوهن بمعروف" من غیر فصل، ولا بد من قیام

العدة لأن الرجعة استدامة الملك ألا ترى أنه سمى امساكا وهو الابقاء وانما يتحقق الاستدامة فى العدة ،لأنه لا ملك بعد انقضائها ،والرجعة أن يقول :راجعتك أو راجعت امرأتى أو يطأها أويقبلها أو يلمسها بشهوة .أوينظر الى فرجها بشهوة.

ولما فى الدر المختار (۲۵۰/۳)سعید

باب الصريح (صريحه ما لم يستعمل الا فيه)ولو بالفارسية (كطلقتك وأنت طالق و مطلقة و يقع بها)أى بهذه الفاظ وما بمعناها من الصريح (واحدة رجعية وان نوى خلافها)

ولما فى الدرالمختار(۵۱۱/۳)سعید

(و)فى حق(الحامل)مطلقا ولو أمة أوكتابية او من زنا بان تزوج حبلى من زنا أو دخل بها ثم مات أو طلقها تعتد بالوضع جواهر الفتاوى (وضع)جميع حملها.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: سیف اللہ

۴شعبان ۱۴۳۳ھ — فتویٰ نمبر:

﴿باب العدة واحکامها﴾

﴿عدت سے متعلق احکام کا بیان﴾

﴿غیر مدخول بہا کی عدۃ الوفاۃ کا حکم﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ہمارے گاؤں میں ایک لڑکے کی شادی ہورہی تھی، شادی کے دوران لڑکے کے دشمن آکر مجمع پر فائرنگ کردی جسمیں وہ لڑکا بھی انتقال ہوا۔اب پوچھنا یہ ہے کہ ان کی منکوحہ بیوی جو غیر مدخول بہا ہے پر متوفی عنہا زوجہا کی عدت گزارنا لازم ہے؟ مستفتی: محمد ضابط کوہاٹی

﴿جواب﴾ میاں بیوی میں جدائی اگر موت سے واقع ہو، چاہے بیوی مدخول بہا ہو، یا غیر مدخول بہا۔تو عورت پر عدۃ الوفاۃ (یعنی چار مہینے دس دن) گزارنا لازم ہے۔

لما فی الشامي: (۵۱۰/۳،طبع: سعید)

(والعدة) (للموت لربعة اشهر) بالاهلة لو فى الغرة (عشر) من الايام بشرط بقاء النكاح صحيحاً الى الموت (مطلقاً) وطئت اولا ولو صغيرة او كتابية تحت مسلم.

ولما فى التاتار خانيه: (۲۲/۴،طبع: قديمي)

وعدة المتوفى عنها زوجها اذا كانت غير حامل وهى حرة أربعة اشهر وعشرا يستوى فى ذالك الدخول وعدم الدخول والصغر والكبر.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: ارشد سعید کوہاٹی

۴رجب المرجب ۱۴۳۳ھ — فتویٰ نمبر: ۳۳۲۸

﴿عدت کی ایک خاص صورت کے بارے میں﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ بندہ نے دیکھا کہ ایک آدمی کا انتقال ہو گیا اور اس کی بیوی سے کوئی اولاد نہیں ہوئی تھی جب میت کو گھر سے نکالا گیا تو اسکی بیوی بھی میت کی چارپائی کو پکڑ کر چند قدم باہر آگئی بندہ نے پوچھا کہ یہ کیا وجہ ہے تو بتایا گیا کہ جس عورت کی اولاد نہ ہوئی ہو اور اس کے خاوند کی وفات کے وقت عورت یہ عمل کرے تو عورت کو عدت نہیں گزارنی پڑتی، براہ کرم بندہ کو اس مسئلہ کا علم نہیں تھا کہ کیا اس طرح بھی کر سکتے ہیں، اب پوچھنا یہ ہیکہ یہ طریقہ شریعت کی روشنی میں اس طرح ہے یا نہیں؟

﴿جواب﴾ یہ بات کہ جس شادی شدہ عورت کے ہاں کوئی اولاد نہ ہو تو اس کے شوہر کی وفات پر وہ جنازہ کیساتھ چند قدم باہر نکل آئے تو اس کے ذمہ سے عدت ساقط ہو جاتی ہے بالکل بے بنیاد اور جہالت پر مبنی ہے۔

عورت کی اولاد ہو یا نہ ہو اگر وہ حاملہ ہے تو وضع حمل سے اسکی عدت پوری ہوگی اور اگر غیر حاملہ ہے تو چار ماہ دس دن مکمل گزارنے سے اس کی عدت پوری ہوگی، لھذا علاقہ کے علماء اور دیگر ذمہ دار حضرات کے علم میں بھی یہ بات آنی چاہیے تاکہ وہ اس کا تدارک کر سکیں۔

لما فی الشامی:(۵۱۰/۲،طبع:سعید)

(قوله والعدة للموت)ای موت زوج الحرة ،وأما لامة فياتی حكمهابعده ،قوله كما مر ای قريبا قوله من الايام ای والليالی ايضاكما فی المجتبی.

ولما فی الهنديه:(۵۲۹/۱،طبع: رشيديه)

عدة الحرة فی الوفاة اربعة اشهر وعشرة ايام سواء كان مدخولا بها او لا مسلمة أو كتابية تحت مسلم صغيرة أوكبيرة أو آيسة وزوجها حر او عبدحاضت فی هذه المدة او لم تحض ولم يظهر حبلها كذا فی فتح القدير.

ولما فی الهدايه:(۲۲۸/۲،طبع: رحمانيه)

وعدة الحرة فی الوفات اربعة اشهر وعشرا لقوله تعالی ويذرون ازواجا يتربصن بانفسهن اربعة اشهر وعشرا.

واللہ اعلم بالصواب: شاہ جہان غفرلہ ولوالدیہ

الجواب صحیح: عبدالرحمن عفا اللہ عنہ

فتوی نمبر:۳۳۱۶

رجب المرجب ۱۴۳۳ھ

﴿منگیتر کی وفات سے عدت لازم نہیں ہوتی﴾

﴿سوال﴾ میری بہن کی منگنی ایک شخص کیساتھ ہوئی لیکن ابھی نکاح و رخصتی نہیں ہوئی تھی کہ اس کا ایکسیڈنٹ ہو گیا اور موقع پر مر گیا، معلوم یہ کرنا ہے کہ میری بہن متوفی عنہا زوجہا کی عدت گزارے گی یا اس سے پہلے پہلے اسکی شادی فوت شدہ آدمی کے بھائی کیساتھ کرا سکتے ہیں؟

﴿جواب﴾ واضح رہے کہ عورت پر عدت گزارنا تب لازم ہوتا ہے جب نکاح کے بعد خاوند طلاق دے یا وہ فوت ہو جائے، مذکورہ صورت میں چونکہ صرف منگنی ہوئی تھی باقاعدہ نکاح نہیں ہوا تھا، اس لئے آپ کی بہن پر عدت نہیں ہے، لہٰذا عدت گزارے بغیر دوسری جگہ شادی کر سکتی ہے۔

لما فی التنویر مع الدر:(۵۰۲/۳،طبع سعید)

(وسبب وجوبها)عقد(النكاح المتاكدبالتسليم وماجرى مجراه)من موت اوخلوة اى صحيحة فلاعدة بخلوة الرتقاء وشرطها الفرقة.

ولما فی البحر الرائق:(۵۰۲/۴،طبع سعید)

(قوله هي تربص يلزم المرأة عندزوال النكاح اوشبهه اى لزوم انتظارانقضاء مدة. وقد قالواان ركنهاحرمات اى لزومات كحرمة تزوجهاعلى الغير.

ولما فی الهندية:(۵۲۶/۱،طبع رشيديه)

هي انتظار مدة معلومة يلزم المرأة بعدزوال النكاح حقيقة اوشبهة المتاكدبالدخول او الموت كذافی شرح النقاية للبرجندي.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: سلمان احمد

۲ ربیع الاول ۱۴۳۰ھ — فتویٰ نمبر: ۱۹۵۵

﴿حلالہ صحیح ہونے کے لئے زوج ثانی کا بیوی سے ہمبستری کرنا ضروری ہے﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں مفتیان کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک آدمی نے اپنی بیوی کو تین طلاقیں دیں پھر ایک مولانا صاحب سے پوچھا تو انھوں فرمایا کہ اب بغیر حلالہ شرعیہ کے نکاح نہیں ہو سکتا پھر حلالہ شرعیہ کی صحیح صورت بتا دی یہ شخص نہ مانا اور ایک دوسرے مولوی صاحب کے پاس چلا گیا تو انہوں نے کہا کہ نکاح ہو سکتا ہے اور پھر ایک آدمی سے اس شخص کی بیوی کا نکاح کروا دیا یہ آدمی اس عورت کے پاس گیا اور بغیر ہمبستری کیے کچھ دیر باتیں کر کے واپس آ کر طلاق دے دی مولوی صاحب نے پہلے شوہر سے اسکا نکاح کر دیا، پوچھنا یہ ہے کہ یہ

نکاح منعقد ہو گیا؟ اگر نہیں تو ایسے مولوی صاحب کے ساتھ قربانی کرنا اس کے ساتھ صف میں نماز پڑھنا اور دیگر معاملات لین دین کرنا جائز ہے یا نہیں؟ مستفتی: سعید جان کوہستانی

﴿جواب﴾ تین طلاقیں دینے کے بعد بیوی پہلے شوہر کے لئے تب ہی حلال ہو گی جب اسکی عدت گزر جانے کے بعد کوئی دوسرا شخص اس سے نکاح کرلے اور باقاعدہ ہمبستری کرے پھر یہ شخص اگر مر جائے یا طلاق دے دے تو عدت گزر جانے کے بعد پہلے شوہر سے دوبارہ نکاح ہوسکتا ہے، حلالہ صحیح ہونے کے لئے احناف زوج ثانی کے محض نکاح کو کافی نہیں سمجھتے، دخول ضروری ہے جیسا کہ حدیث میں رسول اللہ ﷺ نے امراۃ رفاعۃ القرظی سے فرمایا تھا (لاحتی تذوقی عسیلتہ ویذوق عسیلتک) (حدیث) اور مسئلہ چونکہ مجتہد فیہا ہے اس لئے مسئلہ بتانے والے شخص کے ساتھ قربانی وغیرہ کرنا جائز ہے اور یہ شخص صحیح مسئلہ معلوم ہونے کے باوجود اگر بیوی بغیر حلالے کے اپنے پاس رکھتا ہے تو کبیرہ گناہ کا مرتکب ہو رہا ہے۔

لما فی الهدایة: (۴۰۹/۲، طبع رحمانیه)

ولن کان الطلاق ثلاثا فی الحرة او ثنتین فی الامة لم تحل له حتی تنکح زوجا غیره نکاحا صحیحا ویدخل بها ثم یطلقها او یموت عنها (ثم قال بعد سطور) وشرط الدخول ثبت باشارة النص وهو ان یحمل النکاح علی الوطی حملا للکلام علی الافادة دون الاعادة اذ العقد استفید باطلاق اسم الزوج او یزاد علی النص بالحدیث المشهور وهو قوله علیه السلام لاتحل للاول حتی تذوق عسیلة الآخر......الخ

ولما فی شرح الفقه الأکبر: (ص ۱۱۷، بیروت) ولا نکفر مسلما بذنب من الذنوب وان کانت کبیرة.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ واللہ اعلم بالصواب: محمد غفر لہ ولوالدیہ

۲ ربیع الاول ۱۴۳۰ھ فتوی نمبر:

﴿خلع کی صورت میں عورت پر کتنی عدت واجب ہوگی؟﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام کہ اگر کوئی عورت اپنے شوہر سے خلع لے لے تو اس کی عدت کتنی ہوگی؟ نیز عدت کے دنوں کا نان ونفقہ شوہر کے ذمہ ہوگا یا نہیں؟ مستفتی: عمر فاروق

﴿جواب﴾ خلع سے طلاق بائن واقع ہوتی ہے، خلع لینے والی عورت کو ماہواری آتی ہو اور میاں بیوی میں خلوت صحیحہ بھی ہوئی ہو تو عورت کی عدت تین حیض ہوگی اور اگر عورت کو ماہواری نہ آتی ہو تو اسکی عدت تین ماہ ہوگی لیکن اگر خلع لینے والی عورت حاملہ ہو تو اس کی عدت وضع حمل ہی

ہوگی، عدت کے دنوں کا نان ونفقہ اور سکنی شوہر کے ذمہ ہوگا لیکن اگر خلع میں نفقہ کو ساقط کرنے کی صراحت کردی تو نفقہ ساقط ہوجائے گا، اسی طرح اگر سکنی سے بیوی نے شوہر کو بری کردیا تو شوہر سکنی سے بھی بری ہوجائے گا۔

لمافی التنویر مع الدر:(۴۴۱/۳،طبع ایچ ایم سعید)

(خلعها او طلقها بخمر او خنزير او ميتة اونحوها) مماليس بمال (وقع) طلاق (بائن في الخلع رجعي في غيره)

وفي الشامية: قوله بائن في الخلع لانه من الكنايات الدالة على قطع الوصلة فكان الواقع به بائناً.

ولمافي التنوير مع الدر:(۴۵۲/۳-۴۵۳-۴۵۴-۴۵۵،طبع سعيد)

(ويسقط الخلع)...... (والمبارأة)...... (كل حق) ثابت وقتهما (لكل منهما على الآخر مما يتعلق بذلك النكاح)...... (الانفقة العدة) وسكناها فلا يسقطان (الااذانص عليها) فتسقط النفقة لا السكنى لانها حق الشرع الااذا ابرأته عن مؤنة السكنى فيصح فتح.

وفي الشامية: قوله الااذا ابرأته عن مؤنة السكنى بان كانت ساكنة في بيت نفسها او تعطى الاجرة من مالها فيصح التزامها ولكن مقتضى هذا انه لابد من التصريح بمؤنة السكنى مع انه ذكر في الفتح وغيره في فصل الاحداد لو اختلعت على ان لاسكنى لها فان مؤنة السكنى تسقط عن الزوج ويلزمها ان تكترى بيت الزوج ولا يحل لها ان تخرج منه.

ولمافي الهداية:(۴۲۸/۲،طبع رحمانيه)

اذا طلق الرجل امرأته طلاقا بائنا اور جعيا او وقعت الفرقة بينهما بغير طلاق وهي حرة ممن تحيض فعدتها ثلثة اقراء وان كانت ممن لاتحيض من صغر او كبر فعدتها ثلثة اشهر ...... كذا التي بلغت بالسن ولم تحض بآخر الآية وان كانت حاملا فعدتها ان تضع حملها.

الجواب صحیح: عبدالرحمن عفا اللہ عنہ   واللہ اعلم بالصواب: عدنان خدابخش

۲ ربیع الثانی ۱۴۳۱ھ   فتوی نمبر: ۲۵۷۱

﴿حالت نفاس میں دی گئی طلاق میں عدت کا حکم﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں حضرات علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک عورت کے ہاں رات کو بچے کی ولادت ہوئی صبح خاوند نے طلاق دیدی تو کیا اب یہ عورت نفاس کے خون کے علاوہ تین حیض عدت گزارے گی یا صرف نفاس کا خون رکنے تک اس کی عدت شمار ہوگی؟

﴿جواب﴾ نفاس کے خون پر عدت کا مدار نہیں ہے، لہذا تین حیض گذارنے پر ہی اس

عورت کی عدت طلاق پوری ہوگی۔

لمافی قوله تعالیٰ:(سورة البقرة،آیت۲۲۸) والمطلقت يتربصن بانفسهن ثلثة قروء --- الآية.

ولمافی الشامی:(۲۲۸/۲،طبع سعید)

وفی التنویرلدت ثم طلقهازمضی سبعة أشهرفنکحت آخرلم یصح فالم تحض ثلث حیض وفی الشامیة:(ومضی سبعة أشهر)کا لمعنی انه لم یصح مالم تحض وان مضی تسعة أشهرالخ

ولمافی تنویرالابصار:(۵۰۵/۲،طبع سعید)

وهی فی حرة تحیض لطلاق أوفسخ بجمیع أسبابه ---بعدالدخول حقیقة أوحکمانلاثة حیض کوامل الخ.

ولمافی الغاثیة علی هامش الهندیة:(۵۲۹/۱،باب العدة،طبع رشیدیه)

وعدة الطلاق وتارة تکون بالحیض وتارة تکون بالشهوروتارة تکون بوضع الحمل الخ.

ولمافی الاشباه والنظائر:(ص۳۶۳،طبع)وتنقضی العدة به(الحیض)دون النفاس الخ.

الجواب صحیح:عبدالرحمٰن عفااللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب:انیس طالب کان اللہ لہ

۲۸صفر۱۴۳۱ھ — فتویٰ نمبر:۲۳۶۴

﴿مسلم کا عیسائی عورت کو طلاق اور پھر عیسائی سے حلالہ نکاح کا حکم﴾

﴿سوال﴾ ایک مسلمان آدمی نے اپنی صحیح العقیدہ عیسائی بیوی کو تین طلاقیں دے دی تھیں۔ اب وہ پشیمان ہے اور چاہتا ہے کہ اپنی بیوی کے چچازاد بھائی سے حلالہ کرائے جبکہ وہ چچازاد بھی صحیح العقیدہ عیسائی ہے، کیا اس طریقہ سے حلالہ ہوجائیگا؟ جواب دیکر ممنون فرمائیں۔

﴿جواب﴾ سوال میں درج حلالہ کے جس طریقہ کا ذکر ہے اس طریقہ سے حلالہ کرنے اور کرانے والے پر حضور اقدس ﷺ نے لعنت فرمائی ہے، ایک مسلمان شخص کو طلاق دینے سے پہلے ہی اس کے انجام پر نظر رکھنی چاہیے تاکہ نہ طلاق کی نوبت آئے اور نہ حلالہ کی ضرورت پڑے تاہم سوال میں ذکر کردہ طریقہ سے اگر حلالہ کرادیا گیا تو یہ عمل اگرچہ شرعاً ناپسندیدہ ہے لیکن حلالہ درست ہوجائیگا اور بیوی پہلے شوہر کے لئے حلال ہوجائیگی۔

ولمافی البزازیة علی هامش الهندیة:(۲۶۲/۲،طبع رشیدیه)

مطلقة المسلم اذاکانت کتابیة فتزوجت بکتابی ودخل بهاحلت للاول.

الجواب صحیح:عبدالرحمٰن عفااللہ عنہ — واللہ اعلم:عبدالوہاب عفااللہ عنہ

۲۷ربیع الثانی۱۴۲۷ھ — فتویٰ نمبر:۱۹۱

﴿جس گھر میں عدت واجب ہوئی اسی میں پوری کرے﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں مفتیان کرام اس مسئلہ کے بارے میں اگر معتدہ عورت کے گھر کے لوگ ایک مکان سے دوسرے مکان منتقل ہو رہے ہوں، اس وجہ سے کہ انکے خاندان کے افراد بہت زیادہ ہیں، اسی مکان میں رہنا بہت مشکل ہے، اس لئے کہ یہ مکان بنسبت دوسرے مکان کے زیادہ چھوٹا ہے۔ اب پوچھنا یہ ہے کہ یہ تمام لوگ منتقل ہو رہے ہیں بمع اپنی تمام سازوسامان کے اور اسی گھر میں کوئی باقی نہیں رہتا اس صورت میں یہ متوفی عنھا زوجھا انکے ساتھ منتقل ہوسکتی ہے یا نہیں؟ برائے مہربانی وضاحت فرمائیں۔ مستفتی مولوی عمر فاروق لاہور

﴿جواب﴾ عدت جس گھر میں واجب ہو جاتی ہے اسی میں پوری کرنا واجب ہوتا ہے البتہ اس گھر میں جان یا عزت محفوظ نہ ہو یا گھر کرایہ کا ہو اور کرایہ کا بندوبست نہ ہو یا اس گھر میں دیگر ورثاء کا حق ہو اور عورت کا ذاتی حصہ رہائش کیلئے کافی نہ ہو اور ورثاء خالی کرنے کا مطالبہ کریں تو اس قسم کی مجبوری کیوجہ سے دوران عدت گھر تبدیل کرنے کی گنجائش ہوتی ہے، مذکورہ صورت میں گھر والے اسی گھر میں اس عورت کو عدت گزارنے کا موقع اگر دیں اور بقدر ضرورت اس کیلئے سامان بھی چھوڑ دیں اور اسکے ساتھ محرم بھی ہو تو ایسی صورت میں نکلنے کی گنجائش نہیں ہے اور ایسا انتظام کرنا اگر مشکل ہو یا گھر والے تعاون نہیں کرتے اور اکیلے رہنے میں عزت یا جان کا خطرہ ہو تو نکلنے کی گنجائش ہے۔

(لمافی الدر مع رد: ج۳/۵۳۶ کتاب الطلاق باب العدة فصل فی الحداد سعید)

(وتعتدان) ای معتدة طلاق وموت (فی بیت وجبت فیه) هو مایضاف الیهما بالسکنی قبل الفرقة ولو غیر بیت الزوج ولا یخرجان منه (الاأن تخرج او یتهدم او تخاف) انهدامه او (تلف مالها او تجد کراء البیت) ونحو ذلک من الضرورات لأقرب موضع الیه.

(لمافی التاتارخانیة: ج۳/۲،۵۳ رشیدیه)

وللمعتدة ان تخرج من بیتها الی صحن الدار وتبیت فیه ای منزل شاءت الاان تکون فی الدار منازل لغیر هما فلا تخرج من بیتها الی تلک المنازل، فأن باتت المرأة مع زوجها فی منزل هو ملک الزوج فمات الزوج فان کان نصیبها لایکفیها فان رضی ورثة الزوج ان تسکن فیه سکنت، وان أبو کانت فی سعة من التحول ویکون ذلک عذرا لها وفی "الخانیة" وکذا اذا خافت علی متاعها فی ذلک المنزل ثم لا تخرج بعد ذلک عن المکان الذی انتقلت الیه ــــ وان خافت سقوط ذلک المنزل فلابأس بان تخرج

وتسكن منزلا آخر لم لاتخرج من ذلك المنزل الابعذر ،واذلم يكن مع المعتدة فى منزل العدة احدوهى تخاف بالليل لامن اللصوص ولا من الجيران بل تخاف بالقلب من أمر الميت او الموت ان كان الخوف شديدا كان لها الانتقال وان لم يكن الخوف شديداليس لها الانتقال ،وهو بمنزل وحشا وجدت فى قلبها.

لمافى مجمع الانهر:(۲/۱۵۳/طبع المنار كوئٹة)

وتعتدالمعتدة فى منزل يضاف اليها وقت الفرق او الموت الاتخرج جبرا وخافت على مالهااو انهدام او لم تقدر على كرائه ولاباس بكينونتهمامعا بمنزل ــالخ

الجواب صحیح: مفتی عبدالرحمٰن عفااللہ عنہ　　واللہ اعلم بالصواب: صفی اللہ عفرلہ ولوالدیہ

۹ جمادی الاولیٰ ۱۴۳۵ھ　　فتوی نمبر: ۴۴۳۹

﴿طلاق مغلظہ کی عدت دوسری جگہ گزارنے کا حکم﴾

﴿سوال﴾ طلاق مغلظہ واقع ہونے کے بعد بیوی کیلئے شوہر کے گھر میں اقامت اختیار کرنا بہت مشکل ہوجاتا ہے،ایسی صورت میں میکے میں عدت گزار سکتی ہے؟اورایسی صورت میں نان ونفقہ کس کے ذمہ ہوگا؟بینواتوجرا۔

﴿جواب﴾ عورت پراس گھر میں عدت گزارنا واجب ہے جہاں فرقت کے وقت وہ رہتی تھی اور سسرال والوں کیساتھ تعلقات کی خرابی یاان سے ذہنی اذیت کیوجہ سے میکے میں عدت گزارنے کی اجازت نہیں،البتہ اگر سسرال میں جان ومال یاعزت وآبروخطرہ میں ہوپھرقریب دوسری جگہ عدت گزارنے کی گنجائش ہے لیکن دوسری جگہ عدت گزارنے کی صورت میں شوہر کے ذمہ نان ونفقہ نہیں ہے۔

لمافى قوله تعالى:(سورة الطلاق،آیت ۱)

لاتخرجوهن من بيوتهن ولايخرجن الاان يأتين بفاحشة مبينة.....الآية.

ولما فى المظهرى:(۹/۳۴۸ طبع رشيديه)

ومن هذه الاية يثبت انه لايجوزللمطلقة رجعية كانت اوبائنة الخروج من بيت الزوج ليلاونهاراالابضرورة فان الضرورة مستثناة فى العبادات وهى تبيح المحظورات والضرورة مثل انهدام البيت اوخوف السرقة اوعدم وجدان كراء البيت اوضيق المنزل عليهااوكون الزوج فاسقاوالطلاق بائناولم يكن هناك قادرعلى حيلولة اونحو ذلك.

ولمافى اعلاء السنن:(۹/۲۱۷ طبع دار الكتب بيروت)

لحديث:عن جابررضى الله عنه عن النبى صلى الله عليه وسلم قال:المطلقة ثلاثالها السكنى والنفقة.

ولما فی الهدایة:(۲/۲۰۵،مطبع رحمانیه)

ولا یجوز للمطلقة الرجعیة والمبتوتة الخروج من بیتها لیلا ولا نهارا۔ وعلی المعتدة ان تعتد فی المنزل یضاف الیها بالسکنی حال وقوع الفرقة

ولما فی التنویر مع الدر:(۲/۶۳۶،مطبع سعید)

(وتعتدان)ای معتدة طلاق وموت(فی بیت وجبت فیه)ولا یخرجان منه(الا ان تخرج او یتهدم المنزل او تخاف)انهدامه او(تلف مالها او لا تجد کراء البیت)ونحو ذلک من الضرورات فتخرج لاقرب موضع الیه۔

الجواب صحیح:عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ   واللہ اعلم بالصواب:فرمان اللہ غفرلہ

۲۵ربیع الاول ۱۴۲۸ھ   فتویٰ نمبر:۷۰۰

﴿عورت پر عدت شوہر کے گھر میں گزارنا لازم ہے﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان صاحبان کہ میرے داماد کو گزشتہ ایام میں قتل کر دیا گیا ہے، میری بچی اپنے سسرال میں عدت گزار رہی تھی لیکن اسکے سسرال میں اسکی ساس، دیور، دیورانی (جو کہ میری دوسری بیٹی) ہے اسکے علاوہ کوئی محرم گھر میں نہیں ہے، میں اور کوئی اور محرم اپنی بچی کے ساتھ اسکے سسرال میں نہیں رہ سکتے، اسلئے میں اپنی بیٹی کو اپنے گھر لے آیا ہوں تاکہ عدت میرے پاس گزار سکے آپ حضرات سے گزارش ہے کہ قرآن وسنت کی روشنی میں میرے اس عمل پر مطلع فرمائیں جناب کا مشکور ہونگا۔   مستفتی:محمد سلیم کراچی

﴿جواب﴾ شریعت مطہرہ نے عورت کو عدت اپنے شوہر کے گھر میں گزارنے کا حکم دیا ہے، الا یہ کہ عورت کو اپنی جان مال عزت وآبرو کے بارے میں فتنہ کا قوی اندیشہ ہو تو اسکو دوسری جگہ منتقل ہونے کی اجازت ہے، مذکورہ صورت میں آپکی بیٹی اپنے ہی گھر میں عدت گزارے گی یعنی شوہر کے گھر میں اسلئے کہ آپکی بیٹی کے ساتھ دوسری بہن (دیورانی) اور ساس بھی موجود ہے، اس گھر میں بظاہر ایسا کوئی شرعی عذر نہیں جسکی وجہ سے آپکی بیٹی آپکے گھر میں عدت گزارنے پر مجبور ہو آپ کو چاہیے اپنی بیٹی کو اسکے شوہر کے گھر پہنچادیں۔

لما فی الهدایة:(۲/۲۰۵،مطبع رحمانیه)

وعلی المعتدة ان تعتد فی المنزل الذی یضاف الیها بالسکنی حال وقوع الفرقة والموت لقوله تعالیٰ ولا تخرجوهن من بیوتهن والبیت الذی تسکنه ولهذا لو زارت

اظهارا لحلها وعدم كان واجبا تدور بالاسكان عن إعمالها إن عدلت لبه وقال عليه السلام للتي قتل زوجها "امكثي في بيتك حتى يبلغ الكتاب أجله"۔

ولما في التنوير مع الدر (۲/ ۵۳۶ طبع سعید)

(وتعتدان) أي معتدة طلاق وموت (في بيت وجبت فيه) ولا يخرجان منه (إلا أن تخرج أو يتهدم المنزل أو تخاف) انهدامه أو (تلف مالها أو لا تجد كراء البيت) ونحو ذلك من الضرورات فتخرج لأقرب موضع إليه.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفااللہ عنہ   واللہ اعلم بالصواب: محمد طیب حسن زئی

۲۸ صفر ۱۴۳۰ھ   فتویٰ نمبر: ۱۹۷۲

﴿خرچہ کا بندوبست نہ ہو تو بیوہ دن میں حکومتی امداد وصول کرنے کے لئے نکل سکتی ہے﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام کہ میری ایک رشتہ دار عورت ہے اسکا شوہر سیکورٹی گارڈ تھا دو مہینے قبل ڈاکوؤں کے ہاتھوں قتل ہو گیا، اب حکومت کیطرف سے انکی گھر والی کو کچھ رقم مل رہی ہے لیکن رقم کی حصولی کیلئے حکومت نے اسکی بیوی کی حاضری پشاور دفتر میں ضروری قرار دی ہے جبکہ فی الحال وہ عدت گزار رہی ہے اور ہمارے گاؤں سے پشاور آنے جانے میں تقریباً دس گھنٹے لگتے ہیں بلکہ یہ خدشہ بھی ہے کہ رات بھی پشاور میں ٹھہرنا پڑے (کیونکہ آج کل دفاتر میں چھوٹے سے چھوٹے کام کو بھی طویل بنا دیا جاتا ہے) تو کیا ایسی صورت میں وہ اپنے بھائی کیساتھ رقم وصول کرنے جا سکتی ہے؟ نیز اسکے شوہر کے بعد اب کوئی کمانے والا نہیں ہے۔

﴿جواب﴾ بیوہ عورت کے پاس اگر خرچ خوراک نہ ہو اور کوئی اور اسکا ضروری خرچہ برداشت کرنے کے لئے تیار نہ ہو تو ایسی صورت میں وہ عدت کے دوران دن کو کمانے کیلئے نکل سکتی ہے اور رات گزارنے کیلئے گھر لوٹنا ضروری ہے، لہٰذا مذکورہ صورت میں اگر اس عورت کا خرچہ برداشت کرنے کیلئے کوئی تیار نہ ہو اور عدت کے ایام کے خرچہ کا بندوبست کرنے کی کوئی صورت نہ بنتی ہو تو مجبوری کی ایسی صورت میں یہ عورت کسی محرم کیساتھ جا کر اتنی دیر گھر سے باہر رہ سکتی ہے کہ جتنی دیر میں وہ رقم وصول کرلے یا وصولی کی یقین دہانی انکو کرا دیجائے۔

لما في الدر مع الرد: (۲/ ۵۳۶ طبع سعید)

(ومعتدة موت تخرج في الجديدين وتبيت) أكثر الليل (في منزلها) لأن نفقتها عليها فتحتاج للخروج، حتى لو كان عندها كفايتها صارت كالمطلقة فلا يحل لها الخروج فتح.

وفي الشامية: قال في الفتح: والحاصل أن مدار حل خروجها بسبب قيام شغل المعيشة فيتقدر

بقدره، فمتى انقضت حاجتها لا يحل لها بعد ذلك صرف الزمان خارج بيتها اه.

ولما في فتح القدير: (۱۶۵/۴، طبع رشيديه)

والمتوفى عنها زوجها تخرج نهارا وبعض الليل في غير منزلها) وقال صاحب الفتح وهو قوله لان نفقتها عليها وعسى لا تجد من يكفيها مؤنتها فتحتاج الى الخروج لنقلتها غير ان امر المعاش يكون بالنهار عادة دون الليالي فابيح الخروج لها بالنهار دون الليالي انتهى ويعرف من التعليل ايضاً انها اذا كان لها قدر كفايتها صارت كالمطلقة فلا يحل لها ان تخرج لزيارة ونحوها ليلاً ولا نهاراً والحاصل ان مدار الحل كون غيبتها بسبب قيام شغل المعيشة فيتقدر بقدره فمتى انقضت حاجتها لا يحل لها بعد ذلك صرف الزمان خارج بيتها.

ولما في البحر الرائق: (۱۵۴/۴، طبع سعيد)

(قوله ومعتدة الموت تخرج يوماً وبعض الليل) لتكتسب لاجل قيام المعيشة لانه لا نفقة لها حتى لو كان عندها كفايتها صارت كالمطلقة فلا يحل لها ان تخرج لزيارة ولا لغيرها ليلا ولا نهارا والحاصل ان مدار الحل كون خروجها بسبب قيام شغل المعيشة فيتقدر بقدره فمتى انقضت حاجتها لا يحل لها بعد ذلك صرف الزمان خارج بيتها.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ	واللہ اعلم بالصواب: سلمان احمد
۲۷ جمادی الاولیٰ ۱۴۳۰ھ	فتویٰ نمبر: ۲۲۰۷

﴿کوئی معقول عذر نہ ہو تو عدت اپنے شوہر کے گھر میں گزارنا ضروری ہوتا ہے﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک آدمی اپنے اہل وعیال کیساتھ کراچی میں کرائے کے مکان میں رہائش پذیر تھا کہ اچانک اس کا انتقال ہو گیا۔ اب پوچھنا یہ ہے کہ کیا اس کی بیوی کرائے کے مکان میں عدت گزارے گی یا اپنے آبائی گاؤں منتقل ہو کر اپنے والدین کے ہاں عدت گزارے گی؟ برائے مہربانی وضاحت فرمائیں۔

﴿جواب﴾ عورت مطلقہ ہو خواہ "متوفی عنہا زوجہا" ہو اسے اپنے شوہر کے گھر میں عدت گزارنے کا حکم ہے، ہاں کوئی معقول مجبوری ہو جس کو شریعت بھی مجبوری تسلیم کرے مثلاً اس بیوہ کے پاس مکان کا کرایہ برداشت کرنے کیلئے پیسہ نہیں ہے اور مالک مکان کرایہ کا مطالبہ کرے یا اس مکان میں اس کی جان یا عزت محفوظ نہیں ہے، تو ایسی مجبوری میں وہ اپنے والدین کے ہاں عدت گزارنے جا سکتی ہے۔

لما في التنوير مع الدر: (۵۳۶/۳، ایچ ایم سعید)

(وتعتدان) اي معتدة طلاق وموت (في بيت وجبت فيه) ولا يخرجان منه (الا ان تخرج

أو يخاف هدم المنزل أو تخاف اللصوص أو كان بأجرة ولا تجد ما تؤديه أو تلف مالها أو لا تجد كراء البيت ونحو ذلك من الضرورات فتخرج لأقرب موضع اليه.

لما في الفقه الحنفي وأدلته، ۲/۲۷۵ (دار الكلم الطيب بيروت)

وتعتد المطلقة والمتوفى عنها زوجها في البيت الذي كانت تسكنه حال وقوع الفرقة، لأنه البيت المضاف اليه بقوله تعالىٰ (من بيوتهن) لأنه هو الذي تسكنه حتىٰ لو طلقت في غير منزلها عادت اليه فوراً فتعتد فيه الا أن ينهدم أو تخرج منه أو لا تقدر على أجرته فتنتقل.

لما في رد المحتار (۳/۵۳۶ ايچ ايم سعيد)

(قوله الا أن تخرج) الأولى الاتيان بضمير التثنية فيه وفيما بعده، وشمل اخراج الزوج ظلماً أو صاحب المنزل لعدم قدرتها على الكراء او الوارث اذا كان نصيبها من البيت لا يكفيها بحر اي لا يكفيها اذا قسمته لأنه لا يجبر على سكناها معه اذا طلب القسمة أو المهاياة ولو كان نصيبها يزيد على كفايتها (قوله أو لا تجد كراء البيت) افاد انها لو قدرت عليه لزمها من مالها، وترجع به المطلقة على الزوج ان كان باذن الحاكم.

الجواب صحیح: مفتی عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ واللہ اعلم بالصواب: عزیز احمد خضداری

۳ جمادی الثانی ۱۴۳۵ھ فتویٰ نمبر: ۳۱۷۶

﴿عورت عدت کہاں گزارے؟﴾

﴿سوال﴾ ایک شخص نے کسی کو اپنا مکان رہنے کیلئے دیا، اس آدمی نے اس شخص کے مکان پر قبضہ کرلیا پھر صاحب مکان نے عدالت سے رجوع کیا تو عدالت نے صاحب مکان کے حق میں فیصلہ کرتے ہوئے اس آدمی کو ۳۱ دسمبر تک مکان خالی کرنیکا الٹی میٹم دیا، اس آدمی نے اسکو مان لیا لیکن ۳۱ دسمبر کے بعد بھی اس نے مکان کو خالی نہیں کیا پھر صاحب مکان نے دوبارہ عدالت سے رجوع کرلیا تو اس آدمی نے عدالت سے مزید مہلت مانگی، عدالت نے ۳۰ اپریل تک کی مزید مہلت دیتے ہوئے یہ آرڈر جاری کیا کہ اگر ۳۰ اپریل کے بعد یہ آدمی مکان خالی نہ کرے تو انتظامیہ زبردستی اس سے یہ مکان خالی کروائے، مذکورہ تاریخ (۳۰ اپریل) آنے سے پہلے وہ آدمی فوت ہوگیا مکان خالی کرانے کی صورت میں بیوہ کیلئے کیا گنجائش ہے کہ وہ اپنے بیٹے یا کسی اپنے محرم کے گھر میں عدت گزارے؟ یا اسی مکان میں اس پر عدت گزارنا ضروری ہے؟

﴿جواب﴾ مذکورہ صورت میں مکان پر ناجائز غاصبانہ قبضہ تھا، مرحوم پر لازم تھا کہ مکان خوشی سے خالی کرتا، خصوصاً جب عدالت نے بھی مکان خالی کرنے کا حکم دیا تو مرحوم کیلئے مزید مکان میں رہنے کی کوئی گنجائش نہیں رہی اور اب مرحوم کے بعد پسماندگان پر لازم ہے کہ بلا تاخیر

مکان خالی کردیں، مرحوم کا دوسرا ذاتی مکان اگر نہیں ہے تو بیوہ عدت اپنے بیٹے یا دوسرے کسی محرم کے گھر میں گزار دے جو زیادہ قریب ہو۔

لما فی الفتاویٰ مع الدر: (۵۳۶/۳ طبع سعید)

او تعتدان) أی معتدة طلاق و موت (فی بیت وجبت فیه) ولا یخرجان منه (الا ان تخرج أو ینهدم المنزل، أو تخاف) انهدامه أو (تلف مالها أو لا تجد کراء البیت) ونحو ذالک من الضرورات فتخرج لأقرب موضع الیه.

وفی الشامیة (قوله الا أن تخرج) لا ولی الاتیان بضمیر التثنیة فیه وفیما بعده وهو شمل اخراج الزوج ظلماً أو صاحب المنزل لعدم قدرتها علی الکراء أو الوارث اذا کان نصیبها من البیت لا یکفیها بحر.

الجواب صحیح: عبد الرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم: شاہد اسحاق عفا اللہ عنہ

۹ ربیع الثانی ۱۴۲۷ھ — فتویٰ نمبر: ۱۰۷

﴿عدت وفات کے فوراً بعد شروع ہو جاتی ہے﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلے کے بارے میں کہ ایک آدمی سعودی عرب میں کام کرتا تھا وہاں اس کا انتقال ہو گیا اس کی لاش بیس (۲۰) روز بعد پاکستان لائی گئی تو تب اس کی بیوی کو اس کے انتقال کا پتہ چلا، اب اس عورت کی عدت کب سے شمار کی جائیگی انتقال کے روز سے یا جب اس عورت کو اس کے انتقال کی خبر ملی ہے؟ مستفتی: عبد الواحد پشاور

﴿جواب﴾ شوہر کے انتقال کے دن سے ہی عورت کی عدت شروع ہو جاتی ہے اسکو وفات پانے کی خبر ہو یا نہ ہو، لہٰذا عورت اگر حاملہ نہیں ہے تو چار ماہ دس روز گزرنے سے عدت پوری ہو گی اور حمل کی صورت میں وضع حمل سے عدت پوری ہو گی چار ماہ دس روز گذرنے سے پہلے وضع حمل ہو یا بعد میں اسکی عدت وضع حمل سے پوری ہو جاتی ہے۔

لما فی قوله تعالیٰ: (سورة الطلاق الآیة: ۴) ﴿وأولت الاحمال اجلهن ان یضعن حملهن﴾

ولما فی روح المعانی: (۲۶۰/۱۷ طبع رشیدیه)

(وأولت الاحمال اجلهن) ای منتهی عدتهن (ان یضعن حملهن) ولو نحو مضغة وخلقة والا فرق فی ذلک بین ان یکن مطلقات أو متوفی عنهن أزواجهن کما روی عن عمر — عن ابن عمر أنه سئل عن المرأة یتوفی عنها زوجها وهی حامل فقال: اذا وضعت حملها فقد حلت — عن ابی بن کعب قال: قلت للنبی ﷺ (واولات الاحمال وأجلهن أن یضعن حملهن) أهی المطلقة ثلاثاً والمتوفی عنها؟ قال: "هی المطلقة ثلاثا

والمتوفی عنها" وروی جماعة نحوه.

لما فی الدر المختار:(۵۲۰/۳ ،باب العدة ،طبع سعید)

ومبداء العدة بعد الطلاق وبعد الموت علی الفور وتنقضی العدة وان جهلت المرأة بهما ای بعد الموت لانها اجل فلا یشترط العلم بمضیه وفی الشامیة(قوله لانها اجل) ای لان العدة اجل فلا یشترط العلم بمضیه ای بمضی الاجل۔

ولما فی تحفة الفقهاء:(۲۳۳ ،کتاب الطلاق، مکتبه معروفیه)

اذا کان الزوج غائباً، فطلق امراته او مات عنها والمرأة لاتعلم بذالک حتی مضت مدة العدة فانه تنقضی العدة وتعتبر من وقت الطلاق ،والعلم لیس بشرط لمضی العدة فانها اجل وضع لبراءة الرحم ، وانه یحصل بلا علم.

ولما فی البحر الرائق:(۱۴۲/۴ ،طبع سعید)

(ومبداء العدة بعد الطلاق والموت) یعنی ابتداء عدة الطلاق من وقته وابتداء عدة الوفاة من وقتها سواء علمت بالطلاق والموت او لم یعلم حتی لو تعلم ومضت مدة العدة فقد انقضت لان سبب وجوبها الطلاق او الوفاة فیعتبر ابتداؤها من وقت وجود السبب کذا فی الهدایه وشرح علیه العنایه وغایة البیان.

الجواب صحیح:عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ واللہ اعلم بالصواب:محمد تنویر عفا اللہ عنہ

۲۷ربیع الثانی ۱۴۳۳ھ فتویٰ نمبر:۳۶۹۷

﴿عورت کی عدت کب سے شروع ہوگی؟﴾

﴿سوال﴾ ایک شخص بیرون ملک نوکری کررہا تھا اور فوت ہوگیا، اسکے بیوی بچوں کو اس کی موت کی خبر نہ ہوئی جبکہ اسکے تمام رشتہ داروں اور پڑوس والوں کو اسکی خبر پہنچ چکی ہے لیکن وہ اسکی نعش آنے تک اسکے بیوی بچوں کو بتانا نہیں چاہتے ،اس عرصہ میں عورت اپنے رشتہ داروں کے گھر بھی جاتی ہے اور زینت وغیرہ بھی اختیار کرتی ہے، جب اس آدمی کی نعش پہنچتی ہے یا اسکے بیوی بچوں کو اطلاع ہوتی ہے اس وقت تک اس عورت کی آدھی عدت یا پوری عدت گزر چکی ہوتی ہے، پوچھنا یہ ہے کہ اس عورت کی عدت کب سے شمار ہوگی؟ کیا موت کے وقت سے شمار کریں گے جو گزر چکی ہے یا جس وقت اسکو اطلاع ہوئی اس وقت سے شمار کریں گے؟ نیز یہ کہ جب رشتہ داروں اور پڑوس والوں کو موت کی خبر تھی اور اسکی عورت باہر جاتی تھی اور زینت اختیار کرتی تھی تو ان لوگوں کو اس عورت کو خبر نہ دینے کی وجہ سے گناہ ہوگا یا نہیں؟

﴿جواب﴾ عورت کی عدت شوہر کی وفات یا طلاق کے فوراً بعد شروع ہو جاتی ہے چاہے

عورت کو اسکا علم ہو یا نہ ہو، مذکورہ صورت میں بھی عورت کی عدت اسکے شوہر کی وفات کے دن سے شمار ہوگی اور عدت وفات چار ماہ اور دس دن ہوتی ہے اگر عورت حاملہ نہ ہو۔

حمل کی صورت میں وضع حمل سے عدت پوری ہو جاتی ہے، مذکورہ عورت کو اگر چار ماہ دس دن گزرنے کے بعد اطلاع ہوئی تو اس صورت میں اسکی عدت گزر چکی ہے اور اگر اس سے کم عرصہ میں اطلاع ہوئی تو موت کے وقت سے لیکر چار ماہ دس دن تک جو دن باقی ہیں وہ پورے کر کے عدت سے فارغ ہو جائے گی، حمل کی صورت میں وضع حمل سے عدت پوری ہوگی۔

لما فی الدر المختار: (۵/ ۲۰۲، طبع امدادیہ)

(ومبدأ العدة بعد الطلاق و) بعد (الموت) علی الفور (وتنقضی العدة وان جهلت) المرأة (بهما) ای بالطلاق والموت، لأنها أجل فلا یشترط العلم بمضیه سواء اعترف بالطلاق أو انکر.

رشتہ داروں اور پڑوس والوں کو موت کی اطلاع ہوتے ہی اسکی بیوی کو خبر دے دینی چاہیے تھی تاکہ وہ گھر میں رہ کر عدت گزارتی، اطلاع نہ کرنے کی وجہ سے یہ لوگ گنہگار ہوں گے۔

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ	واللہ اعلم: شاہد اسحاق عفا اللہ عنہ
۵ ربیع الثانی ۱۴۲۷ھ	فتویٰ نمبر: ۹۵

﴿دوران عدت مطلقہ عورت کا ٹیلی فون پر شادی کے بارے میں گفتگو کرنا ناجائز نہیں﴾

﴿سوال﴾ کیا دوران عدت طلاق شدہ عورت ٹیلیفون پر کسی اجنبی شخص کے ساتھ شادی کے بارے میں بات کرسکتی ہے؟ یعنی یہ معاہدہ کرسکتی ہے کہ ہم بعد از ختم عدت شادی کرلیں گے؟

﴿جواب﴾ چونکہ نکاح اللہ تعالیٰ کے عمدہ ترین انعامات میں سے ہے جس کے زائل ہو جانے پر (خواہ طلاق کی وجہ سے ہو یا وفات خاوند کے سبب سے) بہر صورت عورت کے ذمہ عدت گزارنے کے ساتھ ساتھ افسردگی کا اظہار بھی لازم ہے، چنانچہ خوشبو لگانا، سرمہ وغیرہ کا استعمال کرنا اور بلا ضرورت گھر سے باہر نکلنا سب عورت کے لئے ایک معین مدت تک کیلئے ممنوع ہو جاتے ہیں۔

اسی طرح دورانِ عدت دیگر لوگوں کو اللہ تعالیٰ نے اس سے بھی منع فرما دیا ہے کہ وہ عدت گزارنے والی خاتون کو پیغامِ نکاح دے دیں جب دیگر لوگوں کو منع کیا گیا ہے تو عورت کا (دورانِ عدت) اس قسم کا معاملہ یعنی ٹیلیفون وغیرہ پر کسی کے ساتھ اس موضوع پر گفت وشنید اور

بھی زیادہ ممنوع ہے، نیز فقہاءِ کرام نے اس کی ایک وجہ یہ بھی بیان کی ہے کہ عورت کی دورانِ عدت اس قسم کی حرکات شوہر (اوّل) کی ناراضگی اوردل شکنی کا سبب بن سکتی ہیں جوایک ناجائز عمل ہے، نیز اسمیں خاونداول کی حق تلفی بھی ہے، لہٰذا دورانِ عدت معتدہ کوان امور سے حتی الامکان گریز کرنا چاہیے۔

لمافی روح المعانی:(١٥٢/٢،طبع رشیدیه)

(ولاجناح عليكم فيما عرّضتم به من خطبة النساء اواكننتم في انفسكم علم الله الأية) ولايمكن حملها على الاستغراق لان من النساء من يحرم التعريض بخطبتهن في العدة كالرجعيات والبائنات وفيه: تحت قوله: "ولاتعزموا عقدة النكاح حتىٰ يبلغ الكتاب اجله" اى ينتهى ماكتب وفرض من العدة.

ولمافى الشامى:(٢٢٢/٥،طبع امداديه)

(لاالمطلقة اجماعا)...وشمل المطلقة البائن وبه صرّح الزيلعى"

وفى الفتح ان التعريض لايجوزفى المطلقة بالاجماع فانه لايجوزلهاالخروج من منزلهااصلاً فلايتمكن من التعريض على وجه لايخفىٰ على الناس ولاضمانه الىٰ عداوة المطلق.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفااللہ عنہ واللہ اعلم: محمد شریف حسین عفااللہ عنہ

٢٤ ربیع الثانی ١٤٢٧ھ فتویٰ نمبر: ٢١٣

﴿عدت وفات میں زیورات کا استعمال ممنوع ہے﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علمائے کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ تین ماہ ہو گئے ہیں کہ میرے شوہر کا انتقال ہوگیا ہے، اب میرے بڑے بیٹے کی شادی ہے تو کیا اس میں میں اپنے گھر کے اندر زیورات لاکٹ، چوڑیاں وغیرہ پہن سکتی ہوں یا نہیں؟ مستفتیہ: ام نعمان پشاور

﴿جواب﴾ شوہر کے انتقال پر عورت کو چار ماہ دس روز تک سوگ کرنے کا حکم ہوتا ہے، شرعی اصطلاح میں اس کو "حداد" کہتے ہیں، یعنی زیب وزینت کے تمام چیزوں سے اجتناب ضروری ہوتا ہے، چوڑیاں اور لاکٹ وغیرہ بھی چونکہ زینت کی اشیاء ہیں لہٰذا دورانِ عدت گھر میں بھی پہننے کی گنجائش نہیں ہے۔

لما فی قوله تعالى (البقرة: ٢٣٤)

﴿والذين يتوفون منكم ويذرون ازواجاً يتربصن بانفسهن اربعة اشهر وعشراً.﴾

الجوهرة النيرة:(٩٧/٢،كتاب العدة مير محمد كتب خانه كراچى)

واذا مات الرجل عن امرأته الحرة فعدتها اربعة اشهر وعشرة وهذه العدة لاتجب الا فى نكاح صحيح.

ولما فی البدائع الصنائع:(۲۰۸/۳، فصل فی احکام العدة طبع سعید)

الاحداد فی اللغة عبارة عن الامتناع من الزینة یقال احدت علی زوجها وحدت ای امتنعت من الزینة وهو ان تجتنب الدهن والکحل ولا تختضب ولا تمتشط ولا تلبس حلیا ولا تتشوف.

ولما فی الهدایه:(۴۲۲/۲، باب العدة طبع رحمانیه)

وعلی المبتوتة والمتوفی عنها زوجها اذا کانت بالغا مسلمة الحداد، والحداد ان تترک الطیب والزینة والکحل والدهن المطیب وغیر المطیب الا من عذر.

ولما فی الدر المختار مع الشامی :(۵۳۰/۳، فصل فی الحداد، طبع سعید)

(تحد مکلفة مسلمة اذا کانت معتدة بت او موت بترک الزینة) وفی الشامیة قوله بترک الزینة بحلی ای بجمیع انواعه من فضة وذهب وجواهر بحر، قال القهستانی: والزینة ما تتزین به المرأة من حلی او کحل کما فی الکشاف ... ویؤیده ما فی قاضیخان: المعتدة تجتنب عن کل زینة.

ولما فی البحر الرائق:(۱۵۰/۴، فصل فی الحداد طبع سعید)

قال العلامة ابن نجیم مصری رحمه الله: وشمل لبس الحریر بجمیع انواعه وألوانه ولو أسود وجمیع انواع الحلی من ذهب وفضة وجواهر، زاد فی التتارخانیه القصب.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ | واللہ اعلم بالصواب: محمد تنویر عفا اللہ عنہ

۲۷ ربیع الثانی ۱۴۳۴ھ | فتویٰ نمبر: ۳۶۹۱

﴿عدت طلاق میں شوہر کا انتقال ہو جائے تو عدت وفات لازمی ہے﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علمائے کرام اس مسئلہ کے بارے میں کے ایک عورت کو شوہر نے ایک طلاق رجعی دی اس کی عدت پوری نہیں ہوئی تھی کہ اس کا شوہر انتقال کر گیا، تو اب اس عورت پر کون سی عدت لازم ہوگی عدت طلاق یا عدت وفات؟ مستفتی: محمد نعیم پشاور

﴿جواب﴾ طلاق رجعی کی صورت میں عدت طلاق رجعی کی تھی لیکن شوہر کے انتقال کے بعد اب پوری عدت وفات گزارنا ضروری ہے یعنی وفات کے دن سے چار ماہ دس دن مکمل عدت میں بیٹھنا عورت پر لازم ہے۔

لما فی فقه الاسلامی وادلته:(۷۱۸۹/۹، طبع رشیدیه)

اذا مات الرجل فی اثناء عدة زوجته التی طلقها طلاقا رجعیا انتقلت بالاجماع من عدتها بالاقراء او الاشهر الی عدة وفاة وهی اربعة اشهر وعشرة ایام سواء کان الطلاق فی حال الصحة ام فی حال مرض الموت ،لان المطلقة رجعیا تعد زوجة ما دامت فی العدة ،وموت الزوج یوجب علی زوجته عدة الوفاة فتلغوا احکام الرجعة وسقطت بقیة عدة الطلاق ،فتسقط نفقتها ،وتثبت احکام عدة الوفاة من احداد وغیره

ولما فی فقہ الحنفی وادلتہ:(۲/۲۰۵،دار الکلم بیروت)

وعدۃ الوفاۃ لمن توفی عنها زوجها اربعۃ اشهر وعشرا لقولہ تعالی "والذین یتوفون منکم ویذرون ازواجا یتربصن بانفسهن اربعۃ اشهر وعشرا".

ولما فی بدائع الصنائع:(۳/۳۰۰،بیان انتقال العدۃ وتغیرها ،طبع سعید)

اذا طلق امرأتہ ثم مات فان کان الطلاق رجعیاً انتقلت عدتها الی عدۃ الوفاۃ سواء طلقها فی حالۃ المرض او الصحۃ وانهدمت عدۃ الطلاق وعلیها ان تستانف عدۃ الوفاۃ فی قولهم جمیعا لانها زوجتہ بعد الطلاق اذالطلاق الرجعی لایوجب زوال الزوجیۃ وموت الزوج یوجب علی زوجتہ عدۃ الوفاۃ.

الجواب صحیح:عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب:محمد تنویر عفا اللہ عنہ

۷ جمادی الثانی ۱۴۳۳ھ — فتوی نمبر:۲۷۵۷

﴿خلع کے بعد عدت کا حکم﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میری لڑکی سدرہ کا تین سال پہلے کامران ولد اعجاز سے نکاح ہوا تھا لیکن رخصتی نہیں ہوئی تھی اور نہ کبھی ملاقات ہوئی تھی بعد میں ناچاقی پیدا ہوگئی اور کامران نے رخصتی لینے سے انکار کیا اور آخرکار زبانی کہا کہ مجھے خلع منظور ہے اور کورٹ کے ذریعے ہم نے خلع لے لیا،معلوم کرنا ہے کہ سدرہ پر عدت گزارنا لازم ہے یا بغیر عدت کے بھی کسی دوسرے سے نکاح کرسکتی ہیں؟

مستفتی شیخ محمد اسلم

﴿جواب﴾ واضح رہے کہ طلاق کے بعد عدت کی ضرورت تب ہی پیش آتی ہے جب منکوحہ کے ساتھ صحبت یا خلوت صحیحہ کی نوبت آئی ہو،بصورت دیگر عدت کی ضرورت نہیں ہوتی۔

لما فی قولہ تعالیٰ:(پارہ ۲۲ سورۃ الاحزاب،آیت ۴۹)

یاایها الذین امنوا اذانکحتم المؤمنت ثم طلقتموهن من قبل ان تمسوهن فمالکم علیهن من عدۃ تعتدونها......الآیۃ.

مذکورہ صورت میں سدرہ کے ساتھ نہ تو شوہر کی صحبت ہوئی ہے اور نہ خلوت صحیحہ،لہٰذا سدرہ دوسری جگہ عدت گزارے بغیر نکاح کرسکتی ہے بشرطیکہ خلع صحیح ہوئی ہو۔

الجواب صحیح:عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم:صلاح الدین ڈیروی

۱۶ ربیع الاول ۱۴۲۷ھ — فتوی نمبر:۳۶

﴿صغیرہ مطلقہ کا عدت گزارنے کے درمیان حیض آنے سے عدت کا حکم﴾

﴿سوال﴾ مسماۃ ہندہ نابالغہ ہے اس کو شوہر نے طلاق دیدی تو اس نے مہینوں کے ذریعے عدت گزارنی شروع کی، ابھی تین ماہ مکمل نہیں ہوئے تھے کہ اسے حیض آنا شروع ہو گیا، اب یہ مہینوں کے ذریعے عدت مکمل کرے یا نئے سرے سے تین حیض پورے ہونے تک عدت میں رہے گی؟

﴿جواب﴾ چونکہ مذکورہ صورت میں ہندہ کو تیسرا مہینہ مکمل ہونے سے تھوڑی دیر پہلے حیض آ گیا ہے، اس لئے نئے سرے سے حیض کے حساب سے عدت شمار کرے گی اور تین حیض پورے کرنا اس پر لازم ہے۔

لمافی الهندية:(۱/۵۳۱طبع رشيديه)

صغيرة طلقها زوجها فمضت ثلاثة أشهر الا يوما ثم حاضت فمالم تحض ثلاث حيض لاتنقضي عدتها.

ولمافي التنوير مع الدر:(۵/۱۹۵-۱۹۶طبع امداديه)

(والصغير لوحاضت بعدتمام الأشهر(لا)تستانف(الااذاحاضت في أثنائها) فتستانف بالحيض.

وفي الشامية:قوله:(في أثنائها)أي قبل تمامها ولوبساعة.

الجواب صحیح :عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ | واللہ اعلم: صلاح الدین ڈیروی

۳۰ ربیع الثانی ۱۴۲۷ھ | فتوی نمبر: ۲۳۲

﴿تنہائی مکان کی وجہ سے عدت وفات دوسرے گھر میں گزارنے کا حکم﴾

﴿سوال﴾ ایک عورت کا شوہر مر گیا ہے اور وہ اپنے مرحوم شوہر کے گھر میں اکیلی ہے تو کیا اس صورت میں یہ عورت اپنے بیٹے یا بیٹی کے گھر میں عدت گزار سکتی ہے یا نہیں؟

﴿جواب﴾ مذکورہ صورت میں اگر اس عورت کو اپنے شوہر کے گھر میں مال، جان یا عزت کا خطرہ ہو تو ایسی صورت میں یہ اپنے بیٹے یا بیٹی کے گھر میں عدت گزار سکتی ہے، البتہ اگر اس گھر میں کوئی غیر محرم ہو تو اس سے پردہ ضروری ہے۔

لمافي مبسوط السرخسي:(۶/۳۲طبع دار المعرفة بيروت)

وان كانت في منزل مخوف على نفسها اومالها وليس معها رجل كانت في سعة من الرحلة لان المقام مع الخوف لايمكن وفي المقام ضرر عليها في نفسها ومالها وذلك عذر في حق اسقاط الشرع.

ولما فی فتاوی قاضیخان:(۶/۳۲،طبع دار المعرفۃ بیروت)

المعتدۃ اذاکانت فی منزل لیس معها احدالی ان قال ،وان کانت الخوف شدیداًکان لهاان تنتقل لانهالولم تنتقل یخاف علیهامن ذهاب العقل ونحوه.

ولما فی التنویرمع الدر:(۳/۵۳۶،طبع ایچ ایم سعید)

(وتعتدان)ای معتدۃ طلاق وموت(فی بیت وجبت فیه)ولایخرجان منه(الاان تخرج او یتهدم المنزل او تخاف)انهدامه او(تلف ماله اولاتجدکراء البیت)ونحوذلک من الضرورات فتخرج لاقرب موضع الیه.

الجواب صحیح:عبدالرحمٰن عفااللہ عنہ　　　واللہ اعلم بالصواب:محمد عبداللہ چارسدوی

۹ ربیع الاول ۱۴۲۸ھ　　　فتوی نمبر:۶۶۳

﴿طلاق بائن والی عورت کیلئے زینت کا حکم﴾

﴿سوال﴾ کیافرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ طلاق بائنہ والی عورت دوران عدت زینت اختیار کرسکتی ہے یعنی نئے کپڑے خوشبو سرمہ وغیرہ لگاسکتی ہے؟

﴿جواب﴾ طلاق بائنہ والی عورت دوران عدت زینت اختیارنہیں کرسکتی،البتہ کسی عذر کی وجہ سے بغیر خوشبو کا تیل لگاسکتی ہے،اسی طرح سرمہ وغیرہ بھی استعمال کرسکتی ہے،بلاعذران چیزوں کا استعمال صحیح نہیں۔

لمافی الهندیۃ:(۱/۵۵۸،طبع قدیمی)

علی المبتوتۃوالمتوفی عنهازوجهااذاکانت بالغۃمسلمۃالحدادفی عدتهاکذافی الکافی،والحدادالاجتناب عن الطیب والدهن والکحل والحناء والخضاب ولبس المطیب والمعصفروالثوب الأحمروماصبغ بزعفران.

ولمافی تنویرالابصار:(۳/۵۳۱،طبع سعید)

(اذاکانت معتدۃ بت اوموت بترک الزینۃ والطیب والدهن والکحل والحناء ولبس المعصفروالمزعفرالابعذر)

الجواب صحیح:عبدالرحمٰن عفااللہ عنہ　　　واللہ اعلم بالصواب:عبدالستار

۱۴۲۸ھ　　　فتوی نمبر:۸۹۳

﴿بوڑھی عورت بھی پوری عدت گزاریگی﴾

﴿سوال﴾ کیافرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میرے والدصاحب کے

فوت ہونے کے پچیس (۲۵) تیس (۳۰) دن بعد میری والدہ (جنکی عمر ساٹھ (۶۰) سال سے زیادہ ہے) علاج کیلئے ایک رشتہ دار ڈاکٹر کے پاس گئیں تو اس ڈاکٹر نے علاج معالجہ کے بعد رات گزارنے کا کہا والدہ نے ایام عدت کا کہہ کر معذرت کرلی جس پر ڈاکٹر نے کہا کہ بوڑھی عورت پر عدت نہیں ہے، پوچھنا یہ ہے کہ واقعی بوڑھی عورت پر عدت نہیں ہے؟ اگر ہے تو علاج معالجے کیلئے گھر سے نکل سکتی ہے یا نہیں اور کتنے دن عدت گزاریگی؟ مستفتی: فرمان علی پورن

﴿جواب﴾ ڈاکٹر کا یہ کہنا کہ ''بوڑھی عورت پر عدت نہیں'' درست نہیں ہے، بوڑھی عورت بھی غیر حاملہ جوان عورت کی طرح چار مہینے اور دس دن عدتِ وفات گزاریگی، دوران عدت اگر گھر پر علاج معالجہ کا بندوبست ہوسکتا ہو تو بہتر ہے ورنہ بدرجہ مجبوری گھر سے نکلنے کی بھی گنجائش ہے، ضرورت پوری کر کے گھر واپس لوٹنا ضروری ہے، رات باہر گزارنے کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔

لما فی التنویر مع الدر والرد: (۵۱۰/۳، طبع سعید)

(و) العدة (للموت اربعة اشهر) بالاهلة لو فی الغرة کما مر (وعشر) من الایام ..... (مطلقا) وطئت اولا ولو صغیرة او کتابیة تحت مسلم ولو عبدا فلم یخرج عنها الا الحامل". (قوله من الایام) أی واللیالی ایضاً کما فی المجتبیٰ.

ولما فیه ایضاً: (۵۳۶/۳ طبع سعید)

(ومعتدة موت تخرج فی الجدیدین وتبیت) اکثر اللیل (فی منزلها) لان نفقتها علیها فتحتاج للخروج، حتی لو کان عندها کفایتها صارت کالمطلقة فلا یحل لها الخروج فتح. وجوّز فی القنیة خروجها لاصلاح مالا بد لها منه کزراعة ولا وکیل لها. (قوله وجوز فی القنیة الخ) قال فی النهر: ولا بد أن یقید ذلک بأن تبیت فی بیت زوجها.

ولما فی الهندیة: (۵۲۹/۱ طبع رشیدیه)

"عدة الحرة فی الوفاة اربعة اشهر وعشرة أیام سواء کانت مدخولا بها او لا مسلمة او کتابیة تحت مسلم صغیرة أو کبیرة أو آیسة .. المعتبر عشر لیال وعشرة أیام عند الجمهور کذا فی معراج الدرایة.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: محمد شاکراللہ

۱۱ جمادی الثانی ۱۴۲۹ھ — فتویٰ نمبر: ۱۶۰۲

﴿دوران عدت حج کیلئے جانا منع ہے﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے متعلق کہ میاں بیوی اس سال دونوں حج کیلئے جانے والے تھے، دونوں نے فارم جمع کروایا تھا، رمضان المبارک کے آخر میں شوہر کا

انتقال ہوگیا، اب سوال یہ ہے کہ عورت اس حالت عدت میں حج کیلئے جاسکتی ہے یا نہیں؟

﴿جواب﴾ دوران عدت عورت کیلئے حج پر جانا منع ہے، عدت گزارنے کے بعد اپنا ذاتی مال اتنا اس کے پاس ہو جس سے وہ اپنے ساتھ کسی محرم کا خرچہ برداشت کر سکے تو دوبارہ اس پر حج فرض ہوگا ورنہ نہیں۔

لمافی التنویر مع الدر:(۲/۴۶۵ طبع سعید)

(وعدم عدة عليها مطلقا)اية عدة كانت ابن ملك (والعبرة لوجوبها)اى العدة المانعة من سفرها(وقت خروج اهل بلدها)وكذا سائر الشروط بحر.

وفى الشامية:(قوله ومع عدم عدة الخ)اى فلا يجب عليها الحج اذا وجدت كما فى شرح المجمع واللباب قال شارحه وهو مشعر بانه شرط الوجوب۔۔۔(قوله اية عدة كانت)اى سواء كانت عدة وفاة او طلاق بائن اورجعى.

ولما فى الهندية:(۱/۲۱۹ طبع رشيديه)

(ومنها عدم قيام العدة فى حق المرأة)عدة وفاة كانت او عدة طلاق والطلاق بائن او رجعى هكذا فى شرح الطحاوى فلا تخرج المرأة الى الحج فى عدة طلاق او موت.

ولما فى قاضيخان على هامش الهندية:(۱/۵۵۴ رشيديه)المعتدة لا تسافر لحج ولا لغيره.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم: محمد حسن پورلوی

۱۱ رجب المرجب ۱۴۲۹ھ — فتویٰ نمبر: ۱۶۵۵

﴿دوران عدت کن کن امور سے احتراز لازمی ہے؟﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلے کے بارے میں کہ میرے والد صاحب کا انتقال ہوگیا ہے۔ میری والدہ عدت گذار رہی ہیں تو ان پر کن کن امور سے احتراز کرنا لازم ہے؟ میرا تایازاد بھائی (جسکی عمر پندرہ سال ہے جب کہ میری والدہ عمر رسیدہ خاتون ہیں) اچانک ہمارے گھر آگیا تو اس سے عدت پر کوئی فرق تو نہیں پڑے گا؟ اس پر ہمارے گھر میں ایک بحث چھڑ گئی ہے کوئی کیا کہتا ہے کوئی کیا؟

نیز ہمارے گھر میں ایک خانساماں بھی ہے جس کی عمر تقریباً بیس سال ہے میری والدہ پر اس سے کتنا پردہ کرنا لازمی ہے؟

مستفتی: علی بن یعقوب

﴿جواب﴾ عدت وفات چار ماہ دس دن ہوتی ہے اگر بیوہ حاملہ نہ ہو، حاملہ ہو تو وضع حمل

سے عدت پوری ہوتی ہے، عدت کے دوران عورت کے لئے گھر سے باہر نکلنا جائز نہیں ہوتا اور گھر پر رہتے ہوئے بھی سوگ کی صورت اختیار کرنے کا حکم ہوتا ہے، میک اپ کرنا، نیا کپڑا پہننا اسی طرح زیب وزینت کی اشیاء کا استعمال منع ہوتا ہے۔ غیر محرم سے پردہ کا حکم تو عام حالات میں بھی ہے البتہ عدت میں اس کی تاکید زیادہ ہوجاتی ہے، آپ کا تایازاد بھائی اگر بالغ ہے تو اس سے پردے کا حکم تو ہے لیکن اس طرح بے دھیانی میں آجانے سے کوئی ایسا گناہ نہیں ہوا جس سے عدت کے حکم میں فرق آتا ہو اور نہ ہی ایسی بات ہے کہ اب اس پر بحث ہوتی رہے۔

آپکی والدہ اگر عمر رسیدہ ہیں اور خادم اور خانساماں سے کام لینے میں کسی قسم کے فتنے کا اندیشہ اگر نہیں ہے تو اب بھی اس سے کام لینے کی گنجائش ہے۔

لمافی التنویر مع الدر المختار:(۳/۵۳۰تا ۵۳۱طبع سعید کراچی)

تحد بضم الحاء وکسرها کما مر مکلفة مسلمة ولو امة منکوحة بنکاح صحیح ودخل بها بدلیل قوله اذ کانت معتدة بت او موت وان امر المطلق او المیت بترکه لانه حق الشرع اظهارا للتاسف علی فوات النکاح بترك الزینة بحلی او حریر او امتشاط بضیق الاسنان والطیب وان لم یکن لها کسب الا فیه والدهن ولو بلا طیب کزیت خالص والکحل والحناء ولبس المعصفر والمزعفر ومصبوغ بمغرة او ورس الا بعذر راجع للجمیع لان الضرورات تبیح المحظورات.

ولما فی فتاوی عالمگیریه:(۱/۵۳۳طبع رشیدیه کوئٹه)

علی المبتوتة والمتوفی عنها زوجها اذا کانت بالغة مسلمة الحداد فی عدتها کذا فی الکافی والحداد الاجتناب عن الطیب والدهن والحناء والخضاب ولبس المطیب والمعصفر والثوب الاحمر وما صبغ بزعفران الا اذا کانت غسیلا لا ینفض ولبس القصب و الخز والحریر ولبس الحلی التزین والامتشاط کذا فی التتارخانیه قال شمس الائمه المراد من الثیاب المذکورة ما کان جدیدا منها تقع به الزینة اما اذا کان خلقا لا تقع به الزینة فلا بأس به کذا فی المحیط.

ولما فیه ایضا:(۱/۵۳۵ طبع رشیدیه کوئٹه)

وان کان المنزل لزوجها وقد مات عنها فلها ان تسکن فی نصیبها ان کان ما یصیبها من ذلک ما یکتفی به فی السکنی وتستتر عن سائر الورثة ممن لیس بمحرم لها کذا فی البدائع

ولما فی التنویر مع الدر المختار:(۶/۳۶۹ طبع سعید کراچی)

وینظر من الاجنبیة ولو کافرة مجتبی الی وجهها وکفیها فقط للضرورة قیل والقدم والذراع اذا اجرت لنفسها للخبز.

ولما فیه ایضا:(۶/۳۶۸طبع سعید کراچی)

اما العجوز التی لاتشتهی فلا بأس بمصافحتها ومس یدها اذا امن.

ولما فی الھندیہ:(۵/۳۲۹،طبع رشیدیہ کوئٹہ)

واما النظر الی الاجنبیات فنقول یجوز النظر الی مواضع الزینة الظاهرة منهن وذالک الوجه والکف فی ظاهر الروایة کذا فی الذخیرة وان غلب علی ظنه انه یشتهی فهو حرام کذا فی الینابیع .النظر الی وجه الاجنبیة اذالم یکن عن شهوة لیس بحرام لکنه مکروه کذا فی السراجیه ـــــ ولا یحل له ان یمس وجهها ولا کفها وان کان یأمن الشهوة وهذا اذا کان شابة تشتهی فان کانت لاتشتهی لا بأس بمصافحتها ومس یدها کذا فی الذخیرة.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ واللہ اعلم بالصواب: محمد اویس غفرلہ ولوالدیہ

۲۰ ربیع الاول ۱۴۳۲ھ فتویٰ نمبر: ۳۶۲۳

﴿دوران عدت ہم بستری کرنے سے تجدید عدت لازم نہیں ہوتی﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک شخص نے اپنی بیوی کو طلاق دیدی گواہان کی موجودگی میں تین طلاق دینے کے بعد بیوی شوہر کے گھر میں ہی رہی شوہر اسکے ساتھ مار پیٹ اور ہم بستری کرتا رہا، دس ماہ تک یہ سلسلہ جاری رہا جبکہ دونوں کے چار بچے ہیں جن میں دو فوت ہو چکے ہیں اور دو حیات ہیں، اب وہ والد کے پاس ہیں اور عورت تو موقع دیکھ کر گھر سے بھاگ گئی۔

پوچھنا یہ ہے کہ وہ عورت از سر نو عدت گزار کر دوسری جگہ نکاح کرے یا بغیر عدت کے بھی نکاح کر سکتی ہے جبکہ طلاق ہوئے تقریباً سال ہونے کو ہے، ابھی وہ عورت دوسرے شہر آگئی ہے اور کسی دوسرے شخص سے نکاح کرنا چاہتی ہے، دین اسلام میں اس بارے میں کیا حکم ہے؟

﴿جواب﴾ تین طلاقیں دیکر بھی مطلقہ بیوی کو بیوی کی طرح رکھنا بڑا گناہ ہے اور اس سے ملنا زنا ہے جبکہ زنا سے عدت واجب نہیں ہوتی، طلاق دیئے ہوئے سال گذر گیا ہے تو بظاہر عدت گذر گئی ہے، لہٰذا اگر عدت گزر گئی ہے تو یہ عورت دوسری جگہ شادی کر سکتی ہے، عدت طلاق کے بعد تین ماہواری گزرنے پر پوری ہو جاتی ہے۔

لما فی ردالمحتار:(۵/۲۰۰،طبع امدادیہ)

قوله:(بشبهة) متعلق بقوله:"وطئت" وذالک کالموطوءة للزوج فی العدة بعد الثلاث بنکاح وکذا بدونه اذاقال:ظننت أنها تحل لی،أو بعد ما أبانها بألفاظ الکنایة،وتمامه فی الفتح،ومفاده انه لو وطئها بعد الثلاث فی العدة بلا نکاح عالما بحرمتها لاتجب عدة أخری لأنه زنا.

ولما فی الهندیة:(۱/۵۳۲،طبع رشیدیه)

واما المطلقة ثلاثا اذا جامعها زوجها فی العدة مع علمه انها حرام علیه ومع اقراره بالحرمة لاتستأنف العدة ولکن یرجم الزوج والمرأة.

ولما فی البزازیة علی هامش الهندیة:(۴/۲۵۷ طبع رشیدیه)

طلقها ثلاثا ووطئها فی العدة مع العلم بالحرمة لاتستأنف العدة وتنقضی العدة بثلاث حیض ویرجمان اذا علما بالحرمة ووجد شرائط الاحصان.[۱]

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: خلیل اللہ دیروی

۸ جمادی الاولیٰ ۱۴۲۹ھ — فتویٰ نمبر: ۱۴۶۵

﴿معتدۃ الوفاۃ کے لئے شرعی احکامات﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ اگر کسی عورت کے شوہر کا انتقال ہو جائے تو شریعت نے اس عورت پر عدت لازم کی ہے، پوچھنا یہ ہے کہ شوہر کے گھر میں ہی عدت گزارنا لازم ہے یا کہیں اور بھی عدت کے ایام گزار سکتی ہے؟

اسی طرح کونسی ضروریات کو پورا کرنے کے لئے عورت گھر سے نکل سکتی ہے اور عدت کے دوران کن کن چیزوں سے عورت کو منع کیا گیا ہے؟ — مستفتی: گلزار اللہ پشاور

﴿جواب﴾ عدت وفات شوہر کے گھر میں گزارنا ضروری ہے یعنی شوہر کے انتقال کے وقت جس گھر میں یہ عورت رہائش اختیار کی ہوئی تھی اسی گھر میں عدت پوری کرنا واجب ہے، البتہ اس گھر میں عورت کی عزت یا جان کا خطرہ ہو یا اس گھر میں کھانے پینے کی اشیاء کا بندوبست کرنا ممکن نہ ہو یا مکان کرائے کا ہو اور مالک مکان خالی کرانے پر اصرار کرے تو ایسی مجبوریوں میں ولی کے گھر میں عدت گزارے۔ دوران عدت عورت پر لازم ہے کہ گھر سے باہر نہ نکلے البتہ فطری ضروریات کے لئے مثلاً روزی کا انتظام کرنا یا علاج کے لئے باہر جانا پڑ جاتا ہے اور گھر میں وہ ضرورت پوری نہ ہو سکتی ہو تو دن میں پردے کے ساتھ نکلنے کی گنجائش ہے، رات بہر حال گھر میں گزارنے کا حکم ہے۔

مذکورہ پابندیوں کے علاوہ شریعت نے دوران عدت نکاح اور دواعی نکاح سے بھی سختی کے ساتھ منع کیا ہے، اس لئے سوگ کا حکم ہے یعنی کسی قسم کی زینت اختیار کرنا گناہ ہے، لہٰذا نیا کپڑا پہننا اسی طرح میک اپ کرنا، خوشبو لگانا سب منع ہیں، پردہ کا اہتمام ویسے بھی ضروری ہے لیکن

عدت کے دنوں میں اس حکم کی تاکید بہت زیادہ ہے۔

لما فی التنویر مع الدر:(۵۳۶/۳،طبع سعید)

(ومعتدة موت تخرج فی الجدیدین وتبیت) أکثر اللیل (فی منزلها) لان نفقتها علیها فتحتاج للخروج وجوز فی القنیه خروجها للاصلاح مالابدلها منه کزراعة ولاوکیل لها ۔۔۔۔(وتعتدان) ای معتدة طلاق وموت (فی بیت وجبت فیه) ولا یخرجان منه (الاان تخرج اوینهدم المنزل اوتخاف) ۔۔۔۔ (تلف مالها اولاتجد کراء البیت) ونحوذلک من الضرورات فتخرج لاقرب موضع الیه.

وفی الشامیة: (قوله فی بیت وجبت فیه) هو مایضاف الیهما بالسکنی.

ولما فی الهندیة: (۵۳۳/۱،طبع رشیدیه)

علی المبتوته والمتوفی عنها زوجها اذاکانت بالغة مسلمة الحداد فی عدتها ۔۔۔ والحداد الاجتناب عن الطیب والدهن والکحل والحناء والخضاب ولبس الطیب ۔۔۔۔ ولبس الحلی والتزین ولامتشاط کذافی التاتارخانیه قال شمس الائمة المرادمن الثیاب المذکورة ماکان جدیدأمنهاتقع به الزینه ۔۔۔ وانمایلزمها الاجتناب فی حالة الاختیار اما فی حالة الاضطرار فلاباس بها ان اشتکت راسها او عینها فصبت علیها الدهن او اکتحلت لاجل المعالجة فلاباس به ولکن لاتقصدبه الزینة کذافی المحیط.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ والله اعلم بالصواب: نعیم اقبال عفا اللہ عنہ

۱۸ صفر الخیر ۱۴۳۱ھ فتویٰ نمبر: ۲۴۵۰

﴿حمل ساقط کروانے سے عدت کا حکم﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ زید نے اپنی بیوی ہندہ کو جو پانچ ماہ کی حاملہ تھی، تین طلاق دیدی، ہندہ نے پانچ ماہ والا حمل اسقاط کروادیا، مذکورہ حالت میں ہندہ کی عدت کیا ہوگی؟ مستفتی: محمد طارق

﴿جواب﴾ اگر اسقاط شدہ حمل میں بچہ کی شبیہ یا خلقت کسی حد تک ظاہر ہوگئی تھی تو ہندہ کی عدت مکمل ہوگئی ہے لیکن ایسے بچے کو ساقط کرنا قتل جیسا گناہ ہے۔

لما فی التنویر مع الدر:(۵۱۱/۳-۵۱۲،طبع سعید)

(و) فی حق (الحامل) مطلقاولوامة اوکتابیة اومن زناباَن تزوج حبلی من زناودخل بها ثم مات اوطلقها تعتدبالوضع جواهر الفتاوی (وضع) جمیع (حملها) لان الحمل اسم لجمیع مافی البطن وفی البحر: خروج اکثر الولد کالکل فی جمیع الاحکام الافی حلها للازواج احتیاطاً ولاعبرة بخروج الراس ولومع الاقل.

وفی الشامیة:(قوله لان الحمل الخ)علة لتقدیر لفظ الجمیع فلو ولدت وفی بطنها آخر تنقضی العدة بالآخر،واذا اسقطت سقطاان استبان بعض خلقه انقضت به العدة لانه ولدو الافلا.

ولما فی البحر الرائق:(۱۴۵/۴،طبع سعید)

واذا سقطت سقطا استبان بعض خلقه انقضت به العدة لانه ولدوان لم یستبن بعض خلقه لم تنقض لان الحمل اسم لنطفة متغیرة بدلیل ان الساقط اذاکان علقة او مضغة لم تنقض به العدة لانها لم تتغیر فلا یعرف کونها متغیرة بیقین الاباستبانة بعض الخلق کذا فی المحیط

الجواب صحیح:عبدالرحمٰن عفااللہ عنہ　　　　واللہ اعلم بالصواب:نعمان اقبال عفااللہ عنہ

۱۶جمادی الاولیٰ ۱۴۳۱ھ　　　　فتویٰ نمبر:۲۷۰۰

﴿باب فی الحضانة وثبوت النسب﴾

﴿طلاق کے بعد بچے کی پرورش کا حق کس کو حاصل ہے؟﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان دین متین اس مسئلہ کے بارے میں کہ زید نے اپنی بیوی کو طلاق دے دی، اس بیوی سے زید کی ایک بچی بھی ہے، طلاق کے بعد یہ بچی اپنی ماں کے پاس رہی، کچھ عرصہ کے بعد اس کی ماں نے دوسرا نکاح کر لیا، اب زید جو اس بچی کا باپ ہے وہ کہہ رہا ہے کہ بچی میرے پاس رہے گی اور نانی کہتی ہے کہ بچی کی تربیت و پرورش کا حق مجھے حاصل ہے، شریعت کی رو سے بچی کی پرورش کا حق کس کو حاصل ہے باپ کو یا نانی کو؟

﴿جواب﴾ مذکورہ صورت میں بچی کی والدہ نے جب دوسرا نکاح کر لیا تو اس سے اس کا حق حضانت ساقط ہو گیا، اب اس کی تربیت و پرورش کی زیادہ حقدار اس کی نانی ہے نہ کہ بچی کا باپ، تاہم بچی کے تمام اخراجات باپ کے ذمہ ہوں گے۔

لما فی الهدایة:(۴۳۸/۲،باب حضانة الولدومن احق به طبع رحمانیه)

واذا وقعت الفرقة بین الزوجین فالام احق بالولد لماروی ان امرأة قالت یارسول الله ان ابنی هذاکان بطنی له وعاء وحجری له حوی وثدیی له سقاء وزعم ابوه انه ینزعه منی فقال علیه السلام انت احق به مالم تتزوجی ولان الام اشفق واقدر علی الحضانة فکان الدفع الیهاانظر...... والنفقة علی الاب علی مانذکر......فان لم تکن له ام فام الام اولی من ام الاب وان بعدت لان هذه الولایة تستفادمن قبل الامهات

الجواب صحیح:عبدالرحمٰن عفااللہ عنہ　　　　واللہ اعلم:صلاح الدین ڈیروی

۲۲ربیع الثانی ۱۴۲۷ھ　　　　فتویٰ نمبر:۱۶۸

﴿نکاح کے تین ماہ بعد پیدا ہونے والی بچی کی پرورش اور ولایت کا مسئلہ﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میرے بھائی کی شادی کے تین ماہ بعد اس کی بیوی کے ہاں بچی کی پیدائش ہوئی، جو شادی سے پہلے بھائی کے ساتھ غلط تعلق کا نتیجہ تھا، ابھی وہ بچی تقریباً آٹھ سال کی ہے اور بھائی نے بیوی کو حالت حمل میں تین طلاقیں دی ہیں، عورت اپنے میکے میں عدت گزار رہی ہے۔

پوچھنا یہ ہے کہ کیا حالت حمل میں طلاق واقع ہو جاتی ہے؟ اس کے علاوہ یہ بھی بتا دیں کہ نکاح کے تین ماہ بعد پیدا ہونے والی بچی کا خرچہ اور پرورش کس کے ذمہ ہے؟ جبکہ میرا بھائی نکاح سے پہلے تعلق کو تسلیم کرتا ہے، مزید یہ کہ اس کم سن لڑکی کا نکاح ہم کر سکتے ہیں یا نہیں؟

﴿جواب﴾ طلاق حالت حمل میں بھی واقع ہو جاتی ہے، لہٰذا یہ خاتون عدت گزار کر کسی دوسری جگہ چاہے تو نکاح کر سکتی ہے۔

لما فی التنویر مع الدر:(۲۳۲/۳، طبع سعید)(وحل طلاقهن)أی الآیسة والصغیرة والحامل.

لڑکی کے بارے میں اس شخص کے اقرار کو دیکھا جائیگا اگر وہ کہتا ہے کہ یہ میری لڑکی ہے، غلط کاری کے نتیجے میں پیدا ہوئی ہے، اس طرح کی کوئی وضاحت نہیں کرتا تو یہ لڑکی ثابت النسب ہوگی، اس شخص کو ولایت حاصل ہوگی، بالغ ہونے سے پہلے والد اس کا نکاح بھی مناسب جگہ کر سکتا ہے اور نان نفقہ بھی اسکے ذمہ ہوگا، ایک دوسرے کے وارث بھی ہوں گے اور اگر وضاحت کیساتھ کہتا ہے کہ زنا سے یہ لڑکی پیدا ہوئی ہے تو اس صورت میں لڑکی صرف ماں کی طرف منسوب ہوگی اور ولایت بھی اسی کو حاصل ہوگی۔

لما فی التنویر مع الرد:(۴۹/۳، طبع سعید)

[فروع]لو نكحها الزانی حل له وطؤها اتفاقا والولدله ولزمه النفقة.

وفی الشامیة:(قوله والولدله)أی ان جاء ت بعد النكاح لستة اشهر مختارات النوازل، فلو لاقل من ستة اشهر من وقت النكاح لا یثبت النسب ولا یرث منه الاان یقول هذا الولد منی، ولایقول من الزنی خانیة.

ولما ایضا فیها:(۷۸/۳، طبع سعید)

(فان لم یكن عصبة فالولایة للأم) وفی الشامیة:(قوله فالولایة للأم الخ)أی عندالامام ومعه ابویوسف فی الأصح وقال محمدلیس لغیر العصبات ولایة وانما هی للحاكم

والاول الاستحسان،والعمل عليه الافی مسائل ليست هذه منها.

ولمافی الهندية:(۱/ ۵۴۰،طبع رشيديه)

ولوزنیٰ بامرأة فحملت ثم تزوجها فولدت ان جاء ت به لستة اشهر فصاعداثبت نسبه وان جاء ت به لاقل من ستة اشهرلم يثبت نسبه الاان يدعيه ولم يقل انه من الزناأماان قال انه منی من الزنافلايثبت نسبه ولا يرث منه.كذافی الينابيع.

ولمافی البحر:(۸/ ۵۰۲،طبع سعيد)

(ولايرث ولدالزناواللعان من جهة الام فقط)۔۔۔ ولايتصورأن يرث هوأو يورث بالعصوبة۔۔۔۔وكذايرث معتقه اومعتق معتقه أوولده بذلك وقدتقدم.

الجواب صحیح:عبدالرحمٰن عفااللہ عنہ واللہ اعلم بالصواب:خلیل اللہ دیروی عفااللہ عنہ

۲۲ربیع الثانی ۱۴۲۹ھ فتویٰ نمبر:۱۳۷۹

﴿بچی کا حق پرورش نوسال تک ماں کو حاصل ہے﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میرے بھائی کی اہلیہ نے کورٹ کے ذریعے خلع لیا ہے،اوراس سے میرے بھائی کی ایک بچی بھی ہے جس کی عمر تقریباً ۱۳/۱۴سال ہے،اب ماں نے اس لڑکی کے غیر محرم کیساتھ دوسرے جگہ شادی کرلی ہے اورلڑکی بھی اسی کے پاس رہ رہی ہے،لڑکی کا خرچہ والد صاحب یعنی میرے بھائی ادا کررہے ہیں ،پوچھنا یہ ہے کہ شرعاً ایسی صورت میں مذکورہ لڑکی کی پرورش کا حق کسے حاصل ہے،جبکہ ابھی وہ جوان ہونے کے قریب ہے،اور ہمارے لئے بھی یہ بڑی عار کی بات ہے کہ ہماری بچی غیر کے پاس رہے،لڑکی کی دادی ابھی تک حیات ہیں اور ہمارے ہاں گھر پہ ہی رہائش پزیر ہیں نیز اس کی نانی بھی حیات ہے لیکن وہ بیرونی ملک کسی غیر مسلم ملک میں رہ رہی ہے۔ مستفتی:محمد آصف

﴿جواب﴾ لڑکی کا حق پرورش نو'۹' سال کی عمر تک ماں کو حاصل ہے بشرطیکہ ماں نے اس لڑکی کے غیر محرم کیساتھ شادی نہ کی ہو،اگر شادی کی ہو تو اس کا حق پرورش ساقط ہوجاتا ہے۔ صورت مذکورہ میں چونکہ ماں نے لڑکی کے غیر محرم کیساتھ شادی کی ہے اس لئے اسکا حق پرورش باقی نہیں رہا،اوراس کے علاوہ چونکہ اب لڑکی کی عمر نوسال سے زیادہ ہوگئی ہے اس لئے اب والد کو یہ حق حاصل ہے کہ لڑکی اپنے پاس رکھے۔

لمافی الدر المختار:(۳/ ۵۶۵،طبع سعید)

(و)الحاضنة(يسقط حقها بنكاح غير محرمه)ای الصغير وكذابسكناها عند المبغضين

له فمالى القنية او تزوجت الام بآخر فامسكته ام الام فى بيت الراب فللأب أخذه

وفيه فى الدر المختار :(۵٦٧/۳،طبع:سعيد)

(وغيرهما احق بهما حتى تشتهى)وقدر بتسع وبه يفتى وبنت احدى عشرة مشتهاة اتفاقا زيلعى (وعند محمد أن الحكم فى الام والجدة كذلك)وبه يفتى لكثرة الفساد زيلعى

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ

واللہ اعلم بالصواب: عزیز اللہ آغا عفی عنہ

۵ جمادی الاولی ۱۴۳۳ھ

فتوی نمبر: ۳۲۲۸

﴿باپ کی وفات کے بعد نابالغ بچوں کی پرورش کا حق کس کو حاصل ہے؟﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان شرع دین متین اس مسئلہ کے بارے میں کہ میرے بھائی کا ڈھائی سال قبل انتقال ہوگیا تھا اس نے ترکہ میں کچھ نہیں چھوڑا ہے ان کے لواحقین میں انکی بیوہ اور دو بیٹیاں تھیں وہ اپنے شوہر کی وفات کے بعد ڈھائی سال تک ہمارے ساتھ رہی اب وہ اپنے والدین کے گھر جانا چاہتی ہے، پوچھنا یہ ہے کہ کیا وہ اپنے ساتھ اپنے بچوں کو لے جاسکتی ہے یا نہیں یعنی وہ انکی پرورش کرسکتی ہے؟ نیز بلوغت کے بعد وہ بچے ازروئے شریعت کس کے پاس رہینگے؟ دوسری بات یہ پوچھنی ہے کہ میری بھابی کو میرے والد صاحب کی جائیداد میں حصہ کے مطالبہ کا حق حاصل ہے یا نہیں؟ جبکہ میرے والد ابھی حیات ہیں، برائے مہربانی شریعت کی روشنی میں جواب عنایت فرمائیں۔

مستفتی: محمد صابر سخاکوٹ

﴿جواب﴾ بچیوں کی پرورش کا حق بالغ ہونے تک انکی والدہ کو حاصل ہے اور خرچہ بچیوں کے ولی یعنی دادا کے ذمہ ہے۔ بلوغت کے بعد انکا دادا بچیوں کو اپنے پاس رکھ سکتے ہیں آپکے بھائی مرحوم کی ذاتی جائیداد وغیرہ اگر نہیں تھی تو والد صاحب کی جائیداد میں انکی بیوی بچوں کا کوئی حصہ نہیں بنتا البتہ بچیوں کا دادا چاہے تو زندگی مین بطور ھبہ اپنی پوتیوں کو دے سکتے ہیں اور ایک تہائی کی حد تک ان کیلئے وصیت کرنا چاہے تو کرسکتے ہیں۔

(والحاضنة)أما أو غيرها(أحق به)أى بالغلام (والأم والجدة) لأم أو لأب (احق بها)أى بالصغيرة(حتى تحيض) أى تبلغ فى ظاهر الرواية،

وفى الشامى:۵٦٦/۳، طبع سعيد)

وفى الخلاصة وغيرها:واذا استغنى الغلام وبلغت الجارية فالعصبة أولى، يقدم الأقرب فالأقرب ولاحق لابن العم فى حضانة الجارية اهـ

أيضا وفي الفتح: ويجبر الأب على أخذ الولد بعد استغنائه عن الأم لأن نفقته وصيانته عليه بالاجماع ا هـ

ولما في التنوير مع الدر: (۵۶۶/۳، طبع سعيد)

(وغيرها أحق بها حتى تشتهي) وقدر بتسع، وبه يفتى، وبنت احدى عشرة مشتهاة اتفاقا زيلعي (وعن محمد أن الحكم في الأم والجدة كذالك)

ولما في البدائع: (۴/۳۵، ۳۶ طبع سعيد)

ولو كان لهم جد موسر لم يفرض النفقة على الجد ولكن يؤمر الجد بالانفاق عند حاجتهم...... وان لم يكن الأب قادرا على الكسب بان كان زمنا قضي بنفقتهم على الجد لأن عليه نفقة أبيهم فكذا نفقتهم.

ولما في الشامي: (۶/۷۵۸، طبع سعيد)

وموضوعه (أي موضوع علم الفرائض) التركات...... وأركانه ثلاثة: وارث، ومورث، وموروث

ولما في شرح المجلة المادة ۱۱۹۲ (۴/۱۳۲، طبع رشيديه)

كل يتصرف في ملكه كيف شاء لكن اذا تعلق حق الغير به يمنع المالك من تصرفه على وجه الاستقلال.

ولما في البحر: (۸/۴۰۲، طبع سعيد)

(وهي مستحبة) يعني الوصية مستحبة (ولا تصح بما زاد على الثلث)

الجواب صحیح: مفتی عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: عمران الحق سواتی

۲ ربیع الثانی ۱۴۳۵ھ — فتویٰ نمبر: ۲۰۰۸

﴿طلاق کے بعد بچے کی پرورش کا حق کس کو ہے؟﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ جاوید نے اپنی بیوی کو طلاق دیدی ہے، جاوید کا اس بیوی سے ایک دودھ پیتا بچہ بھی ہے، مطلقہ بیوی عدت گزرنے کے بعد بچے کو لیکر میکے چلی گئی، اب اس بچے کے بارے میں اختلاف ہو رہا ہے، جاوید بچے کے لینے کا اصرار کرتا ہے اور عورت دینے سے انکار کررہی ہے اور کہتی ہے کہ پرورش کا حق مجھے حاصل ہے، غرض یہ ہے کہ شریعت کی رو سے پرورش کا حق ماں کو حاصل ہے یا نہیں؟ اگر حاصل ہے تو کتنے عرصے تک حاصل ہے؟ بینوا توجروا۔

﴿جواب﴾ بچے کی پرورش کا حق ماں کو حاصل ہے بشرطیکہ وہ کسی دوسری جگہ شادی نہ کرے شادی کرنے کی صورت میں اس کا یہ حق ساقط ہو جاتا ہے، البتہ بچے کے محرم سے شادی کرلی تو

اس صورت میں اس کا یہ حق باقی رہے گا، لہٰذا مذکورہ صورت میں یہ عورت بچے کو سات سال تک اپنے پاس رکھ سکتی ہے اور اس کے خرچہ کا جاوید سے مطالبہ کر سکتی ہے۔

لما فی الھدایۃ:(۱/۴۲۸-۴۲۹-۴۳۰،طبع رحمانیہ)

واذا وقعت الفرقۃ بین الزوجین فالام احق بالولد ..... والنفقۃ علی الاب..... والام والجدۃ احق بالغلام حتی یاکل وحدہ ویشرب وحدہ ویلبس وحدہ ویستنجی وحدہ..... لان تمام الاستغناء بالقدرۃ علی الاستنجاء..... والخصاف قدر الاستغناء بسبع سنین..... الخ.

ولما فی الھندیۃ:(۱/۵۴۱-۵۴۲،طبع رشیدیہ)

أحق الناس بحضانۃ الصغیر حال قیام النکاح أو بعد الفرقۃ الام الا ان تکون مرتدۃ أو فاجرۃ غیر مامونۃ کذا فی الکافی..... والام والجدۃ أحق بالغلام حتی یستغنی وقدر بسبع سنین.

ولما فی التنویر مع الدر:(۳/۵۵۵تا۵۶۶،باب الحضانۃ،طبع سعید)

(تثبت للأم)..... (ولو)..... (بعد الفرقۃ .....)..... (وتستحق) الحاضنۃ (اجرۃ الحضانۃ.....) ..... (و) الحاضنۃ (یسقط حقھا بنکاح غیر محرمہ) ای الصغیر..... (والحاضنۃ) أما أو غیرھا (أحق بہ) ای بالغلام حتی یستغنی عن النساء وقدر بسبع وبہ یفتی.

الجواب صحیح:عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب:عبداللہ عفا اللہ عنہ

۲۸ جمادی الثانی ۱۴۲۸ھ — فتویٰ نمبر:۱۰۲۴

﴿ تفریق کی صورت میں سات سال کی عمر تک حق پرورش ماں کو حاصل ہے ﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں حضرات مفتیان کرام اس مسئلہ کے بارے میں، کہ میری بہن کو طلاق ہوئی اور اسکا مہر تقریباً 5 لاکھ روپے تھا، ہم نے جب ان لوگوں سے بہن کیلئے مہر کا مطالبہ کیا تو انہوں نے کچھ عرصے کیلئے مہلت مانگی جو کہ وہ پوری ہوگئی، انہوں نے بچے کے بارے میں کہا کی وہ بھی ہمیں دیں چونکہ میں نے بہن اور ماں سے کوئی مشورہ نہیں کیا تھا اس لئے کچھ نہ کہہ سکا، لیکن وہ لوگ کہہ رہے ہیں کہ آپ نے وعدہ کر لیا تھا، تو پوچھنا یہ ہے کہ اب اس بچے کی پرورش کا حق دار کون ہے؟ یہ بھی واضح رہے کہ اس بچے کی نانی بھی حیات ہے۔

﴿جواب﴾ میاں بیوی کی تفریق کی صورت میں بچے کی پرورش کا حق اسکی والدہ کو حاصل ہے، سات سال کی عمر تک وہ اپنے پاس رکھ سکتی ہے اور اس کے ضروری خرچے بچے کے والد کے ذمہ ہے۔ البتہ یہ خاتون اگر دوسری ایسی جگہ شادی کرلے جو بچے کیلئے محرم نہ ہوں تو اسکا یہ حق ساقط ہو جاتا ہے، اور بچے کی نانی پھر پرورش کا حق رکھتی ہے۔ آپ نے بالفرض اگر ان لوگوں کے

ساتھ یہ عہد کر لیا تھا کہ بچہ آپ لوگوں کے حوالہ کروں گا تو اس کا آپکو کوئی حق حاصل نہیں ہے،
نومولود بچے کی ضروریات کا خیال اسکی والدہ ہی بہتر رکھ سکتی ہے اور بالفرض اس بچے کی والدہ کسی
وجہ سے بچہ اپنے پاس اگر نہیں رکھتی تو نانی چونکہ حیات ہے پھر اسکا حق ہے لہذا بچے کی والدہ اور
نانی کی رضامندی کے بغیر آپ از خود اس فیصلہ کا مجاز نہیں ہے کہ بچہ اس کے والد کے حوالہ کریں۔

لما فی التنویر مع الدر:۵۵۵/۳،۵۶۲،۵۶۳ طبع سعید

تربیة الولد (تثبت للأم)ثم بعد الام بان ماتت أو لم تقبل أو تزوجت بأجنبي (ام الام)ثم ام الاب ثم الاخت لاب وأم ثم لام ثم الاخت لاب ـــ ثم الخالات كذالك.

ولما فی التنویر مع الدر أيضا:۵۶۶/۳ طبع سعید

والحاضنة احق به اى بالغلام حتى يستغنى عن النساء وقدر بسبع وبه يفتى لانه الغالب ولو اختلفا فى سنه فان اكل وشرب ولبس واستنجى وحده دفع اليه ولو جبرا والا لا.

ولما فی الشامی:۵۶۲/۳ طبع سعید

فان كان الاب معسرا والصغير له مال أو لا يقال للام اما ان تمسكيه مجانا أو تدفعيه للعمة مثلا المتبرعة صونا لماله لو له مال،وان كان الاب موسرا والصغير له مال فكذالك،لان الاجرة حينئذ على الصغير،وان كان الاب موسرا ولا مال للصغير فالام مقدمة وان طلبت الاجرة نظرا للصغير بلا ضرر له فى ماله.

ولما فی التنویر مع الدر:۵۵۹/۳ طبع سعید

واذا اسقطت الام حقها صارت كميتة او متزوجة فتنتقل للجدة بحر ولا تقدر الحاضنة على ابطال حق الصغير فيهما حتى لو اختلعت على ان تترك ولدها عند الزوج صح الخلع وبطل الشرط لانه حق الولد فليس لها ان تبطله بالشرط ولو لم يوجد غيرها اجبرت بلا خلاف وهذا يعم مالو وجد وامتنع من القبول بحر.

ولما فی الشامی ایضا:۵۵۹/۳

فتنتقل للجدة اى تنتقل الحضانة لمن يلى الام فى الاستحقاق كالجدة ان كانت والا فلمن يليها فى مايظهر واستظهر الرحمتى أن هذا الاسقاط لايدوم فلها الرجوع لان حقها يثبت شيئا فشيئا فيسقط الكائن لا المستقبل اى فهو كاسقاطها القسم لضرتها فلا يرد ان الساقط لا يعود لان العائد غير ساقط۔ثم رايت بخط بعض العلماء وعن المفتى ابى السعود مسئلة فى رجل طلق زوجته ولها ولد صغير منه واسقطت حقها من الحضانة وحكم بذالك حاكم فهل لها الرجوع باخذ الولد؟الجواب: نعم لها ذالك فان اقوى الحقين فى الحضانة للصغير ولئن اسقطت الزوجة حقها فلا تقدر على اسقاط حقه ابدا.

ولمافی الشامی ایضا ۵۶۱/۲

قال فی البحر: لعلی هذا یجب علی الاب ثلثة: اجرة الرضاع، واجرة الحضانة، ونفقة الولد، ومثله فی الشرنبلالیة.

الجواب صحیح: عبد الرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: محمد زبیر غفرلہ ولوالدیہ

۳ صفر المظفر ۱۴۳۴ھ — فتویٰ نمبر: ۲۵۰۴

﴿اخلاقی نقصان کی وجہ سے عورت کا حق پرورش ساقط ہو جائیگا﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کہ بارے میں کہ میری شادی ۲۰۰۸ء میں اجالہ فرخ بنت سید جواد شاہ سے ہوئی جس سے میرا ایک بیٹا بھی ہے، میں اپنی بیوی کی تمام ضروریات پوری کرتا ہوں، اور اس کو ہر طرح سے خوش رکھنے کی کوشش کرتا ہوں، لیکن وہ میرے ساتھ رہنے پر راضی نہیں، اور اصل بات یہ ہے کہ اس کے والدین اپنی بیٹیوں سے کمائی کرتے ہیں، ایک جوان بیٹی فیشن ڈیزائنر ہے بازار میں مردوں کے ساتھ مخلوط ماحول میں کام کرتی ہے اور میری بیوی کو آرٹی فیشل اسٹال پر مارکیٹ میں بٹھاتے ہیں، اس کے علاوہ ان کے گھر کا ماحول دینی لحاظ سے انتہائی خراب ہے، میری بیوی بغیر کسی خلع وطلاق کے اپنے والدین کے گھر پر ہے اور وہ میرے چار سالہ بیٹے کو بھی اپنے ساتھ رکھنے کا مطالبہ کرتی ہے جبکہ بیٹے کو اس کے ساتھ چھوڑنے میں اس کے خراب ماحول میں بڑے نقصان ہونے کا اندیشہ ہے، اس ماحول میں پاک تربیت سے محروم ہو جائے گا بلکہ بالکل بیکار سا ہو جائے گا، جبکہ میں اور میرے والدین اپنے بیٹے کا ہر طرح سے خیال رکھتے ہیں اور اس کو "حق اکیڈمی اسکول" میں بھی داخل کرادیا ہے اور نماز کی بھی عادت ڈلواتے ہیں۔

غرض مسئلہ یہ ہے کہ کیا ان حالات کے باوجود مجھ پر اپنے بیٹے کو اپنی بیوی کے حوالے کرنا ضروری ہے؟

مستفتی: فرخ پٹیل

﴿جواب﴾ واضح رہے کہ مفتی غیب نہیں جانتا، اور سوال میں درج شدہ باتوں کی حقائق تک رسائی بھی مفتی کی ذمہ داری نہیں ہے مفتی تو سوال کے مطابق جواب دیتا ہے، لہذا آپ نے سسرال کے متعلق جو احوال لکھے ہیں یہ باتیں اگر سچ ہیں تو ایسی صورت حال میں بچے کو ننیال میں اس کے ماں کے حوالے کرنا جائز نہیں ہے، یہ بچے کیساتھ زیادتی ہوگی، اور آپ کو قدرت ہو تو

اپنی بیوی کو بھی اپنے گھر میں پابند کریں نرمی سے بات نہ مانے تو زبردستی اور سختی کی بھی گنجائش ہے نکاح میں ہوتے ہوئے کسی بھی عورت کو شوہر کی اجازت کے بغیر گھر سے باہر جانے کی شریعت اس کے خود کو کوئی اجازت نہیں دیتی، چہ جائے کہ وہ اپنے بچے کو بھی ساتھ لے جائے، البتہ طلاق یا خلع کی صورت میں پرورش کا حق سات سال کی عمر تک والدہ کو مشروط طور پر حاصل ہے۔

(۱) کہ کسی ایسے آدمی سے وہ شادی نہ کرے جو بچے کے لئے غیر محرم ہو، ایسی جگہ شادی کرنے سے اس کا حق پرورش ساقط ہو جائے گا۔ نمبر (۲) والدہ بچے کو ایسے ماحول میں نہ رکھے جہاں اس کے جان یا اخلاق کے نقصان کا قوی اندیشہ ہو ایسی صورت اگر ہو تو پرورش کا حق اس کو حاصل نہیں۔

(۳) عورت مجبوراً اگر کمانے کے لئے نکلتی ہے اور کام کاج کی وجہ سے بچے پر شفقت کے تقاضوں کو پورا نہیں کر سکتی تو ایسی صورت میں بھی اس کا یہ حق باقی نہیں رہتا۔ لیکن آپ کی بیوی تو تا حال آپ کے نکاح میں ہے اس کے لئے اپنی ذات کو آپ سے الگ دور رکھنا جائز نہیں ہے چہ جائیکہ وہ بچے کو آپ سے جدا کرے۔

لما فی الشامی: (۳/۵۵۵، طبع: سعید)

قال الرملی: ویشترط فی الحضانة ان تکون حرة بالغة عاقلة امینة قادرة۔۔۔ والمراد بکونها امینة ان لا یضیع الولد عندها باشتغالها عنه بالخروج من منزلها کل وقت،

ولما فیه أیضاً: (۳/۵۵۷ طبع: سعید)

والحاصل ان الحضانة ان کانت فاسقة فسقا یلزم منه ضیاع الولد عندها سقط حقها والا فهی احق به الی ان یعقل فینزع منها کالکتابیة (قوله بان تخرج کل وقت الخ) المراد کثرة الخروج لان المراد علی ترك الولد ضائعا والولد فی حکم الامانة عندها، ومضیع الامانة لا یستأمن، ولا یلزم ان یکون خروجها لمعصیة حتی یستغنی عنه بما قبله فانه قد یکون لغیرها، کما لو کانت قابلة أو غاسلة أو بلانة أو نحو ذالک۔

ولما فی فتاوی عالمگیریه: (۱/۵۴۱، طبع رشیدیه کوئٹه)

أحق الناس بحضانة الصغیر حال قیام النکاح أو بعد الفرقة الام الا ان تکون مرتدةً أو فاجرةً غیر مأمونة کذا فی الکافی۔

الجواب صحیح: عبد الرحمن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: محمد اویس عفی عنہ

۸ ربیع الاول ۱۴۳۴ھ — فتوی نمبر: ۳۵۶۶

﴿عورت کا اپنے شوہر کیساتھ ایگریمنٹ کرنا﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلے کے بارے میں کہ میاں بیوی کی تفریق کی

صورت میں اگر عورت نے اپنے شوہر کے ساتھ یہ معاہدہ (ایگریمنٹ) کرلیا کہ جب بچہ پیدا ہو جائیگا تو آپ کے پاس رہے گا حالانکہ شوہر کے پاس دودھ کا انتظام بھی نہیں ہے تو کیا یہ حق بچہ کی ماں کو حاصل ہے؟ اور یہ کہ پرورش کا حق فقہاء کرام نے جس تفصیل سے بیان فرمایا ہے یہ حق پرورش والے کا ہے یا بچے کا؟ اگر بچے کا حق ہے تو والدہ کو اس طرح کا معاہدہ کرنے کا اختیار ہوگا؟

﴿جواب﴾ حق پرورش سے متعلق شرعی احکام میں بچے اور ماں وغیرہ دونوں کی طبعی ضرورت اور طبعی محبت وشفقت ملحوظ ہے۔ یہ حق نہ صرف ماں اور دیگر پرورش ذمہ داروں کا ہے اور نہ صرف بچے کا ہے بلکہ دونوں کا ہے۔ چنانچہ ماں وغیرہ پرورش سے اگر انکار کریں تو بلا وجہ ان کو مجبور نہیں کیا جائیگا لیکن بچے کی غذائی ضرورت وغیرہ کے لئے دوسرا کوئی انتظام اگر نہ ہوسکے تو ایسی صورت میں ماں وغیرہ کو انکار کرنے کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ گناہ کے علاوہ قاضی یا پنچایت کے لوگ مجبور بھی کرسکتے ہیں۔ لھذا بچہ پیدا ہونے سے پہلے عورت نے اس طرح کا معاہدہ اگر کیا ہے اور بچے کے والد کے پاس واقعی بچے کی ضروریات پورا کرنے کے لئے انتظام بھی ہے اور پرورش کی حق دار باقی عورتوں کو مثلاً نانی، بہن، وغیرہ کو بھی کوئی اعتراض نہ ہو۔ تو اس معاہدہ کے مطابق بچہ کو والد کے حوالہ کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں ہے لیکن بچے کے والد کے پاس بچے کے لئے مناسب غذا وغیرہ کا اگر بندوبست نہ ہو اور عورت کو بھی اس کا علم ہو تو ایسی صورت میں بچے کی ماں وغیرہ کے لئے کوئی گنجائش نہیں ہے کہ بچہ اس کے والد کے حوالہ کریں اور یہ بھی واضح رہے کہ حق پرورش ایسا حق ہے کہ ساقط کرنے کے باوجود کسی بھی وقت واپس اس کا مطالبہ کیا جا سکتا ہے یعنی معاہدہ کے باوجود ماں چاہے تو بلا وجہ بھی مطالبہ کرسکتی ہے۔ اور بچے کے والد پر ایسی صورت میں واجب ہوگا کہ بچہ اسکی والدہ کے حوالہ کریں یعنی معاہدہ کا کوئی اعتبار نہیں ہے۔

لما فی تنویر مع الدر:(۵۵۹/۳ طبع: سعید)

ولا تجبر من لها الحضانة عليها الا اذا تعينت لها بان لم ياخذ ثدى غيرها او لم يكن للاب ولا للصغير مال به يفتى خانيه

ولما فی الشامی:(۵۶۰/۳ طبع: سعید)

قلت :ولم يو خذ من هذا التوفيق بين القولين وذالك ان ما فی المحيط يدل على ان لكل من الحضانة والمحضون حقا فی الحضانة ومثله ما قدمناه عن المفتى ابی السعود فقول من قال انها حق الحضانة فلا تجبر محمول على ما اذا لم تتعين

لها والقصر على انها حقها لان المحضون حينئذ لا يضيع حقه لوجود من يحضنه غيرها ومن قال انها حق المحضون فلتجبر محمول على ما اذا تعينت والقصر على انها حقه لعدم من يحضنه غيرها والدليل على ذالك ايضاً ما مر عن الظهيرية حيث عزى الى الفقهاء الثلاثة القائلين بالجبر انها تجبر عندهم اذا لم يوجد غيرها لا اذا وجد.

ولما في البحر:(۲۰۲/۴،طبع: سعيد)

(قوله ولا تجبر امه لترضع) لانه كالنفقة و هي على الاب و عسى لا تقدر فلا تجبر عليه قضاءً تؤمر به ديانةً لانه من باب الاستخدام وهو واجب عليه ديانةً كما قدمناه اطلقه فشمل ما اذا كان الاب لا يجد من يرضعه او كان الولد لا يأخذ ثدى غيرها، و نقل الزيلعي الاتفاقي انه ظاهر الرواية يتغذى بالدهن وغيره من المائعات فلا يؤدى الى ضياعه و نقل عدم الاجبار في هذه الحالة في المجتبى عن البعض، ثم قال والاصح انها تجبر عند الكل و جزم به في الهداية و في الخانية و عليه الفتوى و ذكر في فتح القدير انه الاصوب،لان قصر الرضيع الذى لم يأنس الطعام على الدهن والشراب سبب تمريضه وموته.وفي الخانية وان لم يكن للاب ولا للولد الصغير مال تجبر الام على الارضاع عند الكل فمحل الخلاف عند قدرة الاب بالمال.

ولما في البدائع ۴/۴۰ طبع سعيد كراچی

و لكنها ان ابت لا تجبر عليه لما قلنا الا اذا كان لا يوجد من يرضعه فحينئذ تجبر على ارضاعه اذ لو لم تجبر عليه لهلك الولد، و لو التمس الاب لولده مرضعاً فأرادت الام ان ترضعه بنفسها فهي اولى لانها اشفق عليه .

ولما في الشامي:(۵۶۹/۳،طبع: سعيد)

(فتنتقل للجدة) اى تنتقل الحضانة لمن يلي الام في الاستحقاق كالجدة ان كانت، و الا فلمن يليها فيما يظهر و استظهر الرحمتي ان هذا الاسقاط لا يدوم فلها الرجوع لان حقها يثبت شيأ فشيأ فيسقط الكائن لا المستقبل، اى فهو كاسقاطها القسم لضرتها، فلا يرد ان الساقط لا يعود لان العائد غير الساقط ـــ ثم رأيت بخط بعض العلماء، و عن المفتي ابي السعود مسئلة في رجل طلق زوجته و لها ولد صغير منه و اسقطت حقها من الحضانة و حكم بذالك حاكم فهل لها الرجوع بأخذ الولد؟الجواب نعم لها ذالك.

الجواب صحیح: عبد الرحمٰن عفا اللہ عنہ　　　　واللہ اعلم بالصواب: محمد زبیر غفرلہ ولوالدیہ

۱۰ صفر الخیر ۱۴۳۴ھ　　　　فتوی نمبر: ۳۵۲۵

﴿غیر کی منکوحہ سے نکاح اور اس سے ہونے والی اولاد کے نسب کا حکم﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں مفتیان کرام اس مسئلہ کے متعلق کہ ایک شخص نے ایک عورت کے ساتھ جعلی شناختی کارڈ بنوا کر گواہوں اور قاضی کے سامنے نکاح کر لیا تھا اور اب اس کی شادی کو سات آٹھ سال ہو چکے ہیں اور اولاد بھی ہے جبکہ اس عورت کا پہلے سے بھی ایک نشئی آدمی کے

ساتھ نکاح اور رخصتی ہو چکی ہے اور یہ بات دونوں کے علم میں تھی کہ اس پہلے والے آدمی نے طلاق نہیں دی، مسئلہ یہ معلوم کرنا ہے کہ کیا ان کا نکاح قاضی کے پڑھانے سے ہو گیا؟ ان کی موجودہ اولاد کا نسب کس سے ثابت ہوگا؟

مستفتی: شوکت علی ضیاء کالونی کورنگی

﴿جواب﴾ صورت مسئولہ میں عورت کا دوسرا نکاح شرعاً کالعدم اور باطل ہے، پہلا نکاح بدستور باقی ہے، اس عورت پر واجب ہے کہ پہلے والے شوہر کے پاس لوٹ جائے، البتہ جو بچے پیدا ہوئے ہیں، ان کا حکم یہ ہے کہ جب تک وہ اپنے اصل شوہر کے نکاح میں ہے اس وقت تک وہ بچے اس کے شوہر ہی کے سمجھے جائیں گے۔

ہاں اگر شوہر ان بچوں کو اپنے طرف منسوب کرنے سے انکار کرے تو عدالت میں جا کر لعان کے ذریعے انکار کردے یا تو عدالت عورت کو سزا سنائے گی یا پھر دونوں کے درمیان نکاح کو فسخ کردے گی، ایسی صورت میں بچے شوہر کی طرف نہیں بلکہ ماں کی طرف منسوب ہونگے۔

لما فی صحیح البخاری: (۲/ ۵۲۱ طبع رحمانیہ) الولد للفراش وللعاھر الحجر.

ولما فی اعلاء السنن: (ج ۱۵ ص ۳۸۹، طبع دار الکتب العلمیة)

لان مدار النسب علی الفراش لا علیٰ المخلوقیة من الماء.

ولما فی الشامی: (۳/ ۵۱۶ طبع سعید)

اما نکاح منکوحة الغیر ومعتدته فالدخول فیه لا یوجب العدة ان علم انها للغیر لانه لم یقل احد بجوازه فلم ینعقد اصلا.

ولما فیه ایضا: (۳/ ۵۵۰ مطلب الفراش علیٰ اربع طبع سعید)

(قوله علیٰ اربع مراتب)۔۔۔ وقوی وهو فراش المنکوحة ومعتدة الرجعی فانه فیه لا ینتفی الا باللعان.

ولما فی الھندیة: (۱/ ۵۳۶ طبع رشیدیه)

قال اصحابنا لثبوت النسب ثلاث مراتب (الاولی) النکاح الصحیح وما هو فی معناه من النکاح الفاسد والحکم فیه انه یثبت النسب من غیر دعوة ولا ینتفی بمجرد النفی وانما ینتفی باللعان.

ولما فی بدائع الصنائع: (۲/ ۳۳۱ طبع سعید)

ومنها ثبوت النسب وان کان ذلک حکم الدخول حقیقة لکن سببه الظاهر هو النکاح لکون الدخول امرا باطنا فیقام النکاح مقامه فی اثبات النسب ولهذا قال النبی صلی الله علیه وسلم الولد للفراش وللعاهر الحجر وکذا لو تزوج المشرقی بمغربیة فجاءت بولد یثبت النسب وان لم یوجد الدخول حقیقة لوجود سببه وهو النکاح.

الجواب صحیح: عبد الرحمٰن عفا اللہ عنہ

واللہ اعلم بالصواب: عبد الوہاب نعمانی عفا اللہ عنہ

۵ ربیع الثانی ۱۴۳۶ھ

فتویٰ نمبر: ۵۸۴

﴿طلاق کے بعد ٹھہرنے والا حمل غیر ثابت النسب ہے﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلے کے بارے میں کہ اگر کوئی شخص اپنی بیوی کو طلاق مغلظہ دینے کے باوجود اس سے تعلقات بدستور قائم رکھے اور وہ بیوی (مطلقہ مغلظہ) اس سے حاملہ بھی ہو جائے تو کیا اس حمل کا اسقاط جائز ہے؟ اور کیا یہ بچہ ثابت النسب ہوگا؟

﴿جواب﴾ پیٹ میں موجود بچے میں جان پڑنے سے پہلے کسی خاص وجہ سے اسقاط جائز ہے بلا وجہ جائز نہیں ہے۔ اور بچہ میں جان پڑنے کی مدت فقہاء کرام چار ماہ بتاتے ہیں۔

صورت مسئولہ میں بچہ کا نسب اس شخص سے چونکہ ثابت نہیں ہوگا تو یہ بھی اسقاط کے جواز کے لئے ایک وجہ ہے لیکن چار ماہ سے پہلے اسقاط کی گنجائش ہے اس کے بعد نہیں۔

لما فی الشامی :(۱۷۶/۳ طبع: سعید کراچی)

قال فی النهر بقی هل یباح الاسقاط بعد الحمل؟ نعم یباح مالم یتخلق منه شیئ ولن یکون بعد ذلک الا بعد مائة وعشرین یوما وهذا یقتضی انهم ارادو بالتخلق نفخ الروح والا فهو غلط۔

ولما فی الشامی :(۳۷۴/۶ طبع: سعید کراچی)

وفی الذخیرة: لو ارادت القاء الماء بعد وصوله الی الرحم قالوا ان مضت مدة ینفخ فیه الروح لایباح وقبله اختلف المشائخ فیه والنفخ مقدر بمائة وعشرین یوما بالحدیث قال فی الخانیة: ولا اقول به لضمان المحرم بیض الصید لانه اصل الصید، فلا اقل من ان یلحقها اثم وهذا لو بلا عذر ۔ویاتی تمامه قبیل احیاء الموات۔والله اعلم۔

ولما فی جامع الترمذی:(باب الولد للفراش ص:۲۳۸ طبع: فاروقی کتب خانه)

عن ابی هریرة رضی الله عنه قال قال رسول الله ﷺ الولد للفراش وللعاهر الحجر۔

وفی حاشیة الترمذی تحت هذا الحدیث

الولد للفراش ای لمالکه وهو الزوج والمولی لانهما یفترشانها وللعاهر الزانی من عهر عهرًا او عهورا اذا اتی المرأة لیلا للفجور ثم غلب علی الزنا مطلقا عینی ۔لاحظ للزانی فی الولد وانما هو لصاحب ام الولد وهو زوجها او مولاها۔

ولما فی الهدایة :(۴۳۵/۲ طبع: رحمانیه لاهور)

واذا جاءت به لتمام سنتین من وقت الفرقة لم یثبت لان الحمل حادث بعد الطلاق فلا یکون منه لان وطیها حرام الا ان یدعیه لانه التزمه وله وجه بان وطیها بشبهة فی العدة۔

ولما فی کفایت المفتی :(۱/۹ طبع :ادارة الفاروق)

بہت سی صورتوں میں بوجہ شبہۃ الحِل نہ ہونے کے باوجود وطی حرام ہونے کے نسب ثابت نہیں

ہوتا۔ جیسے مطلقہ ثلاثہ سے حالت عدت میں وطی کرلی تو باوجود دعوے کے نسب ثابت نہیں ہوگا۔

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ
واللہ اعلم بالصواب: محمد اویس غفر اللہ لہ ولوالدیہ

۱۰ ربیع الاول ۱۴۳۲ھ
فتویٰ نمبر: ۳۵۸۰

﴿مجہول النسب کے شناختی کارڈ کے خانہ ولدیت میں کس کا نام لکھا جائے گا؟﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء دین ومفتیان شرع متین اس مسئلہ کے بارے میں کہ میاں اور بیوی کی اولاد نہیں ہو رہی تھی، شوہر نے اپنے دوست کے معروف النسب بچے کو اسکی اجازت سے اور ایک مجہول النسب بچے کو راستے سے اٹھا کر دونوں بچوں کی پرورش کی اور اب دونوں جوان ہوگئے ہیں۔

پوچھنا یہ ہے کہ ان دونوں بچوں کی نسبت کس کی طرف کیجائیگی؟ جبکہ آج کل کے دور میں دنیا کے ہر کونے خصوصاً پاکستانی شناختی کارڈ میں نام مع ولدیت لکھنا ضروری ہے تو شناختی کارڈ کے خانہ ولدیت میں کس کا نام لکھا جائے گا؟
مستفتی: عمران اللہ کبل سواتی

﴿جواب﴾ صورت مسئولہ میں دوست کا بچہ چونکہ معروف النسب ہے، اس لئے اس کی نسبت اپنے حقیقی باپ کی طرف کرنا شرعاً وقانوناً واجب اور ضروری ہے، لہذا شناختی کارڈ کے خانہ ولدیت میں اسکے حقیقی باپ ہی کا نام لکھا جائے گا۔

اور جو بچہ جھولے یا راستے سے اٹھا کر لیا ہے وہ چونکہ مجہول النسب ہے، اس لئے اس کی نسبت پرورش کنندہ کی طرف کرنا شرعاً ناجائز اور حرام ہے، لہذا شناختی کارڈ کے خانہ ولدیت میں اسکے پرورش کنندہ کا نام لکھنے کی گنجائش نہیں ہے۔

البتہ حکومت پاکستان کے قانون کے تحت چونکہ شناختی کارڈ میں نام مع ولدیت لکھنا ضروری ہے، لہذا مذکورہ ضرورت اور مجبوری کی وجہ سے شناختی کارڈ کے خانہ ولدیت میں لفظ عبداللہ لکھنے کی شرعاً گنجائش ہے جبکہ لغوی معنیٰ (اللہ کا بندہ) مراد لیا جائے اور محکمہ نادرا والوں سے معلومات کرنے پر معلوم ہوا کہ ایسی صورت میں وہ بھی "عبداللہ" یعنی اللہ کا بندہ شناختی کارڈ میں لکھتے ہیں۔

لما فی قوله تعالیٰ: (سورة الاحزاب آیت ۵)

أدعوهم لأبآئهم هو أقسط عندالله فان لم تعلموا آبآئهم فاخوانكم فی الدين..... الآية.

ولما فی صحیح البخاری:(۲/۵۲۲،باب من ادعی الی غیر أبیه ،طبع رحمانیه)

عن سعد قال سمعت النبی صلی الله علیه وسلم یقول من ادعی الی غیر أبیه وهو یعلم أنه غیر أبیه فالجنة علیه حرام.

ولما فی سنن أبی داود:(۲/۳۵۶،رقم الحدیث ۵۱۱۳،طبع رحمانیه)

عن سعد بن مالک قال سمعته اذنای ووعاه قلبی من محمد ﷺ أنه قال من ادعی الی غیر أبیه وهو یعلم أنه غیر أبیه فالجنة علیه حرام.

ولما فی أحکام القرآن:(۳/۲۹۱،طبع ادارة القرآن والعلوم الاسلامیة)

اطلاق الأب والابن بطریق الادعاء لایجوز وعلی سبیل الشفقة یجوز ولا یستحسن. الثالث ان اطلاق الأبوة والبنوة لایجوز الافی النسب بخلاف الأخوة فان اطلاقها کمایجوز فی النسب یجوز فی غیره من الأسباب والعلائق الدینیة والدنیویة ،ولذلک لایجوز أن یقول الرجل لولد غیره:ابنی ،وکذا أن یقول الرجل لغیر أبیه:أبی فقد نهی الله سبحانه وتعالی عن دعاء غیر أبیه ابنه بالبنوة فی هذه الأیة"أدعوهم لأبآئهم "وروی الأئمة البخاری ومسلم والترمذی"ان ابن عمر رضی الله عنهما قال:ماکناندعو زید بن حارثة الا زید بن محمد حتی نزلت"أدعوهم لأبآئهم هو أقسط عند الله"وحرم رسول الله صلی الله علیه وسلم دعاء غیر أبیه بالأب فقال:(من ادعی الی غیر أبیه وهو یعلم أنه غیر أبیه فالجنة علیه حرام".

ولما فی روح المعانی:(ج ۲۱-۲۲ص ۱۹۷-۱۹۸ سورة الاحزاب أیت ۵،طبع رشیدیه)

(أدعوهم لأبآئهم)ای انسبوهم الیهم وخصوهم بهم أخرج الشیخان والترمذی والنسائی وغیرهم عن ابن عمر رضی الله تعالی عنهما أن زید بن حارثة مولی رسول الله صلی الله علیه وسلم ماکناندعوه الا زید بن محمد حتی نزل القرآن"أدعوهم لأبآئهم"...... فدعی زید بن حارثة.

الجواب صحیح :عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ　　　　واللہ اعلم بالصواب: صادق محمد سواتی غفرلہ ولوالدیہ

کیم صفر ۱۴۳۲ھ　　　　فتویٰ نمبر: ۲۸۲۶

﴿شادی کے ایک ماہ بعد پیدا ہونے والے بچہ کا حکم﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام مندرجہ ذیل مسئلہ کے بارے میں کہ کسی نے اپنی منگیتر سے زنا کیا پھر اس کے بعد اس سے نکاح ہوا شادی کے ایک ماہ بعد اس کے یہاں بچہ پیدا ہوا اس بچہ کو کس کی طرف منسوب کریں اور یہ بچہ اسکی میراث میں شریک ہوگا یا نہیں؟ واضح رہے کہ یہ حمل اس زنا کے نتیجہ میں تھا، نیز حالت حمل میں نکاح ہو جاتا ہے یا نہیں؟

﴿جواب﴾ نکاح کئے بغیر منگیتر سے ملنا بڑا گناہ ہے، لڑکے اور لڑکی دونوں کے والدین کی بھی ذمہ داری ہے کہ منگنی کے بعد دونوں کے بارے میں گناہ کا اندیشہ ہو تو فوراً شرعی نکاح

کرادیں، شادی کی رسومات بجالانا کوئی ضروری نہیں ہے اور چاہے تو دوبارہ بھی دکھلاوے کیلئے نکاح کرادیں لیکن شرعاً پہلے ہی نکاح کا اعتبار ہوگا، اس نکاح ثانی کی شرعی کوئی حیثیت اگرچہ نہیں ہوگی لیکن کم از کم اصل نکاح کیوجہ سے گناہ سے تو بچ جائیں گے۔

مذکورہ صورت میں شادی کے ایک ماہ بعد یہ بچہ پیدا ہوا ہے، اس بچے کے بارے میں اگر یہ شخص اقرار کرتا ہے کہ یہ میرا بچہ ہے تو اسی کا بچہ سمجھا جائیگا اور ثابت النسب ہوگا بشرطیکہ وہ خود اعتراف نہ کرے کہ میں نے زنا کیا تھا جس سے یہ بچہ پیدا ہوا، باقی لوگوں کیلئے جائز نہیں کہ وہ از خود تبصرے کرتے رہیں کہ شادی کے ایک ماہ بعد یہ بچہ پیدا ہوا، لہذا یہ ولد الزنا ہے وغیرہ شرعی ثبوت کے بغیر اندازوں سے زنا کی نسبت کسی مسلمان کیطرف کرنا کبیرہ گناہ ہے بلکہ جہاں تک ممکن ہو مسلمان کے بارے میں اچھا خیال کرنا ضروری ہے۔

لہذا ایسی صورت میں اس طرح خیال کرنے سے کوئی گناہ نہ ہوگا کہ ممکن ہے دونوں نے آپس میں پہلے سے نکاح کیا ہوگا اور بعد میں یہ دوسرا نکاح صرف رسمی درجہ میں تھا۔

(۲) حالت حمل میں نکاح منعقد ہو جاتا ہے۔

لمافی التنویر مع الرد:(۴۹/۳، طبع سعید کمپنی)

لو نکحها الزانی حل له وطؤها اتفاقا والولد له ولزمه النفقة.

وفی الشامية:(قوله والولد له)ای ان جاءت بعد النکاح لستة اشهر مختارات النوازل، فلو لأقل من ستة اشهر من وقت النکاح، لا یثبت النسب، ولا یرث منه الا ان یقول هذا الولد منی، ولا یقول من الزنی خانية. مکذافی الهندية:(۵۴۰/۱ طبع)

لمافی التنویر مع الدر:(۴۸/۳، طبع سعید)(و)صح نکاح(حبلی من زنی لا)حبلی(من غیره)

وفی الشامية:(قوله وصح نکاح حبلی من زنی)ای عندهما، وقال ابو یوسف لا یصح والفتوی علی قولهما، کمافی القهستانی عن المحیط.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ　　　　واللہ اعلم بالصواب: محمد زبیر اکرام

۱۳ جمادی الاولیٰ ۱۴۳۱ھ　　　　فتویٰ نمبر: ۲۶۹۲

﴿ نکاح فاسد سے ثبوت نسب کا حکم ﴾

﴿ سوال ﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام دریں مسئلہ کہ پہلے زید کے جمیلہ سے ناجائز تعلقات تھے، بعد میں زید کا نکاح جمیلہ کی لڑکی سے ہوگیا، کچھ عرصہ کے بعد معلوم ہوا کہ زید کا جمیلہ کی لڑکی

سے نکاح شرعاً جائز نہیں تھا، اب زید کے لئے کیا حکم ہے؟ اور جو اولاد جمیلہ کی لڑکی سے پیدا ہو چکی ہے، اس کے نسب کا کیا حکم ہے؟ مستفتی: عبدالحمید صاحب

﴿جواب﴾ مذکورہ صورت نکاح فاسد کی ہے، لہٰذا زید اس عورت کو فوراً اپنے سے علیحدہ کردے اور جو اولاد پیدا ہوئی ہے وہ زید ہی سے ثابت النسب ہوگی اور زید ہی کی اولاد کہلائے گی کیونکہ نکاح فاسد سے نسب ثابت ہو جاتا ہے۔

واضح رہے کہ باقاعدہ جدائی کے بعد اس عورت کے ذمہ عدت گزارنا واجب ہے عدت گزارنے کے بعد دوسری جگہ شادی کر سکتی ہے۔

لما فی التنویر مع الدر:(۵۱۶/۳، باب العدة، طبع سعید)

(وعدة المنكوحة نكاحا فاسدا)فلا عدة فى باطل وكذا موقوف قبل الاجازة اختيار ،لكن الصواب ثبوت العدة والنسب بحر.

وفى الشامية:(قوله نكاحاً فاسدا)هى المنكوحة بغير شهود،ونكاح امرأة الغير بلا علم بانها متزوجة ونكاح المحارم مع العلم بعدم الحل فاسد عنده خلافا لهما فتح.

ولما فى فتح القدير:(۲۸۸/۴،طبع رشيديه)

قوله:(والمنكوحة نكاحا فاسدا)وهى المنكوحة بغير شهود......ونكاح المحارم مع العلم بعدم الحل فاسد عند ابى حنيفة خلافا لهما الخ.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم: صلاح الدین ڈیروی

۲۲ جمادی الثانی ۱۴۲۷ھ — فتویٰ نمبر: ۴۵۶

﴿نکاح کے سات ماہ بعد پیدا ہونے والا بچہ ثابت النسب ہے﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میرا نکاح سات مہینے پہلے یکم دسمبر ۲۰۰۶ کو مسماۃ ریحانہ سے ہوا پھر نکاح کے ٹھیک سات ماہ بعد یعنی پرسوں تیس جون کی رات کو میرا بیٹا پیدا ہوا، اب گھر کے سب لوگ شک میں مبتلا ہیں کہ یہ بیٹا میرا ہے کہ نہیں؟ میں خود بھی پریشان ہوں، براہ کرم میری راہنمائی فرمائیں۔ مستفتی: خیرالدین

﴿جواب﴾ صورت مذکورہ میں نکاح کے سات ماہ بعد آپ کا جو بیٹا پیدا ہوا ہے، شرعاً یہ آپ ہی کا بیٹا ہے، شریعت نے کم از کم چھ ماہ کی مدت کو بچے کی پیدائش کیلئے ضروری قرار دیا ہے، اس عرصہ میں پیدا ہو جائے تو ثابت النسب ہے، نیز تجربہ بھی شاہد ہے کہ سات ماہ میں بھی بچہ پیدا

ہو جاتا ہے اور صحیح سلامت رہتا ہے، اس لئے کسی قسم کے شک میں مبتلا ہونے کی ضرورت نہیں۔

لما فی الهدایة:(۲/۴۳۸،طبع رحمانیه)

واقله ستة اشهر لقوله تعالی وحمله وفصاله ثلاثون شهرا ثم قال وفصاله فی عامین فبقی للحمل ستة اشهر.

ولما فی الهندیة:(۱/۵۳۶،طبع رشیدیه)

واذا تزوج الرجل امراة فجاءت بالولد لاقل من ستة اشهر منذ تزوجها لم یثبت نسبه وان جاءت به لستة اشهر فصاعدا یثبت نسبه منه اعترف به الزوج او سکت.

ولما فی الشامی:(۳/۴۹،طبع سعید)

(قوله والولد له) ای ان جاءت بعد النکاح لستة اشهر مختارات النوازل،فلو لأقل من ستة أشهر من وقت النکاح لا یثبت النسب.

الجواب صحیح: عبد الرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: اسرار عزیز

۱۸ جمادی الثانی ۱۴۲۸ھ — فتویٰ نمبر: ۹۹۸

﴿اصل باپ کے علاوہ کسی کی طرف منسوب کرنا گناہ ہے﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ''شادی کارڈ یا اسکول کالج کے سرٹیفکیٹ، نکاح فارم پر حقیقی والد کا نام چھوڑ کر پالنے والے کا نام لکھوانا کیسا ہے کیا شرعاً اس میں کوئی قباحت ہے۔ اس سے نکاح پر کوئی اثر تو نہیں پڑتا؟ مستفتی: قاری محمد طاہر کراچی

﴿جواب﴾ اپنے حقیقی والد کے علاوہ کسی غیر کی طرف اپنے کو منسوب کرنا یا کوئی دوسرا جاننے کے باوجود غیر کی طرف کسی کو منسوب کرے تو قرآن کریم کے واضح حکم کے خلاف ہے سخت گناہ ہے، بعض صورتوں میں اس سے نکاح پر بھی اثر پڑتا ہے لھذا اس سے اجتناب ضروری ہے ہاں پرورش کرنے والے کا نام لکھنا ضروری ہو تو ایسی صورت میں وضاحت کے ساتھ ''پرورشی والد'' ساتھ لکھیں تو اس کی گنجائش معلوم ہوتی ہے۔

لما فی سورة الاحزاب آیت ۵

ادعوهم لابائهم هو اقسط عندالله فان لم تعلموا اباءهم فاخوانکم فی الدین و موالیکم

ولما فی روح المعانی: (۲۱،۲۲/۱۹۷،۱۹۸،طبع رحمانیه)

(ادعوهم لابائهم) ای انسبوهم الیهم و خصوهم بهم واخرج الشیخان والترمذی و النسائی و غیرهم عن ابن عمر رضی الله تعالی عنهما ان زید بن حارثة مولی رسول الله ﷺ ما کنا ندعوه الا زید محمد حتی نزل القران "ادعوهم لابائهم" فدعی زید بن حارثة

ولما فی کنز العمال :(۸/۱،۶۱،۶۸، طبع رحمانیہ)

ومن تولی غیر موالیہ او ادعی الی غیر ابیہ فعلیہ لعنۃ اللہ و الملائکۃ و الناس اجمعین لایقبل اللہ منہ صرفاً ولا عدلاً.

وفیہ ایضاً:﴿ان من افری الفری ان یعتزی الرجل الی غیر والدیہ﴾

ولما فی العالمگیریہ:(۲۶۸/۱، طبع رشیدیہ)

و لو کان الشہود یعرفونہا و ہی غائبۃ فذکر الزوج اسمہا لا غیر و عرف الشہود انہ ارادا بہ المرأۃ التی یعرفونہا جاز النکاح کذا فی محیط السرخسی.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: محمد حامد یاسین، بھکر

۲۵ جمادی الثانی ۱۴۳۴ھ — فتویٰ نمبر: ۳۸۱۰

﴿مفقود سے متعلق مسائل﴾

﴿لاپتہ شخص کی بیوی کا حکم﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام کہ ایک شخص لاپتہ ہوا، باوجود تحقیق وتفتیش کے معلوم نہ ہوسکا کہ وہ زندہ ہے یا مرگیا ہے! کیا اسکی بیوی کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ کسی دوسرے شخص سے نکاح کرے، اگر یہ حق حاصل ہے تو اسکو کچھ وقت انتظار کرنے کی ضرورت ہے یا نہیں؟

﴿جواب﴾ ایسی عورت کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ مسلمان قاضی کی عدالت میں اپنا مقدمہ پیش کرے اور گواہوں کے ذریعے ثابت کرے کہ فلاں شخص سے اسکا نکاح ہوا ہے اور پھر اسکے لاپتہ ہونے کو بھی گواہوں سے ثابت کرے اسکے بعد قاضی اپنے طور پر تحقیق وتفتیش کرے اور جب لاپتہ آدمی کے ملنے سے مایوسی ہوجائے تو قاضی عورت کو مزید چار سال انتظار کرنے کا حکم کرے اس دوران بھی اگر اسکا پتہ نہ چلے تو قاضی اس شخص کے مردہ ہونے کا فیصلہ سنادے اسکے بعد عورت چار ماہ دس دن عدت وفات گزار کر دوسری جگہ نکاح کرسکتی ہے۔

(۱) یہ اس وقت ہے جب عورت کے پاس نفقہ موجود ہو اور گناہ میں مبتلا ہونے کا اندیشہ نہ ہو (۲) اور اگر اسکے پاس نفقہ بالکل نہیں جس سے وہ اپنا گزارہ چلا سکے تو پھر چار سال انتظار کی بھی ضرورت نہیں بلکہ قاضی ایک ماہ انتظار کے بعد اسکا نکاح فسخ کرے۔

(۳) اور اگر گناہ میں مبتلا ہونے کا شدید اندیشہ ہو تو پھر دیکھیں گے اس شخص کے لاپتہ ہونے کے بعد ایک سال گزرا ہے یا نہیں؟ اگر ایک سال گزرا ہے تو قاضی بغیر انتظار کے اسکا

نکاح فسخ کرے اور اگر ایک سال نہیں گزرا تو ایک سال انتظار کا حکم کرے اسکے بعد نکاح فسخ کرے، نیز یہ بات یاد رہے کہ آخری دونوں صورتوں میں عورت عدت طلاق گزارے گی۔

لمافی حیلة الناجزة:(ص ۱۲۲-۱۲۳-۱۲۴ طبع دار الاشاعت)

اذاکان المتعنت فی ارض الاسلام وله مال يتحقق منه علی زوجته المتروكة فی المقام هو مافی المؤطا والمدونة وغيرهما عن مالک عن يحيی بن سعيد ان عمر بن خطاب قال ايما امراة فقدت زوجها فلم تدر اين هو فانها تنتظر اربع سنين ثم تعتد اربعة اشهر وعشرا ثم تحل ...... أن المتعنت فانما يأجل لامرأته مادامت نفقتها والاطلقت بعدم النفقة وقضی ﷺ فی الرجل لايجد ما ينفق علی امرأته بان يفرق بينهما رواه الدار قطنی والبيهقی.... وهذا بعد التلوم بنحو شهر او باجتهاده عند المالكية.....وان كان تخوفها الزنا وتضررها بعدم الوطی والعنامع وجود النفقة والغنافبعد صبر ماسنة فاكثر عند جل المالكية.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ واللہ اعلم بالصواب: افتخار احمد کلکتی

۲/۱/۱۴۳۰ھ فتویٰ نمبر:۱۸۰۲

﴿فصل فی نفقة الزوجة والاولاد والآباء والامهات وسکناهم﴾

﴿مریض بیوی کا علاج کس کے ذمہ ہے؟﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں مفتیان کرام اس مسئلے کے بارے میں کہ بیوی اگر بیمار ہو جائے تو اس کا علاج شوہر کے ذمہ واجب ہے یا نہیں؟ مستفتی: سبحان الدین

﴿جواب﴾ میاں بیوی کا رشتہ اور تعلق ایسا نازک ہے کہ یہ ضابطہ سے نہیں رابطہ سے ہی قائم رہ سکتا ہے، چنانچہ شوہر پر اگر ضابطہ کے تحت بیوی کا علاج ضروری نہیں تو بیوی پر اس کی خدمت مثلاً کھانا تیار کرنا گھر کی صفائی کا انتظام کرنا اور بچوں کو کھلانا وغیرہ بھی ضروری نہیں ہے، اس لئے دونوں کو چاہیئے کہ واجب حقوق کے علاوہ خوش اخلاقی اور ایثار کا مظاہرہ آپس میں کریں تاکہ یہ رشتہ مضبوط رہے اور دونوں خوشی اور الفت کی زندگی گزاریں۔

لمافی الهندية:(۱/۵۴۹، طبع رشيديه)

ولايجب الدواء للمرض ولاأجرة الطبيب ولاالفصد ولاالحجامة كذا فی السراج الوهاج.

ولمافی الدر مع الرد:(۵/۲۸۵، طبع امداديه) كمالايلزمه مداواتها.

وفی الشامية: أی اتيانه لها بدواء المرض ولا أجرة الطبيب ولا الفصد ولاالحجامة.

ولمافی الهندية:(۱/۵۴۸، طبع رشيديه)

وان قالت لاأطبخ ولاأخبز قال فی الكتاب لاتجبر علی الطبخ والخبز وعلی الزوج أن

یاتیہا بطعام مہیا أو یاتیہا بمن یکفیہا عمل الطبخ والخبز قال الفقیہ ابو اللیث رحمہ اللہ ان امتنعت المرأۃ عن الطبخ والخبز انما یجب علی الزوج أن یاتیہا بطعام مہیا

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ　　　　واللہ اعلم: صلاح الدین چترالی

۱۵ ربیع الثانی ۱۴۲۷ھ　　　　فتویٰ نمبر: ۱۳۴

﴿محتاج والدین کے نفقے کا حکم﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک آدمی کے چار بیٹے ہیں اور سب کی شادیاں کرا کر ہر ایک کو الگ مکان دیا ہوا ہے اور ہر ایک اپنا کام چلاتا ہے اور والد صاحب چونکہ عمر رسیدہ ہیں کوئی کام نہیں کر سکتے تو بیٹوں کو الگ کرتے وقت ہر ایک کے ذمے کچھ رقم مقرر کی تھی، اب بعض بیٹے اسمیں تساہل اور سستی سے کام لیتے ہیں تو اس سستی اور غفلت کی وجہ سے وہ بیٹے گناہ گار ہونگے یا نہیں؟ بینوا توجروا۔　　　　مستفتی: بلال احمد صوابی

﴿جواب﴾ والدین اگر محتاج ہوں تو اولاد پر انکا نفقہ واجب ہے اور نہ دینے والا گنہگار ہوگا لیکن اگر والدین غنی ہوں تو اولاد کو انکے اخراجات پر مجبور نہیں کیا جائیگا، اولاد چاہے مالدار کیوں نہ ہو اور اولاد خود اگر محتاج ہے تو بھی والدین کا خرچہ اسکے ذمہ نہیں ہے اگرچہ والدین محتاج ہوں۔

لمافی التنویر مع الدر: (۶۲۳/۳، طبع ایچ ایم سعید)

(النفقۃ لاصولہ الفقراء) ولو قادرین علی الکسب

وفی الشامیۃ: (قولہ الفقراء) قیدبہ لانہ لاتجب نفقۃ الموسر الا الزوجۃ.

ولمافی الھندیۃ: (۵۶۴/۱، طبع رشیدیہ)

قال ویجبر الولد الموسر علی نفقۃ الابوین المعسرین مسلمین کانا او ذمیین قدرا علی الکسب او لم یقدرا

ولمافی الھدایۃ: (۴۴۸/۲، طبع رحمانیہ)

وعلی الرجل ان ینفق علی ابویہ واجدادہ وجداتہ اذا کانوا فقراء وان خالفوہ فی دینہ.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ　　　　واللہ اعلم بالصواب: احمد علی عفی عنہ

۱۶ ربیع الاول ۱۴۳۱ھ　　　　فتویٰ نمبر: ۲۵۲۶

﴿بچے کو دودھ پلانا دیانۃً ماں کے ذمہ واجب ہے﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میرا ایک دوست ہے اسکی

بیوی سرکاری ملازمت کرتی ہے اسکے شیر خوار بچے ہیں، بلا کسی شرعی عذر کے جبکہ ڈاکٹر نے بھی منع نہیں کیا ہے بلکہ صرف اس عذر پر کہ وہ ملازمت کرتی ہے اور بچے کو دودھ پلانے سے کمزوری واقع ہوگی، یا حسن میں بگاڑ پیدا ہوگا بچے کو دودھ نہیں پلاتی۔ آپ فرمائیں کہ از روئے شرع ایسی عورت کا کیا حکم ہے؟ مستفتی: سمیع اللہ صاحب

﴿جواب﴾ بچے کو دودھ پلانا دیانۃً ماں کی ذمہ واجب ہے، بغیر کسی صحیح عذر کے اس کیلئے انکار کرنا جائز نہیں ہے اور چونکہ اسکے اخراجات شوہر کے ذمہ ہیں اس لئے ملازمت کا عذر معقول نہیں، اسی طرح حسن میں بگاڑ کا عذر بھی صحیح نہیں۔ مذکورہ اعذار کیوجہ سے اپنے بچے کو دودھ نہ پلانا بچے کیساتھ بڑی زیادتی ہے۔

(سورۃ البقرہ پارہ ۲ ایت ۲۳۳) ﴿والوالدت یرضعن اولادھن حولین کاملین لمن اراد ان یتم الرضاعة وعلی المولودله رزقهن وکسوتهن بالمعروف لاتکلف نفس الاوسعها لاتضار والدة بولدها ولا مولودله بولده وعلی الوارث مثل ذلک۔الخ

(صحیح البخاری ج۲/۸۰۶ کتاب النفقات رحمانیہ) وقال یونس عن الزهری نهی الله ان تضار والدة بولدها وذلک ان تقول الوالدة لست مرضعته وهی امثل له تابی غذاء واشفق علیه وارفق به من غیرها فلیس لها ان تابی بعد ان یعطیها من نفسه ما جعل الله علیه ولیس للمولوله ان یضار بولده والدته فیمنعها ان ترضعه ضرارا لها الی غیرها فلا جناح علیهما ان یسترضعا عن طیب نفس الوالد والوالدة فان اراد افصالا فلا جناح علیهما بعد ان یکون ذلک عن تراض منهما وتشاور فصاله فطامه ۔

(الدر المختار ج۳/۵۷۱ باب النفقة سعید)

هی لغة ما ینفقه الانسان علی عیاله وشرعا (هی الطعام والکسوة والسکنی) وعرفا هی الطعام (ونفقة الغیر تجب علی الغیر باسباب ثلاثة: زوجیة وقرابة وملک)۔ (فتجب للزوجة) بنکاح صحیح (علی زوجها) لانها جزاء الاحتباس، وکل محبوس لمنفعة غیره کمفتی وقاض ووصی زیلعی۔

(وایضا فیها: ۳/۵۹۹ / سعید)

ونفقات الزوجات المختلفة مختلفة بحالها (قوله ونفقات الزوجات ۔) ۔ واذا کان للرجل نسوة بعضهن احرار مسلمات وبعضهن اماء ذمیات فهن فی النفقة سواء ۔ قال فی البحر وینبغی ان یکون هذا مفرعا علی ظاهر الروایة من اعتبار حاله ۔ واما علی المفتی به فلیس فی النفقة سواء لاختلاف حالهن یسارا وعسرا فلیست نفقة الموسرة کنفقة المعسرة ولا نفقة الحرة کالامة کما لا یخفی ۔

الجواب صحیح: مفتی عبد الرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: صفی اللہ غفرلہ

۲۷ جمادی الاولیٰ ۱۴۳۵ھ — فتویٰ نمبر: ۳۱۸۱

﴿والدنہ ہوں تو معذور بہن کا خرچہ بھائیوں کے ذمہ ہے﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علمائے کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ معذور بہن کا نفقہ بھائی پر لازم ہے یا نہیں؟ جبکہ اس کے والدین بھی انتقال کر گئے ہوں اور چچا وغیرہ بھی نہ ہوں۔

﴿جواب﴾ جب تک والد زندہ ہوں تو یہ ان کی ذمہ داری ہے کہ وہ اپنے نابالغ اور معذور بچوں کے اخراجات خرچہ وغیرہ کا بندوبست کریں، اور والد کے انتقال کے بعد یہ ذمہ داری دیگر ورثاء پر بقدر الارث لازم ہو جاتی ہے، لہذا معذور بہن کا نفقہ اس کے بھائی پر لازم ہے اور بھائی ایک سے زیادہ ہو تو خرچہ سب کے ذمہ برابر واجب ہوگا۔

لما فی الهندیه:(۵٦۵/۱،الفصل الخامس فی نفقة ذوی الارحام)

والنفقة لكل ذی رحم محرم اذا كان صغيراً او كانت امرأة بالغة فقيرة او كان ذكرا فقيراً زمنا او اعمى ،ويجب ذلک علی قدر الميراث ويجبر عليه۔

ولما فی الهدایه:(۴۴۹/۲ ،كتاب الطلاق ،طبع رحمانيه)

والنفقة لكل ذی رحم محرم اذا كان صغيرا فقيرا او كانت امرأة بالغة فقيرة او كان ذكرا بالغا فقيرا زمنا او اعمى لان الصلة فی القرابة القريبة واجبة دون البعيدة والفاصل ان يكون ذا رحم محرم وقد قال الله تعالى وعلى الوارث مثل ذلک وفی قراة عبد الله بن مسعود وعلى الوارث ذی الرحم المحرم مثل ذلک ويجب ذلک على مقدار الميراث ويجبر عليه، لان التنصيص على الوارث تنبيه على المقدار ولان الغرم بالغنم والجبر لايفاء حق مستحق۔

ولما فی تنویر الابصار مع الدر:(۶۲۷/۳، ۶۲۸ ،طبع سعید)

وتجب ايضا (لكل ذی رحم محرم صغير او انثى)مطلقا ولو كانت الانثى بالغة صحيحة او كان الذكر بالغا لكن عاجزا عن الكسب بنحو زمانة كعمى وعته وفلج مزاد فی الملتقى والمختار :اولا يحسن الكسب لحرفة _بقدر الارث لقوله تعالى وعلى الوارث مثل ذلک ولذا يجبر عليه _وفی الشامية (قوله بقدر الارث) ای تجب نفقة المحرم الفقير على من يرثونه اذا مات بقدر ارثهم منه

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ	واللہ اعلم بالصواب: محمد تنویر عفا اللہ عنہ
۷ جمادی الثانی ۱۴۳۴ھ	فتویٰ نمبر: ۳۷۵۵

﴿ڈلیوری کیس (ولادت) کا خرچہ شوہر کے ذمہ ہے﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ آج کل ڈلیوری کیس (ولادت) پر خرچہ بہت زیادہ ہوتا ہے تو کیا ڈلیوری کیس (ولادت) کا خرچہ شوہر کے ذمہ لازم

ہے یا بیوی خود اسکا انتظام کرے؟

﴿جواب﴾ ڈلیوری کیس (ولادت) کا خرچہ شوہر کے ذمہ لازم ہے۔

لما فی البحر الرائق:(۲/۲۰۱،طبع ایچ ایم سعید)

وان الاب ينفرد بتحمل نفقة الولد ولا يشاركه فيها احد وان الولد اذا كان غنيا والاب محتاجا لم يشارك الولد احد فى نفقة الوالد ذكره المصنف فى شرح المنار قيد بالطفل وهو الصبى حين يسقط من البطن الى ان يحتلم.

ولما فى التاتارخانيه:(۲/۱۶۷،طبع قديمى)

وفى "المنافع" ونفقة الصغير واجبة على ابيه وان خالفه فى دينه.

ولما فى التنوير مع الدر:(۳/۶۱۲،طبع سعيد)(وتجب)النفقة بانواعها على الحر(لطفله)

وفى الشامية:هو الولد حين يسقط من بطن امه الى ان يحتلم.

الجواب صحیح:عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ واللہ اعلم بالصواب:بلال احمد

۲۵ ربیع الاول ۱۴۲۸ھ فتویٰ نمبر:۷۰۱

﴿محتاج والدین کا نان ونفقہ اولاد پر لازم ہے﴾

﴿سوال﴾ میں ایک بوڑھی بیوہ اور تنگدست عورت ہوں اور میرے تین بیٹے کمانے والے ہیں، دو شادی شدہ ہیں اور ایک بیٹے کی ابھی شادی نہیں ہوئی، ان تین بیٹوں میں سے کوئی بھی میرا خرچہ برداشت نہیں کرتا اگر خرچہ کا مطالبہ کروں تو کہتے ہیں کہ ہمارے ذمہ نہیں، پوچھنا یہ ہے کیا میرا نان ونفقہ میرے بیٹوں کے ذمے ہے یا نہیں؟ مستفتیہ:ام یحییٰ کورنگی

﴿جواب﴾ ماں باپ جب محتاج ہوں اور ان کا ذریعہ آمدن کچھ نہ ہو یا ہو لیکن کافی نہ ہو تو ان کا نان ونفقہ اولاد پر لازم ہے اگر اولاد بدبخت ہو بخوشی خرچہ نہ دے تو کسی بھی انکل سے یا عدالت کے تعاون سے خرچہ وصول کرنے کا حق والدین کو حاصل ہے۔

لما فى المظهرى:(۷/۲۵۶،طبع رشيديه)

وصاحبهما فى الدنيا معروفا(سورة لقمان)(مسئلة)يجب بهذه الاية الانفاق على الابوين المفتقرين وصلتهما وان كانا كافرين الخ.

ولما فى الهداية:(۲/۴۲۸،طبع رحمانيه)

وعلى الرجل ان ينفق على ابويه واجداده وجداته اذا كانوا فقراء وان خالفوه فى دينه.

ولما فى البحر الرائق:(۴/۲۰۵،طبع سعيد)

(قوله ولابويه واجداده وجداته لو فقراء)اى تجب النفقة لهؤلاء اما الابوان فلقوله تعالى

"وصاحبهما في الدنيا معروفا" انزلت في الابوين الكافرين وليس من المعروف ان الابن يعيش في نعم الله تعالى ويتركهما جوعا.

ولمافي التنوير مع الدر:(۲/۲۱-۲۲۲، سعید)(و)تجب(علی موسر.....النفقة لاصوله الفقرآ.)

الجواب صحیح:عبدالرحمٰن عفااللہ عنہ　　　　والله اعلم بالصواب:محمد حسین

۱۱جمادی الثانی ۱۴۲۸ھ　　　　فتویٰ نمبر:۹۸۴

﴿تین طلاق اور بچوں کے نان نفقے کا حکم﴾

﴿سوال﴾ عرض یہ ہے کہ ایک شخص نے آج سے ساڑھے تین سال پہلے اپنی بیوی کو غصے کی حالت میں دو طلاقیں دیں، گھر میں صلح صفائی دونوں کی کرادی گئی وہ دونوں پھر سے گھر میں میاں بیوی کی حیثیت سے رہنے لگے پھر ساڑھے تین سال بعد اس شخص نے اپنی بیوی کو ایک اور طلاق دی، صرف ایک بار کہا، آیا بیوی کو طلاق ہوگئی یا نہیں؟ عدت کس طرح گزارے؟ چھ بچے ہیں: بڑا 16 سال کا، سب سے چھوٹا ساڑھے 4 سال کا، بیوی چاہتی ہے کہ عدت کس طرح گزارے؟ اگر وہ عدت نہ گزارے تو کوئی اور صورت نکلتی ہو تو بتائیں، بچوں کا کیا ہوگا؟! شوہر بچے نہیں رکھنا چاہتا، بیوی بچوں کو کیسے رکھے؟ ان کا خرچہ وغیرہ شوہر اٹھانا نہیں چاہتا، اب آپ قرآن وسنت کی روشنی میں کچھ بتائیں۔ بینوا توجروا۔

﴿جواب﴾ مذکورہ صورت میں تین/۳ طلاقیں پڑ چکی ہیں، اس لئے مطلقہ خاتون خاوند پر ہمیشہ کے لئے حرام ہوگئی جب تک کہ حلالہ شرعیہ کے بعد دوبارہ نکاح نہ کرلے، عدت پوری کر کے دوسری جگہ چاہے تو شادی کرسکتی ہے۔

لمافي قوله تعالى:(سورة البقرة، ایت ۲۳۰)

فان طلقها فلا تحل له من بعد حتى تنكح زوجا غيره.....الأية.

مطلقہ عورت وہیں عدت گزارے گی جہاں اس کو طلاق ہوئی ہے، بچوں کی پرورش کا حق ان کی ماں کو ہی حاصل ہے جب تک کہ بچے سات سال کے اور بچیاں بالغ نہ ہو جائیں، تاہم بچوں کا نان نفقہ باپ کے ذمہ ہی ہے، نہ دے تو عدالت کے ذریعے وصول کرسکتی ہے۔

لمافي التنوير مع الدر:(۵/۲۲۳تا۲۲۹،طبع امدادیه)

(ولاتخرج معتدة رجعي وبائن)باى فرقة.....(مكلفة من بيتها اصلا.....وتعتدان.....في بيت وجبت فيه.....الاان تخرج.....وتنتقل المعتدة.....أوتضررت بالمكث في المكان)

ولما فيه ايضا:(۳۲۶/۵،فى باب النفقة،طبع امداديه)

(وتجب)النفقه بانواعها على الحر(لطفله.....الفقير)

وفى الشامية:قوله:(لطفله)هوالولدحين يسقط من بطن امه الى ان يحتلم...... قوله:(الفقير)اى ان لم يبلغ حدالكسب،فان بلغه كان للأب ان يؤجره اويدفعه فى حرفة ليكتسب الخ.

ولمافيه ايضا:(ص ۲۵۲ فى باب الحضانة،طبع امداديه)

تربية الولد(تثبت للأم ولوبعدالفرقة الاان تكون مرتدة)

ولمافى التنويرمع الدر:(۲۶۷/۵-۲۶۸،باب الحضانة،طبع امداديه)

(والحاضنة احق به)اى بالغلام حتى يستغنى عن النساء وقدربسبع وبه يفتى ---(والام والجده احق بها)بالصغيرة(حتى تحيض)اى تبلغ فى ظاهرة الرواية.

الجواب صحیح:عبدالرحمٰن عفااللہ عنہ — واللہ اعلم:محمد شریف حسین

۹ رجب ۱۴۲۷ھ — فتویٰ نمبر:۵۱۶

﴿بیوی کیلئے نان ونفقہ کے علاوہ شوہر کی تنخواہ پر کوئی حق حاصل نہیں ہے﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں حضرات علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ شوہر کی تنخواہ پر بیوی کا حق مقدم ہے یا کہ والدین کا؟ نیز اگر کوئی شخص نان ونفقہ اپنی بیوی کو مکمل پابندی کے ساتھ دیتا رہتا ہے لیکن تنخواہ اپنے غریب والدین کو دیتا ہے تو کیا ایسی صورت میں بیوی شوہر سے نان ونفقہ کے علاوہ تنخواہ کا مطالبہ کرسکتی کہ نہیں؟ براہ کرم شرعی حکم سے مطلع فرما کر عنداللہ ماجور ہوں۔

﴿جواب﴾ تنخواہ خاوند کی ذاتی ملکیت ہے جس میں اسکو ہر طرح تصرف کرنے کا مکمل اختیار حاصل ہے تاہم شوہر پر بیوی کا نان ونفقہ واجب ہے خواہ بیوی مالدار ہو یا غریب، اس کے علاوہ بیوی کو شوہر کے مال میں ایسا کوئی حق حاصل نہیں ہے کہ شوہر کو والدین وغیرہ پر خرچ کرنے سے منع کرے۔ اور والدین اگر فقیر وتنگدست ہوں تو ان کا نان ونفقہ بھی اپنے بیٹے کے ذمہ واجب ہے۔

لمافى المشكوة:ج ۲/ ۴۲۱(طبع سعيد)

عن ابى امامة ان رجلاقال يارسول الله ماحق الوالدين على ولدهماقال هماجنتك ونارك.

ولمافى الدرمع الرد:۲/(طبع سعيد)

(لأن طاعتهمافرض عين)___وفيه لايحل سفر فيه خطر الاباذنهماوماغير هؤلاء كالزوجة والأولادوالأخوات والأعمام فانه يخرج بلااذنهم الااذاكانت نفقتهم واجبة عليه وخاف عليهم الضيعة.

وفی التنویر: ج/۵۷۲ (طبع سعید)

(ونفقة الغير تجب على الغير باسباب ثلاثة: زوجية وقرابة وملك، فتجب للزوجة بنكاح صحيح.

وفی الھندیة: ج۱/۵۶۵ (طبع سعید)

الأب اذا كان فقيرا معسرا وله أولاد صغار محاويج وابن كبير موسر يجبر الابن على نفقة ابيه ونفقة اولاده الصغار.

وفی شرح المجلة: ج۴/۱۳۱ (طبع رشیدیہ) وکل يتصرف فی ملکه کیف یشاء.

الجواب صحیح: مفتی عبدالرحمٰن عفااللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: فضل حق زیزاروی

۱۵ جمادی الاولیٰ ۱۴۳۵ھ — فتوی نمبر: ۱۴۴۷

﴿بیوی کے لئے الگ مکان کی تحدید﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میرے بیٹے حافظ محمد رضوان کی شادی محمد نعیم کی بیٹی انعم سے ہوئی اور اسی ماہ انعم امید سے ہوگئی، پہلے ماہ ہی سے وہ اپنے شوہر سے الگ گھر کی ضد کرنے لگی اور شادی کے دو ماہ بعد اپنے میکے جا کر بیٹھ گئی، شوہر کے بار بار رابطہ کرنے پر اسکے گھر والوں نے کہا کہ یا تو الگ گھر لیکر دو یا طلاق دے دو، ہماری بار بار کوشش کے باوجود وہ لوگ نہیں مانے اور ہم پر طرح طرح کے الزامات لگا دیئے، میں نے وقت کو آگے بڑھانے کے لئے کہہ دیا کہ جب تک اولاد نہیں ہوتی ہم کوئی فیصلہ نہیں کریں گے یہ سوچ کر کہ شاید بچے کی پیدائش کے بعد انکا دل پھر جائے اور لڑکی واپس اپنے گھر آجائے۔

ہم اسکو اپنی بلڈنگ میں گراؤنڈ فلور جو کے تین کمروں پر مشتمل ہے میں منتقل کرنے پر راضی ہوگئے مگر وہ لوگ نہیں مانے، بالآخر ایک دن ہمیں اطلاع دی کہ اگر آپ کو بچے کے کان میں اذان دینی ہے تو ہسپتال آجائیں، ہم سب گھر والے ہسپتال گئے اور میں نے بچے کے کان میں اذان دی، اسکے بعد انعم کے والد مجھے ایک طرف لے گئے اور کہا کہ ہماری بیٹی آپکے گھر نہیں جانا چاہتی اور آپ اس مسئلہ کو ختم کردیں اور بچے کا جو بھی فیصلہ کرنا ہے کرلیں، میں تو اسی وقت یہ بچہ لپیٹ کر آپ کو دے دیتا لیکن ہسپتال والے نہیں مانیں گے، میں نے ڈاکٹر سے دودھ کا ڈبہ لکھوالیا ہے، میں بچے کو ماں کا دودھ نہیں پلواؤں گا اور گھر میں بچے کو ماں کے ساتھ بھی نہیں رکھوں گا، آپ چار پانچ دن میں اسکا فیصلہ کرلیں، رضوان اب بھی گھر بسانا چاہتا ہے اور ماں بیٹے کو گھر لانا

چاہتا ہے، برائے مہربانی شریعت کی روشنی میں ہمارے لئے کیا حکم ہے؟ مستفتی: محمد شاہد

﴿جواب﴾ واضح رہے کہ شوہر پر بیوی کیلئے علیحدہ مکان کا انتظام کرنا شرعاً لازم ہے، یہ اسکا حق ہے جسکا وہ مطالبہ کرسکتی ہے لیکن اسکا یہ مطلب نہیں ہے کہ مستقل الگ گھر دینا ضروری ہے، چنانچہ بڑے گھر میں ایک الگ کمرہ جسکے ساتھ باورچی خانہ اور باتھ روم بھی ہو اور سامان وغیرہ اس میں وہ بحفاظت رکھ سکتی ہو اور دیگر شرعی فطری تقاضے اطمینان سے اس میں پورے کرسکتی ہو تو یہ کافی ہے، اس سے زیادہ کا وہ مطالبہ نہیں کرسکتی، لہٰذا اگر آپ اپنی بلڈنگ میں گراؤنڈ فلور دے رہے ہیں تو شرعاً یہ کافی ہے، اس سے زیادہ کا مطالبہ کرنا اسکے لئے جائز نہیں۔

لمافی قوله تعالىٰ:(سورة الطلاق آیت ٦) اسکنوهن من حيث سكنتم من وجدكم......الأية.

ولمافی الهداية:(ص۲۱۷-۱۸ ج۲ طبع رحمانيه)

وعلى الزوج ان يسكنها فی دار مفردة ليس فيها احد من اهله ــ ولو اسكنها فی بيت من الدار مفردة وله غلق كفاها.

اسکے علاوہ کسی وجہ سے میاں بیوی کی ناراضگی اس حد تک پہنچ چکی ہو کہ بڑوں کی نصیحت سے بھی معاملہ ٹھیک ہوتا نظر نہ آرہا ہو، لڑکی طلاق کا مطالبہ کرتی ہو اور شوہر بھی تفریق پر آمادہ ہو تو صرف ایک طلاق دیدے تاکہ تین ماہواری تک رجوع کا موقع مل سکے پھر اس دوران اگر میاں بیوی کا ذہن صاف ہو جائے اور شوہر چاہے تو رجوع کرسکتا ہے اور اگر شوہر رجوع نہیں کرنا چاہتے تو عدت گزار کر بیوی دوسری جگہ شادی کرسکے گی، مزید طلاق کی ضرورت نہیں۔

لیکن یاد رہے کہ طلاق کی صورت میں پورا حق مہر بیوی کو دینا ضروری ہوگا اور اگر دیا ہے تو واپسی کا مطالبہ شوہر نہیں کرسکتا، البتہ خلع کی صورت میں حق مہر شوہر واپس لے سکتا ہے اور خلع کی صورت میں مزید طلاق دینے کی ضرورت نہیں رہتی، صرف خلع پر دونوں رضامندی ظاہر کردیں تو یہ طلاق بائن شمار ہوگی، شوہر رجوع نہیں کرسکے گا، البتہ باہمی رضامندی سے عدت کے اندر اور عدت کے بعد بھی نئے حق مہر کے ساتھ نکاح ہوسکے گا۔

لمافی قوله تعالىٰ:(سورة البقرة آیت ۲۲۹)

الطلاق مرتٰن فامساك بمعروف او تسريح باحسان ولا يحل لكم ان تاخذوا مما اتيتموهن شيئا الا ان يخافا الا يقيما حدود الله فان خفتم الا يقيما حدود الله فلا جناح عليهما فيما افتدت به ــ الأية.

ولمافی الهداية:(۲/۲۱۳،طبع رحمانيه)

واذاتشاق الزوجان وخافاان لايقيما حدود الله فلاباس بان تفتدى نفسها منه بمال فاذافعل ذلک وقع بالخلع تطليقة بائنة ولزمها المال.

تفریق کی صورت میں بچے کی پرورش کا حق ماں کو حاصل ہے، وہ دوسری جگہ شادی نہ کرے تو سات سال کی عمر تک بچے کو اپنے پاس رکھ سکتی ہے اور بچے کا خرچہ والد کے ذمے ہوتا ہے لیکن وہ دودھ نہیں پلارہی اور بچہ اپنے پاس نہیں رکھنا چاہتی تو یہ بچے کے ساتھ زیادتی ہے، ایسی صورت میں والد خود بچے کی پرورش کا انتظام کرلے۔

لمافی قوله تعالیٰ:(البقرة آیت ۲۳۳)والوالدات يرضعن اولادهن حولين كاملين---الأية.

ولمافی البحر:(۴/۱۶۷،طبع سعيد)

(قوله احق بالولدامه قبل الفرقة وبعدها)اى فى التربية والامساك.

ولمافی للهداية:(اولين ص ۴۱۱،طبع رحمانيه)

واذا وقعت الفرقة بين الزوجين فالام احق بالولد والنفقة علىٰ الاب ولا تجبر الام عليه.

ولمافی البحرايضا:(۴/۲۰۲،طبع سعيد)

(وقوله لاتجبرامه لترضع)لانه كالنفقةوهى علىٰ الاب وعسىٰ ان لاتقدرفلاتجبرعليه قضاء وتؤمربه ديانة لانه من باب الاستخدام وهوواجب ديانة.

الجواب صحیح:عبدالرحمٰن عفااللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب:فیاض احمد

۲۳ جمادی الاول ۱۴۳۰ھ — فتوی نمبر:۲۱۷۸

﴿بیوی کے لئے الگ مکان دلوانا اس کا حق ہے﴾

﴿سوال﴾ میری چھ بہنیں ہیں، میں سب سے بڑا ہوں، بھائی کوئی نہیں، تین بہنوں کی شادی ہوگئی ہے، تین غیر شادی شدہ ہیں، میری اپنے والد اور بہنوں سے کبھی نہیں بنی یہاں تک کہ میری بہنیں مجھے مارتی بھی تھیں، تنگ آکر میں نے اپنی ماں کے مشورے سے اپنی شادی کی، شادی سے پہلے ہی اپنا گھر کرائے پر لے لیا، کبھی میری ماں بھی میرے ساتھ رہنے آجاتی ہیں۔

اب میں چاہتا ہوں بیوی کو لیکر باپ کے گھر رہنے جاؤں مگر میری بیوی راضی نہیں ہے، میری بیوی کہتی ہے کہ تمہارے امی ابو کے ساتھ رہ لوں گی مگر تمہاری بہنوں کے ساتھ نہیں رہوں گی، میری بہنیں سروس کرتی ہیں اور ان کی زبان بہت خراب ہے مجھے بتائیں کہ میں کیا کروں؟

مستفتی علی احمد

جبکہ میری بیوی میرے اور میرے ماں باپ کے ساتھ بہت اچھی ہے؟

﴿جواب﴾ مذکورہ صورت میں بہنوں کی شادیاں با آسانی جلدی سے ہوسکتی ہیں تو بہت اچھا، شادی کے بعد اپنی بیوی کو اپنے والدین کے گھر لے جا کر رہائش اختیار کرلیں اور اگر بہنوں کی شادیوں میں دیر ہے اور بیوی اصرار کررہی ہے الگ مکان میں رہنے کا، بہنوں کے ہوتے ہوئے والدین کے ساتھ رہنا آپ کی بیوی کے لئے مشکل ہو رہا ہے تو بیوی کو الگ مکان دلوانا شرعاً اس کا حق ہے۔

لمافی تنویر الابصار:(۲/۵۹۹-۶۰۰،طبع سعید)

(وكذاتجب لها السكنى فى بيت خال عن اهله)

وفى الشامية:(قوله خال عن اهله الخ)لانها تتضرر بمشاركة غيرها فيه،لانها لاتأمن على متاعها ويمنعها ذلك من المعاشرة مع زوجها ومن الاستمتاع الأان تختار ذلك، لانها رضيت بانتقاص حقها.

الجواب صحیح:عبد الرحمٰن عفا اللہ عنہ   واللہ اعلم:صلاح الدین ڈیروی

۱۴۲۷ھ   فتویٰ نمبر:

﴿بیوی کے نان ونفقہ کا مسئلہ﴾

﴿سوال﴾ ایک آدمی کا نکاح ہوا کچھ عرصہ میاں بیوی ایک ساتھ رہے پھر عورت اپنے والدین کے گھر گئی اور چند دن وہاں رہی پھر شوہر نے اسکو کبھی نہیں بلایا، زوجہ اور اسکے والدین کے تقاضا کے باوجود شوہر اسکو لینے نہیں آیا اور نہ اس کو اپنے گھر آنے کی اجازت دی، اب اسکے والدین یہ چاہتے ہیں کہ یہ اپنی زوجہ کو اپنے پاس بلالے یا یہیں رہتے ہوئے اسکا نان نفقہ دے مگر شوہر کسی امر پر بھی راضی نہیں ہوتا، کیا اس صورت میں عورت نفقہ کا مطالبہ کرسکتی ہے؟

﴿جواب﴾ مذکورہ صورت میں شوہر کے ذمہ عورت کا نفقہ لازم ہے کیونکہ عورت کی طرف سے کوئی نافرمانی نہیں پائی گئی، لہٰذا عورت بذریعہ دعویٰ وغیرہ اپنا نفقہ لے سکتی ہے اور بصورت دیگر عدالت کے ذریعہ خلع بھی لے سکتی ہے۔

لمافی التنویر مع الدر:(۲/۵۷۲تا۵۷۵،طبع سعید)

(فتجب للزوجة على زوجها ــــــــ ولو هى فى بيت أبيها)اذالم يطالبها الزوج

بالنقلة به يفتى، وكذا اذا طالبها ولم تمتنع الخ.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفااللہ عنہ
واللہ اعلم: شاہد اسحاق عفااللہ عنہ

۲۷ جمادی الثانی ۱۴۲۷ھ
فتویٰ نمبر: ۴۷۴

﴿بیوی کی رہائش اور نان ونفقے کا حکم﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام کہ میرے سسر صاحب میری اہلیہ کو اپنے گھر لے گئے، کافی عرصہ گزر چکا ہے لیکن وہ انھیں دوبارہ ہمارے گھر نہیں بھیج رہے ہیں، صورتِ حال سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنی صاحبزادی کے واسطے الگ رہائش کا مطالبہ کررہے ہیں، نیز چند روز قبل میرے سسر صاحب نے یہ پیغام بھی بھیجا تھا کہ میں اس دورانیے کا خرچہ بھی تم سے وصول کروں گا جس دوران تمہاری اہلیہ ہمارے گھر رہ چکی ہیں، براہِ کرم شرع شریف کی روشنی میں ارشاد فرمائیں کہ کیا بیوی کیلئے الگ رہائش کا انتظام کرنا شوہر پر ضروری ہے؟ نیز یہ بھی وضاحت ہو کہ اس دورانیے کا نفقہ بھی میرے اوپر لازم ہے؟ بینوا توجروا۔

﴿جواب﴾ بیوی اگر شوہر کے اہلِ خانہ کے ساتھ رہنے پر راضی نہ ہو تو شوہر پر بیوی کیلئے الگ گھر مہیا کرنا لازم ہے، ایسی صورت میں دیکھیں گے اگر بیوی کا تعلق مالدار گھرانے سے ہو تو اسکے لئے باقاعدہ الگ گھر کا انتظام کرے اور اگر بیوی کا تعلق امیر گھرانے سے نہ ہو تو شوہر کے ذمہ بیوی کیلئے الگ گھر میسر کرنا ضروری نہیں، البتہ یہ ضروری ہے کہ اسی گھر کے اندر بیوی کیلئے کم ازکم ایک ایسا کمرہ مہیا کرے جس کا کنٹرول مکمل طور پر بیوی کے ہاتھ میں ہو۔

رہا نفقے کا مسئلہ سو اگر بیوی شوہر کی اجازت کے بغیر بلا کسی عذر شرعی کے میکے چلی جائے تو وہ ناشزہ (نافرمان) قرار پائے گی، اس کا نفقہ خاوند پر لازم نہیں ہوگا جبتک کہ وہ نافرمانی چھوڑ کر شوہر کی اطاعت نہ کرلے، لہٰذا مذکورہ دورانیے میں آپکی اہلیہ کا نفقہ بھی آپ پر لازم نہیں ہے۔

لما في فتح القدير: (۱۹۲/۴، طبع رشیدیه)

(وان نشزت فلا نفقة لها حتى تعود الى منزله) لان فوت الاحتباس منها اذا عادت جاء الاحتباس فتجب النفقة. قال الله تعالى: اسكنوهن من حيث سكنتم من وجدكم (سورة الطلاق).

ولما في الشامي: (۳۲۲/۵، طبع امدادیه)

والحاصل ان المشهور وهو المتبادر من اطلاق المتون انه يكفيها بيت له غلق من

دار ... وذلک یختلف باختلاف الناس، فلی الشریفة ذات الیسار لابد من الراد ھالی دار ومتوسط الحال بکلیھا بیت واحد من دار ..... وھذا التفصیل ھو الموافق لما امر من ان المسکن یعتبر بقدر حالھما ... اذلاشک ان المعروف ان یختلف باختلاف الزمان والمکان، فعلی المفتی ان ینظر الی حال اھل زمانه وبلده، اذبدون ذٰلک لاتحصل المعاشرة بالمعروف.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم: محمد شریف حسین چترالی

۱۵ جمادی الاولیٰ ۱۴۲۷ھ — فتویٰ نمبر: ۴۲۴

﴿عدت طلاق میں عورت کے نان نفقہ کا مسئلہ﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں مفتیانِ کرام کہ طلاق ہوجانے کے بعد عورت کے کھانے پینے اور کپڑے وغیرہ کا انتظام کس کے ذمے ہوتا ہے شوہر پر یا عورت کے دیگر اولیاء پر؟

﴿جواب﴾ عورت کو طلاق ہوجانے کے بعد اسکے کھانے، پینے اور کپڑے وغیرہ کا انتظام اس کے شوہر پر لازم ہوتا ہے جب تک کہ اسکی عدت ختم نہ ہوجائے اور جب اس کی عدت گزر جائے تو شوہر پر مذکورہ چیزیں لازم نہیں ہوں گی۔

لمافی الدرالمختار: (۵/۳۳۳ طبع امدادیه)

(و) تجب (لمطلقة الرجعی والبائن والفرقة بلا معصية كخيار عتق وبلوغ وتفريق بعدم كفاءة النفقة والسكنى والكسوة) ان طالت المدة.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم: محمد شریف حسین چترالی

۴ جمادی الاولیٰ ۱۴۲۷ھ — فتویٰ نمبر: ۴۳۷

﴿متوفیٰ عنہا زوجہا کے نفقہ کا شرعی حکم﴾

﴿سوال﴾ فاطمہ کے شوہر زید کا انتقال ہوگیا، اب عدت کے دوران فاطمہ کا نان ونفقہ کس کے ذمہ ہے؟ بینوا توجروا۔ — مستفتی: عبدالرحیم صاحب

﴿جواب﴾ جب تک شوہر حیات ہو تو بیوی کے اخراجات شوہر ہی کے ذمہ ہوتے ہیں لیکن جب شوہر کا انتقال ہوجاتا ہے تو باہمی تعلق منقطع ہونے کی وجہ سے شوہر سے یہ ذمہ داری ساقط ہوجاتی ہے، اب یہ عورت شوہر کے ورثاء سے بھی نان ونفقہ کا مطالبہ نہیں کرسکتی، اس عورت کو اپنے اخراجات خود برداشت کرنے ہوں گے، البتہ جہاں کہیں عورت اپنے اخراجات خود برداشت

کرنے سے عاجز ہو تو اس صورت میں عورت کے ذی رحم محرم (رشتہ داروں) پر یہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ وہ اس عورت کے نان ونفقہ کا خیال رکھیں۔

لمافی الهندية: (۵/۲۲۳، طبع رشيديه)

ولانفقة للمتوفى عنها زوجها لأن احتباسها ليس لحق الزوج بل لحق الشرع فإن التربص عبادة منها ألاترى ان معنى التعرف عن براءة الرحم ليس بمراعى فيه حتى لاتشترط بعدم كفاءة النفقة والسكنى والكسوة ان طالت المدة.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم: محمد شریف حسین چترالی

۱۴۲۷ھ — فتویٰ نمبر:

﴿زوجہ کی تجہیز وتکفین کا خرچہ شوہر پر ہے﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں مفتیانِ کرام اس مسئلہ کے متعلق کہ کیا زوجہ کی وفات پر کفن دفن کا خرچہ شوہر پر واجب ہے؟ کیا زوجہ کے وفات پانے پر میاں بیوی کا تعلق ختم نہیں ہوا؟

﴿جواب﴾ زوجہ کی تجہیز وتکفین کی ذمہ داری شرعاً شوہر پر واجب ہے بشرطیکہ تجہیز وتکفین سنت طریقے پر ہو، سنت طریقے سے ہٹ کر جو اسراف اور تعدی کی جاتی ہے وہ شوہر کے ذمہ شرعاً واجب نہیں۔

لمافی التنویر مع الدر: (۲/۱۰۱، طبع امدادیه)

(واختلف فى الزوج، والفتوى على وجوب كفنها عليه) عند الثاني (وان تركت مالاً) خانية. ورجحه فى البحر بأنه الظاهر لانه ككسوتها.

وفى الشامية: اعلم أنه اختلفت العبارات فى تحرير قول أبى يوسف: ففى الخانية والخلاصة والظهيرية: أنه يلزمه كفنها وان تركت مالاً وعليه الفتوى وفى المحيط والتجنيس والواقعات وشرح المجمع لمصنفه: اذا لم يكن لها مال فكفنها على الزوج وعليه الفتوى.

ولمافى البحر: (۲/۲۰۰، طبع سعيد)

فلاتجب نفقتها عليه ولأن النفقة شيئاً فشيئاً ولا ملك له بعد الموت فلا يمكن ايجابها فى ملك الورثة.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم: صلاح الدین چترالی

۱۴۲۷ھ — فتویٰ نمبر:

﴿عورت شوہر کی اجازت کے بغیر میکے چلی جائے تو اس کے نفقے کا حکم﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں مفتیانِ کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک عورت اپنے

شوہر کے گھر سے بغیر اس کی اجازت کے اپنے میکے چلی گئی، شوہر کے گھر میں رہتے ہوئے اس عورت اور اس کے ساس سسر اور اس کے شوہر کے درمیان کئی مرتبہ جھگڑا ہوا۔

علاقے کے معزز حضرات اس عورت کو قصور وار ٹھہراتے ہیں اور یہ عورت کئی بار بغیر شوہر کی اجازت کے میکے جا چکی ہے، آخری بار جانے کے بعد واپس آنے کو تیار نہیں اور اپنے شوہر سے نان نفقہ کا مطالبہ کر رہی ہے، کیا اس کا مطالبہ درست ہے؟ کیا اس صورت میں شوہر کے ذمہ نان نفقہ واجب ہے؟ اور اگر شوہر بغیر مطالبہ نفقہ کے خود اپنی مرضی سے بیوی کے لئے نفقہ بھیج دے تو اس کا کیا حکم ہے؟ بینوا توجروا۔

﴿جواب﴾ بیوی کا نان نفقہ شوہر پر تب لازم ہے کہ اگر وہ اپنے شوہر کے گھر رہتے ہوئے حقوق زوجیت ادا کر رہی ہو، شوہر کی اجازت کے بغیر بیوی اگر میکے چلی گئی ہے تو شوہر کے ذمہ اس کا نفقہ واجب نہیں جب تک وہ واپس نہ آئے اور اس کو مطالبہ کا بھی حق حاصل نہیں، البتہ اگر شوہر بیوی کی زیادتی کے باوجود نفقہ اس کے گھر پر بھیج رہا ہے تو یہ اس کا احسان اور تبرع ہے۔

لمافی الهندية:(۱/۵۴۵)وان نشزت فلانفقة لهاحتی تعود الی منزله.

ولمافی التنویرمع الدر:(۳/۵۷۵-۵۷۶،طبع سعید)

(لا)نفقة لاحدعشر:۔۔۔و(خارجة من بيته بغيرحق)وهي الناشزة حتى تعود.]

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفااللہ عنہ — واللہ اعلم: صلاح الدین چترالی

۱۹ ربیع الاول ۱۴۲۷ھ — فتوی نمبر: ۵۲

﴿شوہر کا مال اس کی اجازت کے بغیر کسی پر خرچ کرنا جائز نہیں ہے﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان شرع دین متین مندرجہ ذیل مسئلہ کے بارے میں کہ ایک شخص نے اپنے بیوی کو تین طلاقیں دیکر فارغ کر دیا عورت نے عدت گزارنے کے بعد دوسرے مالدار آدمی سے عقد نکاح کر لیا، جبکہ اس عورت کے سابقہ شوہر سے تین نابالغ اور ایک بالغ بیٹا بھی ہے وہ عورت اپنے موجودہ شوہر کی اجازت کے بغیر اس کا مال اپنے بیٹوں کو نان ونفقہ کی صورت میں دیتی ہے جبکہ ان بچوں کو پتہ بھی ہے کہ ہماری والدہ اپنے موجودہ شوہر کا مال اس کی اجازت کے بغیر بطور نان ونفقہ ہمیں دیتی ہے۔ اب پوچھنا یہ ہیکہ آیا ان اولاد کا خرچہ والد کے ذمہ لازم یا ان کے والدہ کے، نیز یہ بھی بتائیں کہ عورت نے اپنے موجودہ شوہر کا جو مال اس

کی اجازت کے بغیر اپنے سابقہ شوہر کے بیٹوں کو نان ونفقہ کی صورت میں دیا ہے وہ مال ان بچوں کیلئے از روئے شرع حلال ہے کہ نہیں؟ اور کیا عورت کو اس بات کا اختیار حاصل ہے۔ وہ اپنے موجودہ شوہر کا مال اس کی اجازت کے بغیر اپنے سابقہ شوہر کی اولاد پر خرچ کرے؟ براہ کرم شریعت مطہرہ کی روشنی میں جواب عنایت فرما کر ممنون ومشکور فرمائیں۔ مستفتی: عبید اللہ شانگلہ

﴿جواب﴾ نابالغ اولاد کا نان ونفقہ والد کے ذمہ ہوتا ہے نہ کہ والدہ کے ذمہ، والد اپنے نابالغ اولاد کا خرچہ اگر برداشت نہیں کرتا تو یہ ان بچوں کے ساتھ ظلم ہے برادری کے لوگوں کو چاہیے کہ وہ اپنے عزیز کو سمجھائیں تاکہ وہ اپنے معصوم بچوں کے خرچ کا انتظام بلوغت تک کرتا رہے اگر سمجھانے کے باوجود بھی وہ شخص اپنے معصوم بچوں کو خرچہ دینے سے انکار کرے تو پھر شریعت مطہرہ کی رو سے اس کو قید کیا جائیگا، البتہ جب لڑکے بالغ ہو جائیں تو ان کو چاہیے کہ خود محنت مزدوری کر کے اپنے لئے خرچ کا انتظام کریں والد یا والدہ کیلئے بوجھ نہ بنیں، اور اس عورت کیلئے شریعت مطہرہ کا حکم یہ ہے کہ اپنے موجودہ شوہر کے مال میں خیانت ہرگز نہ کرے سابقہ شوہر کے بچوں کا بوجھ اپنے موجودہ شوہر پر نہ ڈالے بچے اگر بالغ ہوں اور ان کو معلوم بھی ہو کہ ہماری والدہ اپنے موجودہ شوہر کی اجازت کے بغیر ان کے مال سے ہم پر خرچہ کر رہی ہے تو ان بچوں کیلئے بلاشبہ یہ مال چوری کا ہے گناہ میں والدہ کے ساتھ بچے بھی شریک ہیں۔ البتہ اس عورت کیلئے شوہر نے ایک خاص مقدار پہلے سے مقرر کر لی ہو یا ابھی مقرر کر لی کہ وہ اپنی بیوی کو بطور نفقہ اتنی رقم دیتا رہیگا پھر عورت اسی خرچہ میں سے بچا کر اپنے بچوں پر خرچ کرے تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں ہے یا شوہر نے اپنے بیوی کو اجازت دیدی کہ اپنے سابقہ شوہر کے بچوں پر بھی خرچ کرتی رہے تو اس میں بھی عورت پر کوئی گناہ نہیں ہے، اور ابتک ایسی کوئی غلطی اگر عورت سے ہوئی ہے تو اس کا حل یہ ہے کہ کسی طرح اتنا مال شوہر کو واپس کر دیا جائے جرم کا اظہار موجودہ شوہر کے سامنے بیشک نہ کرے کہ مجھ سے ایسی غلطی ہوئی ہے کسی بھی بہانہ سے وہ مال شوہر کو واپس کر دیا جائے یا ان کے غیر موجودگی میں ان کے مال میں شامل کر دیا جائے۔

لما في الهداية: ۲/۴۲۷ (طبع رحمانية)

ونفقة اولاد الصغار على الأب لا يشاركه فيها أحد كما لا يشاركه في نفقة الزوجة لقوله تعالى وعلى المولود له رزقهن والمولود له هو الأب

ولمافی قاضی خان: ۱/۲۸۲ (طبع قدیمی)

نفقة أولاد الصغار والاناث المعسرات على الأب لايشاركه فى ذلك أحد ولاتسقط بفقره ولايجب عليه نفقة الذكور الكبار الا أن يكون الولد عاجزا عن الكسب لزمانة أو مرض وكذا لو فرض القاضى على الأب نفقة الولد فتركه لأب لانفقة فاستدانت لأم وأنفقت بأمر القاضى كان لها أن ترجع بذلك على لأب ويحبس الأب بنفقة الولد وان كان لايحبس بسائر ديونه

ولمافی الهندية: ۱/۵۸۲، ۵۸۳ (طبع قديمی)

ونفقة أولاد الصغار على الأب لايشاركه فيها احد كذافى الجوهرة النيرة فان أبى ان يكتسب وينفق عليهم يجبر على ذلك ويحبس كذافى المحيط ويحبس لأب بنفقة الولد وان كان لايحبس بسائر ديونه

ولمافی التاتار خانية: ۴/۱۷۳ (طبع قديمی)

ووجه الفرق أن نفقة الصغير على لأب وان كان معسر افأمانفقة ابن الكبير فليست على لأب

ولمافی الهندية: ۱/۵۵۷ (طبع رشيديه)

وليس لهاأ ن تعطى شئا من بيته بغيراذنه

ولمافی المشكوة: ۱/۲۵۵ (طبع سعيد)

وعن ابى حرة الرقاشى عن عمه قال قال رسول الله صلى الله عليه وسلم ألا لاتظلموأ لالايحل مال امرئ الا بطيب نفس منه

ولمافی البحر ۴/۱۷۴ (طبع سعيد)

وظاهر من غاية البيان ان نفقة المفروضة تصير ملكاللمرأة اذادفعها اليها فلها التصرف فيهامن بيع وهبة وصدقة وادخار

ولمافی التنوير مع الدر: ۳/۱۱۰ (طبع سعيد)

وترد العين لو قائمة وان باعهاأووهبها لبقائهاعلى ملك مالكها

والله اعلم بالصواب: فضل حق زیزاروی الجواب صحیح: مفتی عبدالرحمٰن عفااللہ عنہ

فتوی نمبر: ۳۹۰۲ ۲۰ صفرالخیر ۱۴۳۵ھ

﴿بیوی کے پاس خرچہ میں سے بچ جائے تو کیا حکم ہے؟﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ کوئی آدمی اپنی بیوی کو ایک ماہ کا خرچہ دے جو کہ متوسط طریقہ سے خرچ کیا جائے تو پورا ہو جاتا ہے اگر بیوی خرچہ انتہائی کم کر کے اس میں سے کچھ بچا لے تو کیا وہ بچا ہوا شوہر کو واپس کرنا ضروری ہے یا شوہر کو بتائے بغیر بھی اس کو خرچ کر سکتی ہے؟ مستفتی: ایک سائل

﴿جواب﴾ خرچے سے مراد اگر صرف بیوی کا ذاتی خرچہ ہے تو ایسا خرچہ بیوی کی ملکیت

ہے بچ جائے تو شوہر کو لوٹانا ضروری نہیں ہے لیکن پاک و ہند میں عموماً شوہر بیوی کو پورے گھر کا چولہا چلانے کیلئے خرچ دیتا ہے، بیوی کی ذات کے علاوہ بچوں کا خرچہ بھی شامل ہوتا ہے، ایسے خرچے میں سے بچا کر بیوی مالک نہیں بنتی، شوہر کو لوٹانا ضروری ہے۔

لما فی البحر الرائق:(۱۷۲/۴،طبع سعید)

وظاهر ما فی غاية البيان أن النفقة المفروضة تصير ملكا للمرأة اذا دفعها اليها فلها التصرف فيها من بيع وهبة وصدقة وادخار.

ولما فی الفتاوی قاضی خان:(۴۲۵/۱،طبع قدیمی)

قال وليس فی النفقة عندنا تقدير لازم وانما يجب عليه كفايتها بالمعروف وذالک يختلف باختلاف الاماكن والاوقات وكما يجب لها وذالک قدر الكفاية من الخبز فكذلک الادام لأن الخبز لا يؤكل عادة الا مأدوما وقالوا فی تأويله قوله تعالى من أوسط ما تطعمون اهليكم أما فی عرفنا نفقة المرأة تختلف باختلاف الناس والأوقات ولا تقدر النفقة بالدراهم.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: شاہد محمود عفا اللہ عنہ

۱۷ ربیع الثانی ۱۴۲۹ھ — فتویٰ نمبر: ۱۳۷۳

﴿بدکردار بیوی کے مہر اور نان ونفقہ کا مسئلہ﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اور مفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک لڑکی جس کی شادی کے دو سال ہوئے ہیں، وہ غیر محرم کیساتھ ناجائز قسم کے تعلقات قائم کئے ہوئے ہے، ناجائز تعلقات کا ثبوت یہ بھی ہے کہ اس نے غیر محرم آدمی کے ساتھ ناجائز قسم کی تصویریں کھینچوائی ہے جن کو میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے، اس بناء پر لڑکی کے خاوند نے جب یہ بات سنی تو کہا کہ میں اس لڑکی کو نہیں رکھتا اور وہ لڑکی والدین کے گھر پہنچادی ہے۔

سوال یہ ہے کہ جب سے لڑکی کو والدین کے گھر پہنچادیا گیا ہے، اس وقت سے طلاق کے وقت تک جو عرصہ درمیان میں گزرا ہے، آیا اس دوران میں لڑکی کا نفقہ وخرچہ خاوند کے ذمہ واجب ہے یا نہیں؟ اور ایسی لڑکی کا مہر خاوند کے ذمہ واجب الاداء ہے یا نہیں؟ نیز ایسی صورت میں لڑکی خاوند سے خلع لے سکتی ہے یا نہیں؟ مستفتی: عبدالستار صاحب

﴿جواب﴾ کوئی لڑکی اگر کسی کے ساتھ ناجائز تعلقات قائم رکھتی ہے تو یہ گناہ کبیرہ ہے، شادی شدہ کے لئے گناہ کے علاوہ شوہر کے ساتھ بے وفائی کا ثبوت بھی ہے، مسلمان غیر تمند

آدمی کے لئے ایسی بیوی کو بسانا واقعی مشکل ہے، لہٰذا مذکورہ صورت میں شوہر اگر اسکو نہیں رکھنا چاہتا تو طلاق دینے میں کوئی حرج نہیں، تاہم طلاق کی صورت میں مہر واجب الاداء ہوگا۔

لما في الدر مع الرد:(۵۰/۲،طبع سعيد)

وفي اخر حظر المجتبى:لايجب على الزوج تطليق الفاجرة ولاعليهاتسريح الفاجرالا اذاخافاان لايقيماحدودالله فلابأس أن يتفرقا.

وفي الشامية:عن البحربدليل الحديث،أن رجلااتى النبي ﷺ فقال يارسول الله ان امرأتي لاتدفع يدلامس فقال عليه السلام طلقهافقال انى احبهاوهي جميلة فقال استمتع بها.

بیوی اگر سمجھتی ہے کہ اس خطا کے بعد اب میں اس قابل نہ رہی کہ یہ شوہر مجھے بسا لے، اسلئے نکاح سے خلع چاہتی ہو تو شوہر سے خلع لے لے جسکی صورت یہ بھی ہو سکتی ہے کہ بیوی حق مہر سے دست برداری کا اظہار کر دے تو شوہر کے ذمہ سے حق مہر ساقط ہو جائے گا اور اگر ادا کر دیا ہے تو بیوی حق مہر لوٹا دے تو اس سے ایک طلاق بائن واقع ہو جائے گی اور عدت گزارنے کے بعد عورت دوسری جگہ چاہے تو شادی کر سکے گی۔

لما في الهداية:(۴۰۴/۲،طبع رحمانيه)

واذاتشاق الزوجان وخافاان لايقيماحدودالله فلابأس بان تفتدى نفسهامنه بمال يخلعهابه لقوله تعالى فلاجناح عليهمافيماافتدت به،فاذافعل ذلك وقع بالخلع تطليقة بائنة ولزمهاالمال وان كان النشوزمنهاكرهناله ان ياخذمنهااكثرمااعطاها.

ولمافي التنوير مع الدر:(۹۶/۵،طبع امداديه)

(وان زادت من مال أوبراءة مهرها)عليه في الاولى(مهرها)ان قبضته والالاشئ عليها.

طلاق یا خلع سے پہلے بیوی کا نفقہ شوہر کے ذمہ واجب الاداء رہتا ہے لیکن جو وقت گزرا اور خرچہ لڑکی کے والدین نے برداشت کیا تو اس کا مطالبہ شوہر سے نہیں کیا جا سکتا، البتہ اگر شوہر طلاق یا خلع پر آمادہ نہیں ہے تو بذریعہ عدالت یا پنچائت آئندہ کے خرچہ کا پابند کیا جا سکتا ہے۔

لمافي التنوير مع الدر:(۳۱۱/۵-۳۱۲،طبع امداديه)

(والنفقة لاتصيردينا الابالقضاء أوبالرضاء)..... فقبل ذلك لايلزمه شئ.

وفي الشامية:أى لايلزمه عمامضى قبل الفرض بالقضاء أوالرضاء.

ولمافي البحرالرائق:(۱۸۶/۴ طبع ايچ ايم، سعيد)

ولاتجب نفقة مضت الابالقضاء اوالرضاء لان النفقة صلة وليست بعوض عندنافلم يستحكم الوجوب فيهاالابالقضاء والمراد بعدم وجوبهاعدم كونهادينا عليه فلاتكون دينا عليه يطالب به

ويحبس عليه الا باحدى هذين الشيئين فحينئذ تصير ديانة امه فلا تحل منه ابدا

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم: محمد اسلم چترالی المراہ

۲۵ ذی الحجہ ۱۴۲۹ھ — فتوی نمبر: ۱۰۴۸

﴿نابالغ اولاد کے مال میں والدین ولی کی حیثیت سے تصرف کر سکتے ہیں﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علمائے کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ بعض والدین اپنے نابالغ بچوں کی اشیاء مثلاً کپڑے جوتے وغیرہ یا کھلونے دوسرے بچوں کو صدقہ کر دیتے ہیں اس وجہ سے تاکہ ضائع یا خراب نہ ہو جائے اور اس کے بدلے ان کے لیے اپنی طرف سے نئی چیزیں خرید لیتے ہیں تو آیا اس طور پر بچوں کا مال دوسروں کو دینا جائز ہے یا نہیں؟

﴿جواب﴾ نابالغ اور ناسمجھ اولاد کے مال میں والدین کو ولی کی حیثیت سے ہر مفید تصرف یا کم از کم کسی مصلحت کی خاطر تصرف کرنے کا اختیار حاصل ہے، البتہ واضح نقصان دہ تصرف کا اختیار حاصل نہیں ہے، اس لیے بچوں کی قیمتی اشیاء دوسروں کو ھبہ کرنا یا صدقہ کرنا جائز نہیں ہے، البتہ ایسی اشیاء جو کسی بھی درجہ میں اپنے بچوں کے کام میں نہیں آتی اور دوسروں کے کام آتی ہیں تو ایسی اشیاء کو بطور صدقہ یا ھبہ کے دینا جائز ہے اس لیے ایسی چیزیں اپنے بچوں کے حق میں اب ردی اشیاء کے حکم میں ہیں تو کچرے میں ڈالنے سے زیادہ بہتر یہی ہے کہ کسی کے کام آجائیں، اور ایسی اشیاء کے بدلے دوسری کارآمد اشیاء اپنی طرف سے بچوں کو دلوانے کا بھی ارادہ ہو تو یہ زیادہ اولیٰ ہے اور احتیاط کے مطابق ہے۔

لما فی تنویر الابصار (۵/۵۲۸) طبع سعید

(والولاية في مال الصغير الى الاب ثم وصيه ثم وصي وصيه)

ولما فی الفقه الاسلامی وادلته (۱۰/۷۳۱) طبع رشيديه

اولاً: الولي على المال، اذا كان للقاصر مال كان للاب الولاية على ماله حفظا واستثمارا باتفاق المذاهب الاربعة،

وفيه ايضاً ـــ ص ۷۳۲ تصرفات الولي على المال)

تصرف الولي في مال القاصر مقيد بالمصلحة للمولى عليه، فلا يجوز له مباشرة التصرفات الضارة ضررا محضا كهبة شيئي من مال للمولى عليه او التصدق به او البيع والشراء بغبن فاحش، ويكون تصرفه باطلا وله مباشرة التصرفات النافعه نفعاً محضاً كقبول الهبة والصدقة والوصية، وكذا التصرفات المترددة بين الضرر

والنفع كالبيع والشراء والاجارة والاستجار والشركة والقسمة،

ولما في الدر المختار (۶/۳۹۰) طبع سعيد)

وجاز (شراء ما لا بد للصغير منه وبيعه) اى بيع ما لا بد للصغير منه لاخ وعم وام،

ولما في بدائع الصنائع (۵/۱۵۲ طبع سعيد)

واما الولاية، فالولاية في الاصل نوعان نوع يثبت بتولية المالك ونوع يثبت شرعاً لا بتولية المالك، اما الاول فهو ولاية الوكيل... واما الثانى فهو ولاية الاب والجد اب الاب والوصى والقاضى، وهو نوعان ايضاً ولاية النكاح وولاية غيره من التصرفات۔ واما ولاية غيره من التصرفات.. فسبب هذا النوع من الولاية في التحقيق شيئان احدهما الابوة والثانى القضاء، اماالابوة فلانهما داعية الى كمال النظر في حق الصغير لوفور شفقة الاب وهو قادر على ذالك لكمال رايه وعقله والصغير عاجز عن النظر لنفسه بنفسه وثبوت ولاية النظر للقادر على العاجز عن النظر امر معقول مشروع لانه من باب الاعانة على البر ومن باب الاحسان ومن باب اعانة الضعيف واعانة اللهفان وكل ذالك حين عقلاً وشرعاً،

وفيه ايضاً۔ (۵/ ۱۵۳)

واما شرائطها۔ واماالذى يرجع الى المولى فيه فهو ان لا يكون من التصرفات الضارة بالمولى عليه لقوله عليه السلام لا ضرر ولا اضرار في الاسلام وقال عليه الصلاة والسلام من لم يرحم صغيرنا فليس منا والاضرار ليس من المرحمة في شئى فليس له ان يهب مال الصغير من غيره بغير عوض لانه ازالة ملكه من غير عوض فكان ضرراً محضاً وكذا ليس له ان يهب بعوض عند ابى حنيفة وابى يوسف وعند محمد له ذالك.

ولما في تبيين الحقائق (۶/۱۸ طبع سعيد)

(فلو وهب لذى رحم محرم منه لايرجع فيها) لقوله عليه السلام:اذا كانت الهبة لذى رحم محرم لم يرجع فيها" لان المقصود منها صلة الرحم وقد حصل وفي الرجوع قطعية الرحم فلا يرجع فيها.

واللہ اعلم بالصواب: محمد تنویر عفا اللہ عنہ

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ

فتویٰ نمبر: ۳۵۵۹

۲۶ صفر المظفر ۱۴۳۳ھ

﴿کتاب الأیمان والنذور﴾

﴿غیر اللہ کی قسم کھانا جائز نہیں﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ غیر اللہ کی قسم کھانا جائز ہے یا نہیں؟ اور اگر کسی نے کھالی تو اس کا کیا حکم ہے؟
مستفتی: محمد حسن پشاوری

﴿جواب﴾ غیر اللہ کی قسم کھانا جائز نہیں ہے کسی نے کھالی ہو تو شرعاً یہ کوئی قسم نہیں ہے، اس لئے اس کی پاسداری واجب نہیں یعنی خلاف ورزی کرنے کی صورت میں قسم توڑنے کا کفارہ وغیرہ واجب نہیں ہوتا، ہاں غیر اللہ کی قسم کھانے کی وجہ سے سخت گناہ ہوا اس لئے توبہ واستغفار ضروری ہے، البتہ قرآن کریم چونکہ اللہ تعالیٰ کی صفات میں سے ہے، اس لئے قرآن کریم کی قسم معتبر ہے توڑنے کی صورت میں کفارہ واجب ہوگا۔

لمافی الترمذی:(۱۸۵/۱، باب فی کراهية الحلف بغير الله تعالى،طبع فاروقی ملتان)
عن ابن عمر أن رسول الله صلى الله عليه وسلم ادرك عمر وهو فى ركب وهو يحلف بابيه فقال رسول الله صلى الله عليه وسلم ان الله ينهاكم ان تحلفوا بآبائكم ليحلف حالف بالله اوليسكت.

ولمافی التنویر مع الدر:(۷۱۲/۳،طبع سعید)
(لا) يقسم (بغير الله تعالى كالنبى والقرآن والكعبة)

وفی الشامية:(قوله لايقسم بغير الله تعالى)عطف على قوله والقسم بالله تعالى:اى لاينعقدالقسم بغيره تعالى اى غيراسمائه وصفاته ولوبطريق الكناية كمامر،بل يحرم كمافی القهستانی،بل يخاف منه الكفرفى نحووحياتى وحياتك كمايأتى.

ولمافی الفقه الاسلامی وادلته:(۲۴۷۱/۴،طبع رشیدیه)
اذاحلف الانسان بغيرالله تعالى كالاسلام او.....اوبالآباء اوالامهات اوالابناء او.....
ومثل:(لعمرك وحياتك وعيشك وحقك)فلايكون يمينا باجماع العلماء،وهو مكروه
قال الشافعى:اخشى ان يكون معصية ولاتجب عليه كفارة،لانه حلف بغير الله تعالى
والناس وان تعارفوا الحلف بالآباء ونحوهم لكن الشرع نهى عنه.....ولان هذا النوع من
الحلف لتعظيم المحلوف به وهذا التعظيم لايستحقه الاالله تعالى.

ولمافی الدرالمختار:(۷۱۲/۳،طبع سعید)
ولايخفى ان الحلف بالقرآن الآن متعارف فيكون يمينا.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب: محمد شعیب پشاوری

۱۹ صفر الخیر ۱۴۳۲ھ — فتویٰ نمبر: ۲۸۸۲

﴿قسم معلق کی ایک صورت اور اس کا کفارہ﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علمائے کرام اس مسئلہ کے بارے کہ اگر کسی نے قسم کھائی کہ " قسم دے باران بہ نہ ؤشی" قسم ہے بارش نہیں ہوگی، اور بارش ہوگئی تو اس کا کیا حکم ہے؟

﴿جواب﴾ مذکورہ صورت میں اس کی قسم منعقد ہوگئی ہے، اور بارش ہونے پر قسم ٹوٹ گئی ہے لہذا اس پر قسم کا کفارہ لازم ہے، دس مسکینوں کو صبح وشام کا کھانا کھلائے، یا بقدر ستر پوشی کپڑا پہنائے، اور اگر یہ نہ کرسکے تو مسلسل تین روزے رکھے۔

لما فی التنویر:(۳/۷۸۶ طبع: سعید)

(امکان تصور البر فی المستقبل شرط انعقاد الیمین) ولو بطلاق (وبقائها) اذ لا بد من تصور الأصل لتنعقد فی حق الخلف وهو الکفارة.

ولما فی الشامی:(۳/۷۸۶ طبع سعید کراچی)

قلت:لکن عبر فی البحر وعلیه فالمراد بتصوره کونه ذا صورة أی کونه موجوداً فالمراد امکان وجوده فی المستقبل أی امکانه عقلاً وان استحال عادةً احترازاً عما لا یمکن عقلاً ولا عادةً کما فی المثال الآتی فهذالا تنعقد فیه الیمین ولا تبقی منعقدةً، بخلاف ما أمکن وجوده عقلاً وعادةً أو عقلاً فقط مع استحالته عادةً کما فی مسئلة صعود السماء و قلب الحجر ذهباً فانها تنعقد کما سیأتی.

ولما فی الهدایة اوّلین:(ص ۴۷۹ طبع رحمانیه)

قال کفارة الیمین عتق رقبة یجزی فیها ما یجزی فی الظهار وان شاء کسا عشرة مساکین کل واحد ثوباً فما زاد، وادناه ما یجوز فیه الصلوة، وان شاء أطعم عشرة مساکین کالاطعام فی الظهار، والأصل فیه قوله تعالی:فکفّارته اطعام عشرة مساکین الأیة، وکلمة أو للتخییر فکان الواجب احد الأشیاء الثلثة قال فان لم یقدر علی احد الأشیاء الثلاثة صام ثلثة ایام متتابعات.

الجواب صحیح: مفتی عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ　　　واللہ اعلم بالصواب: محمد ابرار عفی عنہ

۱۹ صفر الخیر ۱۴۳۳ھ　　　فتویٰ نمبر: ۳۵۳۰

﴿یمین غموس کا حکم﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ اگر کسی شخص نے گزرے ہوئے زمانے کے کسی واقعے پر جان بوجھ کر جھوٹی قسم کھائی تو اس کا کیا حکم ہے اور اس کا کیا کفارہ ہے؟

﴿جواب﴾ گزشتہ زمانے کے کسی واقعے یا بات پر جھوٹی قسم کھانا یمین غموس کہلاتا ہے،

غموس کے معنی غوطہ زن ہونا گویا ایسا شخص گناہ میں سرتا پاڈوب جاتا ہے تو یہ انتہائی سخت اور بڑا گناہ ہے اور اس کا مستقل کفارہ تو نہیں ہے، البتہ توبہ و استغفار ضروری ہے، نیز اس قسم کے ذریعے اگر کسی کا مالی نقصان کیا ہو یا عزت نفس وغیرہ کو مجروح کیا ہو تو اس کی تلافی بھی ضروری ہے، اس کے بغیر توبہ و استغفار سے بھی یہ گناہ معاف نہ ہوگا۔

لما فی قوله تعالی:(سورة النحل،آیت ۹۴)

ولا تتخذوا ایمانکم دخلا بینکم فتزل قدم بعد ثبوتها الأية.

ولما فی البخاری:(۵۱۸/۲،باب الیمین الغموس،طبع رحمانیه)

عن عبدالله بن عمرو عن النبی صلی الله علیه وسلم قال الکبائر الاشراک بالله وعقوق الوالدین وقتل النفس والیمین الغموس.

ولما فی الشامی:(۷۰۵/۳،کتاب الایمان،طبع سعید)

(وهی کبیرة مطلقا)ای اقتطع بها حق مسلم اولا.

ولما فی التنویر مع الرد:(۷۰۵/۳-۷۰۶،کتاب الایمان،طبع سعید)

(وهی غموس ان حلف علی کاذب عمدا کوالله ما فعلت عالما بفعله اوکوالله ماله علی الف عالما بخلافه ووالله انه بکر عالما بانه غیره ویأثم بها)

وفی الشامیة:(قوله ویأثم بها)ای اثما عظیما کما فی الحاوی......(قوله فتلزمه التوبة) اذ لا کفارة فی الغموس یرتفع بها الاثم فتعینت التوبة للتخلص منه.

ولما فی تکملة فتح الملهم:(۳۵/۶،باب قبول توبة القاتل،طبع دار العلوم کراتشی)

اذا کان فی وسعه ان یتدارک حق خصمه اویطلب منه العفو فلا توبة الا به.

الجواب صحیح:عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ | واللہ اعلم بالصواب:محمد شعیب پشاوری

۱۴ صفر الخیر ۱۴۳۲ھ | فتویٰ نمبر:۲۸۸۰

﴿منت،قسم اور اس کے کفارہ کا حکم﴾

﴿لا ینعقد القسم بغیر اسماء الله تعالی وصفاته﴾

﴿سوال﴾ مردی سوگند خورد باین الفاظ قسم بہ شریعت محمدی.آیا سوگند شماری شود؟ ام اسکندر

﴿جواب﴾ سوگند خوردن بہ الفاظ مذکورۃ قسم شمار نہ می شود زیرا این قسم خوردن بغیر اللہ است واین از نگاہ شرع ممنوع است واللہ اعلم۔

لما فی البدائع:(۸/۳،طبع سعید)

ولو قال ودین الله أوطاعته أوشرائعه أوانبیائه وملائکته أوعرشه لم یکن یمینا لانه حلف بغیر الله.

ولمافی الدر والرد:(۷۱۵/۳، طبع سعید) وشربه ودبغه وجدوده الخ

وفی الشامیۃ: لامحل لذکر ماھذا الانہا لیست من الصفات، لان المراد بہا الاحکام المتعبد بہا وھی غیرہ تعالٰی فلا یقسم بہا وان تعورف الخ

الجواب صحیح: عبد الرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: محمد علی

۱۱ جمادی الثانی ۱۴۳۰ھ — فتویٰ نمبر: ۲۲۹۸

﴿غیر ارادی طور پر قسم کھانے کا حکم﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک آدمی بات بات پر قسم کھاتا ہے گویا کہ اسکا تکیہ کلام بن گیا ہے، پوچھنا یہ ہے کہ شریعت میں اسکا کیا حکم ہے؟

﴿جواب﴾ ایسا شخص جو ماضی، حال کی ہر بات پر غیر ارادی طور پر قسم کھاتا ہو خود بخود اسکی زبان پر جاری ہو جاتی ہو تو ایسی قسم یمین لغو کہلاتی ہے، ایسی قسم پر اللہ تعالیٰ کی ذات سے امید ہے کہ مؤاخذہ نہیں فرمائیں گے لیکن اگر قسم معلق کر لی مثلاً یوں کہے اللہ کی قسم فلاں کام نہیں کرونگا، یہ یمین لغو نہیں کہلاتی خواہ غیر ارادی طور پر ایسا بولا ہو بلکہ یہ یمین منعقدہ کہلاتی ہے جس کا حکم یہ ہے کہ حانث ہونے کی صورت میں اس کا کفارہ ادا کرنا ضروری ہے۔

لمافی قولہ تعالیٰ:(سورۃ البقرۃ ،آیت۲۲۵) لا یؤاخذکم اللہ باللغو فی ایمانکم ---الآیۃ.

ولمافی المظہری:(۲۸۷/۱ طبع رشیدیہ)

واللغو ..... ھھنا ما جری من الیمین علی اللسان من غیر عقد وقصد سواء کان فی الانشاء او الخبر الماضی او المستقبل وھذا التفسیر مروی عن عائشۃؓ روی الشافعی انہا قالت: لغو الیمین قول الانسان لا واللہ الخ واخرجہ أبوداود..... وکذا لا ینعقد عند الشافعیؒ اذا کان ھذا القسم من الیمین فی الانشاء فلا یجب علیہ الکفارۃ ان حنث والحجۃ لہ ھذہ الایۃ بھذا التفسیر وقال أبو حنیفۃؒ ینعقد الیمین ویجب الکفارۃ ان حنث الخ.

ولمافی الخلاصۃ:(۱۲۳/۲ طبع رشیدیہ)

واللغو لا یؤاخذ بہ صاحبہ الا فی الطلاق والعتاق والنذور.

الجواب صحیح: عبد الرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: محمد احمد عفی عنہ

۹ رجب المرجب ۱۴۲۹ھ — فتویٰ نمبر: ۶۲۵

﴿قسم اٹھوانے والے کے سامنے "ہاں میں ہاں" ملانا﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں حضرات علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک شخص نے

ایک لڑکی کا ہاتھ زبردستی قرآن پر رکھا اور کہا کہ تم میرے علاوہ کسی سے شادی مت کرنا اور لڑکی نے بھی گھبراہٹ کی وجہ سے "ہاں میں ہاں" ملادی اور اب اس لڑکی کی شادی کسی دوسری جگہ ہوگئی ہے تو کیا یہ حانث ہوگئی؟ اور اگر حانث ہوگئی ہے تو اس کا کفارہ کیا ہے؟ مستفتیہ: ام عمارہ کورنگی

﴿جواب﴾ صورت مسئولہ میں اس شخص کا مقصد قسم دلوانا ہی تھا لیکن "ہاں" کرتے ہوئے اس لڑکی کا ارادہ قسم کا نہیں تھا، اس لئے ان دونوں میں سے کسی ایک پر بھی قسم لازم نہیں ہوئی اور خلاف کرنے کی صورت میں کوئی بھی حانث نہیں ہوا۔

لما فی فتاوی قاضی خان: (۵۳۷/۱، طبع قدیمی)

ولو قال: والله لتفعلن كذا وكذا غدا فقال الآخر: نعم فهو على خمسة أوجه: احدها: ان ينوى المبتدى الحلف على نفسه والمجيب بقوله: نعم يريد الحلف على نفسه وفي هذا الوجه كل واحد منهما يكون حالفا الخ والثاني: ان يريد المبتدى استحلاف المجيب والمجيب بقوله نعم يريد اليمين على نفسه الخ والثالث: ان يريد المبتدى استحلاف المجيب بقوله نعم يريد الوعد في ذلك دون اليمين وفي هذا الوجه لا يكون احدهما حالفا.

ولما في الفتاوى البزازية: (۲۲۲/۱، طبع قديمي)

(نوع آخر) الله ليفعلن كذا أو مع الواو فقال الآخر نعم — ان قصد المبتدى الاستحلاف والمجيب ان لا يكون عليه يمين ويكون قوله نعم على معناه بلا يمين، فهو كما نوى ولا يمين على واحد منهما الخ، ومثله في التاتارخانية: (۲۹۲/۴، طبع قديمي)

ولما فيه ايضا: (۳۰۰/۴، طبع قديمي)

اليمين على نية الحالف ان كان مظلوما وان كان ظالما فعلى نية المستحلف.

الجواب صحیح: عبد الرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: انیس طالب کان اللہ لہ

۱۷ ربیع الثانی ۱۴۳۶ھ — فتویٰ نمبر: ۲۵۹۲

﴿مستحلف کو نعم سے جواب دیا جائے، تو کیا حکم ہے؟﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اور مفتیان شرع متین اس مسئلہ کے بارے میں کہ مجھے میری سہیلی نے اصرار کر کے قسم دلوائی یعنی تجھے قسم ہو کہ آئندہ کے لئے پاپڑ نہیں کھانا، میں نے "ہاں" کرلی لیکن قسم کا کوئی ارادہ نہیں تھا، بلکہ ہاں کرتے وقت خیال تھا، کہ میرے لیے چھوڑنا مشکل ہے تو کیا میں قسم کھانے والی ہوگئی؟ مستفتیہ: طالبہ یوسفیہ بنوریہ

﴿جواب﴾ ظاہر ہے کہ آپ کی سہیلی کا مقصد اس جملہ سے آپ ہی کو قسم دلوانا تھا لیکن ہاں

کرتے ہوئے آپ کا ارادہ قسم کا نہیں تھا، اس لئے آپ دونوں میں سے کسی ایک کی بھی قسم عائد نہیں ہوئی، خلاف کرنے کی صورت میں کوئی بھی حانث نہیں ہوگا۔

لما فی الدرمع الرد:(۵/۶۶۵-۶۶۱،طبع امدادیہ)

فروع:قال لغیره:والله لتفعلن كذافهو حالف.....مالم ينو الاستحلاف.

وفی الشامیة:قوله:(مالم ينو الاستحلاف).....قال فی الخانية:ولو قال:والله لتفعلن كذافقال الاخر نعم،فهو على خمسة اوجه:احدها:ان ينوى كل من المبتدى والمجيب الحلف على نفسه فهما حالفان اماالاول فظاهر وأماالثانى فلأن قوله نعم يتضمن اعادة ماقبله فكانه قال والله لافعلن كذا،فان لم يفعل حنثا جميعا.الثانى:ان يريدالمبتدى الاستحلاف والمجيب اليمين على نفسه،فالحالف هوالمجيب فقط. الثالث:ان لايريدالمجيب اليمين بل الوعدفلايكون احدهما حالفا الرابع:ان لا يكون لاحدهمانية فالحالف هوالمبتدى فقط الخامس:ان يريدالمبتدى الاستحلاف والمجيب الحلف،فالمجيب حالف لاغيراه.ملخصاً.قلت هذاالاخير هو عين الثانى، فتامل.

ولما فی الدرمع الرد:(۵/۵۶۹،طبع امدادیہ)

عرض عليه اليمين فقال:نعم.....عن التاترخانية انه بنعم لايصير حالفا هو الصحيح.

وفی الشامیة:قوله:(كان حالفا)لانه اذاقال والله لتفعلن كذافقال نعم كانه يصير قال والله لافعلن،لان مافی السوال معادفی الجواب كماسياتی فی آخرالايمان.....مانقله ح عن البحر.

والله اعلم بالصواب: عزیز الرحمٰن چارسدوی   الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ

فتویٰ نمبر: ۱۴۰۹   ۵ جمادی الاولیٰ ۱۴۲۹ھ

﴿دوسرے کی صفائی کیلئے قسم کھانا﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ دوسرے کی صفائی کیلئے قسم کھانا جائز ہے یا ناجائز؟ نیز اگر قسم غلط ثابت ہوجائے تو مواخذہ ہوگا یا نہیں؟

﴿جواب﴾ کسی شخص کا اس واقعہ کے علم کے بغیر دوسرے کی طرف سے قسم کھانا یا وکیل بن کر قسم کھانا تو درست نہیں ہے، البتہ اگر اسے اس چیز کے بارے میں علم ہو جس پر قسم کھا رہا ہے تو علم پر قسم کھانا درست ہے مثلاً یوں کہے کہ اللہ کی قسم میرے علم کے مطابق فلاں نے یہ کام نہیں کیا ہے، ایسی صورت میں قسم غلط ثابت ہوجائے تو عنداللہ مواخذہ نہیں ہوگا، جان بوجھ کر دوسرے کی طرف سے جھوٹی قسم کھائی تو سخت گنہگار ہوگا اور توبہ کے علاوہ قسم کیوجہ سے اگر کسی کا مالی نقصان ہوا

ہے تو اسکی تلافی بھی واجب الذمہ ہوگی۔

لما فی فقہ الاسلامی:(۲۰۹/۸،طبع الباب المتلق علیھا،ط بیروت)

فلا تقبل الیمین النیابة لصلتھا بذمة الحالف، وعلیہ فلا یحلف الوکیل أوولی القاصر ویوقف الأمر حتی یبلغ.

ولما فی التنویر مع الدر:(۵/۵۵۲،طبع سعید)

(التحلیف علی فعل نفسہ یکون علی البتات)ای القطع بانہ لیس کذلک(و)التحلیف (علی فعل غیرہ)یکون(علی العلم)

ولما فی فقہ الاسلامی:(۲۰۲/۸،طبع الباب النیة فی الیمین،طبع بیروت)

یحلف الشخص فی فعل غیرہ علی نفی علمہ مطلقا،سواء کان اثباتاام نفیا لما ثبت فی الصحیح ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم حلف الیہود فی القسامة"باللہ ماقتلتم ولاعلمتم لہ قاتلا"ولان الانسان لاعلم لہ بفعل غیرہ ولایدرک حقیقة تصرفاتہ فیحلف علی نفی العلم.

الجواب صحیح:عبدالرحمٰن عفااللہ عنہ　　　واللہ اعلم بالصواب:عبدالحکیم کشمیری

۱۳ربیع الاول ۱۴۲۹ھ　　　فتوی نمبر:۱۲۰۳

طلاق کی قسم اٹھانے اور اس پر مجبور کرنے کا حکم

سوال: کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ہمارے علاقے میں اگر کسی پر چوری وغیرہ کا الزام ہو تو اس سے طلاق کی قسم کھلواتے ہیں، پوچھنا یہ ہے کہ اگر وہ تعلیقا قسم کھالے اور اس نے چوری بھی کی ہو تو طلاق واقع ہوجائے گی یا نہیں؟ اسی طرح اگر تعلیق ذکر نہ کرے بلکہ یوں کہے کہ''میری بیوی کو طلاق ہو میں نے چوری نہیں کی ہے'' یا صرف یوں کہے کہ''میری بیوی کو طلاق ہو'' آخری جملہ ذکر نہ کرے تو اسکا شرعا کیا حکم ہے؟ نیز ایسے موقع پر جج یا ثالث کو طلاق پر مجبور کرنے کا حق حاصل ہے یا نہیں؟　　مستفتی:محمد عظیم خان ڈیرہ اسمٰعیل خان

جواب: (۱) مذکورہ صورت میں جب بیوی کی طلاق کو معلق کرکے قسم کھالے کہ اس نے چوری نہیں کی ہے اور واقع میں اس نے چوری کی ہو تو طلاق واقع ہوجائے گی، اسی طرح اپنی بات کو باقاعدہ تعلیق کے بغیر بولے جیسا کہ دوسری صورت میں ہے تو اسکا بھی یہی حکم ہے یعنی اگر چوری کی ہو تو طلاق واقع ہوجائے گی ورنہ نہیں، البتہ تیسری صورت میں جب وہ صرف یوں کہتا ہے

کہ "میری بیوی کو طلاق ہو" اور اسکے ساتھ مزید کوئی بات نہیں کہتا تو بہر صورت ایک طلاق رجعی واقع ہو جائے گی، اس لئے کہ یہاں اگرچہ اسکی مراد تعلیق ہے لیکن تعلیق کی کوئی صورت نہیں پائی جاتی۔

لمافی الدر المختار:(۸۵۱/۲،طبع سعید)

قيل له ان كنت فعلت كذافامرأتك طالق فقال نعم وقدكان فعل طلقت......ادعى عليه فحلف بالطلاق ماله عليه شئى فبرهن بالمال حنث به يفتى.

ولمافى التاتارخانية:(۳۲۷/۳،طبع قديمى)

رجل ادعى على آخرأنه سرق ثوبه فأخذالمدعى عليه ثوب المدعى وقال:امرأته طالق(كه من جامه تونى برداشته ام)فقدقيل لاتطلق امرأته ان لم يكن سرق ثوبه، وقيل تطلق قضاء اعتبارلصورة الشرط والاول اظهر.

ولمافيه ايضا:(۱۸۹/۳-۱۸۸،طبع قديمى)

وطلاق اللاعب والهازل واقع وكذالرجل يريدان يتكلم بكلام فسبق لسانه بالطلاق فالطلاق واقع......وفى المنتقى:قال ابوحنيفة رحمه الله لايجوزالغلط فى الطلاق.

(۲) جب مدعی کا اصرار ہو یا مدعی علیہ ایسا شخص ہو جو حق تعالیٰ کے نام کی حرمت کی پرواہ نہ کرتا ہو اور قاضی یا جج حلف بالطلاق میں مصلحت سمجھتا ہو تو اسکے لئے طلاق پر قسم لینے کی گنجائش ہے، عام ثالث کو چونکہ اختیار کلی حاصل نہیں ہوتا، لہٰذا وہ طلاق کی قسم کھلانے پر مجبور نہیں کرسکتا۔

لمافى التنويرمع الرد:(۵۵۵/۵،طبع سعيد)(لابطلاق وعتاق)

وفى الشامية:وظاهره أن القائل بالتحليف بهمايقول أنه غيرمشروع ولكن يعرض عليه لعله يمتنع فان من له ادنى ديانة لايحلف بهماكاذبافانه يؤدى الى طلاق الزوجة وعتق الامة اوامساكهمابالحرام بخلاف اليمين بالله تعالى فانه يتساهل به فى زماننا كثيراتأمل.

ولمافى فقه الاسلامى:(۲۰۵/۸،طبع الباب اليمين بالطلاق،طبع بيروت)

وأجازمتأخروالحنفية الحلف بالطلاق اذاطلبهاالخصم وألحّ فيهااوكان الحالف لا ينزجرالابهالفسادالزمان وقلة المبالات بالحلف بالله تعالى.

ولمافى الهداية:(۲۱۵/۳،طبع رحمانيه)

ولايستحلف بالطلاق ولابالعتاق لمارويناوقيل فى زمانناإذاألح الخصم ساغ للقاضى أن يحلف بذلك لقلة المبالاة باليمين بالله وكثرة الامتناع بسبب الحلف بالطلاق.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ　　　واللہ اعلم بالصواب: عبدالحکیم کشمیری

۱۳ ربیع الثانی ۱۴۲۹ھ　　　فتویٰ نمبر: ۱۳۶۱

﴿یمین معلق کی ایک صورت﴾

﴿سوال﴾ میری اور پھوپھی کے درمیان تلخ کلامی ہوئی تو پھوپھی نے کہا کہ تجھے قرآن کی

قسم تو آئندہ ہمارے گھر نہ آنا، میں نے کہا ٹھیک ہے میں نہیں آونگی اب پھوپھی پریشان ہیں اور مجھے اپنے گھر آنے پر مجبور کررہی ہیں، پوچھنا یہ ہے کہ میرے جانے سے میں حانث ہو جاؤنگی یا نہیں؟ نیز حانث ہونے کی صورت میں کفارہ کیا ہوگا؟ مستفتیہ: ام اشفاق سوات

﴿جواب﴾ محض کسی کو یہ کہنا کہ ''تجھے قرآن کی قسم آئندہ ہمارے گھر نہ آنا'' اس سے قسم منعقد نہیں ہوتی، البتہ اسکے جواب میں (ہاں ٹھیک ہے میں نہیں آؤنگی) قسم کی نیت سے اگر کہد یا ہے تو قسم منعقد ہوگئی ہے جیسا کہ سوال میں مذکور ہے صرف وعدہ مقصود ہو اور قسم کی نیت نہ ہو تو بھی قسم منعقد نہ ہوگی، لہٰذا (ہاں ٹھیک ہے میں نہیں آؤنگی) جواب میں کہتے ہوئے اگر آپکی نیت قسم کی تھی تو اس صورت میں آپ پھوپھی کے گھر جانے سے حانث ہو جائیں گی، کفارہ قسم لازم ہوگا اور ایسی قسم کا توڑنا بہتر ہے، لہٰذا آپ پہلے پھوپھی کے گھر چلی جائیں پھر دس مسکینوں کو کھانا کھلائیں یا دس مسکینوں کو ستر چھپانے کی بقدر کپڑا دیدے اور اگر اسکی استطاعت نہ ہو تو تین دن متواتر یعنی پے در پے روزے رکھیں۔

لما فی قوله تعالی: (پارہ ۷، سورۃ المائدۃ، آیت ۸۹)

فكفارته اطعام عشرة مسكين من اوسط ماتطعمون اهليكم اوكسوتهم اوتحرير رقبة فمن لم يجد فصيام ثلثة ايام......الأية.

ولما فی الدر المختار: (۷۱۲/۳-۷۱۳، طبع سعید)

قال الكمال: ولا يخفى أن الحلف بالقرآن الان متعارف فيكون يمينا واما الحلف بكلام الله فيدور مع العرف. وقال العيني: وعندى أن المصحف يمين لاسيما فى زماننا.

ولما فی الدر المختار: (۸۲۹/۳، طبع سعید)

ولو قال عليك عهدالله ان فعلت كذا فقال: نعم فالحالف المجيب.

وفى الشامية: ولو قال: والله لتفعلن كذا فقال الآخر نعم، فهو على خمسة أوجه: ـــ الثانى أن يريد المبتدئ الاستحلاف والمجيب اليمين على نفسه فالحالف هو المجيب فقط. الثالث: أن لا يريد المجيب اليمين بل الوعد فلا يكون أحدهما حالفا. الرابع: أن لا يكون لأحدهما نية فالحالف هو المبتدئ فقط. الخامس: أن يريد المبتدئ الاستحلاف والمجيب الحلف فالمجيب حالف لا غيراه ملخصا.

الجواب صحیح: عبد الرحمٰن عفا اللہ عنہ . واللہ اعلم بالصواب: حبیب الوہاب سواتی

۱۴ جمادی الثانی ۱۴۳۰ھ فتویٰ نمبر: ۱۵۲۷

﴿غصے کی حالت میں قسم کھانے کا حکم﴾

﴿سوال﴾ جناب مفتی صاحب! میں کپڑوں کی سلائی کا کام کرتی تھی، ایک دن غصے میں آ کر میں نے قسم کھائی کہ آج کے بعد کپڑوں کی سلائی کا کام نہیں کرونگی لیکن چند سال کے بعد میں نے پھر سلائی کا کام شروع کیا، اب میرے لئے شرعی حکم کیا ہے؟ مستفتیہ: ایک سائلہ سنگل ہانڈی

﴿جواب﴾ مذکورہ صورت میں آپ پر قسم توڑنے کا کفارہ لازم ہو گیا ہے، کفارہ کی تفصیل یہ ہے کہ دس مسکینوں کو کھانا کھلایا جائے یا دس مسکینوں کو کم از کم ستر پوشی کے بقدر کپڑا دیا جائے اور اگر اسکی استطاعت نہ ہو تو تین روزے مسلسل رکھے جائیں۔

لمافی التنویر مع الدر: (۳/۷۲۵-۷۲۶، طبع سعید)

(وكفارته) (تحرير رقبة او اطعام عشرة مساكين) (او كسوتهم بما) يصلح للاوساط وينتفع به فوق ثلاثة اشهر، و(يستر عامة البدن) فلم يجز السراويل الا باعتبار قيمة الاطعام

ولمافی مختصر القدوری: (ص ۲۲۳، طبع قدیمی)

وكفارة اليمين عتق رقبة يجزء فيها مايجزء فى الظهار وان شاء كسا عشرة مساكين كل واحد ثوبا فمازاد وادناه مايجوز فيه الصلوة وان شاء اطعم عشرة مساكين كالاطعام فى كفارة الظهار فان لم يقدر على احد هذه الاشياء الثلاثة صام ثلاثة ايام متتابعات

ولمافی کنز الدقائق: (۱/۱۶۵-۱۶۶، طبع قدیمی)

وكفارته (أى كفارة اليمين) تحرير رقبة او اطعام عشرة مساكين كما فى الظهار او كسوتهم بما يستر عامة البدن فان عجز عن احدها صام ثلاثة ايام متتابعات

ولمافی الهدایة: (۲/۴۸۱، طبع رحمانیه)

كفارة اليمين عتق رقبة يجزء فى الظهار وان شاء كسا عشرة مساكين كل واحد ثوبا فما زاد وادناه مايجوز فيه الصلوة وان شاء اطعم عشرة مساكين كالاطعام فى كفارة الظهار والاصل فيه قوله تعالى فكفارته اطعام عشرة مساكين الاية وكلمة او للتخيير فكان الواجب احد الاشياء الثلاثة

الجواب صحیح: عبد الرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: محمد وارث نعمان

۲۹ ربیع الاول ۱۴۲۹ھ — فتویٰ نمبر ۱۲۷۷

﴿اليمين قد يكون على فعل واجب﴾

﴿سوال﴾ رجل لا يصلى الفجر اكثر الايام فقال يوما والله لأصلين الفجر غدا فنام

ولم يصل هل يجب عليه الكفارة؟ ام احمد

﴿جواب﴾ نعم يجب عليه الكفارة فان الكفارة يتعلق بالحنث وقد وجد فيجب الكفارة والله اعلم.

لما في البدائع: (۱۷/۳، طبع سعيد)

وان كان على فعل الواجب بان قال والله لأصلين صلوة الظهر أو لاصوم رمضان فانه يجب عليه الوفاء ولايجوز له الامتناع عنه لقوله ﷺ من حلف أن يطيع الله فليطعه ولو امتنع يأثم ويحنث ويلزمه الكفارة (ثم قال) ان الكفارة لايمتنع وجوبها لعذر في الحانث بل يتعلق بمطلق الحنث سواء كان الحانث ساهيا أوخاطئا أو نائما أو مغمى عليه.

ولما في الدر المختار: (۷۲۸/۳، طبع سعيد) كحلفه ليصلين الظهر اليوم وبره فرض.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: محمد سلمہ

۲۸ جمادی الاولی ۱۴۳۰ھ — فتوی نمبر: ۲۲۲۵

﴿الفاظ قسم لکھنے کا حکم﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام کہ اگر کوئی شخص قسم کے الفاظ بولنے کے بجائے لکھ دے تو قسم منعقد ہو جاتی ہے یا نہیں؟ اور اسے پورا کرنا لازم ہوتا ہے یا نہیں؟

﴿جواب﴾ ضرورت کی وجہ سے کتابت کو زبان سے بولنے کے قائم مقام قرار دیا گیا ہے، لہٰذا کوئی خوشی اور رضامندی سے قسم کے الفاظ لکھ دے تو قسم منعقد ہوگی اور توڑنے کی صورت میں بھی حانث ہوگا، البتہ جبرا کسی سے قسم کے الفاظ لکھوائے گئے زبان سے نہیں بولے تو قسم منعقد نہیں ہوگی اور خلاف کرنے کی صورت میں حانث بھی نہ ہوگا۔

لما في البحر الرائق: (۲۲۶/۳، طبع سعيد)

وقيدنا بكونه على النطق لانه لواكره على ان يكتب طلاق امرأته فكتب لاتطلق لان الكتابة اقيمت مقام العبارة باعتبار الحاجة ولاحاجة هنا كذا في الخانية وفي البزازية اكره على طلاقها فكتب فلانة بنت فلان طالق لم يقع اه وفي الخزانة لأبي الليث وجملة ما يصح معه ثمانية عشر شيئا الطلاق والرضاع واليمين والنذر.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: شاہد محمود

۸ صفر ۱۴۲۹ھ — فتوی نمبر: ۱۱۷۸

﴿قرآن مجید کی قسم کھانا﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ زید نے قرآن مجید پر ہاتھ رکھ کر کہا کہ میں حلفیہ کہتا ہوں کہ آئندہ خالد کو قرض نہیں دوں گا لیکن کچھ عرصہ کے بعد جب خالد زید کے پاس قرض مانگنے آیا تو زید نے پھر خالد کو قرض دے دیا، مذکورہ صورت میں کفارہ کن چیزوں کا ادا کریگا؟ بینوا توجروا۔

مستفتی: محمد اسلم

﴿جواب﴾ مذکورہ صورت میں زید حانث ہوگیا اور زید کے ذمہ کفارہ لازم ہے، کفارہ کی تفصیل یہ ہے کہ دس مسکینوں کو دو وقت کا کھانا کھلایا جائے اگر چاہے تو ہر مسکین کو صدقہ فطر کی مقدار غلہ یعنی پونے دو سیر گندم یا اسکی قیمت بھی دے سکتے ہیں یا دس مسکینوں کو لباس مہیا کیا جائے اگر کھانا کھلانے یا اس کی قیمت دینے وغیرہ کی گنجائش نہ ہو تو تین دن مسلسل روزہ رکھے۔

لمافی الهداية:(۲/۴۷۸-۴۷۹ مطبع رحمانيه)

ولو قال اقسم او اقسم بالله او احلف او احلف بالله او اشهد بالله فهو حالف لأن هذه الألفاظ مستعملة فى الحلف۔۔ قال: كفارة اليمين عتق رقبة يجزى فيها مايجزى فى الظهار وان شاء كساعشرة مساكين كل واحد ثوبا فمازاد وأدناه مايجوز فيه الصلوٰة وان شاء أطعم عشرة مساكين كالاطعام فى كفارة الظهار والأصل فيه قوله تعالىٰ "فكفارته اطعام عشرة مساكين من أوسط ماتطعمون الاية وكلمة او للتخيير فكان الواجب احد الأشياء الثلثة قال فان لم يقدر على احد الأشياء الثلثة صام ثلثة ايام متتابعات كذا فى الدر والهندية والبحر.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم: صلاح الدین ڈیروی

۱۶ ربیع الثانی ۱۴۲۷ھ — فتوی نمبر: ۱۳۸

﴿قرآن کریم کی قسم منعقد ہو جاتی ہے﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ قرآن پاک کی قسم کھانے سے قسم منعقد ہو جاتی ہے یا نہیں؟ قسم منعقد ہونے کی صورت میں کفارہ لازم ہوگا یا نہیں؟ اگر کفارہ لازم ہے تو ادائیگی کی کیا صورت ہے؟ بینوا توجروا۔

﴿جواب﴾ قرآن پاک کی قسم کھانے سے قسم منعقد ہو جاتی ہے اور کفارہ بھی لازم ہو جاتا ہے اور قسم کا کفارہ یہ ہے کہ اس کو اختیار ہے چاہے وہ ایک غلام آزاد کرے یا دس مسکینوں کو پیٹ

بھر کر دو وقت کھانا کھلائے یا دس مسکینوں کو کپڑا پہنائے اور اگر مالی کفارہ ادا کرنے کی قدرت نہ ہو تو تین دن مسلسل روزے رکھے۔

لما فی الھندیۃ (۲/۶۲ مطبع رشیدیہ)

ادنى الكسوة ما يكون ثوبا [illegible] وقال محمد [illegible]
[illegible] كما في المضمرات

ولما فی فتح القدیر: (۲/۱۲ مطبع رشیدیہ)

ثم [illegible] ان يكون ثوبا كما هو قول الائمة الثلاثة

ولما فی الھدایۃ (۲/۱۰ مطبع رحمانیہ)

كفارة اليمين عتق رقبة يجزئ فيها ما يجزئ في الظهار وان شاء كسا عشرة مساكين كل واحد ثوبا فما زاد وادناه ما يجوز فيه الصلاة وان شاء اطعم عشرة مساكين كالاطعام في كفارة الظهار فان لم يقدر على احد الاشياء الثلاثة صام ثلاثة ايام متتابعات

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم: صلاح الدین چترالی

۱۷ ربیع الاول ۱۴۲۷ھ — فتویٰ نمبر: ۳۰

بھائی سے بات نہ کرنے کی قسم کا حکم

سوال: کیا فرماتے ہیں علماء دین ومفتیان شرع متین اس مسئلہ کے بارے میں کہ زید نے قسم کھائی کہ میں اپنے حقیقی بھائی سے بات نہیں کروں گا، اب چونکہ اس سے زید کی والدہ ناراض ہوتی ہے، اس لئے زید دوبارہ اپنے حقیقی بھائی سے تعلقات بحال کرنا چاہتا ہے اگر زید قسم توڑ دے تو شرعاً اس کے لئے کیا حکم ہے؟ بینوا توجروا۔ مستفتی: محمد اسلم

جواب: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے کہ "جب تم کسی بات کی قسم کھالو پھر دیکھو کہ دوسری صورت بہتر ہے یعنی قسم کے خلاف کرنا بہتر ہے تو جو کام بہتر ہو کرلو اور اپنی قسم (کے توڑنے) کا کفارہ ادا کردو"۔ مشکوٰۃ: (۲/۲۹۶، طبع سعید)

یہ حدیث شریف اس سوال کا جواب ہے، لہٰذا صورت مسئولہ میں زید اپنی قسم توڑ دے اور قسم کا کفارہ ادا کرے، قسم کا کفارہ ہے دس مسکینوں کو دو وقت کا کھانا کھلانا یا ان کو لباس دینا اور اگر اس کی استطاعت نہ ہو تو تین روزے مسلسل رکھنا۔

لما فی الھدایۃ: (۲/۴۷۹ مطبع رحمانیہ)

قال ومن حلف على معصية مثل ان لا يصلي او لا يكلم اباه او ليقتلن فلانا ينبغي ان

يحنث نفسه ويكفر عن يمينه لقوله عليه السلام من حلف على يمين ورأى غيرها خيرا منها فليأت بالذي هو خير ثم ليكفر عن يمينه ولأن فيها الفاء تفويت البر إلى جابر وهو الكفارة ولا جابر للمعصية في ضده.

وقال أيضا كفارة اليمين عتق رقبة يجزئ فيها ما يجزئ في الظهار وإن شاء كسا عشرة مساكين كل واحد ثوبا فما زاد وأدناه ما يجوز فيه الصلوة وإن شاء أطعم عشرة مساكين كالإطعام في كفارة الظهار والأصل فيه قوله تعالى فكفارته إطعام عشرة مساكين الآية وكلمة أو للتخيير فكان الواجب أحد الأشياء الثلثة قال فإن لم يقدر على أحد الأشياء الثلثة صام ثلثة أيام متتابعات.

وکذا في البحر الرائق: (۲/۲۸۹-۲۹۱، طبع سعید) وکذا في الدر المختار: (۳/۷۲۵، طبع سعید)

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم: صلاح الدین ڈیروی

۲۲ ربیع الثانی ۱۴۲۷ھ — فتویٰ نمبر: ۱۶۷

﴿قسم کے ٹوٹنے کا مسئلہ﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں مفتیانِ کرام کہ بندہ نے کچھ عرصہ قبل یہ قسم کھائی تھی کہ میں مدرسے سے وظیفہ نہیں لوں گا پھر بعد میں نادم ہوا، اب جبکہ ایک طویل عرصہ گزر چکا ہے، کیا بندہ کے لئے مدرسہ سے وظیفہ وصول کرنا جائز ہے؟ نیز کیا کوئی دوسرا فرد میری اجازت سے یعنی وکیل بن کر) مذکورہ وظیفہ وصول کرسکتا ہے؟

﴿جواب﴾ مذکورہ صورت میں وظیفہ خواہ آپ خود وصول کریں یا کوئی اور آپ کا وکیل بن کر حاصل کرلے، بہرصورت آپ حانث ہوجاؤ گے یعنی آپ کی قسم ٹوٹ جائیگی اور کفارہ ادا کرنا آپ کے ذمے واجب ہوگا۔

لما في التنوير مع الرد: (۵/۷۲۷-۷۲۸-۷۲۹، طبع سعید)

(ويحنث بفعله وفعل مأموره في النكاح والطلاق والصدقة والقرض والاستقراض)

وفي الشامية: قوله: (والصدقة) هي كالهبة فيما مر قال ابن وهبان: وكذا ينبغي أن يحنث في حلفه أن لا يقبل صدقة فقبل بقبضها.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم: محمد شریف حسین چترالی

۹ جمادی الثانی ۱۴۲۷ھ — فتویٰ نمبر: ۳۹۴

﴿نہ مارنے کی قسم کھائی تو بال کھینچنے سے بھی حانث ہو جائے گا﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں ایک شخص نے قسم کھائی کہ میں اپنی بیوی کو نہیں ماروںگا پھر ایک مرتبہ اس نے غصہ میں آکر اپنی بیوی کے بال کھینچے، کیا اس صورت میں حانث ہوگا یا نہیں؟

مستفتی: عادل احمد کیماڑی کراچی

﴿جواب﴾ غصہ کی حالت میں کسی کے بال کھینچنا بھی مارنا ہے، لہذا یہ شخص حانث ہوگیا ہے اس پر کفارہ قسم لازم ہے۔

لمافی التنویر مع الدر والرد:(۸۳۶/۳،طبع ایچ ایم سعید)

(لایضرب زوجته فمد شعرها او خنقها او عضها او قرصها) ولو ممازحا خلافا لما صححه فی الخلاصة ــــــــ (قوله خلافا لما صححه فی الخلاصة) قال فی النهر: واطلاقه یعم حالة الغضب والرضا لکن فی الخلاصة لو عضها او اصاب راس انفها فادماها ففی الجامع الصغیر ان کان فی حالة الغضب یحنث وان کان فی حالة الملاعبة لایحنث وهو الصحیح وذکره فی البحر ایضا عن الظهیریة.

ولما فی الهندیة:(۱۲۸/۲،طبع رشیدیه کوئٹه)

رجل حلف ان لایضرب امراته فقرصها او عضها او خنقها او مد شعرها فاوجعها حنث فی یمینه قالوا هذا اذا لم یکن فی الملاعبة وان کان فی الملاعبة لایحنث وهو الصحیح---- والصحیح ان یکون حانثا اذا کان علی وجه الغضب.

ولما فی فتاوی قاضی خان علی هامش هندیة:(۱۱۱/۲،طبع رشیدیه کوئٹه)

رجل حلف ان لایضرب امراته فقرصها او عضها او خنقها او مد شعرها حنث فی یمینه قالوا هذا اذا لم یکن فی الملاعبة وان کان فی الملاعبة لایحنث.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: عقیل احمد حقانی عفی عنہ

۱۵ صفر الخیر ۱۴۳۱ھ — فتوی نمبر: ۲۲۳۹

﴿غیر اللہ کی قسم کھانے کا حکم﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں مفتیان کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میں نے قسم کھائی کہ میرے باپ کی قسم میں امتحان نہیں دوں گی لیکن اب میں امتحان دینا چاہتی ہوں تو قسم توڑنے کا کیا کفارہ ادا کروں؟ بینوا توجروا۔

﴿جواب﴾ غیر اللہ کی قسم ہونے کی وجہ سے مذکورہ قسم منعقد ہی نہیں ہوئی، لہذا آپ پر کوئی

کفارہ لازم نہیں، آپ امتحان دے سکتی ہیں، البتہ غیر اللہ کی قسم کھانے کی وجہ سے گناہ ہوا ہے، اس لئے توبہ واستغفار لازم ہے اور آئندہ غیر اللہ کی قسم کھانے سے اجتناب کریں کیونکہ غیر اللہ کی قسم کھانے کی کوئی گنجائش نہیں ہے، ایسی قسمیں کھانا گناہ ہے۔

لمافی الدرالمختار:(۷۰۵/۳،طبع ایچ ایم سعید کمپنی)

وهل يكره الحلف بغيرالله تعالى؟قيل نعم للنهي وعامتهم لا ،وبه افتوالاسيمافي زماننا،وحملواالنهي على الحلف بغيرالله لاعلى وجه الوثيقة كقولهم بابيك ولعمرك ونحوذلك عيني.

لمافی الهدایة:(۴۷۷/۲،طبع رحمانیه)

ومن حلف بغيرالله لم يكن حالفاكالنبي والكعبة لقوله عليه السلام من كان منكم حالفابالله أوليذر.

الجواب صحیح:عبدالرحمٰن عفااللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب:محمد ضیاءالدین

۱۳جمادی الاولیٰ ۱۴۲۸ھ — فتویٰ نمبر:۸۸۹

﴿اپنے والد کو پیسے نہ دینے کی قسم کھانا﴾

﴿سوال﴾ ایک شخص قرآن کی قسم کھا کر کہتا ہے کہ وہ اپنے والد کو پیسے نہیں دے گا جبکہ قسم کھانے کے بعد اپنے والد کو پیسے دے دیتا ہے، سوال یہ ہے کہ قرآن مجید کی قسم کھانے سے قسم منعقد ہو جاتی ہے یا نہیں؟ اگر ہو جاتی ہے تو قسم توڑنے کا کفارہ کیا ہے؟ مستفتی محمد اسلم کمالیہ

﴿جواب﴾ والد کو پیسے نہ دینے کی قسم کھانا ناجائز بات کی قسم ہے اولاً تو اس طرح کی قسم کھانا گناہ ہے، اس سے پرہیز ضروری ہے اور اگر غلطی سے کسی نے اس طرح کی غلط قسم کھالی تو اس کا توڑنا ضروری ہے اور بعد میں اس کا کفارہ ادا کرنا بھی ضروری ہے۔

قسم صرف اللہ تعالیٰ کے نام کی کھانی چاہیے، تاہم قرآن مجید کی قسم کوئی کھائے تو شرعاً یہ بھی معتبر ہے۔

لمافی البحرالرائق:(۴/۲۸۶،طبع سعید)

وفي فتح القديرثم لايخفى ان الحلف بالقرآن الآن متعارف فيكون يمينا.

ولمافی الدرالمختار:(۷۱۲/۳،طبع سعید)

(لا)يقسم(بغيرالله تعالى كالنبي والقرآن والكعبة)قال الكمال:ولايخفى ان الحلف بالقرآن الآن متعارف فيكون يمينا.

قسم توڑنے کا کفارہ یہ ہے کہ دس محتاجوں کو دو وقت کا کھانا کھلا دے یا ان کو کپڑا پہنا دے اگر اس کی طاقت نہ رکھتا ہو تو پھر تین دن کے لگا تار روزے رکھے۔

لمافی الهداية:(۲/۴۷۹،طبع رحمانيه)

(قال:كفارة اليمين عتق رقبة يجزى فيها ما يجزى فى الظهار وان شاء كسا عشرة مساكين كل واحد ثوبا فما زاد وادناه ما يجوز فيه الصلاة وان شاء اطعم عشرة مساكين كالاطعام فى كفارة الظهار) والاصل فيه قوله تعالى فكفارته اطعام عشرة مساكين الاية وكلمة او للتخيير فكان الواجب احد الاشياء الثلاثة (قال فان لم يقدر على احد الاشياء الثلاثة صام ثلاثة ايام متتابعات)

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: خضر حیات کمالوی

۱۸ جمادی الثانی ۱۴۲۸ھ — فتویٰ نمبر: ۱۰۰۸

﴿الفاظ قسم بولے بغیر قرآن پر ہاتھ رکھنے سے قسم نہیں ہوتی﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان شرع دین متین اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک آدمی نے قرآن مجید پر ہاتھ رکھ کر یا قرآن مجید سر پر رکھ کر کہا کہ میں فلاں کام نہیں کرونگا، کیا اس سے قسم منعقد ہو جائیگی۔ اور اگر وہ یہ کام کرے تو کفارہ واجب ہوگا یا نہیں؟

﴿جواب﴾ قرآن مجید پر ہاتھ رکھنا یا قرآن کریم سر پر رکھنا کوئی قسم نہیں ہے، البتہ قسم کے الفاظ بھی ساتھ بولے ہوں مثلا کلام پاک کی قسم یا اس پر ہاتھ رکھ کر بولا ہو کہ اس کی قسم، اسکی حرمت کی قسم یا اسکی مار پڑے وغیرہ. کہ آئندہ میں یہ فلاں کام نہیں کرونگا یا فلاں کام کرنا مجھ پر لازم ہے تو قسم منعقد ہو جاتی۔ لیکن مذکورہ صورت میں قسم کا کوئی لفظ نہیں بولا. اس لئے قسم منعقد نہیں ہوئی اور خلاف کرنے کی صورت میں کوئی کفارہ واجب نہ ہوگا۔

لما فى مجمع الانهر:(۲/۲۵۹، طبع:منار)

اليمين تقوية (أحد طرفى الخبر) من الفعل والترك (بالمقسم به)

ولما فى البحر:(۴/۲۷۷، طبع سعيد)

وعرفها فى الكافى بأنها عبارة عن تحقيق ما قصده من البر فى المستقبل نفيا أو اثباتا، وعرفها فى التبيين بأنها عقد قوى به عزم الحالف على الفعل أو الترك، وفى شرح النقاية بأنها تقوى الخبر بذكر الله أو بالتعليق......وركنها اللفظ المستعمل فيها.

ولما فى البدائع:(۲/۵، طبع سعيد)

وأما ركن اليمين با الله تعالى فهو اللفظ الذى يستعمل فى اليمين بالله تعالى، وأنه

مركب من المقسم عليه والمقسم به ثم المقسم به قد يكون اسماً وقد يكون صفة

ولما في الهندية:(۵۱/۲، طبع رشيديه)

فاليمين في الشريعة عبارة عن عقد قوى به عزم الحالف على الفعل أوالترك وهي نوعان يمين بالله تعالى أو صفته و يمين بغيره أى بغير الله وهي تعليق الجزاء بالشرط، وأما اليمين بغير الله فنوعان أحدها اليمين بالآباء والانبياء.........

والثاني الشرط والجزاء،وهذا النوع ينقسم الى قسمين :يمين بالقرب ويمين بغير القرب،وأما اليمين بالقرب فهو أن يقول ان فعلت كذا فعلى صوم..... وأما اليمين بغير القرب فهي الحلف بالطلاق والعتاق، وأما ركن اليمين بالله فذكر اسم الله أو صفته وأما ركن اليمين بغيره فذكر شرط صالح وجزاء صالح.

الجواب صحیح: مفتی عبدالرحمٰن عفی اللہ عنہ   واللہ اعلم بالصواب: عمران الحق سواتی

۶ جمادی الاولیٰ ۱۴۳۵ھ   فتویٰ نمبر:

﴿لفظ بخدا سے قسم کھانے کا حکم﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میں نے اپنے دوست کی کسی بات پر تنقید کی اور بعد میں مجھے احساس ہوا اور تنقید کو نامناسب سمجھ لیا تو میں نے اس سے کہا بخدا میں آئندہ آپ کو ایسی بات نہیں کہوں گا جبکہ میں نے یہ کہتے ہوئے قسم کا ارادہ نہیں کیا تھا بلکہ بے دھیانی سے منہ سے یہ الفاظ جاری ہو گئے تو کیا ایسے کہنے سے قسم منعقد ہو جائے گی؟

﴿جواب﴾ لفظ بخدا کے ساتھ قسم کھانے سے قسم منعقد ہو جاتی ہے کیونکہ یہ لفظ فارسی میں لفظ اللہ کا ترجمہ ہے۔

لما في البحر الرائق:(۲۸۱/۴،طبع سعید)

(قوله:واليمين بالله تعالى والرحمن والرحيم وجلاله وكبريائه واقسم واحلف واشهد) بيان لالفاظ اليمين المنعقدة.

معلق قسم میں نیت وارادے کا اعتبار نہیں ہوتا ہے الفاظ قسم کے ساتھ قسم کھانے سے قسم منعقد ہو جاتی ہے خواہ اس نے قسم کھانے کا ارادہ کیا ہو یا نہ کیا ہو۔

لما في فتح القدير:(۵۱/۵،طبع رشيديه)

(والقاصد في اليمين والمكره عليه والناسي) وهو من تلفظ باليمين ذاهلا عنه ثم تذكر انه تلفظ به وفي بعض النسخ الخاطي وهو من اراد ان يتكلم بكلام غير الحلف فجرى على لسانه اليمين فاذاحنث لزمته الكفارة(لقوله عليه الصلاة والسلام ثلاث جدهن

جدو هزلهن جد النكاح والطلاق واليمين. هكذا في البحر الرائق: (۲/۲۸۰، طبع سعيد) والتاتارخانية: (۲/۲۰٦، طبع قديمي)، والهندية: (۲/۵۱، طبع رشيديه) والشامية: (۵/۴۷۹، طبع امداديه)

الجواب صحیح: عبد الرحمٰن عفا اللہ عنہ واللہ اعلم بالصواب: محمد حیات کمالوی

۲۲ جمادی الثانی ۱۴۲۸ھ فتوی نمبر: ۱۰۰۷

﴿کفارہ یمین کے روزے لگاتار رکھنا ضروری ہے﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ قدوری، کنز، ہدایہ وغیرہ میں مذکور ہے کہ کفارہ قسم کے روزے لگاتار رکھے جائیں جبکہ ایک مفتی صاحب نے بتایا کہ کفارہ یمین کے روزے متفرق طور پر بھی درست ہیں، لہٰذا مذکورہ مسئلہ کی وضاحت مطلوب ہے۔

﴿جواب﴾ کفارہ کے روزے متواتر رکھنا ضروری ہے، متفرق طور پر رکھنا درست نہیں ہے۔

لما في التنوير مع الدر: (۳/۷۲۷، طبع سعيد)

(صام ثلاثة أيام ولاء) ويبطل بالحيض بخلاف كفارة الفطر.

وفي الشامية: (قوله ولاء) بكسر الواو والمد: أي متتابعة لقراءة ابن مسعود وأبي فصيام ثلاثة أيام متتابعات (قوله بخلاف كفارة الفطر) أي كفارة الافطار في رمضان، فان مدتها لاتخلو غالبا عن الحيض.

ولما في البحر الرائق: (۴/۲۹۰، طبع سعيد)

(قوله وان عجز عن أحدها صام ثلاثة أيام متتابعة)... وشرطنا التتابع عملا بقراءة ابن مسعود متتابعات... كذا في الغاية وقيد بالتتابع لانه لو صام الثلاثة متفرقا لايجوز له.

ولما في خلاصة الفتاوى: (۲/۱۲۵، طبع رشيديه)

كفارة المعسر صيام ثلاثة ايام متتابعات فلو حاضت المرأة في ثلاثة استقبلت بخلاف كفارة صيام رمضان والله اعلم..

الجواب صحیح: عبد الرحمٰن عفا اللہ عنہ واللہ اعلم: محمد وارث خان

۳ جمادی الثانی ۱۴۲۹ھ فتوی نمبر: ۱۵۳۰

﴿قسم توڑنے پر کفارہ کا حکم﴾

﴿سوال﴾ جناب مفتی صاحب! ایک عورت کی وجہ سے مجھے بہت تکلیف پہنچی تھی تو میں نے قسم کھائی تھی کہ کبھی بھی اس عورت کو معاف نہیں کروں گی، بعد میں اس عورت کی موت کے وقت

اس کے بیٹوں نے مجھے مجبور کیا کہ میں اسے معاف کر دوں تو میں نے معاف کر دیا، پوچھنا یہ ہے کہ مجھ پر کوئی کفارہ لازم ہوگا یا نہیں؟ مستفتیہ ایک سائلہ سٹل ہائڈی

﴿جواب﴾ مذکورہ صورت میں قسم توڑنے پر گناہ نہیں ہے بلکہ اس طرح کی قسم کو توڑنے میں ثواب ہے، تاہم کفارہ بہر صورت لازم ہے اور وہ یہ ہے کہ دس مسکینوں کو دونوں وقت کا کھانا کھلایا جائے یا دس مسکینوں کو کپڑا دیا جائے اور اگر اسکی طاقت نہ ہو تو تین روزے مسلسل رکھے جائیں۔

لمافی الهداية:(۲/۴۷۹ ،طبع رحمانيه)

كفارة اليمين عتق رقبة يجزى فيهامايجزى في الظهاروان شاء كساعشرة مساكين كل واحد ثوبا فمازادوادناه يجوزفيه الصلاة وان شاء اطعم عشرة مساكين كالاطعام في كفارة الظهارفان لم يقدرعلى احدالاشياء الثلاثة صام ثلاثة ايام متتابعات.

ولمافي الكنزالدقائق:(ص ۱۶۵ ،طبع قديمي)

وكفارته تحريررقبة أواطعام عشرة مساكين كمافي الظهارأوكسوتهم بمايستر عامة البدن فان عجزعن احدهاصام ثلاثة ايام متتابعات.

ولمافي القدوری:(ص ۲۲۳ ،طبع قديمي)

وكفارة اليمين عتق رقبة يجزى فيهامايجزى في الظهاروان شاء كساعشرة مساكين كل واحدثوبافمازادوادناه مايجوزفيه الصلاة وان شاء اطعم عشرة مساكين كالاطعام في كفارة الظهارفان لم يقدرعلى احدهذه الاشياء الثلاثة صام ثلاثة ايام متتابعات.

الجواب صحیح: عبد الرحمٰن عفا اللہ عنہ واللہ اعلم بالصواب: محمد وارث خان

۱۸ جمادی الاولیٰ ۱۴۲۹ھ فتویٰ نمبر: ۱۴۷۱

﴿کفارہ یمین میں ایک خاص صورت کی وضاحت﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں اگر کوئی شخص قسم کا کفارہ اسطرح ادا کرے کہ بیس مسکینوں کو ایک ہی وقت کا کھانا کھلا دے یا دس مختلف مسکینوں کو دو وقت کھلا دے تو کیا اس سے کفارہ ادا ہو جائے گا؟ بینوا توجروا۔

﴿جواب﴾ کفارہ یمین میں دس مسکینوں کو دو وقت کھانا کھلانا ضروری ہے یا ایک مسکین کو دس دن تک صبح شام کھانا کھلا دینا ضروری ہے اگر صبح ایک مسکین کو اور شام کے وقت کسی دوسرے مسکین کو کھلا دیا تو اس سے کفارہ ادا نہیں ہوگا، لہٰذا سوال میں ذکر کردہ پہلی صورت میں بیس مسکینوں کو ایک وقت کھلا دینے سے کفارہ ادا نہیں ہوگا، البتہ دوسری صورت میں دس مختلف

مسکینوں کو دو وقت کھلا دینے سے کفارہ ادا ہو جائے گا بشرطیکہ شام کو کھانے والے وہی ہوں جنہوں نے صبح کو کھایا تھا۔

لما فی الجوهرة النیرة:(۲/۲۵۲،طبع میر محمد)

وان غداعشرة وعشاعشرة غيرهم لم يجزيه وكذااذاغدامسكيناوعشاغيره عشرة ايام لم يجزيه لانه فرق طعام العشرة على عشرين فلم يحصل لكل واحدمنهم المقدار المقدر كمااذافرق حصة المسكين على مسكينين.

ولمافی رد المحتار:(۳/۷۲۵،طبع سعید)

(قوله عشرة مساكين)اى تحقيقااوتقديراحتى لواعطى مسكيناواحدافى عشرة ايام كل يوم نصف صاع يجوز...واذاغدامسكيناوعشى غيره عشرة ايام لم يجزه لانه فرق طعام العشرة على عشرين كمااذافرق حصة المسكين على مسكينين.

الجواب صحیح:عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ　　واللہ اعلم بالصواب:رشید عالم مروت

۲۱ جمادی الثانی ۱۴۲۸ھ　　فتویٰ نمبر:۱۴۲۸

قسم کا دارومدار عرف پر ہوتا ہے

سوال: کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں میرے ایک دوست نے مجھ سے کہا کہ میرے لئے کھانا لاؤ تو اس کے جواب میں میں نے یہ الفاظ کہے کہ ''خدا کی قسم آج کے بعد آپ کیلئے کھانا بالکل نہیں لاؤں گا'' پھر چند دنوں کے بعد میں اس کیلئے صرف روٹی لیکر گیا، اب پوچھنا یہ ہے کہ کیا ان الفاظ کے کہنے کے بعد بغیر سالن کے روٹی لیجانے کیوجہ سے میں حانث ہو گیا ہوں؟ اگر ہاں تو پھر اس کا کفارہ کیا ہے؟ برائے مہربانی وضاحت فرمائیں۔

جواب: (۱) عام لوگ روٹی کو کھانا شمار کرتے ہیں، لہذا روٹی لانے سے آپ نے قسم توڑ دی ہے اس لئے آپ حانث ہو گئے ہیں۔

لمافی البدائع :(۳/۱۲۰،دار العلم بیروت)

ولوحلف لاياكل طعاما فان ذالك يقع على الخبز واللحم والفاكهة سوى التمر ونحو ذالك ويقع على مايؤكل على سبيل الادام مع الخبز ،لان الطعام فى اللغة اسم لمايطعم الاانه فى العرف اختص بما يؤكل بنفسه اومع غيره عادة.

لما فی الولوالجیة:(۲/۱۷۹،طبع فاروقیہ پشاور)

ولوحلف لاياكل طعاما ينصرف الى كل مطعوم وهو مايطعم عادة خبزا كان اوفاكهة اولحما اوغيره.

(۲)اس کا کفارہ یہ ہے کہ دس مسکینوں کو دووقت کا کھانا کھلایا جائے یا دس مسکینوں کو کپڑا دیا جائے اور اگر اس کی طاقت نہ ہو تو تین روزے مسلسل رکھے جائیں۔

لما فی الهداية:(۲/۷۱،طبع رحمانیه)

كفارة اليمين عتق رقبة يجزى فيها يجزى فى الظهار وان شاء كسا عشرة مساكين كل واحد ثوبا فمازاد وادناه مايجوز فيه الصلوة ان شاء اطعم عشرة مساكين كالاطعام فى كفارة الظهار ... فان لم يقدر على احد الاشياء الثلثة صام ثلثة ايام متتابعات.

لما فى الهندية:(۲/۶۱،طبع رشيديه)

ان قدر عتق رقبة يجزى فيما يجزى فى الظهار أو كسوة عشرة مساكين لكل واحد ثوب فمازاد وادناه مايجوز فيه الصلوة أو اطعامهم والطعام فيها كالاطعام فى كفارة الظهار ... والاصح أنه يجزى التكفير بالصوم كذا فى المبسوط

الجواب صحیح: مفتی عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: عزیز احمد خضداری غفرلہ ولوالدیہ

۸ رجب المرجب ۱۴۲۵ھ — فتویٰ نمبر: ۳۲۲۷

کتاب النذر

منت ماننے کے مسائل

نذر میں دارومدار الفاظ پر ہوتا ہے

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے کرام اس مسئلے کے بارے میں کہ میں نے دل میں یہ کہا کہ اگر میرا یہ پیر اچھا ہو گیا تو میں ایک دن کا روزہ رکھوں گی لیکن غلطی سے میری زبان سے یہ نکل گیا کہ ایک مہینے کا روزہ رکھوں گی تو اب پیر اچھا ہونے کے بعد مجھ پر ایک روزہ رکھنا ضروری ہے یا ایک مہینہ؟ اگر ایک مہینہ ہو تو پھر مسلسل رکھنا ضروری ہے یا نہیں؟ حالانکہ میری نیت نہ تو پورا مہینے کی تھی اور نہ ہی تسلسل کی۔

مستفتی: ایک محلہ حیدرآباد

جواب: نذر میں دارومدار الفاظ پر ہوتا ہے نیت کا اتنا دخل نہیں ہوتا، لہٰذا مذکورہ صورت میں آپ پر ایک مہینے کے روزے رکھنا ضروری ہے البتہ اس میں آپ کو یہ اختیار حاصل ہوگا کہ پورے مہینے کے روزے آپ ایک ساتھ لگاتار رکھیں یا ایک ایک کر کے رکھ لیں۔

لما فى الشامى:(۲/۷۳۲،مطلب فى الكلام على النذر،طبع سعيد)

قال فى شرح الملتقى والنذر عمل اللسان ... سواء قصد ما تلفظ به او لا ولهذا قال فى

الولوالجیہ: رجل اراد ان یقول للہ علی صوم یوم فجری علی لسانہ صوم شہر کان علیہ صوم شہر بحراہ، وکذا لو اراد ان یقول کلاماً فجری علی لسانہ النذر لزمہ لان هزل النذر کالجد کالطلاق.

ولما فی الھندیہ: (۲۰۹/۱، الباب السادس فی النذر، طبع رشیدیہ)

ولو قال للہ علی ان صوم شہراً متتابعاً لزمہ التتابع، وان اطلق بخیر۔ ولو قال للہ علی ان اصوم یومین او ثلاثۃ او عشرۃ لزمہ ذلک ویعین وقتاً یودی فیہ فان شاء فرق وان شاء تابع الا ان ینوی التتابع عند النذر فحینئذ یلزمہ متتابعاً.

ولما فی تنویر الابصار مع الدر: (۷۳۵/۳، کتاب الایمان مطلب فی احکام النذر، طبع سعید)

ومن نذر نذراً مطلقاً او معلقاً بشرط وکان من جنسہ واجب وھو عبارۃ مقصودۃ ووجد الشرط المولق بہ لزم الناذر لحدیث "من نذر وسمی فعلیہ الوفاء بما سمی".

الجواب صحیح: عبدالرحمن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: محمد تنویر عفا اللہ عنہ

۱۹ جمادی الثانیہ ۱۴۳۲ھ — فتویٰ نمبر: ۳۸۰۳

﴿وجود شرط سے پہلے نذر ادا کرنا﴾

﴿سوال﴾ زید نے کہا کہ اگر میرا بیٹا سفر سے بخیریت واپس آگیا تو میں اتنی رقم اللہ کے نام پر دوں گا، اب اگر وہ بیٹے کے آنے سے پہلے ہی نذر دے دے تو کیا اس سے نذر ادا ہو جائے گی یا نہیں؟ یا بیٹے کے آنے کے بعد نذر پوری کرنا ضروری ہے؟ مستفتی محمد اسلم

﴿جواب﴾ نذر کو جب کسی شرط کے ساتھ معلق کیا جائے تو شرط پائے جانے سے پہلے نذر واجب نہیں ہوگی، ادائیگی کی صورت میں نفل شمار ہوگی، لہٰذا مذکورہ صورت میں زید بیٹے کے آنے سے پہلے نذر دینے سے فارغ الذمہ نہیں ہو سکتا بلکہ بیٹے کے آنے کے بعد زید کو دوبارہ نذر پوری کرنی ہوگی۔

لما فی بدائع الصنائع: (۹۳/۵، طبع سعید)

وان کان معلقاً بشرط نحو ان یقول ان شفی اللہ مریضی أو ان قدم فلان الغائب فللہ علیّ أن أصوم شہراً أو أصلّی رکعتین أو أتصدق بدرھم ونحو ذلک فوقتہ وقت الشرط فما لم یوجد الشرط لا یجب بالاجماع ولو فعل ذلک قبل وجود الشرط یکون نفلا لان المعلق بالشرط عدم قبل وجود الشرط وھذا لان تعلیق النذر بالشرط ھو اثبات النذر بعد وجود الشرط کتعلیق الحریۃ بالشرط اثبات الحریۃ بعد وجود الشرط فلا یجب قبل وجود الشرط لانعدام السبب قبلہ وھو النذر فلا یجوز تقدیمہ علی الشرط لأنہ یکون اداء قبل الوجوب وقبل وجود سبب الوجوب فلا یجوز کما لا یجوز التکفیر قبل الحنث لأنہ شرط ان یودیہ بعد وجود الشرط

فیلزمه مراعاة شرطه لقوله علیه الصلوٰة والسلام: المسلمون عند شروطهم۔

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم: صلاح الدین ایروی

۱۶ ربیع الثانی ۱۴۲۷ھ — فتوی نمبر: ۱۴۱

﴿نذر کا مسئلہ﴾

﴿سوال﴾ ایک عورت نے نذر مانی کہ فلاں دن مثلاً ہفتے کے دن میں سو رکعت نفل نماز پڑھوں گی پھر جب وہ دن آیا تو عورت حائضہ ہوگئی تو کیا یہ نذر اب اس سے ساقط ہوجائے گی یا قضا کرنی ہوگی؟ بینوا توجروا۔

﴿جواب﴾ مذکورہ صورت میں اس عورت پر نذر کی قضا لازم ہے کیونکہ حیض کا آنا نماز کے ادا کرنے سے مانع ہے نذر کے وجوب سے مانع نہیں لہٰذا جب پاک ہوجائے تو قضا کرے۔

لما فی التنویر مع الدر: (۲/۲۲ طبع ایچ ایم سعید)

(ولو نذرت عبادة) کصوم وصلاة (فی غد فحاضت فیه یلزمها قضاؤها) لأنه یمنع الأداء لا الوجوب۔

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم: شاہد اسحاق عفا اللہ عنہ

۲۸ جمادی الثانی ۱۴۲۷ھ — فتوی نمبر: ۴۸۷

﴿نذر ماننے کا حکم﴾

﴿سوال﴾ منت ماننا کیسا ہے جائز یا ناجائز؟ اس کے صحیح ہونے کے لئے کوئی شرط ہو تو تحریر کریں اگر قرآن خوانی کی نذر مانی ہو تو اس کو پورا کرنا لازم ہوگا یا نہیں؟ مستفتی: خلیل الرحمٰن کورنگی

﴿جواب﴾ اللہ تعالیٰ کے نام کی منت ماننا جائز ہے مگر اس سے بہتر یہ ہے کہ بغیر منت کے صدقہ وخیرات کی جائے، منت صحیح ہونے کے لئے چند شرطیں ہیں:

(۱) کہ منت اللہ تعالیٰ کے نام کی مانی جائے غیر اللہ کے نام کی منت جائز نہیں بلکہ گناہ ہے۔

(۲) کہ منت صرف عبادت کے کام کی صحیح ہے جو کام عبادت نہیں اس کی منت بھی صحیح نہیں ہے۔

(۳) کہ عبادت بھی ایسی ہو کہ اس طرح کی عبادت کبھی فرض یا واجب ہوتی ہے، جیسے نماز، روزہ، حج وغیرہ، اور عبادت مقصودہ ہو، لہٰذا ایسی عبادت کہ اس کی جنس کبھی فرض یا واجب نہیں جیسے مریض کی عیادت یا مقصود ہی نہیں جیسے تکفین میت وغیرہ تو اس کی منت بھی صحیح نہیں، مروجہ

قرآنی خانی عبادت مقصودہ نہیں ہے، لہذا مروجہ قرآن خوانی کی نذر مانی ہو تو وہ لازم نہیں ہوتی اور نہ اس کا پورا کرنا واجب ہے، البتہ خود قرآن کریم کی تلاوت کرے تو نذر پوری ہو جائیگی۔

لمافی المشکوٰۃ:(۱/۲۹۷، باب فی النذور، طبع سعید)

عن ابی هريرة وابن عمر قالا قال رسول الله صلى الله عليه وسلم (لاتنذروا فان النذر لايغنى من القدر شيئا وانما يستخرج به من البخيل) متفق عليه: وعن عائشة ان رسول الله صلى الله عليه وسلم قال (من نذر ان يطيع الله فليطعه ومن نذر ان يعصيه فلايعصه) رواه البخاری.

لمافی الشامی:(۳/۷۳۸، طبع سعید)

(قوله لم يلزمه) وكذالونذر قراءة القرآن وعلله القهستاني في باب الاعتكاف بأنها للصلاة..... قلت وهو مشكل فان القراءة عبادة مقصودة ومن جنسها واجب.

ولمافی البحرالرائق:(۲/۲۹۲، طبع سعید)

واعلم بأنهم صرحوا بأن شرط لزوم النذر ثلاثة كون المنذور ليس بمعصية وكونه من جنسه واجب وكون الواجب مقصودا لنفسه الىٰ قوله وكذا لونذر سجدة التلاوة وفي الواقعات ولونذر تكفين ميت لم يلزم لأنه ليس بقربة مقصودة كالوضوء الى قوله واما الاعتكاف وهو اللبث في مكان من جنسه واجب وهو القعدة الأخيرة في الصلاة.

ولمافی التنویر مع الدر:(۵/۵۱۵ تا ۵۱۸، طبع امدادیه)

(ومن نذر نذرا مطلقا أو معلقا بشرط وكان من جنسه واجب وهو عبادة مقصودة) خرج الوضوء وتكفين الميت (ووجد الشرط لزم الناذر كصوم وصلاة وصدقة واعتكاف (ولم يلزم) الناذر ماليس من جنسه فرض كعيادة مريض وتشييع جنازة ودخول مسجد) ولو مسجد الرسول صلى الله عليه وسلم أو الاقصى لانه ليس من جنسها فرض مقصود وهذا هو الضابط كما في الدرر وفي البحر شرائطه خمس فزاد ان لايكون معصية لذاته.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ　　　　واللہ اعلم: صلاح الدین ڈیروی

۳ جمادی الاولیٰ ۱۴۲۷ھ　　　　فتویٰ نمبر: ۲۵۴

﴿نذر کے روزوں میں تسلسل کا حکم﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ اگر ایک شخص نذر مانے کہ میرا فلاں کام ہو جائے تو میں دس روزے یا آٹھ روزے رکھوں گا پھر وہ کام پورا ہو جائے تو کیا اب نذر کے روزے تسلسل سے رکھنا ضروری ہے یا بغیر تسلسل کے بھی رکھ سکتے ہیں؟

﴿جواب﴾ اگر نذر مانتے وقت تسلسل سے روزے رکھنے کی نیت نہیں کی تو متفرق طور پر

بھی رکھ سکتے ہیں ورنہ تسلسل سے رکھنا لازمی ہے۔

لمافی الھندیۃ:(۲۱۰/۱،طبع رشیدیہ)

ولوقال للہ علی ان اصوم شھرامتتابعالزمہ التتابع وان اطلق یخیر.

ولمافی فتاوی قاضیخان:(۲۱۸/۱،طبع قدیمی)

وعن ابی جعفرؒ لوقال للہ علی صوم مثل شھررمضان قال ان ارادمثلہ فی الوجوب فلہ ان یفرق وان ارادفی التتابع فعلیہ ان یتابع.

ولمافی الدرالمختارمع الرد:(۴۳۵/۲،طبع سعید)ولونذرصوم شھرغیرمعین متتابعا.

وفی الشامیۃ:(قولہ متتابعا)افادلزوم التتابع ان صرح بہ وکذااذانواہ امااذالم یذکرہ ولم ینوہ ان شاء تابع وان شاء فرق.

الجواب صحیح:عبدالرحمن عفااللہ عنہ　　　　واللہ اعلم بالصواب:اسرارعزیز

۱۴جمادی الثانی ۱۴۲۸ھ　　　　فتوی نمبر:۹۸۹

﴿مسجد کے لئے نذر ماننے کا حکم﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے متعلق کہ میں نے نذر مانی کہ یہ بکرا بیچ کر اس کی رقم مسجد کی ضروریات میں خرچ کروں گا ایک ماہ گذرنے کے بعد بکرا مر گیا اب میرے لئے شرعاً کیا حکم ہے؟ بینوا توجروا۔　　　　مستفتی:فضل الٰہی ڈیروی

﴿جواب﴾ مذکورہ بالا صورت میں آپ کا نذر ماننا درست نہیں کیونکہ نذر عبادت مقصودہ کی مانی جاتی ہے نہ کہ عبادت غیر مقصودہ کی اور مسجد میں رقم خرچ کرنے کی نذر عبادت غیر مقصودہ ہے،لہٰذا مذکورہ صورت میں آپ پر کچھ بھی لازم نہیں ہوتا ہاں خرچ کرنا چاہیں تو اللہ تعالیٰ کے گھر میں رقم خرچ کرنے کا ثواب ملیگا لیکن اس کو نذر نہ کہا جائے۔

لمافی بدائع الصنائع:(۸۲/۵،طبع ایچ ایم سعید)

ومنھاان یکون قربۃ مقصودۃ فلایصح النذربعیادۃ المرضی وتشییع الجنائزوالوضوء والاغتسال ودخول المسجدومس المصحف والاذان وبناالرباطات والمساجدوغیر ذلک وان کانت قربالانھالیست بقرب مقصودۃ.

ولمافی الفقہ الاسلامی:(۴۷۱/۳،طبع دارالفکربیروت)

فلایصح النذربعیادۃ المرضی وتشیع الجنائزوالوضوء وتکفین المیت والاغتسال ودخول المسجدومس المصحف والاذان وبناالرباطات والمساجد ونحوھالان ھذہ الاموروان کانت قربالہ الاانھالیست قربامقصودۃ لذاتھاعادۃ ومن المعلوم ان النذر

قربة مقصودة لذاتها كالعمين فلا يصح نذر ما ليس عبادة او طاعة مقصودة.

ولما في فتح القدير:(۴/۳۷۳مطبع رشيديه كوئته)

وهذا(اى طاعة مقصودة لنفسها ومن جنسها واجب)شروط لزوم النذر لخرج النذر بالوضوء لكل صلوة فانه لا يلزم لانه غير مقصودة وكذا النذر بعيادة المريض لانه ليس من جنسه واجب

ولما في الشامي:(۵/۵۱۸مطبع امداديه ملتان)

المنذور اذا كان له اصل في الفروض لزم الناذر كالصوم والصلاة والصدقة والاعتكاف وما لا اصل له في الفروض فلا يلزم الناذر كعيادة المريض وتشييع الجنازة ودخول المسجد وبناء القنطرة والرباط والسقاية ونحوها هذا هو الاصل الكلي.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: ولی اللہ ڈیروی

۱۳ ربیع الاول ۱۴۲۸ھ — فتویٰ نمبر: ۶۷۲

﴿کسی بزرگ کی قبر کی زیارت کی نذر ماننے کا حکم﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے علمائے کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میں نے اپنے ایک اہم کام کے لیے نذر مانی تھی کہ اگر میرا فلاں کام ہوگیا تو فلاں بزرگ کی قبر کی زیارت کے لیے جاؤں گی اب میرا کام ہوگیا ہے تو کیا میرے لیے ضروری ہے کہ بزرگ کی قبر کی زیارت کو جاؤں؟ نیز مفتی صاحب کیا شرعاً نذر ماننا درست ہے؟ مستفتیہ: ام عدنان

﴿جواب﴾ نذر صرف اللہ کے نام کسی مقصودی عبادت کی مانی جاتی ہے بزرگوں کی قبر کی زیارت کوئی مقصودی عبادت نہیں ہے بلکہ عورتوں کے لیے عام حالات میں بزرگوں کی قبروں کی زیارت کے لیے جانا عبادت نہیں گناہ ہے، لہٰذا اس پر توبہ واستغفار کریں آئندہ کے لیے کوئی اہم کام درپیش ہو تو صلوۃ حاجت اور صدقہ کے ذریعے حل کرانے کی کوشش کریں اور اس کے لیے نذر ماننا بھی جائز ہے لیکن صرف اللہ کے نام غریبوں کو صدقہ یا نوافل وغیرہ کی نذر مانا کریں۔

لما في الترمذي:(۱/۱۸۵ : طبع فاروقي).

عن ابي هريرةؓ قال قال رسول الله صلى الله عليه وسلم لا تنذروا فان النذر لا يغني من القدر شيئا وانما يستخرج من البخيل.

ولما في التنوير الابصار (۳/۷۳۵ :طبع سعيد).

ومن نذر نذرا مطلقا او معلقا بشرط وكان من جنسه واجب وهو عبادة مقصودة ووجد الشرط لزم الناذر.

ولمافی البدائع الصنائع (۸۲/۵ :طبع سعید).

ومنها ان یکون قربة فلا یصح النذر بما لیس بقربة..... ومنها ان یکون قربة مقصودة فلا یصح النذر بعیادة المرضی وتشییع الجنائز والوضوء.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: ناجد محمود کہوٹہ

۲۶ ربیع الثانی ۱۴۳۲ھ — فتویٰ نمبر: ۳۶۰۵

﴿نذر کے روزوں میں تسلسل کا حکم﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک شخص نے نذر مانی کہ اگر میرا یہ کام ہو گیا تو میں پندرہ دن مسلسل روزے رکھوں گا، اس کا وہ کام ہو جاتا ہے، اب اس پر مسلسل روزے رکھنا واجب ہے یا متفرق طور پر بھی رکھ سکتا ہے؟ مستفتی: سعید احمد

﴿جواب﴾ جب نذر مانی ہے کہ مسلسل روزے رکھوں گا تو مسلسل رکھنا لازم ہوں گے۔

لمافی الهندیة: (۲۱۰/۱ :طبع رشیدیه)

ولو قال لله علی ان اصوم شهرا متتابعا لزمه التتابع وان اطلق یخیر.

ولمافی الشامی: (۲۳۶/۲ :طبع سعید)

ولو اوجب علی نفسه صوما متتابعا فصامه متفرقا لم یجز وعلی عکسه جاز.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: عبدالستار

۳ رجب المرجب ۱۴۲۸ھ — فتویٰ نمبر: ۱۰۵۱

﴿نذر کا مصرف﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلے کے بارے میں کہ ایک شخص نے نذر مانی تھی کہ اللہ تعالیٰ میرا یہ مقصد پورا کر دے تو میں اتنی رقم کسی غریب کو دوں گا پھر اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل وکرم سے وہ مقصد پورا کر دیا اور اس نے وہ پیسے ایک غریب شخص کو دیدئے لیکن وہ شخص سید تھا، سید کو نذر کے پیسے دے سکتے ہیں یا نہیں؟ اگر جواب نفی میں ہے تو دوبارہ ادا کرنا ضروری ہے؟

﴿جواب﴾ نذر کا مصرف وہی ہے جو زکوٰۃ کا مصرف ہے نذر کے پیسے بھی کسی سید کو نہیں دے سکتے، لہٰذا سید کو نذر کے پیسے دینے سے نذر ادا نہیں ہوئی دوبارہ ادا کرنا ضروری ہے۔

لمافی المبسوط السرخسی: (۱۲/۳ :طبع دار المعرفة)

وکذلک لو صرفها الی هاشمی او مولی هاشمی وهو یعلم بحاله لا یجوز لقوله ﷺ لا تحل

الصدقة لمحمد ولا لآل محمد ﷺ

ولما في الهندية:(۱/۱۸۹،طبع رشيديه)

ولا يدفع الى بني هاشم هذا في الواجبات كالزكاة والنذر والعشر والكفارة فاما التطوع فيجوز الصرف اليهم

ولما في الدر المختار:(۲/۳۳۱،طبع سعيد)

مصرف الزكاة وهو مصرف ايضا لصدقة الفطر والكفارة والنذر وغير ذلك من الصدقات الواجبة.

الجواب صحیح: عبد الرحمن عفا اللہ عنہ واللہ اعلم بالصواب: فرمان اللہ غفر واللہ

۳۰ جمادی الثانی ۱۴۲۹ھ فتویٰ نمبر: ۱۰۲۰

﴿نذر شدہ چیز واجب التصدق ہے﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک آدمی نے ایک واقعہ کی وجہ سے یہ نذر مانی کہ میرا بیٹا اگر ٹھیک ہو گیا تو میں ایک بکری اللہ کی رضا کیلئے ذبح کرونگا اب وہ آدمی خود اس نذر میں سے کچھ کھا سکتا ہے کہ نہیں؟ مستفتی: عارف شاہ خان

﴿جواب﴾ نذر شدہ چیز واجب التصدق ہے، اسکا مصرف فقراء و مساکین ہیں اس لئے نذر سے اغنیاء کو کھلانا جائز نہیں ہے اور نہ وہ شخص خود کھا سکتا ہے اگر چہ وہ فقیر ہی کیوں نہ ہو۔

لما في التنوير مع الدر:(۶/۳۲۰-۳۲۱،طبع ایچ ایم سعید کمپنی)

(ناذر)فاعل تصدق(لمعينة)ولو فقيرا أولو ذبحها تصدق بلحمها ولو تصدق بها تصدق بقيمة النقصان ايضا ولا يأكل الناذر منها فان أكل تصدق بقيمة ما أكل.

ولما في الشامي:(۶/۳۲۷،طبع ایچ ایم سعید کمپنی)

(قوله ولا يأكل من لحم الأضحية الخ)هذا في الأضحية الواجبة السنة سواء اذا لم تكن واجبة النذر وان وجبت به فلا يأكل منها شيئا ولا يطعم غنيا سواء كان الناذر غنيا أو فقيرا لأن سبيلها التصدق وليس للمتصدق ذلك ولو أكل فعليه قيمة ما أكل.

ولما في خلاصة الفتاوى:(۴/۳۲۰،طبع رشيديه)لا يأكل الناذر منها ولو أكل منها فعليه قيمتها.

ولما في بدائع الصنائع:(۵/۶۸،طبع سعيد)

وكذلك لو أوجب على نفسه أن يتصدق بها لا يأكل منها اذا ذبحها بعد وقتها أو في وقتها سواء

الجواب صحیح: عبد الرحمن عفا اللہ عنہ واللہ اعلم: علی خان غفرلہ ولوالدیہ

۱۷ صفر الخیر ۱۴۳۱ھ فتویٰ نمبر: ۲۳۵۹

﴿نذر کی ایک صورت﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلے کے بارے میں کہ ایک آدمی نے نذر مانی کہ "میں ایک خاص جانور (مثلاً بکرا) ذبح کر کے صدقہ کروں گا" پھر اس کا ارادہ یہ ہوا کہ کسی غریب کو وہ جانور زندہ دیدے تو کیا شرعی نقطہ نظر سے وہ زندہ جانور کسی غریب کو دے سکتا ہے؟ کیا اس سے نذر پوری ہو جائیگی؟

﴿جواب﴾ جائز ہے، نذر ادا ہو جائیگی۔

لمافی التنویر مع الدر: (۲/۷۴۱، طبع سعید)

(نذران یتصدق بعشرۃ دراھم من الخبز فتصدق بغیرہ جازان ساوی العشرۃ) کتصدقه بثمنه.
وفی الشامیة (تنبیه) انما لم یختص فی النذر بزمان ونحوہ خلافاً لزفر لان لزوم ماالتزمه باعتبار ماھو قربة لاباعتبارات اخر لادخل لهافی صیرورته قربة کمامر.

ولمافی التنویر مع الدر: (۲/۷۴۱-۷۴۰، طبع سعید)

(ولوقال ان برئت من مرضی ھذاذبحت شاۃ اوعلی شاۃ اذبحهافبریٔ لایلزمه شیٔ) لان الذبح لیس من جنسه فرض بل واجب کالاضحیة (فلایصح) (الااذازاد وتصدق بلحمهافیلزمه) لان الصدقة من جنسهافرض وھی الزکوٰۃ.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: خالد الرحمٰن کرکی

۱۱ رجب المرجب ۱۴۳۰ھ — فتویٰ نمبر: ۲۳۸۶

﴿ظالمانہ ٹیکس سے نجات کیلئے نذر ماننا﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس بارے میں کہ ٹیکس وصول کرنے والے مجھ سے ایک لاکھ روپے کا مطالبہ کر رہے تھے تو میں نے ان سے خلاصی کیلئے یہ نذر مانی کہ اگر اللہ تعالیٰ نے مجھے اس ظالمانہ ٹیکس سے نجات دی تو میں پچاس ہزار روپے اللہ کی راہ میں صدقہ کرونگا، پھر سفارش وغیرہ کے ذریعہ وہ ایک لاکھ کے بجائے ۲۲ ہزار پر راضی ہو گئے۔ پوچھنا یہ ہے اب بھی نذر کے وہ پچاس ہزار میرے ذمے ہے یا نہیں؟ مستفتی: ڈاکٹر حازم صاحب

﴿جواب﴾ ٹیکس وصول کرنے والے آپ سے ایک لاکھ کا مطالبہ کر رہے تھے جس کو ایک ظالمانہ ٹیکس سمجھ کر اس سے خلاصی کیلئے آپ نے پچاس ہزار کی نذر بھی مان لی تھی، پھر ۲۲ ہزار روپے میں آپ کو اس سے نجات مل گئی۔

اب دیکھنا یہ ہوگا کہ آپ جیسے آمدنی والے کا ٹیکس بلا کسی رشوت ۲۲ ہزار کے لگ بھگ بنتا ہے یا نہیں؟ اگر آپ کی آمدنی جیسی آمدنی سے بلا کسی رشوت ۲۲ ہزار کے لگ بھگ ٹیکس وصول کیا جاتا ہے پھر تو آپ کی منت گویا پوری ہوگئی یعنی آپ کو ظلم سے نجات مل گئی ہے، لہذا پچاس ہزار نذرانے کے اللہ کی راہ میں خرچ کرنا آپ پر لازمی ہے، اور اگر اس جیسی آمدنی سے یہ ٹیکس وصول نہیں کیا جاتا ہے تو منت پوری نہ ہونے کی وجہ سے نذرانے کے پچاس ہزار صدقہ کرنا لازمی نہیں ہے۔

لما فی التنویر مع الدر:(۷۳۸/۳ طبع ایچ ایم سعید)

ومن نذر نذراً مطلقا بشرط أو معلقا بشرط وكان من جنسه واجب وهو عبارة مقصودة ووجد الشرط لزم الناذر كصوم وصلاة وصدقة ...ثم ان المعلق فيه تفصيل فان علقه بشرط يريده كأن قدم غائبي أو شفى مريضي يوفى وجوبا ان وجد الشرط.

لما فی الفقه الاسلامی وادلته:(۲۵۶۷/۳ طبع رشیدیه کوئٹه)

واما اذا كان المنذور معلقا بشرط : ان شفى الله مريضي أو ان قدم فلا نالغائب فلله على صوم شهر او صلاة ركعتين أو التصدق بليرة ونحوه فان وجد الشرط فعليه الوفاء بالنذر نفسه ،لأن المعلق بالشرط كالمنجز فلو فعل المشروط قبل وجود الشرط يكون نفلاً.

لما فی التاتارخانية :(۲۱/۵ طبع قدیمی)

وأما اذا كان المنذور معلقا بالشرط وانه على وجهين ايضاً ان كان شرطا يريدوجوده اما لجلب المنفعة أو لدفع المضرة بأن قال" ان مريضي فان ردالله غائبي فان مات عدوى فعلي صوم سنة" فوجد الشرط يلزمه الوفاء بالسمى ولا يخرج عن العهدة بالكفارة بلا خلاف.

لما فی الشامی :(۸۴۲/۳ طبع ایچ ایم سعید)

ورأيت في طلاق الذخيرة في ترجمة المسائل التي ينظر فيها الى شرط البر: وهب لرجل مالا فقال الواهب امرأتي طالق ثلاثا ان انفقت هذ المال الذى وهبتك الا على اهلك ثم انه انفق بعضه على أهله وقضى بالباقي دينا أوحج أو تزوج لا تطلق امرأة الحالف ذكره خواهرزاده في شرح الحيل وعلله بأن شرط بره انفاق جميع الهبة على أهله فيكون شرط حنثه ضد ذالك وهو انفاق جميعها على غيرهم ولم يوجد.

وفيه ايضاً.

لو حلف لا يأخذ ماله على فلا ن الا جميعا وأخذ البعض دون البعض لا يحنث لأن شرط بره أخذ جميع الدين جملة فيكون شرط حنثه ضد ذالك وهو اخذ جميع الدين متفرقا ولم يوجد ذالك ،وحاصله أنه لا يحنث بمجرد قبض البعض جملة أو متفرقا مالم يقبض الباقي كما مر فاذا ترك البعض بأن لم يقبضه اصلا بابراء او بدونه لم

بمجرده لعدم شرطه وهو المعنى الذي هو جعله أي ... الخ.

الجواب صحیح: مفتی محمد عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ واللہ اعلم بالصواب: محمد ... دارالعلوم ...

۲۸ ربیع الثانی ۱۴۳۵ھ فتویٰ نمبر: ۲۰۷۲

﴿عرفاً نذر کیلئے مستعمل صیغوں سے بھی نذر منعقد ہو جاتی ہے﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ مجھے کوئی کام درپیش تھا، جس کے پورے ہونے کیلئے میں نے یہ الفاظ کہے "میرا یہ کام ہو گیا تو میں دس رکعات نفل نماز پڑھوں گا" ان الفاظ سے میری نذر کی کوئی نیت نہیں تھی اور پھر میرا وہ کام ہو گیا، اب کیا نذر پوری کرنا میرے ذمہ لازم ہے یا نہیں؟ برائے مہربانی وضاحت فرمائیں۔

﴿جواب﴾ نذر صحیح ہونے کیلئے جملہ میں لزوم کے صیغوں کا موجود ہونا شرط ہے اس کے بغیر نذر منعقد نہیں ہوتی۔ البتہ ایسا جملہ جو عرفاً نذر ہی کیلئے بولا جاتا ہو تو اس میں لزوم کے صیغے اگرچہ نہ ہوں، لیکن استحساناً نذر صحیح ہو جاتی ہے، لہذا آپ کے ذمہ روزے رکھنا لازم ہے۔

لما في الدر مع الرد:(۳/۷۲۱طبع سعید)

فان الأيمان مبنية على العرف، فما تعورف الحلف به فيمين وما لا فلا. وفي الشامية فان الأيمان مبنية على العرف، مايتعارف الناس الحلف به يكون يمينا وما لا فلا.

لما في البزازية على الهندية:(۴/۲۷۲طبع رشيديه كوئٹه)

ان عوفيت صمت كذا لم يجب مالم يقل لله علي وفي الاستحسان يجب وان لم يكن تعليقا لا يجب قياسا واستحسانا كما اذا قال انا احج فلا شئي ولو قال ان فعلت كذا فانا احج ففعل يجب عليه الحج.

لما في الشامي:(۳/۷۳۵طبع سعید)

وانما ذكر النذر في الأيمان لما يأتي من انه لو قال علي نذر ولا نية له لزمه كفارة ومر في آخر كتاب الصيام انه لو نذر صوما فان لم ينو شيأ أو نوى النذر وأن لا يكون يمينا كان نذرا ___ وان نواهما أو نوى اليمين كان نذراً ويميناً.

لما في الشامي:(۳/۷۴۰طبع سعید)

فأفاد ان عدم الصحة لكون الصيغة المذكورة لا تدل على النذر أي لأن قوله نبحت شاة وعد لا نذر ويؤيده ما في البزازية: لو قال ان اسلم ولدي أصوم ما عشت فهذا وعد لكن في البزازية أيضا ان عوفيت صمت كذا لم يجب مالم يقل لله علي وفي الاستحسان يجب ولو قال ان فعلت كذا فانا احج ففعل يجب عليه الحج، فعلم ان

تعليل الدرر مبني على القياس والاستحسان خلافه.

الجواب صحیح: مفتی عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ　　واللہ اعلم بالصواب: عزیز احمد خضداری غفرلہ ولوالدیہ

۱۲ رجب المرجب ۱۴۳۵ھ　　فتویٰ نمبر ۴۲۳۹

﴿نذر معلق کی ایک صورت﴾

﴿سوال﴾ مصیبت میں مبتلا شخص نے نذر مانی کہ اللہ میاں اس مصیبت سے نجات دے تو ختم قرآن کرونگا اور اسکی مصیبت رفع ہوگئی، پوچھنا یہ ہے کہ اس صورت میں ایفاء واجب ہے یا نہیں؟ اگر واجب ہے تو اُجرت لیکر پڑھنے والے پڑھ سکتے ہیں یا نہیں؟　　مستفتی: محمد اکرام

﴿جواب﴾ نذر ایسی چیز کی صحیح ہوتی ہے جو کہ عبادۃ مقصودہ ہو اور جنس واجب سے ہو چنانچہ قراءت قرآن بھی ایسی عبادت ہے چونکہ قراءت نماز میں فرض ہے تو قراءتِ قرآن کی نذر بھی صحیح ہوگی، لہٰذا اس صورت میں نذر پوری کرنا ضروری ہے، دوسرے سے اُجرت پر قرآن ختم کرانا (پڑھوانا) معصیت ہے اس سے پرہیز ضروری ہے، لہٰذا خود پڑھنا ضروری ہے، دوسرے سے نہ پڑھوائے۔

لما في الشامي: (۳/۷۸، طبع سعيد)

(قوله لم يلزمه) وكذالو نذر قراءة القرآن وعلله القهستاني في باب الاعتكاف بأنها للصلاة..... قلت وهو مشكل فان القراءة عبادة مقصودة ومن جنسها واجب.

ولما في البحر الرائق: (۲/۲۹۴ طبع سعيد)

واعلم بأنهم صرحوا بأن شرط لزوم النذر ثلاثة كون المنذور ليس بمعصية وكونه من جنسه واجب وكون الواجب مقصودا لنفسه الىٰ قوله وكذالو نذر سجدة التلاوة وفي الواقعات ولو نذر تكفين ميت لم يلزم لأنه ليس بقربة مقصودة كالوضوء الى قوله واما الاعتكاف وهو اللبث في مكان من جنسه واجب وهو القعدة الأخيرة في الصلاة.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ　　واللہ اعلم بالصواب: ظہور احمد شمس

یکم جمادی الاولیٰ ۱۴۲۹ھ　　فتویٰ نمبر: ۱۳۷۱

﴿منت کے روزے اگر نہ رکھ سکے تو فدیہ ادا کرے﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میرا بچہ گم ہوگیا تھا، میری بیوی نے یہ منت مانی کہ اگر میرا بچہ مل جائے تو میں تین مہینے روزے رکھونگی، اب

میرا بچہ پل گیا ہے لیکن میری بیوی بڑھاپے اور کمزوری کی وجہ سے روزے نہیں رکھ سکتی، لہٰذا اس کا فدیہ کیا ہوگا؟
مستفتی: عزت رحمٰن بنارس قصبہ کالونی کراچی

﴿جواب﴾ ایسی صورت میں ہر ایک روزہ کے بدلہ میں فدیہ دیا کریں اور ہر مہینہ ۳۰ دن کا شمار کیا جائیگا، فدیہ دینے کی تفصیل یہ ہے کہ ہر ایک دن کے بدلے کسی مسکین کو پیٹ بھر کر صبح وشام کا کھانا کھلائیں یا ۹۰ دن کے بدلے ۱۸۰ کلو گندم یا اسکی قیمت اسکو دے جسکو زکوٰۃ دی جاسکتی ہو۔

لما في الدر المختار:(۴۲۷/۲،طبع سعید)
لو نذر صوم الأبد فضعف عن الصوم لاشتغاله بالمعيشة له ان يطعم ويفطر لأنه استيقن انه لا يقدر على القضاء.

ولما في خلاصة الفتاوى:(۲۷۵/۱،طبع رشيديه)
لو نذران يصوم ابداله ان يفطر ويتصدق لكل يوم نصف صاع من الحنطة.

ولما في بدائع الصنائع:(۹۱/۵،طبع سعيد)
لو نذر الشيخ الفاني بالصوم يصح نذره وتلزمه الفدية لانه عاجز عن الوفاء بالصوم حقيقة فيلزمه الوفاء به تقدير ابخلفه.

ولما في الهندية:(۲۰۷/۱،طبع رشيديه)
ولو اخر القضاء حتى صار شيخافانيا او كان النذر بصيام الأبد فعجز لذلك او باشتغاله بالمعيشة لكون صناعة شاقة فله ان يفطر ويطعم لكل يوم مسكينا على ماتقدم وان لم يقدر على ذلك لعسرته يستغفر الله انه هو الغفور الرحيم..

الجواب صحیح: عبد الرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: حبیب الوہاب سواتی

۱۱ محرم الحرام ۱۴۲۹ھ — فتویٰ نمبر:

﴿لزوم کے صیغوں کے بغیر بھی نذر معلق منعقد ہو جاتی ہے﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں مفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک عورت نے نذر مانی کہ اگر میرا خاوند بیماری سے ٹھیک یعنی شفایاب ہو جائے تو میں بیس کلو چاول اور پانچ کلو گوشت پکا کر غریبوں کو صدقہ کرونگی تو آیا عورت کے ان الفاظ سے نذر لازم ہوگئی یا نہیں؟

﴿جواب﴾ عورت کے مذکورہ الفاظ نذر کے ہیں، لہٰذا خاوند کے شفایاب ہونے سے اس پر مذکورہ نذر کی ادائیگی لازم ہوگی۔

لما في الشامي:(۷۴۰/۳،طبع سعيد)
ويؤيده ما في البزازية قال ان سلم ولدى اصوم ماعشت فهذا وعد لكن في البزازية

ایضا ان عوفیت صمت کذا لم یجب مالم یقل لله علی وفی الاستحسان یجب ولو قال: ان فعلت کذا فانا احج ففعل یجب علیه الحج اھ .فعلم ان تعلیل الدرر مبنی علی القیاس والاستحسان خلافه .وفی البدائع:(۵/ ۸۲-۸۵،طبع سعید)

ولما فی البزازیة علی هامش الهندیة:(۴/ ۲۷۲،طبع رشیدیه)

ان عوفیت صمت کذا لم یجب مالم یقل لله علی وفی الاستحسان یجب وان لم یکن تعلیقا لایجب قیاسا واستحسانا کما اذا قال انا احج فلا شیئ ولو قال ان فعلت کذا فانا احج ففعل یجب علیه الحج

الجواب صحیح: عبد الرحمٰن عفا اللہ عنہ واللہ اعلم بالصواب: محمد وارث خان

۱۳رجب المرجب ۱۴۲۹ھ فتویٰ نمبر: ۱۷۱۷

﴿نذر معلق کی ایک صورت کا حکم﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں مفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میں مرغی کے نیچے انڈے رکھ کر نذر مان لیتی تھی کہ اگر ان انڈوں سے سارے یا اکثر چوزے پیدا ہو جائیں اور زندہ رہ کر بڑے ہو جائیں تو ان میں سے ایک چاہے مرغ ہو یا مرغی صدقہ کرونگی ،تقریباً آٹھ سال سے جب بھی چوزے انڈوں سے نکلتے تھے تو میں مذکورہ الفاظ دہراتی تھی حالانکہ ابھی تک مذکورہ خواہش پوری ہونے کے باوجود صدقہ نہیں دے سکی تو اب میرے لئے کیا حکم ہے؟ یعنی اس مذکورہ صورت میں نذر واقع ہوئی یا نہیں؟ بینوا توجروا۔

﴿جواب﴾ عورت کے مذکورہ الفاظ سے نذر واقع ہوئی ہے اور جو نذر مانی ہے اس کا پورا کرنا لازم ہے اور جو نذر ابھی تک پوری نہیں کی گئی اسکو اب پورا کرنا ضروری ہے۔

لما فی البزازیة علی هامش الهندیة:(۴/ ۲۷۲،طبع رشیدیه)

ان عوفیت صمت کذا لم یجب مالم یقل لله علی وفی الاستحسان یجب وان لم یکن تعلیقا لایجب قیاسا واستحسانا کما اذا قال أنا أحج فلا شیئ ولو قال ان فعلت کذا فأنا أحج ففعل یجب علیه الحج.

ولما فی الشامی:(۳/ ۷۴۰،طبع سعید)

ویؤیده مافی البزازیة ولو قال ان سلم ولدی أصوم ماعشت فهذا وعد لکن فی البزازیة ایضا ان عوفیت صمت کذا لم یجب مالم یقل لله علی وفی الاستحسان یجب ولو قال: ان فعلت کذا فانا احج ففعل یجب علیه الحج اھ فعلم ان تعلیل الدرر مبنی علی القیاس والاستحسان خلافه.

الجواب صحیح: عبد الرحمٰن عفا اللہ عنہ واللہ اعلم بالصواب: محمد وارث خان

۱۶رجب المرجب ۱۴۲۹ھ فتویٰ نمبر: ۱۷۱۸

﴿نذر معلق کو وجود فعل کے بعد پورا کرنا ضروری ہے﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک عورت کے چار بیٹے ہیں تو جب بھی اس عورت کے ہاں کوئی لڑکا پیدا ہوتا تو وہ عورت نذر مانتی کہ میں ہر مہینے میں اس لڑکے کی طرف سے دو دو روپیہ صدقہ کرونگی اور اب اس عورت کے چار بیٹے ہیں پہلے بیٹے کی عمر تقریباً تیس سال ہے اور دوسرے بیٹے کی عمر تقریباً ستائیس سال ہے تیسرے بیٹے کی عمر اٹھارہ سال ہے اور چوتھے بیٹے کی عمر آٹھ سال ہے حالانکہ اس عورت نے ابھی تک ایک بیٹے کی طرف سے بھی ہر مہینے میں دو دو روپے ادا نہیں کئے، اب اس عورت کیلئے کیا حکم ہے؟

﴿جواب﴾ ہر بیٹے کی پیدائش پر مہینے میں دو دو روپیہ لازم کرنا نذر کی قبیل سے ہے، لہٰذا بیٹے کی پیدائش پر ہر مہینے میں دو دو روپیہ لازم ہونگے اگر ابھی تک پیسے صدقہ نہ کئے ہوں تو اس کو چاہیے کہ حساب لگا کر اپنے اوپر لازم کردہ رقم صدقہ کرے۔

لما فی البزازیۃ علی هامش الهندیۃ:(۲/۲۷۲،طبع رشیدیہ)

ان عرفیت صمت كذا لم يجب مالم يقل لله علي وفي الاستحسان يجب وان لم يكن تعليقا لا يجب قياسا واستحسانا كما اذا قال أنا أحج فلا شئ ولو قال ان فعلت كذا فأنا أحج ففعل يجب عليه الحج. وفي ردالمحتار:(۳/۷۰،طبع سعيد)

ولما فی البدائع:(۵/۸۲-۸۵،طبع سعید)

ولو قال انا احرم او انا محرم او اهدي او امشي الى البيت فان نوى به الايجاب يكون ايجابا ـــــ هذا اذا لم يعلقه بالشرط فان علقه بالشرط بان قال ان فعلت كذا فانا احرم فهو على الوجوه التي بينا انه ان نوى الايجاب يكون ايجابا وان نوى الوعد يكون وعدا لما قلنا وان لم يكن له نية فهو على الايجاب بخلاف الفصل الاول لان العدات لا تتعلق بالشروط وان الواجبات تتعلق بها فالمعرفة الى الايجاب بقرينة التعليق بالشرط ولم توجد القرينة في الفصل الاول فصار الحاصل ان هذا اللفظ في غير المعين بالشرط على الوعد الا ان ينوي به الايجاب وفي المعلق يقع على الايجاب الا ان ينوي به الوعد.

الجواب صحیح: عبد الرحمٰن عفا اللہ عنہ | واللہ اعلم بالصواب: محمد وارث خان

۱۱ رجب المرجب ۱۴۲۹ھ | فتوی نمبر: ۱۷۲۰

﴿نذر کے روزے شرط سے پہلے رکھنے کا حکم﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام کہ ایک طالب علم نے نذر مانی تھی کہ اگر میں فلاں

مدرسے سے فارغ ہوا تو ایک مہینہ روزے رکھونگا، اب وہ اس مدرسہ میں دورہ حدیث پڑھ رہا ہے اور انشاء اللہ سال کے آخر میں فراغت ہو جائیگی تو وہ چاہتا ہے کہ ابھی سے روزے رکھوں تو کیا وہ فراغت سے پہلے روزے رکھ سکتا ہے یا نہیں؟　　　　مستفتی: بخت منیر سواتی

﴿جواب﴾ نذر معلق میں شرط پائے جانے کے بعد حکم کا وجوب ہوتا ہے، لہٰذا فراغت سے پہلے روزے رکھ لئے تو وہ نفلی ہوں گے فراغت کے بعد دوبارہ رکھنا لازم ہوگا۔

لمافی الشامی:(۷۲۱/۳، طبع سعید)

بخلاف النذر المعلق فانه لایجوز تعجیله قبل وجود الشرط..... ان المعلق علی شرط لاینعقد سببا للحال بل عند وجود شرطه کما تقرر فی الاصول.

ولمافی الهندیة:(۲۱۰/۱، طبع رشیدیه)

اذا علق النذر بالصوم بشرط وأداه قبل وجوده لایجوز اجماعا.

ولمافی البدائع:(۹۳/۵، طبع سعید)

وان کان معلقا بشرط نحو ان یقول ان شفی الله مریضی اوان قدم فلان الغائب فلله علی ان اصوم شهرا..... فوقته وقت الشرط فمالم یوجد الشرط لایجب بالاجماع ولو فعل ذلک قبل وجود الشرط یکون نفلا.

الجواب صحیح: عبد الرحمٰن عفا اللہ عنہ　　　　واللہ اعلم بالصواب: حبیب الرحمٰن سواتی

۲۹ صفر الخیر ۱۴۳۰ھ　　　　فتویٰ نمبر: ۲۰۳۷

﴿نذر معلق میں التزام کا لفظ ضروری نہیں ہے﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ کسی شخص نے کہا کہ اگر میرا بیٹا اس بیماری سے شفا پائے تو بکری ذبح کر کے صدقہ کرونگا، جبکہ نذر کا لفظ یا کوئی تاکید کے الفاظ استعمال نہ کئے ہوں، پوچھنا یہ ہے کہ صرف اتنا کہنے سے نذر لازم ہو جائے گی یا نہیں؟

﴿جواب﴾ مطلق نذر کے لزوم کیلئے نذر کا لفظ یا التزام کا کوئی لفظ ضروری ہے، البتہ مذکورہ صورت نذر معلق کی ہے، نذر معلق میں لفظ نذر یا التزام کا لفظ نہ بھی ہو تب بھی استحساناً نذر لازم ہو جاتی ہے کیونکہ نذر معلق میں دلالۃً التزام و تاکید پائی جاتی ہے لیکن یہ اس صورت میں ہے کہ عرفاً نذر کے موقع پر بولے جاتے ہوں مثلاً شفاء امراض، دفع بلیات اور حصول مقاصد کیلئے جو شکرانہ کے طور پر بولے جاتے ہیں بشرطیکہ بولتے وقت نذر کی نفی کی نیت نہ ہو۔

لما فی الشامی:(۲/۷۴۰،طبع سعید)

(قوله لأن الذبح ليس من جنسه فرض الخ)هذاالتعليل لصاحب البحر ،ويخالفه مافی الخانية قال: ان برئت من مرضي هذاذبحت شاة فبرئ لايلزمه شيئ الاان يقول فلله علي ان أذبح شاةاه: وهي عبارة متن الدرروعللهافي شرحه بقوله لان اللزوم لايكون الابالنذروالدال عليه الثاني لاالاول اه.فافادأن عدم الصحة لكون الصيغة المذكورة لاتدل على النذرأي لان قوله ذبحت شاة وعدلانذر ،ويؤيده مافي البزازية لوقال ان سلم ولدى أصوم ماعشت فهذا وعدلكن في البزازية ايضاان عوفيت صمت كذالم يجب مالم يقل لله علي وفي الاستحسان يجب ولوقال:ان فعلت كذافاناأحج ففعل يجب عليه الحج اه.فعلم ان تعليل الد ررمبني على القياس والاستحسان خلافه.

ولمافي البزازية على هامش العالمگيرية:(۴/۲۷۲،طبع رشيديه)

ان عوفيت صمت كذالم يجب مالم يقل لله علي وفي الاستحسان يجب وان لم يكن تعليقالايجب قياساواستحساناكمااذاقال أنااحج فلاشيئ ولوقال ان فعلت كذا فاناأحج ففعل يجب عليه الحج.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفااللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: خلیل اللہ دیروی عفی عنہ

۱۳ جمادی الثانی ۱۴۲۹ھ — فتویٰ نمبر: ۱۵۶۳

﴿نذر کا پورا کرنا واجب ہے﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک شخص نے نذر مانی کہ میرا فلاں کام ہو گیا تو فلاں مہینے کے اتنے روزے رکھوں گا مثلاً (رجب کے بیس روزے) مراد پوری ہو جانے کے بعد وہ شخص اس مہینے میں روزے نہیں رکھتا، یا آدھے رکھ لیتا ہے اور آدھے روزوں کا فدیہ ادا کر دیتا ہے تو کیا اس کے لیے ایسا کرنا شرعاً جائز ہے یا نہیں؟ حالانکہ وہ صحت مند اور تندرست ہے۔ مستفتی: سیف الرحمٰن صاحب

﴿جواب﴾ نذر کو پورا کرنا واجب ہے قرآن کریم میں ارشاد ہے: ولیوفوا نذورھم الآیۃ چنانچہ مذکورہ صورت میں اس شخص کے لیے متعین دنوں کے روزے رکھنا ضروری ہے بغیر کسی عذر شرعی کے چھوڑنا یا فدیہ ادا کرنا جائز نہیں اگر ایسا کیا ہے تو اللہ تعالیٰ سے توبہ و استغفار کرنا چاہیے اور چھوٹے ہوئے روزوں کی قضا کریں الا یہ کہ کوئی ایسی بیماری لاحق ہو گئی ہو کہ جس میں روزے نہ رکھے جا سکتے ہوں اور تندرستی کی امید بھی نہ ہو تو ایسی صورت میں فدیہ ادا کرنے سے روزے ذمہ سے ساقط ہو جائینگے۔

ولمافی الشامی:(۲/۴۲۷،طبع سعید)

المریض اذا تحقق الیأس من الصحة فعلیه الفدیة لکل یوم من المرض اه وکذا مافی البحر لونذر صوم الأبد فضعف عن الصوم لاشتغاله بالمعیشة له أن یطعم ویفطر لأنه استیقن أنه لایقدر علی القضاء ...(قوله اصلاً بنفسه) کرمضان وقضائه والنذر کما مر فیمن نذر صوم الأبد،وکذا لونذر صوماً معیناً فلم یصم حتیٰ صار فانیاً جازت له الفدیة بحر،وکذا فی الشامی:(۴۳۸/۳،طبع سعید)وکذا فی التنویر مع الدر:(۴۲۷/۲،طبع سعید)

ولمافی البدائع:(۹۵/۵،طبع سعید)

وکذا اذا قال لله علی صوم رجب فلم یصم فیما سبق من الشهور علی رجب حتیٰ هجم رجب لایجوزله التاخیر من غیر عذر.

ولمافی البحر الرائق:(۲۸۶/۲،طبع سعید)

ولوقدر علی الصوم یبطل حکم الفداء لان شرط الخلفیه استمرار العجز فی الصوم.

ولمافی التاتارخانیة:(۳۲/۵،طبع قدیمی)

واذانذر بصوم شهر بعینه بأن نذر صوم رجب مثلاً،وجب علیه أن یصوم متتابعاً نص علی التتابع اولم ینص،فان أفطر یوماً قضاه ولایلزمه الاستقبال وان وجب علیه متتابعاً.

الجواب صحیح:عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب:محمد کاشف عزیز غفرلہ

۱۱ ذیقعدہ ۱۴۳۰ھ — فتویٰ نمبر:۲۳۹۶

﴿نذر سے عاجز ہونے کے صورت میں کیا کرے؟﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں۔کہ ایک شخص نے نذر مانی تھی اگر میرا فلاں کام ہوجائے تو جانور ذبح کر کے خیرات کرونگا تو اسکا کام ہوگیا لیکن یہ شخص بالکل غریب ہوگیا ہے اب کیا کرے؟ مستفتی:محمد ریاض

﴿جواب﴾ زندگی میں کسی بھی وقت جانور خرید کر صدقہ کرنے پر اگر قادر ہوا تو نذر پوری کریگا اور جب تک قدرت نہ ہوتو توبہ واستغفار کرتا رہے۔

لمافی التاتارخانیه(۳۲/۵ طبع قدیمی)

"وفی المنتقی":اذاقال:((لله علی عتق نسمة))فاعتق رقبة عمیاءلم یجز،ولوقال:((لله علی عتق نسمة))فاعتق عمیاء:برفی یمینه،وهونظیرمالوقال:((لله علی ان اهدی بشاة))فاهدی بشاة عمیاء،وذکر عیسی بن ابان فی نوادره وابن سماعة فی الوصایاعن محمدؒفیمن نذربعتق عبده بعینه فباعه فان علیه ان یشتریه ویعتقه فان فاته ولم یقدرعلی شرائه فلیس شی ویستغفرالله تعالی،ولایجزیه ان یتصدق بقیمته اوثمنه.

ولمافی فتاوی قاضیخان (۱/ ۵۲۳ طبع قدیمی)

رجل قال: ان فعلت کذا فالف درهم من مالی صدقة ثم فعل ولیس له الا مائة درهم فتکلموا فیه: قال الفقیه ابو اللیث رحمه الله تعالیٰ لایلزمه الصدقة الا ماکان عنده وهکذا روی عن محمد رحمه الله تعالیٰ وان کان عنده عروض او خادم یساوی مائة فانه یبیع وان کان یساوی عشرة یتصدق بعشرة وان لم یکن عنده شی فلاشی علیه کمن اوجب علی نفسه الف حجة یلزم بقدر ماعاش فی کل سنة حجة.

ولمافی التفسیر المظهری (۶/ ۲۸۸ طبع رشیدیه)

ولوقال مالی صدقة فی المساکین ولامال له لایلزمه شی

الجواب صحیح: مفتی عبدالرحمٰن عفا اللہ   واللہ اعلم بالصواب: محمد داؤد فاروقی تاکوی

۲۹ ربیع الثانی ۱۴۳۵ھ   فتویٰ نمبر: ۴۰۳۳

﴿نذر کے کھانے سے اپنے گھر والوں کو کھلانے کا حکم﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک شخص نے نذر مانی کہ اگر میرا فلاں کام ہوگیا تو میں فقیروں کو کھانا کھلاؤنگا، پوچھنا یہ ہے کہ نذر کے کھانے سے اپنے گھر والوں کو کھانا کھلا سکتا ہے یا نہیں؟ یا اسطرح نذر مانے لیکن کھانا کھلانے کے بجائے کھانے کی قیمت مدرسہ کو دے تو کیا مدرسہ میں یہ قیمت دے سکتا ہے یا نہیں؟   مستفتی: محمد نواز صوابی

﴿جواب﴾ اس شخص کا فلاں کام اگر ہوگیا ہے تو فقیروں کو کھانا کھلانا واجب ہے فقیر لوگ ہی اسکا مصرف ہیں، غنی لوگوں کو اسی طرح خود یا گھر والوں کو کھلانا جائز نہیں ہے اور مدرسہ کے طلباء بھی عموماً فقیر ہوتے ہیں انکو کھلانے میں زیادہ ثواب ہے کھانے کی قیمت ادا کرنے سے بھی نذر پوری ہوجائیگی۔

لمافی التنویر مع الدر: (۲/ ۳۴۴ تا ۳۴۶ طبع ایچ ایم سعید)

ویشترط ان یکون الصرف (تملیکا) لا اباحة کمامر - (لا) الی (من بینهما ولاد) — (او) بینهما (زوجیة)

وفی الشامیة: (قوله ولا الی من بینهما) ای بینه وبین المدفوع الیه لان منافع الاملاك بینهم متصلة فلایتحقق التملیک علی الکمال..... وکذا کل صدقة واجبة کالفطرة والنذر والکفارات اما التطوع فیجوز بل اولی کما فی البدائع.

ولمافیه أیضا: (۶/ ۳۲۰ طبع سعید)

(ولوترك التضحیة ومضت ایامها التصدق بهاحیة ناذر) فاعل تصدق (المعینة) ولو

فقيرا ولو ذبحها تصدق بلحمها، ولو نقصها تصدق بقيمة النقصان ايضا ولا يأكل الناذر منها فان أكل تصدق بقيمة ما أكل.

ولما في التاتارخانية:(۵/۲۲،طبع قديمی)

عن محمد بن سلمة سئل فيمن نذر ان يتصدق بماله لا يعطى اباه وولده وهو بمنزلة كفارة اليمين.

ولما في الهندية:(۱/۲۲،طبع رشيديه)

ويجوز دفع القيم في الزكوة عندنا وكذا في الكفارات وصدقة الفطر والعشر والنذر.

والله اعلم بالصواب: احمد علی عفی عنہ

الجواب صحیح: عبد الرحمٰن عفا اللہ عنہ

فتوی نمبر:۲۶۳۳

۲۱ ربیع الثانی ۱۴۳۱ھ

﴿کتاب الوقف﴾

﴿زمین کو تقسیم سے پہلے مسجد کے لیے وقف کرنا صحیح نہیں ہے﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں مفتیان کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ہم تین بہن، بھائی ہیں اور میں اپنی زمین قبل التقسیم مسجد کے لئے دینا چاہتی ہوں تو کیا میرا یہ وقف کرنا درست ہوگا یا نہیں؟

﴿جواب﴾ مشترک زمین میں سے مسجد کے لئے آپ وقف کرنا چاہتی ہیں تو آپ کا اپنا حصہ جب تک الگ اور ممتاز نہیں ہوگا وقف معتبر نہ ہوگا، اس لئے آپ اپنا حصہ پہلے الگ کریں پھر وقف کریں تا کہ بعد میں آپ کے ورثاء وغیرہ کوئی اس کا دعوی نہ کر سکے۔

لما في رد المحتار: ۳۴۸/۴، طبع سعيد.

والخلاف فيما يقبل القسمة، أما ما لا يقبلها كالحمام والبئر والرحى فيجوز اتفاقا الا في المسجد والمقبرة لان بقاء الشركة يمنع الخلوص لله تعالى.

ولما في فتاوى التاتارخانية: ۷۵/۵، طبع قديمي.

واعلم ان الشيوع فيما لا يحتمل القسمة لا يمنع صحة الوقف بلاخلاف واما الشيوع فيما يحتمل القسمة هل يمنع صحة الوقف؟ فليه خلاف على قول محمدؒ يمنع وفي الكبرى وبه يفتى وعلى قول ابي يوسفؒ لا يمنع وفي العتابية والشيوع لا يمنع صحة الوقف عند ابي يوسفؒ في غير المسجد وفي الهداية: والمقبرة وقال محمدؒ يمنع وفي المسجد يمنع بالاتفاق.

ولما في البحر الرائق: ۱۹۷/۵، طبع سعيد.

فقد علمت انه قول محمدؒ فلا يجوز وقف المشاع وقال ابو يوسفؒ هو جائز والخلاف فيما يحتمل القسمة اما ما لا يحتمل القسمة فهو جائز اتفاقا اعتبارا عند محمدؒ بالهبة والصدقة المنفذة الا في المسجد والمقبرة فانه لا يتم مع الشيوع فيما لا يحتمل القسمة عند ابي يوسفؒ ايضا لان بقاء الشركة يمنع الخلوص لله تعالى ولان المهايأة في هذا في غاية التبح بان يقبر فيها الموتى سنة وتزرع سنة ويصلى لله فيه في وقت ويتخذ اصطبلا في وقت بخلاف الوقف لامكان الاستغلال والحاصل ان وقف المشاع مسجدا او مقبرة غير جائز مطلقا اتفاقا.

الجواب صحیح: عبدالرحمن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: عمر فاروق لاہوری

۵ ربیع الثانی ۱۴۳۳ھ — فتوی نمبر: ۳۶۵۰

﴿مسجد کے لئے زبانی زمین وقف کرنا معتبر نہیں ہے﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میری ایک زمین تھی، میں

نے صرف زبانی مسجد کے لئے وقف کی تھی، اتفاق سے اس جگہ کے قریب میں اب مسجد بن گئی ہے، جو عام لوگوں کے لئے کافی ہے، اب میں چاہتا ہوں کہ اسی زمین پر مدرسہ بناؤں یا اس کو بیچ کر دوسری جگہ جہاں ضرورت ہو مسجد بناؤں، تو کیا میں اس زمین پر مدرسہ یا اسکو بیچ کر دوسری جگہ مسجد بنا سکتا ہوں؟ برائے کرم شریعت کی روشنی میں رہنمائی فرمائیں۔ مستفتی: سمیع الرحمٰن دیر

﴿جواب﴾ آپ کی اس زمین کے قریب میں اگر مسجد بن گئی ہے، تو بہتر یہی ہے کہ آپ اس پر مدرسہ بنالیں یا بیچ کر دوسری مناسب جگہ مسجد بنالیں۔

لما في البحر ۲۴۸/۵ طبع سعيد

ومن بنى مسجدا لم يزل ملكه عنه حتى يفرزه عن ملكه بطريقه ويأذن بالصلاة فيه واحد زال ملكه.

ولما في الشامي ۳۵۶/۴ طبع سعيد

وانه لو قال وقفته مسجدا ولم يأذن بالصلاة فيه ولم يصل فيه أحد انه لا يصير مسجدا بلا حكم وهو بعيد، كذا في الفتح ملخصاً." وفي تقريرات الرافعي تحت (قوله وهو بعيد الخ) لا بعد فيه مع معرفة وجهه وذالك أنه بالقول لم يحصل التسليم الذى هو شرط بخلاف الصلاة فيه مع الاذن فانه يحصل التسليم مع ما يدل على الخروج تأمل.

ولما في الهندية ۴۲۵/۲ طبع قديمي كتب خانه

من بنى مسجدا لم يزل ملكه عنه حتى يفرزه عن ملكه بطريقه ويأذن بالصلاة فيه اما الافراز فلانه لا يخلص لله تعالى الا به، كذا في الهداية.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: محمد زبیر غفرلہ ولوالدیہ

۱۱ ربیع الاول ۱۴۳۴ھ — فتویٰ نمبر: ۳۶۱۳

﴿مسجد کے پلاٹ میں مدرسہ بنانا﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء دین اور مفتیان شرع متین مندرجہ ذیل مسئلہ کے بارے میں کہ (۱) بندہ نے ۲۰۰۳ کو سلطان آباد موضع H ایریا میں ایک پلاٹ خریدا (۲) چونکہ مذکورہ پلاٹ کے قریب کوئی اور مسجد نہیں تھی اور دیگر مساجد کافی دور تھیں اور جماعت میں خصوصاً فجر میں شرکت نہیں ہوسکتی تھی، اس لئے اہل محلّہ کے اصرار پر بندہ نے مذکورہ پلاٹ میں نمازوں کیلئے باقاعدہ امام کا تقرر کیا، البتہ بندہ کا ارادہ مذکورہ پلاٹ میں مدرسہ بنانے کا تھا۔

(۳) اس کے بعد اہل خیر نے اسکے ساتھ متصل قبلہ کی جانب تین پلاٹ خریدے، مذکورہ

پلاٹوں میں سے قبلہ کی جانب سے پہلا پلاٹ ڈبل سٹوری تھا تو جیسے جیسے نئے پلاٹ خریدتے گئے اس طرح سے نمازی حضرات نماز کیلئے آگے بڑھتے گئے اور جماعت اگلے پلاٹوں میں ہوتی رہی، اس کے بعد جب رمضان آیا تو یہاں پر معتکفین بھی اعتکاف کیلئے بیٹھ گئے، ایک دفعہ مذکورہ اہل خیر رمضان کے آخری عشرے میں مذکورہ پلاٹوں کو دیکھنے کیلئے آیا اور اس نے معتکفین کو دیکھا تو اس نے ڈبل سٹوری والے پلاٹ کی چھت پر کھڑے ہو کر پوچھا کہ یہ اعتکاف والے یہاں کیسے بیٹھے ہیں، اس لئے کہ ہم نے مسجد کی نیت نہیں کی ہے تو کیا یہ اعتکاف ہو جاتا ہے؟

(۴) اس کے بعد اسی اہل خیر نے اگلا پلاٹ خریدا، واضح رہے کہ ابتداء سے بندے کی نیت مدرسہ اور مسجد دونوں بنانے کی تھی البتہ مذکورہ پلاٹوں میں سے کسی پلاٹ کو مسجد یا مدرسہ کیلئے متعین نہیں کیا تھا جب کہ اس جگہ کا نام جامعہ قاسم العلوم ومسجد عائشہ رکھا تھا وجہ اسکی یہ تھی کہ مذکورہ جگہ میں لوگ ابتداء سے نماز پڑھ رہے تھے اور طلبہ دینی تعلیم حاصل کر رہے تھے اور اُوپر کی چھت پر طلبہ کی رہائش اور مطبخ کا انتظام تھا اور اب بھی ہے۔

(۵) مذکورہ پلاٹوں کے خریدے جانے کے بعد بندہ کا ارادہ تھا کہ مذکورہ پلاٹوں کے ساتھ دائیں طرف متصل پوری پٹی جو کہ ان پلاٹوں جتنی ہے کو خرید کر قبلہ کی جانب مسجد بنائیں گے اور پچھلے حصے میں مدرسہ اور اساتذہ کے مکانات بنائیں گے بندہ نے مذکورہ پٹی کے مالکان سے خریدنے کی بات بھی چلائی مگر قیمت زیادہ ہونے کی بنا پر فی الحال بات نہیں بن سکی۔

(۶) مذکورہ پلاٹوں (جو کہ ۱۰۳ فٹ لمبائی پر مشتمل ہے) پر بندہ نے تعمیر شروع کی جسکا نقشہ اس طرح بنایا کہ مشرقی حصہ (جو کہ ۴۶ فٹ پر مشتمل ہے) میں زمینی حصہ میں وضوء خانہ اور استنجاء خانے کی تعمیر کی اور اسکے اُوپر پہلی منزل میں مدرسہ کی تعمیر کی ہے جو کہ ابھی زیر تعمیر ہے اور مغربی حصہ کو نقشہ میں مسجد کیلئے متعین کیا گیا ہے اور فی الحال مسجد کیلئے مجوزہ جگہ نیچے نمازوں اور اوپر طلبہ کی رھائش، درس گاہوں اور مطبخ کیلئے حسب سابق استعمال ہو رہی ہے، اور مدرسے کی تعمیر جاری ہے تعمیر مکمل ہونے کے بعد مدرسے کی عمارت میں طلبہ منتقل ہو جائیں گے تو یہ جگہ مسجد کیلئے خاص ہو جائے گی۔

اب پوچھنا یہ ہے کہ مذکورہ جگہ میں ۴۶ فٹ مدرسے کیلئے اور بقیہ حصہ کو مسجد کیلئے استعمال کرنا

درست ہے یا نہیں یا پورے حصے میں مسجد بنانا ضروری ہے؟ جبکہ بندہ نے پورے حصے میں مسجد بنانے کی نیت نہیں کی ہے بلکہ مسجد کے ساتھ ساتھ مدرسے کی بھی نیت کی تھی۔

دوسری بات یہ پوچھنی ہے کہ مسجد کیلئے مجوزہ جگہ میں نیچے پوری مسجد ہو اور اوپر والے آدھے حصے میں مدرسہ اور آدھے حصے میں مسجد ہو تو کیا یہ صورت جائز ہے یا نہیں؟

﴿جواب﴾ مسجد، مدرسہ کی نیت سے زمین خریدنے والے اہل خیر نے اور بحیثیت منتظم آپ دونوں نے اس جگہ لوگوں کیلئے اگرچہ نماز باجماعت پڑھنے کا انتظام کیا تھا، لیکن پوری جگہ کو مستقل مسجد قرار دینے کا ابھی ارادہ نہیں تھا، تو اس جگہ کو ابھی تک شرعی مسجد کا حکم شامل نہیں ہے۔

آپ لوگ اپنی صوابدید پر جتنے حصہ میں مسجد بنانا چاہتے ہیں اس میں مسجد کی تعمیر کریں اور جتنے حصہ میں مدرسہ بنانا چاہتے ہیں اس میں مدرسہ کی تعمیر کریں،

ایک بار مسجد کیلئے جو حصہ مختص ہو جائے اور آپ لوگوں کی اجازت سے نمازی لوگ اسمیں نماز باجماعت بھی پڑھ لیں تو پھر اس میں تبدیلی کی گنجائش نہیں رہتی اور نہ اسکے ایک حصہ کو مستقل مدرسہ قرار دے سکتے ہو، لہٰذا نیچے مسجد اوپر مستقل مدرسہ نہیں ہوسکتا۔

اور یہ جگہ اب تک چونکہ شرعی مسجد کے حکم میں نہیں تھی لہٰذا اعتکاف کرنے والوں کا اعتکاف صحیح نہیں ہوا، مرد حضرات کا اعتکاف بغیر مسجد کے صحیح نہیں ہوتا۔

لما في الهندية (۲/۴۵۵، طبع رشيديه)

رجل له ساحة لا بناء فيها أمر قوما ان يصلوا فيها بجماعة فهذا على ثلاثة أوجه: أحدها اما ان أمرهم بالصلاة فيها ابدا نصا بان قال: صلوا فيها ابدا، أو أمرهم بالصلاة مطلقا ونوى الأبد ففي هذين الوجهين صارت الساحة مسجدا لومات لا يورث عنه، واما ان وقت الأمر باليوم او الشهر أو السنة ففي هذا الوجه لا تصير الساحة مسجدا

ولما في فتاوى قاضيخان (۳/۱۶۵، قديمی)

وان أمرهم بالصلاة شهرا أو سنة ثم مات يكون ميراثا عنه، لأنه لابد من التابيد، والتوقيت ينافي التابيد. قال أيضا: متولي المسجد اذا جعل الموقوف على المسجد مسجدا، وصلى الناس فيه سنين ثم ترك الصلاة وأعيد منزلا مستغلا جاز، لأن المتولي وان جعله مسجدا لا يصير مسجدا.

ولما في التاتارخانية (۵/۸۴۲، قديمی)

وفي "الحاوي" وفي "المنتقى": اذا بنى الرجل مسجدا وبنى فوقه غرفة وهو (المسجد) في

يده فله ذالك، وان كان حين بناه خلى بينه وبين الناس ثم جاء بعدذالك يبني لا يترك، وفي 'جامع الفتاوى': ولو قال: عنيت ذالك لا يصدق.

ولما في الهندية: (۲۱۱/۱، رشيديه)

(تفسيره) فهو اللبث في المسجد مع نية الاعتكاف كذا في النهاية. (وأما شروطه) فمنها النية ... ومنها مسجد الجماعة فيصح في كل مسجد له أذان واقامة.

ولما في التاتارخانية: (۲۱۱/۲، قديمي)

وجوازه يختص بالمساجد، قال القدوري: ولا يصح الاعتكاف الا في مسجد الجماعات وروى عن أبي حنيفةؒ: أنه لا يصح الا في مسجد يصلى فيه الصلوات الخمس.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: سیف اللہ

۸ صفر الخیر ۱۴۳۳ھ — فتوی نمبر:

﴿مشاع زمین کا شریک سے اجازت لئے بغیر مسجد کیلئے وقف کرنا جائز نہیں﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ زید اور خالد کی مشترکہ زمین تھی جس میں زید نے خالد کی اجازت سے ایک کنال زمین اہل محلہ والوں پر مسجد کیلئے بیچ دی بعد میں زید نے اہل محلہ والوں کے مطالبہ کرنے پر خالد کی اجازت کے بغیر دو مرلہ زمین وقف کی خالد کو جب معلوم ہوا تو وہ اس کے وقف کرنے پر راضی نہ تھا تو اب پوچھنا یہ ہے کہ زید کا یہ وقف کرنا ازروئے شرع صحیح ہے یا نہیں؟

﴿جواب﴾ زید کا اہل محلہ کے مطالبہ پر خالد سے اجازت لئے بغیر مشترکہ زمین کو مسجد کیلئے وقف کرنا جائز نہیں ہے، اس لئے کہ یہ مشاع زمین ہے اور مشاع زمین کا شریک سے اجازت لئے بغیر مسجد کیلئے وقف کرنا جائز نہیں ہے لہٰذا دو مرلہ زمین کی اجازت خالد بھی دیدے تو وقف صحیح ہوگا، ورنہ نہیں۔

لما في التنوير مع الدر والرد: (۳۴۸/۴، طبع سعيد)

(ويفرز) فلا يجوز وقف مشاع يقسم خلافا للثاني، وقال الشامي تحت (قوله: ويفرز) أى بالقسمة وهذا الشرط وان كان مفرعا على اشتراط القبض لأن القسمة من تمامه الا أنه نص عليه ايضاحا، وأبو يوسف لما لم يشترط التسليم اجاز وقف المشاع والخلاف فيما يقبل القسمة أما ما لا يقبلها كالحمام والبئر والرحى فيجوز اتفاقا الا في المسجد والمقبرة لأن بقاء الشركة يمنع الخلوص لله تعالى.

ولما في الهندية: (۳۶۵/۲، طبع رشيديه)

واتفقوا على عدم جعل المشاع مسجدا أو مقبرة سواء مما لا يحتمل القسمة أو يحتملها

ولما في البحر الرائق: (۱۹۷/۵، طبع:سعيد)

والخلاف فيما يحتمل القسمة أما مالا يحتمل القسمة فهو جائز اتفاقا اعتبارا عند محمد بالهبة والصدقة المنفذة، الا في المسجد والمقبرة فانه لايتم مع الشيوع فيما لا يحتمل القسمة عند أبي يوسف لأن بقاء الشركة يمنع الخلوص لله تعالىٰ.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ　　　　واللہ أعلم بالصواب: برکت اللہ

۳۰ جمادی الثانی ۱۴۳۳ھ　　　　فتوی نمبر: ۳۲۷۶

﴿بغیر زمین کے بالائی منزل کے وقف کرنے کا حکم﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان شرع دین اس مسئلہ کے بارے میں. کہ دومنزلہ عمارت میں اوپر والی منزل کو مدرسہ کیلئے وقف کرنا صحیح ہے یانہیں؟ نیز اس وقف شدہ عمارت کے نیچے جو عمارت ہے کسی کو میراث میں مل سکتی ہے یانہیں؟ اگر مل سکتی ہے تو جس کو ملی ہے اس کو گرانے کا حق حاصل ہے یانہیں؟　　　　مستفتی: مولانا نعمت اللہ صاحب

﴿جواب﴾ اوپر والی منزل مدرسہ کیلئے وقف کرنا صحیح ہے۔ نیچے کی عمارت اگر وقف نہیں ہے تو اوپر والی وقف شدہ منزل نیچے والی منزل کیلئے وراثت میں منتقل ہونے کیلئے مانع نہیں ہے۔ نچلی منزل کے گرانے سے اوپر والی منزل کا گرنا بھی چونکہ لازمی امر ہے۔ اس لئے کسی معقول عذر کے بغیر نچلی منزل کے مالک کو گرانے کا حق حاصل نہیں ہے۔ البتہ معقول وجہ ہو تو باہمی رضامندی سے یا قاضی کے فیصلہ سے اس کو گرانے کا حق حاصل ہوگا۔

لما في التنوير مع الدر والرد: (۳۸۹/۴، ۳۹۰، طبع:سعيد كراچی)

(بنى على ارض ثم وقف البناء) قصدا (بدونها ان الارض مملوكة لايصح وقيل صح وعليه الفتوى) سئل قارئ الهداية عن وقف البناء والغراس بلا ارض؟ فاجاب: الفتوى على صحته ذلك، ورجحه شارح الوهبانية واقره المصنف معللا بانه منقول فيه تعامل فيتعين به الافتاء. قلت: لايخفى عليك ان المفتى به الذى عليه المتون جواز وقف المنقول المتعارف وحيث صار وقف البناء متعارفا كان جوازه موافقا للمنقول ولم يخالف نصوص المذهب على عدم جوازه لانها مبنية على انه لم يكن متعارفا كما دل عليه كلام الذخيرة المار۔

ولما في حاشية الطحطاوي: (۵۲۹/۲، طبع: رشيدية)

والفتوى على صحة وقف البناء والغرس دون الارض كما في فتاوى قارئ الهداية.

ولما فی تنقیح الحامدیۃ:(۱۱۰/۱،طبع:حقانیۃ؟)

وفی فتاوی شلبی وقف البناء بدون الارض صحیح والحکم به صحیح۔

ولما فی التنویر مع الدر والرد(۲۲۷/۵،۲۲۸،۲۲۹،طبع:سعید)

(ولا یمنع الشخص من تصرفه فی ملکه الااذاکان الضرر)بجاره ضرر(ابینا)فیمنع من ذلک وعلیه الفتوی بزازیه؟واختاره فی العمادیة وافتی به قارئ الهدایة،حتی یمنع الجار من فتح الطاقة ،وهذاجواب المشائخ استحسانا.

ولما فی الشامی،ومامر فی تصرفه فیمافیه حق الجار،فان السفل وان کان ملکا لصاحبه الاان لذی العلو حقافیه فلذااطلق المنع فیه ولذالوهدم ذو السفل سفله یؤمر باعادته بخلاف ماهنافک هذاماظهرلی فاغتنمه ـــ والحاصل ان القیاس فی جنس هذه المسائل ان من تصرف فی خالص ملکه لایمنع منه ولواضربغیره لکن ترک القیاس فی محل یضربغیره ضررابینا وقیل بالمنع وبه اخذکثیرمن مشائخنا وعلیه الفتوی اه :ـــ وذکر بعض المشائخ ان المختار تقیید المنع بالمضراو المشکل وماذاک الالکونه تصرفافیماللجارفیه حق وهوصاحب العلوفالاصل فیه عدم جواز التصرف الاباذنه۔

لمافی التنویر مع الرد:(۴۴۳/۵،طبع:سعید)

(یمنع صاحب سفل علیه علولآخر من ان یتد فی سفله اوینقب کوة بلارضاالآخر) وفی الشامی:(قوله ولوانهدم السفل الخ)ای بنفسه وامالوهدمه فقد قال فی الفتح ،وعلمت انه لیس لصاحب السفل هدمه فلوهدمه یجبرعلی بنائه لانه تعدی علی صاحب العلو وهو قرار العلو.

الجواب صحیح:مفتی عبدالرحمٰن عفی اللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب:عمران الحق سواتی

۲۹ جمادی الاولیٰ ۱۴۳۵ھ — فتویٰ نمبر:۴۶۶۷

﴿وقف کی زمین کا دوسری زمین کے ساتھ تبادلہ کرنے کا حکم﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ چند سال پہلے زید نے اپنی زمین مدرسہ کیلئے وقف کردی تھی جس پر ایک حد تک چاردیواری بھی ہوئی لیکن جب زلزلہ آیا تو یہ چاردیواری گرگئی جو ابھی تک اسی حالت میں ہے،اب عمرو مدرسہ کی انتظامیہ سے کہہ رہا ہے کہ آپ لوگ یہ جگہ مجھے گھر بنانے کیلئے دیدیں اور اس کے بدلے میں میں اپنی زمین میں سے اتنی جگہ دیدونگا لہذا آپ لوگ وہاں مدرسہ بنالیں گے،تو کیا وقف کی زمین کا اسطرح تبادلہ کرنا دوسری زمین کے بدلے صحیح ہوگا یا نہیں؟

مستفتی:عبدالوحید بلگرامی

﴿جواب﴾ مدرسہ کیلئے زمین وقف کرتے وقت زید اگر اسکی اجازت دیتے کہ اس زمین

کے بدلہ میں دوسری جگہ بھی مدرسہ کیلئے انتظامیہ چاہے تو لے سکتی ہے پھر تو یہ تبادلہ جائز ہوتا، لیکن زید نے ایسی اجازت اگر نہیں دی ہے تو انتظامیہ کو اس کا اختیار نہیں ہے۔

البتہ یہ جگہ مدرسہ کیلئے بالکل موزوں نہ ہو تو قاضی کی اجازت سے اس سے بہتر جگہ تبادلہ میں لی جا سکتی ہے۔

لمافی الشامی (۴/۳۸۴، طبع: سعید)

(قوله وجاز شرط الاستبدال به الخ) اعلم أن الاستبدال على ثلاثة وجوه: الأول: أن يشرطه الواقف لنفسه أو لغيره أو لنفسه وغيره، فالاستبدال فيه جائز على الصحيح وقيل اتفاقا. والثاني: أن لا يشرطه سواء شرط عدمه أو سكت لكن صار بحيث لا ينتفع به بالكلية بأن لا يحصل منه شيء أصلا، أو لا يفي بمؤنته فهو أيضا جائز على الأصح اذا كان باذن القاضي ورأيه المصلحة فيه. والثالث: أن لا يشرطه أيضا ولكن فيه نفع في الجملة وبدله خير منه ريعا ونفعا، وهذا لا يجوز استبداله على الأصح المختار.

ولما في فتح القدير (۶/۲۱۲، مكتبة رشيدية)

أجمعوا أن الواقف اذا شرط الاستبدال لنفسه يصح الشرط والوقف ويملك الاستبدال أما بلا شرط أشار في السير الى أنه لا يملكه الا باذن القاضي.

ولما في فتاوى قاضي خان (۳/۱۸۴، طبع: سعيد)

وانما تثبت ولاية الاستبدال بالشرط وبدون الشرط لا تثبت.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ　　　　واللہ اعلم بالصواب: صدیق انور

۳۰ رجب المرجب ۱۴۳۲ھ　　　　فتویٰ نمبر:

﴿وقف شدہ اشیاء کا استعمال واقف کی نیت پر موقوف ہے﴾

﴿سوال﴾ ہمارے علاقے میں لوگ مساجد کے لاؤڈ سپیکر مسجد سے باہر مدارس کیلئے چندہ جمع کرنے اور دینی جلسوں میں استعمال کرتے ہیں کیا یہ جائز ہے؟　　سائل: حافظ سمیع اللہ

﴿جواب﴾ مسجد کیلئے وقف شدہ اشیاء کا استعمال مسجد سے باہر درست نہیں ہے، البتہ اگر وقف کرنے والے نے صرف مسجد کے لئے وقف نہ کی ہو بلکہ تمام دینی امور میں استعمال ہونے کی نیت سے وقف کی ہو تو مسجد سے باہر دوسرے دینی امور میں بھی استعمال کرنے کی گنجائش ہے۔

لما في الهندية: (۲/۴۵۹، طبع رشيديه)

ولو وقف على دهن السراج للمسجد لا يجوز وضعه جميع الليل بل بقدر حاجة المصلين

ويجوز الىٰ ثلث الليل أو نصفه اذا احتيج اليه للصلاة فيه.

ولما في البحر الرائق:(۵/۲۵۰،طبع ایچ ایم سعید)

وليس لمتولي المسجد ان يحمل سراج المسجد الىٰ بيته ولا بأس بأن يترك سراج المسجد فيه من المغرب الىٰ وقت العشاء، ولا يجوز ان يترك فيه كل الليل الا في موضع جرت العادة فيه بذالك كمسجد بيت المقدس ومسجد النبي والمسجد الحرام اوشرط الواقف تركه فيه كل الليل كما جرت العادة في زماننا.

ولما في خلاصة الفتاوى:(۱/۲۲۹،طبع رشیدیه)

ولا يحمل الرجل سراج المسجد الىٰ بيته ويحمل من بيته الى المسجد.

الجواب صحیح:عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ　　　　واللہ اعلم بالصواب:اسلام بادشاہ ہمیتی

۵ جمادی الثانی ۱۴۳۰ھ　　　　فتوی نمبر:۲۱۱۰

﴿مدرسہ کی ضرورت سے زائد رقم کسی کو بطور قرض دینا﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ مہتمم مدرسہ مدرسے کے چندہ کی رقم کسی شخص کو بطور قرض دے سکتا ہے یا نہیں؟ نیز کیا وہ از خود بطور قرض لے سکتا ہے یا نہیں؟ اگر اپنی تنخواہ ایڈوانس لے لے تو اس کی گنجائش ہے یا نہیں؟

﴿جواب﴾ مدرسہ کے چندہ کی رقم کو بطور قرض کسی شخص کو دینا چند شرائط کے ساتھ جائز ہے، ان شرائط کا لحاظ کئے بغیر کسی کو مدرسہ کے چندہ کی رقم بطور قرض دینا ناجائز ہے، نیز مہتمم مدرسہ خود بھی بطور قرض چندہ کی رقم لے سکتا ہے۔

اور اگر اپنی تنخواہ ایڈوانس لے لے تو اسکی بھی گنجائش ہے کیونکہ یہ بھی قرض کی صورت ہے مگر مہتمم مدرسہ کے لیے بھی ان شرائط کی رعایت ضروری ہے، بہتر تو یہ ہے کہ اس کے لیے علیحدہ فنڈ ہو جس سے قرض مانگنے والے کو قرض دیا جائے اور چندہ دینے والے لوگ اسی غرض سے اس مد میں چندہ دیا کریں۔

شرائط:(۱) جو رقم بطور قرض دی جارہی ہے وہ واقعی فی الحال مدرسہ کی ضروریات سے زائد ہو اور اگر مدرسہ کو اس کی ضرورت ہو تو پھر کسی کو قرض دینا جائز نہیں ہے اور نہ ہی خود مہتمم صاحب بطور قرض لے سکتے ہیں۔

(۲) قرض کے ڈوبنے کا خطرہ نہ ہو بلکہ وصول ہونے کی قوی امید ہو بلکہ یقین ہو۔

(۳) جس کو قرض دیا جارہا ہے اس سے معتبر ضامن لیا جائے کہ مقررہ تاریخ پر اگر آپ نے ادا نہ کیا تو ضامن یہ رقم ادا کرے گا۔

(۴) قرض کو کسی استاد کی تنخواہ کے ساتھ منسلک کیا جائے بایں طور کہ فلاں استاد کی چار ماہ کی تنخواہ آپکو بطور قرض دی جارہی ہے۔

(۵) مدرسہ کی منتظمہ کمیٹی کی اجازت بھی ہو تو پھر کسی کو قرض دیا جاسکتا ہے ورنہ نہیں۔

(٦) جس کو قرض دیا جائے اس کے پاس رقم کی حفاظت کا انتظام زیادہ ہو اگر مدرسہ میں رقم کی حفاظت کا انتظام زیادہ ہو تو پھر آسانی سے وہ رقم کسی کو نہ دی جائے اس لئے کہ ایسی رقم کو بطور قرض دینے کی اصل وجہ اس کی حفاظت ہے نہ کہ اس سے کاروبار وغیرہ۔

لما فی جامع الفصولین: (۱۴/۲ مطبع اسلامی کتب خانہ)

لیس للمتولی ایداع مال الوقف والمسجد الامن فی عیاله ولا اقراضه فلو اقرض ضمن وكذا المستقرض وذكر ان القيم لو اقرض مال المسجد لياخذه عند الحاجة وهو احرز من امساكه فلا باس به (عده) يسع المتولى اقراض مافضل من غلة الوقف لو احرز.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: ولی اللہ ڈیروی

۲۵ ربیع الاول ۱۴۲۸ھ — فتوی نمبر: ۶۹۸

﴿وقف کا مسئلہ﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک شخص نے مدرسے کو کمپیوٹر وقف کیا جبکہ مدرسے کو کمپیوٹر کی ضرورت نہ تھی کچھ عرصہ کمپیوٹر مدرسے میں بے کار پڑا رہا، اب وہ شخص متولی کی اجازت سے کمپیوٹر واپس گھر اٹھالایا اور کہا کہ جب مدرسہ کو ضرورت ہوئی تو دوبارہ دے دوں گا، اس شخص کا مدرسے کے کمپیوٹر کو ذاتی طور پر استعمال کرنا کیسا ہے؟

﴿جواب﴾ وقف کرنے کے بعد اس چیز کو واپس لینا خواہ متولی کی اجازت سے ہو جائز نہیں ہے، مدرسہ کو کمپیوٹر کی ضرورت نہیں تو اسکو بیچ کر رقم کی ضرورت تو ہوگی، البتہ مشروط طور پر دیا ہو کہ مدرسہ کو ضرورت ہوئی تو مدرسے کیلئے وقف ہے نہیں ہوئی تو واپس لے لوں گا تو ایسی صورت میں چونکہ وقف صحیح نہیں ہوا اسلئے واپس لینا جائز ہے۔

لما فی التنویر مع الرد:(۴/۳۵۲،مطلب فی شرط واقف الکتب ان لاتعار الابرهن،طبع سعید)

فاذاتم ولزم لایملک ولایملک ولایعار،ولایرهن.

وفی الشامیة:(قوله لایملک)ای لایکون مملوکاللصاحبه ولایملک ای لایقبل التملیک لغیره بالبیع ونحوه لاستحالةتملیک الخارج عن ملکه،ولایعار،ولایرهن لاقتضائهماالملک درر.

ولما فی التاتارخانیة:(۵/۸۸۲،المسائل التی تعود الی قیم المسجد،طبع قدیمی)

الفاضل من وقف المسجدهل یصرف الی الفقرا؟قیل لایصرف وانه صحیح ولکنه یشتری به مستغلاللمسجد.

ولما فی المحیط:(۹/۱۳۱،فی المسائل التی تعود الی بانی المسجد،طبع ادارة القرآن)

فی فتاوی ابی اللیث:سئل الفقیه ابوبکرعن حشیش المسجد یخرج عن المسجدأیام الربیع—قال فی فتاوی اهل سمرقندحشیش المسجداذاکان له قیمة فلابأس لاهل المسجدان یبیعوا،وان رفعواالی الحاکم فهو احب الی.

ولما فی التنویر مع الدر:(۴/۳۴۰-۳۴۱،مطلب قدیثبت الوقف بالضرورة،طبع سعید)

(وشرطه شرط سائرالتبرعات)کحریةوتکلیف(وان یکون)قربةفی ذاته معلوما (منجزا)لامعلقاالابکائن.

وفی الشامیة:(قوله لامعلقا)کقوله:اذاجاء غداواذاجاء رأس الشهراواذاکلمت فلانااوارضی هذه صدقةموقوفة،وان شئت اواحببت یکون الوقف باطلا،لان الوقف لایحتمل التعلیق بالخطر.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفااللہ عنہ | واللہ اعلم بالصواب: تاجدمحمود کھوٹہ

۶ ربیع الاول ۱۴۳۲ھ | فتویٰ نمبر:۲۹۷۳

﴿مدرسہ کی ضرورت سے زائد رقم تجارت میں لگانے کا حکم﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام کہ ایک مہتمم مدرسہ مدرسے کی رقم بینک میں رکھواتا ہے اور ظاہر بات ہے کہ بینک میں سودی کاروبار ہوتا ہے تو وہ مدرسہ کی وقتی ضروریات سے زائد رقم اگر تجارت میں لگادے تو اس سے جو نفع حاصل ہو تو وہ خود استعمال کرسکتا ہے یا نہیں؟ بینوا توجروا۔

﴿جواب﴾ مدرسہ کے لیے منافع حاصل کرنے کی غرض سے مدرسہ کی رقم جو کہ فی الحال ضرورت سے واقعی زائد ہو تجارت میں لگانا زیادہ بہتر ہے بنسبت بینک میں رکھنے کے لیکن مندرجہ ذیل شرائط کے ساتھ:

(۱) تجارت میں لگانے والی رقم کی مدرسہ کو واقعی فی الحال ضرورت نہ ہو۔ (۲) جس شخص کو تجارت کے لئے رقم دی جائے اسکا متقی پرہیزگار ہونا، فاسق وفاجر کو تجارت کے لئے یہ رقم دینا جائز نہیں (۳) تجارت سے نفع کی قوی امید ہو اگر تجارت سے نقصان کا اندیشہ ہو تو پھر یہ رقم دینا جائز نہیں (۴) مدز کوۃ سے تجارت کے لئے رقم زیادہ مدت کے لیے نہ دی جائے۔

(۵) رقم منتظمہ کمیٹی کی صریح اجازت سے تجارت کے لئے دی جائے اگر منتظمہ کمیٹی کی اجازت نہیں تو پھر دینا جائز نہیں۔

(۶) تجارت کا نفع مدرسہ کی ضروریات پر خرچ کیا جائے کیونکہ یہ نفع مدرسہ کے مال سے حاصل ہوا ہے، مہتمم خود اس نفع کو استعمال نہیں کرسکتا۔

(۷) نقصان کی صورت میں لگانے والے کو اپنی جیب سے نقصان بھرنا ہوگا۔ (ماخوذ از تبویب دارالعلوم کراچی)

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: ولی اللہ ڈیروی

۲۵ ربیع الاول ۱۴۲۸ھ — فتوی نمبر: ۴۹۹

﴿مدرسہ کے کھانے سے مہمان نوازی کرنا﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ مدرسہ کے کھانے سے مہمانوں کو کھلایا جاسکتا ہے یا نہیں؟ اور اس میں مدرسہ، مہتمم مدرسہ، اساتذہ کرام اور طلباء کے مہمانوں میں کوئی فرق ہے یا سب کا ایک حکم ہے؟ نیز اگر مہتمم مدرسہ کبھی کبھار معاونین مدرسہ کی مدرسہ کے خرچہ سے دعوت وغیرہ کرے تو اسکا کیا حکم ہے؟ مستفتی: عبدالسبحان صاحب

﴿جواب﴾ مہتمم مدرسہ چندہ دینے والوں کا وکیل ہوتا ہے اور وکیل کو مدرسہ کے مفاد کے لئے چندہ خرچ کرنے کی اجازت ہوتی ہے، کبھی کبھار آنے والے طلباء یا مدرسہ کے مہمانوں کو کھلانا مدرسہ کے مفاد میں ہے اور یہاں کے مدارس میں عرف بھی یہی ہے تو گویا چندہ دینے والوں کی طرف سے دلالۃ اسکی اجازت ہے۔

البتہ مہتمم مدرسہ اور اساتذہ کرام اپنے ذاتی مہمانوں کو اپنے خرچہ سے کھلائیں اور صاحب استطاعت طلباء کرام کے لئے بھی یہی حکم ہے، زیادہ احتیاط تو اس میں ہے کہ اس قسم کے

اخراجات کے لئے ایک مستقل مد ہو اور چندہ دینے والوں کے علم میں ہو، اسی مد سے اس قسم کے اخراجات کیے جائیں۔

لمافی العالمگیریۃ:(۵۱۰/۲،طبع رشیدیہ)

اما معناها شرعا فهو اقامة الانسان غيره مقام نفسه في تصرف معلوم حتى ان التصرف ان لم يكن معلوما يثبت به ادنى تصرفات الوكيل وهو الحفظ.

ولمافی التنویر مع الدر:(۵۱۰/۵،طبع سعید)

(وهو اقامة الغير مقام نفسه)ترفها او عجزا(في تصرف جائز معلوم،فلو جهل ثبت الادنى وهو الحفظ ممن يملكه)اي التصرف نظرا الى اصل التصرف.

ولمافی در المختار:(۵۲۱/۵،طبع سعید)

الوكيل اذا خالف،ان خلافا الى خير في الجنس كبيع بالف درهم فباعه بالف ومائة نفذ ولو بمائة دينار لا،ولو خيرا خلاصة ودرر.

ولمافی الشامی:(۳۶۲/۴،طبع ایچ ایم سعید)

وفي شرح البيري عن المبسوط ان الثابت بالعرف كالثابت بالنص اهـ فالظاهر اعتبار العرف في الموضع او زمان الذي اشتهر فيه دون غيره.

الجواب صحیح:عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ واللہ اعلم بالصواب:محمد ولی اللہ

۱۸ جمادی الاولیٰ ۱۴۲۸ھ فتویٰ نمبر:۹۰۶

﴿ایک مسجد کی رقم دوسری مسجد کی تعمیر میں لگانا جائز نہیں ہے﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ دبئی کے ایک شیخ نے ہمارے محلے کی جامع مسجد کی تعمیر کیلئے بیس لاکھ روپے بطور وقف دیئے ہیں، لیکن ہمارے علاقے کے کچھ لوگ ان پیسوں کو دوسری مسجد میں جو ان کے گھروں کے قریب تعمیر ہو رہی ہے لگانا چاہتے ہیں جبکہ جامع مسجد کی پرانی تعمیر کافی کمزور ہو چکی ہے نئی تعمیر کی شدید ضرورت ہے۔ اب پوچھنا یہ ہے کہ کیا ان کیلئے اس طرح کرنا جائز ہے یا نہیں؟ برائے کرم وضاحت فرمائیں۔

﴿جواب﴾ شیخ نے جس مسجد کی تعمیر کیلئے پیسے دیئے ہیں ان پیسوں کو اسی مسجد کی تعمیر میں خرچ کرنا ضروری ہے دوسری مسجد کی تعمیر میں ان پیسوں کو خرچ کرنا جائز نہیں ہے اور جو لوگ چاہتے ہیں کہ ان پیسوں کو دوسری مسجد کی تعمیر میں خرچ کیا جائے ان کا اس طرح

سوچنا قطعاً غلط ہے اور اگر خرچ کئے ہیں تو پوری رقم واپس کرنا انکے ذمہ ہے اور امانت میں خیانت کی وجہ سے بڑا گناہ بھی کیا ہے۔

لما فی الشامی (۳۵۹/۴،سعید)

(قوله تفریع علی قولهما) ای قوله فیصرف الخ مفرع علی قول الامام وابی یوسف ان المسجد اذا خرب یبقی مسجداابدالکن علمت ان المفتی به قول ابی یوسف انه لایجوزنقله ونقل ماله الی مسجدآخر کمامر عن الحاوی،

(ولما فی الهندیة (۴۷۸/۲،رشیدیة)

سئل شمس الائمة الحلوانی عن مسجداوحوض.....استغنی الحوض عن العمارة وهناك مسجد محتاج الی العمارة او علی العکس هل یجوزللقاضی صرف وقف مااستغنی عن العمارة الی عمارة ماهومحتاج الی العمارة قال لا.

وکذافی التتارخانیة (۵۹۵/۵،قدیمی)

الجواب صحیح: مفتی عبدالرحمن عفااللہ عنہ واللہ اعلم بالصواب: دوست محمد روغانی

۱۴ جمادی الاولی ۱۴۳۵ھ فتوی نمبر ۴۱۳۶

﴿ایسا مدرسہ جو ختم ہو گیا ہو اس کے سامان وغیرہ کا حکم﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں مفتیان کرام کہ میرے پاس ایک خالی پلاٹ تھا میں نے اس کی چاردیواری اپنے خرچے سے بنوائی پھر اس جگہ کو مدرسہ بنانے کا ارادہ ہوا تو مدرسہ کیلئے چندہ کی رقم سے چھت ڈلوائی اور رنگ کروایا اور مدرسے کی ضرورت کیلئے کچھ سامان مثلاً: پائپ چادر وغیرہ خریدیں، کچھ عرصہ وہاں مدرسہ چلتا رہا لیکن اب مدرسہ ختم ہو گیا ہے اور جو سامان مدرسے کا بچ گیا ہے اگر اسے فروخت کیا جائے تو کوئی خاطر خواہ رقم نہیں ملے گی۔

ایسی صورت میں اگر وہ کمرہ اور اس کا سامان کرائے پر استعمال کیلئے دے دوں اور کرائے کی رقم کسی مدرسے میں جمع کرادوں تو کیا میں عہدہ برآ ہو جاؤں گا یا نہیں؟ بینوا توجروا۔

﴿جواب﴾ مدرسہ کے دوبارہ آباد ہونے اور سلسلہ درس وتدریس کا انتظام اگر معقول طریقے سے ہوسکتا ہے تو اسی مدرسہ کو بطریقۂ احسن آباد کیا جائے لیکن اگر اس مدرسے کے آباد ہونے کی بظاہر کوئی صورت نہ ہو اور مدرسہ کا سامان ضائع ہونے کا اندیشہ ہو تو یہ سامان اور کمرہ وغیرہ کو کرایہ پر دیکر اس سے حاصل شدہ کرایہ کسی ایسے قریبی مدرسے میں دینا جائز ہے، جس میں

چندہ وغیرہ صحیح مصارف میں صرف ہوتا ہو تو امید ہے کہ آپ عہدہ برآ ہو جائینگے۔

لما فی التنویر مع الدر:(۴/۳۵۱،طبع سعید)

(ومثله)۔۔۔(حشیش المسجد وحصره مع الاستغناء عنهما و) کذا (الرباط والبئر اذا لم ینتفع بهما فیصرف وقف المسجد والرباط والبئر) والحوض (الی اقرب مسجد او رباط او بئر) أو حوض (الیه)

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفااللہ عنہ

واللہ اعلم بالصواب: محمد ضیاءالدین

۲۳ جمادی الاولیٰ ۱۴۲۸ھ

فتویٰ نمبر:۹۰۵

﴿ایک مسجد کے قرآن پاک دوسری مسجد میں لے جانے کا حکم﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ بعض مساجد میں قرآن پاک اتنے کثرت سے دیئے جاتے ہیں جو مسجد کی ضرورت سے زائد ہوتے ہیں اور پڑھنے کیلئے استعمال بھی نہیں ہوتے اور ان کے ضائع ہونے کا اندیشہ بھی ہوتا ہے، کیا ایسی صورت میں یہ قرآن کسی دوسری مسجد یا مدرسہ میں جہاں ان کی ضرورت ہو دیے جاسکتے ہیں یا نہیں؟

﴿جواب﴾ آج کل مساجد میں واقعی قرآن پاک بہت کثرت سے رکھے جاتے ہیں جو مسجد کی ضرورت سے بھی زائد ہوتے ہیں، لوگ یہ قرآن ثواب کی غرض سے مسجد میں دیتے ہیں جبکہ ان کا یہ مقصد پورا نہیں ہوتا، اس لئے کہ سالہا سال یہ قرآن پاک اسی طرح پڑے رہتے ہیں اور کسی کے پڑھنے میں استعمال نہیں ہوتے، چنانچہ مفتی بہ قول کے مطابق اگرچہ قرآن پاک ایک مسجد سے دوسری مسجد میں منتقل نہیں کر سکتے، جیسا کہ علامہ شامیؒ نے صراحت کی ہے لیکن عصر حاضر کے بعض علماء کرام نے ضرورت کی وجہ سے الدرالمختار کے قول پر فتویٰ دیا ہے کہ ان حالات میں ان مساجد سے دوسری مساجد میں قرآن پاک کی منتقلی میں کوئی حرج اور مضائقہ نہیں اور ہماری رائے بھی یہی ہے کہ جن مساجد میں قرآن پاک اس کثرت سے رکھے ہوں کہ ان کی تلاوت کی نوبت بھی نہیں آتی تو اس طرح کے قرآن پاک جن مساجد میں ان کی ضرورت ہو منتقل کرنے کی گنجائش معلوم ہو رہی ہے۔

لما فی الدرالمختار:(۴/۳۶۵،طبع ایچ ایم سعید)

وان وقف علی المسجد جاز و یقرأ فیه ولا یکون محصورا علی هذا المسجد وبه عرف

حکم نقل کتب الاوقاف من محالها للانتفاع بها.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: محمد حسین

۷ ربیع الثانی ۱۴۲۸ھ — فتویٰ نمبر: ۷۴۰

﴿کسی کی مملوکہ یا وقف کردہ زمین کو مسجد میں شامل کرنے کا حکم﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں مسجد کے قریب چند بوسیدہ قبریں ہیں، اہل محلہ ان قبروں کو ہموار کر کے مسجد کے صحن میں شامل کرنا چاہتے ہیں، کیا شرعاً کسی کی مملوکہ یا قبرستان کیلئے وقف کردہ زمین کو مسجد میں شامل کرنا اور قبروں کو ہموار کرنا جائز ہے؟ اس میں قبروں کی توہین تو نہیں ہوگی؟ مستفتی: حبیب الرحمٰن شورکوٹی

﴿جواب﴾ بوسیدہ قبریں اگر کسی کی مملوکہ زمین میں ہوں اور اتنا طویل زمانہ ان پر گذرا ہو جس میں اہل قبور کے مٹی ہو جانے کا یقین ہو تو پھر مالک کی اجازت سے زمین کو مسجد میں شامل کرنا جائز ہے، اس سے قبروں کی کوئی توہین نہیں ہوتی۔

اور اگر قبریں وقف کی زمین پر بنائی گئی ہوں تو پھر اہل قبور کے مٹی ہو جانے کیساتھ ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ آبادی کے لوگوں نے اس جگہ پر مردوں کا دفن کرنا چھوڑ دیا ہو، نیز مسجد میں توسیع کرنے کی اشد ضرورت ہو تو پھر قبروں کو ہموار کر کے مسجد میں شامل کرنا شرعاً جائز ہوگا، اس صورت میں قبروں کی توہین نہیں ہوگی اور اس مسجد میں نماز پڑھنے سے ثواب پر کوئی اثر نہیں پڑے گا۔

لمافی الشامی: (۲/۲۴۵، طبع ایچ ایم سعید)

قلت: وتقدم انه اذا بلی المیت وصار ترابا یجوز زرعه والبناء علیه.

ولمافی عمدة القاری: (۴/۲۶۵، طبع رشیدیه)

فان قلتَ هل یجوز ان تبنی علی قبور المسلمین قلت: قال ابن القاسم لو ان مقبرة من مقابر المسلمین علت فبنی قوم علیها مسجدا لم ار بذلک بأسا۔۔۔لان المسجد ایضا وقف من اوقاف المسلمین.اهـ.

ولمافی الشامی: (۴/۳۷۹، طبع ایچ ایم سعید)

(قوله وتوخذ ارض)......لکن جواز أخذ المملوکة کرها یفید الجواز بالاولی لان المسجد لله تعالی والوقف کذلک اهـ.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: رشید عالم مروت

۵ جمادی الثانی ۱۴۲۸ھ — فتویٰ نمبر: ۹۵۲

﴿جو جگہ مسجد کی نیت سے خریدی ہو لیکن وقف تام نہ کیا ہو بیچ سکتا ہے؟﴾

﴿سوال﴾ کسی شخص نے زمین خریدی اس ارادے سے کہ اس جگہ مسجد بناؤں گا یا اس کو فروخت کر کے دوسری جگہ مسجد بناؤں گا، اب کچھ لوگوں نے رکاوٹیں ڈالنا شروع کر دیں اور یہ بھی اندیشہ ہے کہ اگر وہاں مسجد بن جائے تو بدعتی حضرات اس پر قبضہ کرلیں گے، مسجد صحیح لوگوں کے ہاتھ سے نکل جائی گی، اب وہیں مسجد بنانی چاہیے یا اس جگہ کو فروخت کر کے کسی اور جگہ مسجد تعمیر کر سکتے ہیں؟ بینوا توجروا۔ مستفتی: فیصل صاحب ابوبکر صدیق مسجد

﴿جواب﴾ صرف ارادہ کرنے سے وہ جگہ شرعی مسجد کا حکم نہیں رکھتی بلکہ مسجد کیلئے باقاعدہ وقف کرے اور اس کے علاوہ وہاں پر متولی کی اجازت سے اذان واقامت کیساتھ نماز باجماعت پڑھی جائے تو وہ مسجد شرعی کے حکم میں ہوگی چونکہ یہاں پر متولی کی اجازت سے نماز باجماعت نہیں پڑھی گئی اور نہ ہی وقف تام ہوا ہے، اس کی جگہ دوسری مقام پر مسجد بنانا جائز ہے اور اس جگہ کو اپنے ذاتی استعمال میں لے سکتا ہے۔

لمافی الهداية:(۲۲۱/۲ طبع رحمانيه)

واذابنى مسجدالم يزل ملكه عنه حتى يفرزه عن ملكه بطريقه ويأذن للناس بالصلاة فيه فاذاصلى فيه واحد زال عندابى حنيفةؒ عن ملكه وقال ابويوسفؒ يزول ملكه بقوله جعلته مسجدا

ولمافى البحر الرائق:(۲۴۸/۵ طبع ايچ ايم سعيد)

من بنى مسجدالم يزل ملكه عنه حتى يفرزه عن ملكه بطريقه ويأذن بالصلاة فيه واذاصلى فيه واحد زال ملكه.

ولمافى فتح القدير:(۲۱۷/۶ طبع رشيديه)

ولهذا يشترط كونها باذان واقامة عندهما ولوجعل له واحد مؤذنا واماما فاذن واقام وصلى وحده صار مسجدا بالاتفاق لأن اداء الصلاة على هذا الوجه كالجماعة. ومثله فى الشامية (۳۵۷/۴، طبع ايچ ايم سعيد)

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ　　　　واللہ اعلم بالصواب: عبدالستار

۱۴۲۸ھ　　　　فتویٰ نمبر: ۹۴۴

﴿وقف کی زمین میں تصرف کرنے کا حکم﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے متعلق کہ اگر مسجد یا مدرسے کے لئے کوئی زمین وقف کی گئی ہو تو اس کا تبادلہ دوسری زمین سے کر کے اس میں مسجد یا مدرسہ بنانا جائز ہے یا

نہیں؟ نیز اگر کوئی شخص زمین وقف کرنے کے بعد واپس لینا چاہے تو شرعاً لے سکتا ہے یا نہیں؟

﴿جواب﴾ (۱) مذکورہ صورت میں اگر دوسری زمین وقف کی زمین سے زیادہ کارآمد ہو یا اس میں وقف کا زیادہ فائدہ ہو تو تبادلہ کی گنجائش ہے۔ (۲) جب کوئی شخص کسی چیز کو وقف کرتے وقت یوں کہے کہ میں نے اس چیز کو وقف کیا ہے یا اس جیسے دوسرے الفاظ استعمال کرے تو وقف تام ہو جاتا ہے، اب یہ چیز اس کی ملکیت سے نکل جاتی ہے اور واقف اس میں کسی قسم کا تصرف نہیں کرسکتا، لہٰذا وقف کرنے کے بعد اسے رجوع کا حق بھی حاصل نہ ہوگا۔

لمافی الشامی: (۵۸۶/۶، طبع امدادیہ)

وفی القنية مبادلة دارالوقف بدار اخرى انما يجوز اذا كانتا فی محلة واحدة اومحلة الاخرى خيراً وبالعكس لايجوز.

ولمافی الدرالمختار: (۵۳۹/۶، طبع امدادیہ)

فاذاتم ولزم لايملك ولايعار ولايرهن وقال الشامی: لايملك ای لايكون مملوكا لصاحبه ولايملك ای لايقبل التمليك لغيره بالبيع ونحوه لاستحالةتمليك للخارج عن ملكه.

ولمافی الفقه الاسلامی: (۷۶۰۴/۸، طبع رشیدیہ)

ورأى ابويوسف ان الوقف اسقاط ملك كالطلاق والاعتاق فانه اسقاط للملك عن الزوجة والعبد، فيتم بمجردالتلفظ ولايشترط فيه التسليم، ويصح وقف المشاع القابل للقسمة من غيرافراز وهذاهوالمفتى به عندالحنفية لانه احوط واسهل.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ　　　واللہ اعلم بالصواب: عبدالحکیم کشمیری

۱۳ جمادی الثانی ۱۴۲۹ھ　　　فتویٰ نمبر: ۱۵۴۰

﴿وقف عیدگاہ صرف اتصال صفوف کے حکم میں مسجد کی طرح ہے﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اور مفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ہمارے گاؤں میں وقف عیدگاہ ہے، اس کو صرف عیدین اور کسی دینی تقریب کے لئے استعمال کیا جاتا ہے، اسکے متصل سڑک بھی ہے لیکن کبھی کبھار راہ گزر بھی اس سے گزرتے ہیں اور بسا اوقات بچے وہاں کھیلتے بھی ہیں، پوچھنا یہ ہے کہ عیدگاہ کو دوسرے امور کے لئے استعمال کرنا جائز ہے؟

﴿جواب﴾ صرف اتصال صفوف کے حکم میں عیدگاہ مسجد کیطرح ہے یعنی جسطرح مسجد میں اتصال صفوف کے بغیر بھی کراہت کے ساتھ نماز ہو جاتی ہے، اسی طرح عیدگاہ میں بھی بغیر

اتصال کے نماز ہو جاتی ہے، باقی احکام میں مسجد کی طرح نہیں ہے، تاہم اسکی حفاظت اور احترام ضروری ہے، اسلئے مستقل گذرگاہ بنانے یا کھیل کے طور پر استعمال کی اجازت نہیں ہے۔

نیز مذکورہ امور اسلئے بھی درست نہیں، کہ واقف نے اس زمین کو اس قسم کے کاموں کے لئے وقف نہیں کیا ہے جبکہ وقف کرنے والے کی نیت کا لحاظ رکھنا شرعاً ضروری ہوتا ہے، لہذا عیدگاہ کو عیدین کی نماز یا دیگر دینی تقریبات کے لئے استعمال کیا جا سکتا ہے، جیسا کہ سوال میں مذکور ہے، اس کے علاوہ امور کے لئے استعمال کرنا منع ہے۔

لمافی التنویر مع الدر:(۱/۶۵۷،طبع ایچ ایم سعید)

(واما المتخذ لصلاة الجنازة أو عيد)فهو(مسجدفي حق جوازالاقتداء)وان انفصل الصفوف رفقابالناس(لافي غيره)به يفتي نهاية(فحل دخوله لجنب وحائض)كفناء مسجد.

وفي الشامية:والمختارللفتوى انه مسجدفي حق جوازالاقتداء الخ لكن قال في البحر ظاهره انه يجوزالوطء والبول والتخلي فيه ولايخفى مافيه فان الباني لم يعده لذلك فينبغي ان لايجوزوان حكمنابكونه غيرمسجدوانماتظهرفائدته في حق بقية الاحكام وحل دخوله للجنب والحائض.

ولمافي البحرالرائق:(۵/ ۲۴۸،طبع سعید)

وفي الخانية:مسجداتخذ لصلاة الجنازة اولصلاة العيدهل يكون له حكم المسجد......

ومااتخذ لصلاة العيدلايكون مسجداًمطلقاوانمايعطى له حكم المسجدفي صحة الاقتداء بالامام وان كان منفصلا عن الصفوف وامافيماسوى ذلك فليس له حكم المسجد وقال بعضهم له حكم المسجدحال اداء الصلاة لاغيروهووالجبانة سواء ويجنب هذا المكان كمايجنب المسجداحتياطا.

ولمافي الدرالمختار:(۴/۴۳۳،طبع سعید)

قولهم شرط الواقف كنص الشارع اى في المفهوم والدلالة ووجوب العمل به.

الجواب صحیح:عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ　　　　واللہ اعلم:محمد اسلم چترالی

۱۵جمادی الاولی ۱۴۲۹ھ　　　　فتوی نمبر:۱۴۸۰

﴿وقف دکان کو مارکیٹ ویلیو سے کم کرایہ پر دینا جائز نہیں﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ہماری مسجد کی دکان کا کرایہ چار ہزار روپے ہے لیکن محلّہ کا ایک بااثر شخص تین ہزار روپے پر لینا چاہتا ہے، سوال یہ ہے

کہ اس شخص کو تین ہزار روپے پر دینا جائز ہے یا نہیں؟ مستفتی: محمد شعیب

﴿جواب﴾ مسجد کی دکان مال وقف ہے اور مال وقف کو مارکیٹ ویلیو سے کم کرایہ پر دینا جائز نہیں ہے، لہٰذا مذکورہ شخص اگر چار ہزار پر راضی ہو تو ٹھیک ہے ورنہ کسی اور شخص کو جو چار ہزار روپے ادا کرے دکان کرایہ پر دینی چاہیے۔

لمافی التنویر مع الدر:(۴۰۲/۲ طبع ایچ ایم سعید)(ویوجر)بأجر(المثل)ف(لا)یجوز(بالاقل)

ولمافی خلاصۃ الفتاوی:(۱۱۲/۴ طبع رشیدیہ)

المتولی اذا رعن الوقف لایصح ولو أجر یصح ان کان بأجر المثل.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: عبدالرزاق عفا اللہ عنہ

۵ رجب المرجب ۱۴۲۹ھ — فتوی نمبر: ۱۶۷۶

﴿مشروط وقف کیا ہو تو وقف صحیح نہیں ہے﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام کہ زید نے عمرو کو دس لاکھ روپے دیکر وکیل بنایا کہ اس سے کوئی زمین خرید کر آباد کرو جب اسکی آمدنی شروع ہو جائے سب سے پہلے آمدنی سے میرے دس لاکھ روپے مجھے واپس کر دینا اسکے بعد اسکی آمدنی مدرسے پر خرچ کرتے رہنا، اسکے بعد عمرو نے اپنے طور پر اس لئے قرض لیا کہ زمین کی آمدنی سے سب سے پہلے اپنا قرض اتارونگا، زمین آباد کرنا شروع کر دی، پوچھنا یہ ہے کہ مذکورہ زمین وقف کے حکم میں ہے یا نہیں؟ جبکہ زید عمرو دونوں نے مذکورہ زمین کے منافع کو مدرسے کیلئے مشروط وقف کر دیا۔ مستفتی: نصیر صاحب

﴿جواب﴾ مذکورہ صورت میں زمین وقف کے حکم میں نہیں ہے کیونکہ زید اور عمرو دونوں نے زمین کے منافع کو زمین کی لاگت کی وصول یابی کے ساتھ مشروط کیا ہے جبکہ وقف میں تنجیز (غیر مشروط) ضروری ہے۔

لمافی الشامی:(۵۲۲/۶)(وأن یکون)قربۃ فی ذاتہ معلوما(منجزا)لامعلقاالا بکائن ولامضافا.

ولمافی الھندیۃ:(۳۵۵/۲)(ومنھا)أن یکون منجزا غیر معلق فلوقال ان قدم ولدی...... لاتصیر وقفا.

ولمافی البحر:(۱۸۸/۵)وشرائطہ ......أن یکون منجزا غیر معلق فانہ ممالایصلح تعلیقہ بالشرط

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: محمد احمد عفا اللہ عنہ

۲۶ رجب المرجب ۱۴۲۹ھ — فتوی نمبر: ۱۶۹۹

﴿مسئلہ وقف﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام کہ ہم نے دینی سرگرمیاں شروع کرنے کے لئے بارہ (۱۲) لاکھ روپے چندہ جمع کر کے ایک عمارت خریدی، عمارت کی قیمت چونکہ بیس (۲۰) لاکھ روپے تھی اور چندہ بارہ (۱۲) لاکھ روپے ہوا تھا، اسلئے ایک آدمی نے آٹھ (۸) لاکھ روپے دیئے، ہم نے وہ عمارت خرید لی اور وہ آدمی آٹھ (۸) لاکھ روپے کے حساب سے عمارت کے ایک حصہ کا مالک بن گیا اور وہ حصہ ہم کو کرایہ پر دے دیا، ہم نے اس عمارت کو وقف کر دیا اور اس میں دینی و دنیاوی علوم کے امتزاج پر مبنی ایک ادارہ ''اقراء'' کھول لیا جس کی آمدنی سے اس آدمی کا کرایہ بھی ادا کیا جاتا ہے، آپ حضرات سے تین باتوں کے جوابات مطلوب ہیں:

(۱) جس آدمی کا عمارت میں آٹھ لاکھ روپے کے بقدر حصہ ہے اس شخص کو وقف یعنی ''اقرء'' کی آمدنی سے کرایہ ادا کیا جا سکتا ہے؟ (۲) چونکہ اس عمارت میں بارہ (۱۲) لاکھ کے بقدر حصہ وقف اور آٹھ (۸) لاکھ کے بقدر حصہ ملکیت ہے تو درس و تدریس کا کام صرف ''وقف شدہ'' حصہ میں کیا جائے یا پوری عمارت میں کہیں بھی کیا جا سکتا ہے؟ (۳) اگر وقف کی زمین کم پڑ رہی ہو تو ضرورت کے لیے متصل جگہ کرایہ پر لینا کیسا ہے؟ جبکہ کرایہ وقف کی آمدنی سے ادا کیا جا رہا ہو۔

﴿جواب﴾ (۱) وقف کی آمدنی اور عام عطیہ کے رقوم سے شخص مذکور کے مملوک مکان کے حصہ کا عرف کے مطابق جو کرایہ ہو اُداء کیا جا سکتا ہے لیکن زکوۃ اور صدقات واجبہ کی رقم سے کرایہ وغیرہ ادا کرنا جائز نہیں ہے۔

لما فی الدر المختار: (۳۵۱/۲، طبع ایچ ایم سعید)

(وجازت التطوعات من الصدقات و) ... (الأوقاف لهم) أی لبنی هاشم سواء سماهم الواقف أولا.
وفی الشامية: (قوله وجازت التطوعات الخ) قيد بها ليخرج بقية الواجبات كالنذر والعشر والكفارات... قلت: وذكر فی الفتح أن الحق إجراء الوقف مجری النافلة لأن الواقف متبرع.

(۲) اگر شخص مذکور کا مملوک حصہ ''اقرء'' کی ضروریات کے لئے کرایہ پر لیا ہوا ہے تو وہ حصہ وقف حصہ کی طرح اقرء کے مصالح کے لئے استعمال کیا جا سکتا ہے خواہ یہ استعمال درس و تدریس وغیرہ کی صورت میں ہو یا دیگر متعلقہ امور کے لئے۔

لما فی الهندية: (۳۷۰/۴، طبع رشیدیه)

اذا استأجر دارا أو بيتا ولم يسم الذی يريد هاله حتی جازت الاجارة استحسانا كان له أن

یسکنها أو أن یسکنها له أن یضع متاعه فیها أو له أن یعمل فیه مابداله من العمل.

ولما فی الهندیة:(۲/۳۶۵،طبع رشیدیه)

وقف المشاع المحتمل للقسمة لایجوز عند محمد ---- والمتأخرون أفتو بقول أبی یوسف رحمه الله أنه یجوز وهو المختار.

(۳) اگر واقعۃ ''اقرأ'' کی موجودہ عمارت سے اقرأ کی حقیقی ضروریات پوری نہیں ہو رہی ہیں تو ضرورت کی بناء پر دوسری عمارت کرایہ پر لینا جائز ہے اور اس کا کرایہ وقف کی آمدنی اور عام عطیہ سے ادا کیا جا سکتا ہے کیونکہ زکوۃ اور صدقات واجبہ کی رقوم کو ان مصارف میں خرچ کرنا جائز نہیں۔

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: مزمل شاہ لکی مروت

۱۷ رجب ۱۴۳۰ھ — فتویٰ نمبر: ۲۳۸۰

﴿مرہونہ زمین کو وقف کرنے کا حکم﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میں نے ایک آدمی کو قرض دیا اور اسکے بدلے میں اسکی زمین رہن رکھی، کچھ عرصے کے بعد اس آدمی نے وہ مرہونہ زمین مسجد کے لئے وقف کر دی کیونکہ اسکا ارادہ تھا کہ وہ جلد ہی قرض ادا کر دے گا لیکن قرض ادا کرنے سے پہلے ہی اسکا انتقال ہو گیا، اب اسکے ترکے میں اتنا مال نہیں کہ جس سے میرا قرض ادا کیا جا سکے، پوچھنا یہ ہے کہ کیا اسکی زمین کو جو کہ میرے پاس رہن رکھی ہوئی تھی اسکے ورثاء بیچ کر میرا قرض ادا کر سکتے ہیں یا وہ وقف ہی رہے گی؟

مستفتی عابد دیردی

﴿جواب﴾ اگر واقعی مقروض کے ترکے میں اتنا مال نہیں جس سے آپکا قرض ادا کیا جا سکے اور نہ ہی کوئی اور زمین، جائیداد وغیرہ ہے جسکو بیچ کر قرض ادا کیا جا سکے تو مرحوم کا وقف باطل ہو گیا اور اسکے ورثاء اس زمین کو بیچ کر قرض ادا کر سکتے ہیں لیکن اگر اسکا کوئی اور ایسا مال ہو جس سے قرض ادا کیا جا سکتا ہو تو اس زمین کو بیچنا جائز نہ ہوگا اور یہ وقف ہی رہے گی۔

لما فی العالمگیریة:(۲/۳۵۳،طبع رشیدیه)

واما عدم تعلق حق الغیر کالرهن والاجارة فلیس بشرط ثم قال بعد سطور: لو رهن ارضه ثم وقفها قبل ان یفتکها لزم الوقف ولاتخرج عن الرهن بذالک ولو اقامت سنین فی ید المرتهن ثم افتکها تعود الی الجهة ولو مات قبل الافتکاک وترک قدر ما تفتک افتکت ولزم الوقف وان لم یترک وفاء بیعت وبطل الوقف.

ولمافی الفقه الاسلامی وادلته:(ج۱۰ص۷۶۱۵،طبع رشیدیه)

قال الحنفية يصح للراهن وقف المرهون لانه يملكه لكن يبقى حق المرتهن متعلقاً بالمرهون فان ولى الدين تطهرت وخلصت العين المرهونة من تعلق حق المرتهن بها والا فله ان يطلب ابطال الوقف وبيع المرهون وبناءً عليه يجبر القاضي الراهن على دفع ما عليه ان كان موسرا والا ان كان معسرا فيبطل الوقف ويبيع العين المرهونة فيما عليه من الدين وكذالوصات فان كان له مايوفي للدين ظل الشئ موقوفاً والا بيع وبطل الوقف.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ واللہ اعلم بالصواب: فیاض احمد

۲۵ محرم ۱۴۳۰ھ فتوی نمبر: ۱۹۰۲

﴿قبرستان کی وقف زمین پر مسجد بنانا جائز نہیں﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام کہ جو زمین قبرستان کے لئے وقف ہو اس پر مسجد بنانا جائز ہے یا نہیں؟ جبکہ ہمارے گاؤں میں وقف شدہ قبرستان کی قبروں کے نشانات کو مٹا کر مردوں کی ہڈیاں نکال کر دوسری جگہ دفن کی گئی ہیں اور مسجد بنائی گئی ہے، کیا یہ مسجد دیگر مساجد کی طرح مسجد کے حکم میں ہے یا نہیں؟ مستفتی سلیم اللہ بونیری

﴿جواب﴾ وقف کرنے والے کی طرف سے اگر مصرف کی تعین ہو مثلاً قبرستان یا مسجد کیلئے وقف کیا ہے تو اسکا لحاظ رکھنا ضروری ہے، اسکے علاوہ مصرف میں استعمال کرنا جائز نہیں ہے، لہٰذا یہ زمین اگر قبرستان کے لئے ہی وقف کی گئی ہے تو اس میں مسجد بنانا جائز نہیں ہے اور نہ ہی یہ بنی ہوئی جگہ مسجد کی حکم میں آسکتی ہے۔

لمافی الشامی:(۴/۳۴۳،طبع سعید)(۱)فان شرائط الواقف معتبرة اذا لم تخالف الشرع.

لمافی الشامی:(۴/۴۹۵،طبع سعید)(۲)شرط الواقف کنص الشارع فیجب اتباعه.

ولمافی الهندية:(۲/۴۷۰،طبع رشیدیه)

وسئل هو ايضاً عن المقبرة في القرى اذا اندرست ولم يبق فيها اثر الموتى لا العظم ولا غيره هل يجوز زرعها واستغلالها قال لا ولها حكم المقبرة كذافي المحيط.....لان المانع هنا كون المحل موقوفا على الدفن فلا يجوز استعماله في غيره فليتأمل.

اور وقف کرنے والے نے صرف قبرستان کیلئے وقف نہ کی ہو بلکہ رفاہ عام کیلئے وقف کی ہو تو اس میں مسجد بنانا جائز ہے اور یہ جگہ اب شرعی مسجد کہلائیگی لیکن مردوں کی ہڈیاں اور دیگر اعضاء جب تک باقی ہوں انکو نکالنا جائز نہیں ہے، البتہ اندازہ ہو کہ یہ قبریں اتنی پرانی ہوگئی ہیں کہ اب

مردوں کے اعضاء وغیرہ بوسیدہ ہوکر مٹی میں تبدیل ہوگئے ہیں تو قبروں کو مٹانا، وہاں مسجد وغیرہ بنانا جائز ہے پھر اس دوران خلاف اندازہ کوئی ایک دوقبروں سے مردوں کی ہڈیاں اگر ثابت نظر آئیں تو اسی جگہ انکو دفنا دیں نکالنا نہیں چاہیے اور مسجد اوپر بنالیں۔

لمافی الهندية:(۱/۱۶۷،طبع رشیدیه)

ولوبلی المیت وصار ترابا جاز دفن غیره فی قبره وزرعه والبناء علیه کذا فی التبیین.

ولمافی فقه الاسلامی وادلته:(۲/۶۶۹،طبع دار الفکر بیروت)

یحرم نبش القبر مادام یظن فیه شیئ من عظام المیت فیه فلاتنبش عظام الموتی عند حفر القبور ولاتزال عن موضعها ویتقی کسر عظامها لقوله ﷺ کسر عظام المیت ککسر عظم الحی فی الاثم اوکسر عظم المیت ککسره حیا.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفااللہ عنہ — واللہ اعلم: حبیب الرحمٰن

۳ محرم ۱۴۲۹ھ — فتوی نمبر: ۱۸۲۹

﴿قبرستان کے درختوں کو کاٹنے کا حکم﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان عظام قبرستان کے درختوں کے بارے میں کہ اس کا کاٹنا جائز ہے یا نہیں؟ مستفتی: ایک سائل فون پر

﴿جواب﴾ قبرستان کے درختوں سے متعلق بعض علاقوں میں ایک غلط تصور کیا جاتا ہے کہ قبرستان کے درختوں کو کاٹنے سے جنات نقصان پہنچاتے ہیں. یا وہاں کے مردوں میں بعض برگزیدہ اشخاص ہوتے ہیں وہ نقصان پہنچاتے ہیں یہ تصور تو بالکل غلط ہے۔ اس طرح کا عقیدہ رکھنا اسلامی تعلیمات کے منافی ہے۔ البتہ قبرستان میں خودرو درختوں اور گھاس وغیرہ کا حکم عام بنجر زمین کی طرح نہیں ہے کچھ فرق ہے۔ چنانچہ سرسبز گھاس اور چھوٹے پودوں کے کاٹنے کو فقہاء نے منع کیا ہے۔ اس لئے کہ سبز پودوں سے متعلق احادیث میں آیا ہے کہ یہ ذکر وتسبیح کرتے ہیں اور مردوں کیلئے باعث برکت وراحت ہوتے ہیں۔ ہاں خشک گھاس کا کاٹنا اور خشک لکڑیاں وہاں سے حاصل کرنے میں کوئی قباحت نہیں ہے۔ بڑے بڑے درخت سرسبز ہو تو وہ بھی گھاس کی طرح ذکر وتسبیح کرتے ہیں لیکن یہ چونکہ بڑی آمدنی کا بھی ذریعہ ہے۔ اور چھوڑنے کی صورت میں قبرستان کی زمین کو گھیرنے اور خراب کرنے کے بھی باعث ہونگے اس لئے ضرورت کے پیش نظر کاٹنے میں کوئی قباحت نہیں ہے۔ لیکن یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ قبرستان اگر کسی کی مملوکہ

زمین میں نہیں ہیں تو علاقہ کے ذمہ دار حضرات کے مشورہ سے ایسے درخت کاٹے جاسکتے ہیں۔ اور لکڑیاں فروخت کرکے آمد قبرستان کے مصارف پر خرچ کرنا ضروری ہوگا۔ کسی کو اپنی ذات کیلئے کاٹنا یا فروخت کرکے روپیہ اپنے استعمال میں لانا جائز نہیں ہے۔

لما فی الهندية:(۲/۴۷۳، طبع رشيديه)

(والمسائل التی تعود الی الأشجار التی فی المقبرة وآراضی الوقف وغير ذلک) مقبرة عليها أشجار عظيمة فهذا علی وجهين اما أن كانت الأشجار نامية قبل اتخاذ الأرض مقبرة أو نبتت بعد اتخاذ الأرض مقبرة ففی الوجه الأول المسئلة علی قسمين اما أن كانت الأرض مملوكة لها مالک أو كانت مواتا لا مالک لها واتخذ أهل القرية مقبرة ففی القسم الأول الأشجار بأصلها علی مالک الأرض يصنع بالأشجار وأصلها ماشاء وفی القسم الثانی الأشجار بأصلها علی حالها القديم. وفی الوجه الثانی المسئلة علی قسمين اما أن علم لها غارس أو لم يعلم ففی القسم الأول كانت للغارس وفی القسم الثانی الحكم فی ذلک الی القاضی ان رای بيعها وصرف ثمنها الی عمارة المقبرة فله ذلک كذا فی الواقعات الحسامية. كذا فی فتاوی قاضی خان:(۳/۱۸۹ طبع قديمی)

ولما فی الشامی:(۴/۳۶۶ طبع سعيد كراچی)

فلو كان الوقف شجرا يخاف هلاكه كان له ان يشتری من غلته فصيلا فيغرزه لان الشجر يفسد علی امتداد الزمان.

ولما فی الفتاوی التاتار خانية:(۲/۱۳۱ طبع قديمی)

. وفی "تجنيس الناصری" حطب نبت فی المقبرة ثمنه يصرف فی مصالح المقبرة. وفی "الكبری" شوكة أو حشيش نبت علی القبور فان كان رطب يكره قلعه، وان كان يابسا لا، واذا كان فی المقبرة حطب يجوز للرجل أن يحتطب فيها.

ولما فی البحر الرائق(۲/۱۹۶، طبع سعيد)

ويكره قطع الحطب والحشيش من المقبرة الا اذا كان يابسا ولا يستحب قطع الحشيش الرطب اھ

الجواب صحیح: مفتی عبدالرحمن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: عمران الحق سواتی

۲۳ ذیقعدہ ۱۴۲۲ھ — فتوی نمبر: ۳۸۷۹

﴿فنڈ بنام سیلاب زدگان کا مستحقین وغیر مستحقین کے درمیان تقسیم کرنے کا حکم﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں مفتیان کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ہمارے ضلع لکی مروت کے لئے حکومت نے فنڈ بنام سیلاب زدگان منظور کیا ہے لیکن متعین کردہ تقسیم کرنے

والے افراد متعلقینِ سیلاب زدگان کے ساتھ ساتھ اپنے متعلقین کو بھی اس فنڈ سے رقم دیتے ہیں جبکہ وہ غیر مستحق ہیں، ان افراد نے مجھے بھی اس فنڈ سے بیس ہزار روپے دینے کا کہا حالانکہ میں سیلاب زدگان میں سے نہیں ہوں، البتہ سیلاب کے دنوں میں بارش کی وجہ سے میرا صرف بھوسہ خراب ہوگیا ہے جبکہ اسکی قیمت بیس ہزار روپے تک نہیں پہنچتی۔

پوچھنا یہ ہے کہ مذکورہ تقسیم کرنے والے افراد کا ایسا معاملہ کرنا شرعاً درست ہے یا نہیں؟ اور میرے لئے اس فنڈ سے بیس ہزار روپے لینا جائز ہے یا نہیں؟ جبکہ میں سیلاب زدہ مستحق نہیں ہوں اگرچہ زکوٰۃ کا مستحق ہوں اگر یہ رقم میں نہ لوں تو غیر مستحق کو مل جائے گی۔

﴿جواب﴾ بارش کی وجہ سے آپ کے بھوسہ کو اگر نقصان پہنچا ہے تو آپ بھی متاثرین میں شمار ہوتے ہیں، لہٰذا جتنا نقصان آپ کا ہوگیا ہے، اتنا لینا آپ کے لئے جائز ہے، اس سے زیادہ وصول نہ کریں یا آپ کے علم میں اگر ایسے متاثرین ہوں جن کو حق وصول نہ ہوا ہو تو ان کو پہنچانے کی نیت سے وصول کرلیں اور پھر ان تک پہنچادیں، یہ آپ کے لئے باعثِ اجر وثواب ہے۔

تقسیم کرنے والے افراد ہدایات کے خلاف صرف تعلق کی بنیاد پر غیر متاثرین کو یہ مال اگر دیتے ہیں تو یہ خیانت ہے، روزِ قیامت ان کو اس کا حساب دینا ہوگا۔

لما في الدر مع الرد:(۴/۴۳۳،کتاب الوقف،طبع سعید)

قولهم:شرط الواقف كنص الشارع اى في المفهوم والدلالة.

وفي الشامية:فاذاقال:وقفت على أولادي الذكوريصرف الى الذكورمنهم بحكم المنطوق،وأماالأناث فلايعطى لهن لعدم مايدل على الاعطاء الاذادل في كلامه دليل على اعطائهن فيكون مثبتاًلاعطائهن ابتداء لابحكم المعارضة لكن نقل البيري في محل آخرعن المصفى،وخزانة الروايات والسراجية أن تخصيص الشىء بالذكريدل على نفي ماعداه في متفاهم الناس وفي المعقولات وفي الروايات.

ولما في الدر:(۴/۴۳۷،طبع سعید)

ونقل عن المبسوط أن السلطان يجوزله مخالفة الشرط اذاكان غالب جهات الوقف قرى ومزارع فيعمل بأمره وان غاير شرط الواقف لأن أصلهالبيت المال.

وفي الشامية:قلت:والمرادمن عدم مراعاة شرطهاأن للامام أونائبه أن يزيدفيها وينقص ونحوذلك وليس المرادأنه يصرفهاعن جهة المعينة،بأن يقطع وظائف العلماء،ويصرفهاالى غيرهم الخ.

ولما في الهندية:(۱/۴۹۱ مطبع رشيديه)

والواجب على الأئمة أن يوصلوا الحقوق الى أربابها ولا يحبسونها عنهم ولا يحل للامام وأعوانه من هذه الأموال قسم بين المسلمين، فان قصر الأئمة في ذلك فوباله عليهم.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ واللہ اعلم بالصواب: صادق محمد سواتی غفرلہ ولوالدیہ

۱۵ صفر الخیر ۱۴۳۲ھ فتویٰ نمبر: ۲۸۶۰

﴿مدرسہ کے فنڈ سے بغیر اجازت کے تعلیمی امور کے علاوہ میں خرچ کرنا جائز نہیں ہے﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میں جس مدرسہ میں پڑھتا ہوں اس کے دفتر میں روزانہ تین قسم کے اخبارات آتے ہیں جنکا مہتمم صاحب اور دیگر اساتذہ کرام مطالعہ کرتے ہیں۔ لیکن جب مہینہ کے آخر میں پیسے ادا کرنے ہوتے ہیں تو مدرسہ کے فنڈ سے ادا کئے جاتے ہیں۔ اب پوچھنا یہ ہے کہ کیا ان اخبارات کے پیسے مدرسہ کے فنڈ سے اداء کرنا جائز ہے یا نہیں؟ برائے کرم وضاحت فرمائیں۔ مستفتی: ایک متعلم

﴿جواب﴾ مہتمم صاحب چونکہ پیسہ دینے والوں کا اور طلباء کا وکیل ہوتا ہے اور انکی طرف سے مہتمم صاحب کو تعلیمی سرگرمیوں میں پیسہ خرچ کرنے کی اجازت ہوتی ہے نہ کہ غیر تعلیمی سرگرمیوں میں، لھذا مہتمم صاحب کیلئے جائز نہیں ہے کہ وہ طلباء کی اجازت کے بغیر ان پیسوں کو غیر تعلیمی امور میں لگائے جیسا کہ سوال میں ذکر ہے، اور جتنے پیسے اب تک انہوں نے اسطرح خرچ کیئے ہیں انکا لوٹانا ان کے ذمہ ضروری ہے۔ البتہ تعاون کرنے والوں میں سے کوئی اس غرض سے بھی پیسہ دیتا ہو کہ تعلیمی خرچوں کے علاوہ بھی مہتمم صاحب جہاں مناسب سمجھیں اساتذہ وغیرہ کی سہولت کیلئے خرچ کر سکتے ہیں تو ایسی صورت میں اخبار لینے کی بھی گنجائش ہے لیکن اخبارات عموماً فحش قسم کی تصاویر پر مشتمل ہوتے ہیں اس لئے مدرسہ کے ماحول کیلئے سودمند نہیں ہیں، ہاں اسلام اخبار یا اس جیسا کوئی اخبار ورسالہ جس میں تصاویر نہ ہوں اور اس کیلئے خاص پیسہ بھی ہو تو لینے کی گنجائش ہے۔

لما في الاشباه والنظائر (۲۷۶ قديمي)

لا يجوز للتصرف في مال غيره بغير اذنه ولا ولاية الا في مسألة في السراجية

وكذا في الدر (۲/۲۰۰ سعيد)

وکذا فی شرح المجلۃ (۱/۲۶۲، و شیدیہ المادۃ ۹۱)

الجواب صحیح: مفتی عبد الرحمٰن عفا اللہ عنہ واللہ اعلم بالصواب: دوست محمد رودغانی

۱ جمادی الثانیہ ۱۴۳۵ھ فتویٰ نمبر ۱۷/۴۱

﴿وقف کو شرط پر معلق کرنے کا حکم﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ زید نے مسجد کے لئے زمین کا کچھ حصہ اس شرط پر وقف کیا کہ اگر مسجد کے لئے دوسری جانب سے راستہ نہ ملے تو یہ حصہ مسجد کا ہوگا، اب مسجد کے لئے دوسری جانب سے راستہ مل گیا لیکن مسجد کے بانی (بنانے والے) اور اہل محلہ واقف سے مطالبہ کرتے ہیں کہ زمین آپ نے وقف کردی تھی جبکہ واقف کا کہنا ہے کہ زمین جس شرط پر دی تھی وہ نہیں پائی گئی، لہذا میں نہیں دوں گا، پوچھنا یہ ہے کہ واقف کا اس طرح انکار کرنا صحیح ہے یا نہیں؟ اور اہل محلہ کو مطالبہ کا حق ہے یا نہیں؟ مستفتی: برکت اللہ ناکوی

﴿جواب﴾ واضح رہے کہ وقف شرط کے ساتھ معلق کرنے سے باطل ہو جاتا ہے۔

لہٰذا صورت مسئولہ میں زید نے وقف کو جب شرط پر معلق کردیا تو وقف باطل ہو گیا اور زمین بدستور اس کی ملکیت میں ہے وہ جیسے چاہے اسمیں مالکانہ تصرف کرسکتا ہے، اہل محلہ کو اس سے مطالبہ کا حق حاصل نہیں خاص طور پر جبکہ راستہ کی ضرورت دوسری طرف سے پوری ہو رہی ہے۔

لما فی الدر مع الرد: (۴/۳۴۰-۳۴۱ طبع سعید)

(وشرطه شرط سائر التبرعات) كحرية وتكليف (وان يكون) قربة فی ذاته معلوما (منجزا) لا معلقا الا بكائن.

وفی الشامية: (قوله لا معلقا) كقوله: اذا جاء غدا واذا جاء راس الشهر او اذا كلمت فلانا فارضی هذه صدقة موقوفة او ان شئت او احببت يكون الوقف باطلا، لان الوقف لا يحتمل التعليق بالخطر لكونه مما لا يحلف به كما لا يصح تعليق الهبة بخلاف النذر لانه يحتمله ويحلف به.

ولما فی البحر: (۵/۱۸۸ طبع سعيد)

وشرائطه اهلية الواقف للتبرع من كونه حرا عاقلا بالغا وان يكون منجزا غير معلق فانه مما لا يصلح تعليقه بالشرط ...... وفی البزازية: وتعليق الوقف بالشرط باطل، وفی الخانية: ولو قال: اذا جاء غد فارضی صدقة موقوفة او قال اذا ملكت هذه الارض فهی صدقة موقوفة لا يجوز لانه تعليق والوقف لا يحتمل التعليق بالخطر لانه لا يحلف به فلا يصح تعليقه كما لا يصح تعليق الهبة بخلاف النذر لانه يحلف به ويحتمل التعليق.

وفی التاتارخانیۃ:(۵/۶۸۲،طبع قدیمی)

فرق بین هذا وبین ما اذا قال ان مت من مرضی هذا فاجعلوا ارضی هذه وقفا والفرق انه فی الفصل الاول علق الوقف بالشرط وتعلیق الوقف بالشرط باطل وفی الفصل الثانی علق التوکیل بالشرط وتعلیق التوکیل بالشرط صحیح وفی الخانیۃ:(۳/۱۹۲،طبع قدیمی)

والله اعلم بالصواب: طاہر زمان کہوٹہ، راولپنڈی

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ

فتویٰ نمبر:۲۸۱۵

۲۵ محرم الحرام ۱۴۳۲ھ

﴿اپنا بیٹا وقف کرنے کا شرعی حکم﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء دین ومفتیان شرع متین کہ(۱) اگر کوئی آدمی اپنا بیٹا کسی دینی یا دنیوی کام کے لئے وقف کرنا چاہے تو ایسا کرنا اس کے لیے جائز ہے؟

(۲) اولاد کی پیدائش یا کسی کام کے ہونے نہ ہونے پر اللہ کے راستے میں یا دین سکھانے، قرآن حفظ کرانے کے لئے اپنے بیٹے کی نذر ماننے کا شرعی حکم کیا ہے؟

(۳) اگر کوئی کہے کہ میں نے اپنا بیٹا اللہ کے راستے میں وقف کر دیا لیکن اس کی مراد نذر ہے تو اس صورت میں نذر منعقد ہو جائیگی؟

مستفتی: محمد مصطفیٰ بونیری

﴿جواب﴾ (۱) انسان وقف نہیں ہوسکتا اس لئے کہ وقف صحیح ہونے کے لئے مال کا اپنی ملکیت میں ہونا ضروری ہے، انسان خواہ اپنا بیٹا ہو وہ مال مملوکہ نہیں ہے۔(۲) البتہ مذکورہ تمام صورتوں میں نذر ماننا صحیح ہے۔(۳) اور وقف بول کر نذر مراد لینا بھی صحیح ہے، سو اس شخص نے اپنے اس جملہ سے کہ میں اپنا بیٹا اللہ کے راستے میں وقف کرتا ہوں اور اس کا مقصد یہ تھا کہ میں اپنے بیٹے کو دینی تعلیم حاصل کرنے میں لگاؤں گا وغیرہ تو یہ درست ہے اور اس شخص پر حسب استطاعت ضروری ہے کہ اپنے بچے کو دینی تعلیم حاصل کرنے پر لگائے۔

لما فی الھندیۃ:(۲/۳۵۲،شرائط الوقف طبع رشیدیہ) الملک وقت الوقف.

ولما فی الفقه الاسلامی وادلته:(۱۰/۲۲۰،طبع دارالفکر بیروت)

اتفق الفقهاء علی اشتراط کون الموقوف مالا متقوما معلوما مملوکا للواقف ملکا تاما ای لاخیار فیه.

ولما فی احکام القرآن للعثمانی:(۲/۱۷،طبع ادارۃ القرآن کراچی)

ویصح النذر بانشاء ولده علی عبادة الله وطاعته والنذر فی مثل ذلک صحیح فی شریعتنا ایضا ان ینذر الانسان ان ینشئ ابنه الصغیر علی عبادة الله تعالی وطاعته

وان لایشغله بغیرهما وأن یعلمه القرآن والفقه وعلوم الدین وجمیع ذلک نذور صحیحة لأن فی ذلک قربة الی الله تعالیٰ.

وهکذافی الشامی:(۴/۲۲۵،طبع سعید)

الجواب صحیح:عبدالرحمٰن عفااللہ عنہ

واللہ اعلم بالصواب:مزمل شاہ لکی مروت

۷صفر ۱۴۲۸ھ

فتوی نمبر:۱۹۱۴

﴿موقوفہ زمین میں مالکانہ تصرف کرنا جائز نہیں﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام کہ ہمارے محلّہ والوں نے مسجد اور مدرسہ کیلئے ۳۰×۶۰ متعین حصہ زمین کا وقف کردیا اور اسکے انتظامات مولوی رشید صاحب کے سپرد کئے،اس کیلئے اہل محلّہ نے تیس تولہ سونا جمع کردیا اور بقول مولوی رشید صاحب کہ انہوں نے بھی اپنی طرف سے ۹ تولہ سونا اور کافی رقم اس میں ملائی اور مدرسہ کیلئے تین کمرے بھی بنائے لیکن اب مولوی رشید صاحب کا ارادہ بدل گیا وہ کہہ رہے ہیں کہ میں اس وقف شدہ زمین کو بیچ کر کہیں جارہاہوں اور اس کا مجھے اختیار ہے کیونکہ میں نے اسمیں کافی رقم اور ۹ تولہ سونا لگایا ہے،پوچھنا یہ ہے کہ آیا مولوی رشید صاحب کو مذکورہ موقوفہ زمین بیچنے کا اختیار ہے یا نہیں؟ مستفتی:مولوی شاکراللہ سواتی

﴿جواب﴾ جو زمین مسجد یا مدرسہ کیلئے وقف ہوجاتی ہے تو وقف تام ہونے کے بعد وہ ہمیشہ کیلئے وقف ہوگی،اس میں کسی کو مالکانہ قسم کے تصرف کرنے کا اختیار نہیں ہے،نہ کوئی اسکو بیچ سکتا ہے اور نہ ہی واقف اسمیں رجوع کرسکتا ہے کیونکہ وہ زمین واقف کی ملکیت سے نکل جاتی ہے اور اگر کوئی شخص بزور باز واس کو بیچے گا بھی تو وہ بیع باطل شمار ہوگی،لینے والے کیلئے ہرگز جائز نہیں ہے اور نہ ہی اس کی ملکیت ثابت ہوسکتی ہے،مولوی رشید صاحب نے اگرچہ اپنا سونا اور رقم بھی اس مدرسہ کی تعمیر میں خرچ کردی ہے،واپس لینے کا حق نہیں رکھتا،البتہ بطور قرض ذاتی رقم اور سونا خرچ کردیا ہو اور اس پر دیانتدار لوگوں کو خرچ کرتے وقت گواہ بنادیا ہو کہ بطور قرض خرچ کررہاہوں تو زیادہ سے زیادہ اسی رقم کا مطالبہ کرنے کا حق دار ہوگا۔

لمافی صحیح البخاری:(۹/۲۲۱،طبع بیروت)

عن أنس رضی الله عنه لماقدم رسول الله ﷺ المدینة أمر ببناء المسجد وقال:یابنی النجار،ثامنونی بحائطکم هذاقالوا لا والله لانطلب ثمنه الاالی الله.

ولما فی صحیح البخاری:(۱۱/۲۶۲،طبع بیروت)

ان عمر بن الخطاب استشار رسول اللہ ﷺ ان یتصدق بماله بثمغ فقال رسول اللہ ﷺ تصدق به تقسم ثمره وتحبس أصله لا یباع ولا یوهب.

ولما فی الهدایة:(۲/۶۲۲،طبع رحمانیه)

من اتخذ أرضه مسجداً لم یکن له ان یرجع فیه ولا یبیعه ولا یورث عنه.

ولما فی الدر مع الرد:(۴/۳۵۱-۳۵۲،طبع سعید)

فاذا تم ولزم لا یملک ولا یملک ولا یعار ولا یرهن.

وفی الشامیة:(قوله ولا یملک)...ای لا یقبل التملیک لغیره بالبیع ونحوه لاستحالة تملیک الخارج عن ملکه.

ولما فی حاشیة البحر الرائق:(۵/۲۱۲،طبع سعید)

آن الناظر اذا انفق من مال نفسه علی عمارة الوقف لیرجع فی غلته له الرجوع دیانة لکن لو ادعی ذلک لا یقبل منه بل لابد من ان یشهد انه أنفق لیرجع.

ولما فی جامع الفصولین:(۲/۱۲۱،طبع اسلامی)

قیم الوقف لو أنفق شیئاً من ماله فی عمارة الوقف فلو أشهد انه أنفق لیرجع فله الرجوع والا فلا.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: عبدالباری چشتی

۲۲ ربیع الاول ۱۴۳۲ھ — فتویٰ نمبر: ۳۰۷۰

﴿مسجد کی موقوفہ زمین پر مقبرہ بنانا﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء دین اس مسئلہ کے متعلق کہ ایک جگہ گاؤں والوں نے گاؤں سے باہر مسجد بنائی تھی، اس کے بعد گاؤں کے اندر مسجد بنالی اور پرانی مسجد (جو کہ گاؤں سے باہر تھی) کو منہدم کر کے اس کی جگہ قبرستان بنالیا، اب گاؤں والے چاہتے ہیں کہ قبروں کی جگہ دوبارہ اس مسجد کی تعمیر کرلیں، شریعت کا کیا حکم ہے؟ سائل: رضوان اللہ حقانی

﴿جواب﴾ جاننا چاہیے کہ جس جگہ ایک مرتبہ مسجد بنالی وہ جگہ تا قیامت مسجد ہی رہے گی، کسی بھی مسجد کو نمازیوں کے نہ ہونے یا گاؤں سے باہر ہونے کی وجہ سے کسی اور مصرف میں لانا یا منہدم کر کے اس پر مقبرہ بنانا جہاں شرعاً ناجائز ہے، وہاں وقف کرنے والوں کے مقصد کے بھی خلاف ہے۔

لہٰذا صورت مسئولہ میں گاؤں والوں کا مسجد کو منہدم کر کے قبرستان بنانا جائز نہ تھا، انہیں اس فعل پر توبہ واستغفار کرنا چاہیے، اب جن قبروں کے متعلق ان کو یقین ہے کہ ان کی میتیں بوسیدہ

اور مٹی ہوچکیں ہیں تو ان کو زمین کے ساتھ ہموار کرہ دیا جائے اور جو میتیں تازہ ہیں اور انکی وہاں سے نکالنے میں بے احترامی کا اندیشہ بھی نہ ہو تو انہیں وہاں سے نکال کر دوسری جگہ دفن کردیں پھر اس جگہ پر دوبارہ مسجد کی تعمیر کرلیں۔

لمافی التنویر مع الدر:(۳۵۸/۴،طبع سعید)

(ولو خرب ماحوله واستغنى عنه يبقى مسجدا عند الامام والثانى) ابدا الى قيام الساعة (وبه يفتى) حاوى القدسى.

ولمافی البحر الرائق:(۲۵۵/۵،طبع سعید) استغنى عن مسجد لا يجوز اتخاذه مقبرة.

ولمافی الهندية:(۲/ ۴۶۳،طبع رشیدیه)

اهل المسجد لو باعوا غلة المسجد او نقض المسجد بغير اذن القاضى الاصح انه لا يجوز كذا فى السراجية.

ولمافی التاتار خانية:(۵۹۰/۵،طبع قدیمی)

سئل القاضى الامام محمود الائمة الاوزجندى عن مسجد لم يبق له جماعة وخرب ماحوله واستغنى الناس عنه هل يجوز جعله مقبرة قال لا.

ولمافی الشامی:(۱۹۹/۱-۲۰۰،طبع سعید)

(فله نبشه) اى نبشه لاخراج الميت (قوله وله تسويته) اى بالارض والزراعة فوقه (قوله وان وقفا فكذلك) اى له قيمة حفره --- وفى حاشية ابى السعود عن حاشية المقدسى وهذا لو وقفت للدفن فلو على مسجد للزرع والغلة فكالمملوكة.

ولمافی الشامی:(۴۴۵/۴،طبع سعید) على انهم صرحوا بان مراعاة غرض الواقفين واجبة.

ولمافی الشامی:(۲۳۲/۲،طبع سعید)

قال الزيلعى: ولو بلى الميت وصار ترابا جاز دفن غيره فى قبره وزرعه والبناء عليه اه.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ والله اعلم: عبدالوہاب لغمانی عفا اللہ عنہ

۸صفر الخیر ۱۴۳۱ھ فتویٰ نمبر: ۲۳۱۵

﴿پرانے قبرستان کو دوبارہ قبرستان کے طور پر استعمال کرنا﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک گاؤں میں پرانا قبرستان ہے جس میں قبریں بوسیدہ ہوگئی ہیں، اب گاؤں میں کوئی اور جگہ قبرستان کیلئے نہیں ملتی تو آیا اسی قبرستان کو دوبارہ میت دفنانے کیلئے استعمال کرنا جائز ہے یا نہیں؟ مستفتی: محمد یاسر صوابی

﴿جواب﴾ صورت مسئولہ میں اگر قبرستان میں قبریں زیادہ وقت گزرنے کی وجہ سے

بوسیدہ ہوگئی ہوں اوران میں موجود میتوں کے جسم گل کر مٹی ہوگئے ہوں تو اسکو دوبارہ قبرستان کے طور پر استعمال کرنا جائز ہے۔

لمافی الشامی:(۲۲۵/۲ طبع ایچ ایم سعید)

فلت:تقدم اذا بلی المیت وصار ترابا یجوز زرعه والبناء علیه.

ولمافی الهندية:(۱۶۷/۱ طبع رشیدیه)

ولوبلی المیت وصار ترابا جاز دفن غیره فی قبره وزرعه والبناء علیه کذا فی التبیین.

الجواب صحیح:عبدالرحمن عفااللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب:احمد علی عفی عنہ

۸ صفر ۱۴۳۱ھ — فتوی نمبر:۲۳۱۴

﴿مرتد کے وقف کا حکم﴾

﴿سوال﴾ مرتد کے وقف کا شرعا کیا حکم ہے؟یعنی ایک شخص نے مسجد کے لئے زمین وقف کی اس وقت وہ مسلمان تھا بعد میں قادیانی بن گیا،اب اس وقف شدہ زمین کا کیا حکم ہے؟واضح رہے کہ اس زمین پر ابھی تک مسجد بنی نہیں ہے؟ مستفتی:فضل کریم

﴿جواب﴾ مسلمان جب مرتد ہو جائے أعاذنا اللہ منہ تو شرعا اس کا وقف باطل ہو جاتا ہے اور وہ میراث بن جاتا ہے،صورت مذکورہ میں اس کا وقف باطل ہے الا یہ کہ اللہ تعالی اس کو دوبارہ اسلام کی دولت سے نوازے اور وہ پھر سے اس وقف کا اعادہ کرے تو وقف درست رہے گا۔

لمافی الدر مع المرد:(۵۲۵/۲ طبع امدادیه)ولو وقف المرتد فقتل أو مات أو لرتد المسلم بطل وقفه.

وفی الشامية:ویصیر میراثا سواء قتل علی ردته أومات أو عاد الی الاسلام الاان اعاد الوقف بعد عوده الی الاسلام.

الجواب صحیح:عبدالرحمن عفااللہ عنہ — واللہ اعلم:محمد عزیز چترالی

۲۱ جمادی الثانی ۱۴۲۷ھ — فتوی نمبر:۴۳۶

﴿فصل فی احکام المساجد وآدابه﴾

﴿مسجد بننے سے پہلے زمین کا حکم مسجد کا نہیں﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک شخص نے مسجد کی غرض سے زمین خریدی لیکن وہ روڈ سے دور تھی،اور وہاں لوگوں کا رجحان کم ہے بعد میں

لوگوں نے مشورہ دیا کہ روڈ کے کنارے پر مسجد بناؤ وہاں پر لوگوں کیلئے زیادہ مفید ہوگا، اب پوچھنا یہ ہے کہ اس نیت سے زمین بیچ کر کہ دوسری جگہ مسجد کیلئے زمین خریدلونگا جبکہ دوسری جگہ زمین خریدنے میں لوگوں کو فائدہ بھی زیادہ ہے اسطرح کرنا شرعاً ہمارے لئے جائز ہے یا نہیں؟

﴿جواب﴾ اس شخص نے مسجد کے ارادہ سے جو زمین خریدی ہے یہاں مسجد کی زیادہ ضرورت اگر نہیں ہے اور اس کے مقابلے میں روڈ کے قریب میں زیادہ ضرورت ہے تو یہ زمین بیچ کر روڈ کے قریب مسجد کیلئے دوسری زمین لینے کی گنجائش ہے بشرطیکہ موجودہ زمین میں باقاعدہ اذان اقامت کیساتھ نماز باجماعت شروع نہ ہوئی ہو اس جگہ میں باقاعدہ نماز باجماعت اگر شروع ہوگئی ہے تو اس کو بیچنے کی گنجائش نہیں ہے۔

لمافی الدرمع رد:ج۴/۳۵۶سعید

(وشرط محمد)والامام(الصلاة فیه)بجماعة ومقتضیٰ هذاانه لایحتاج الی قوله وقلت ونحوه وهوكذلک وانه لوقال وقفته مسجداً،ولم یاذن بالصلاة فیه ولم یصل فیه احدانه لایصیر مسجداًالخ

لمافی الشامی:ج۴/۳۸۶مطلب فی شروط الاستبدال

وفی القنیة مبادلة دار الوقف بدار اخری انمایجوزاذاکانتا فی محلة واحدةاومحلةالاخری خیراًوبالعکس لایجوزوایضاً(قوله وفی فتاوی قاری ،الهدایةالخ)حیث قال سئل عن وقف انهدم ولم یکن له شئی یعمر منه ،ولاامکن اجارته ولاتعمیره،هل تباع انقاضه من حجروطوب وخشب ؟اجاب اذاکان الامر کذلک صح بیعه بامر الحاکم ویشتری بثمنه وقف مکانه فاذالم یمکن رده الی ورثة الوقف ان وجدوا ولا یصرف للفقراء اه.

لمافی البحر:ج۵/۲۴۸سعید

(قوله ومن بنی مسجدا لم یزل ملکه عنه حتی یفرزه عن ملکه بطریقه ویاذن بالصلاة فیه واذصلی فیه واحدزال ملکه) اما الافرازفانه لایخلص لله تعالی الابه واماالصلاة فیه فلانه لابدمن التسلیم عندابی حنیفه ومحمدفیشرط تسلیم نوعه وذالک فی المسجد بالصلاة فیه ...الخ

لمافی الهندیة:ج۲/۴۵۲رشیدیه

(الفصل الاول فیمایصیربه مسجدا وفی احکامه احکام مافیه)من بنیٰ مسجدلم یزل ملکه عنه حتی یفرزعن ملکه بطریقه ویاذن بالصلاة فیه امالافراز فلانه لایخلص لله الابه کذافی الهدایه

لمافی الشامی:ج۴/۳۵۶مطلب فی احکام المسجد

قلت:وفی الذخیرةوبالصلاة بجماعة یقع التسلیم بلاخلاف حتی انه اذابنی مسجداً

او اذن للناس بالصلاة فيه جماعة فانه يصير مسجدا اھ ويصح ان يراد بالفعل الافراز ويكون بيانا للشرط المتفق عليه عند الكل كما قدمناه من ان المسجد لو كان مشاعا لا يصح اجماعا الخ.

لما في البحر:۵/۲۲۸(طبع سعيد)

فلانه لابد من التسليم عند ابي حنيفة ومحمد فيشرط تسليم نوعه وذلك في المسجد بالصلاة فيه وقال ابويوسف يزول ملكه بقوله جعلته مسجدا لان التسليم عنده ليس بشرط لانه اسقاط طلب العبد فيصير خالصا لله تعالىٰ بسقوط حق العبد وصار كالاعتاق الخ.

ولما في الهنديه :(۲/۴۵۵،طبع رشيديه،كوئٹه)

اما الصلاة فلانه لابد من التسليم عند ابي حنيفة رحمه الله ومحمدؒ كذا في البحر التسليم في المسجد ان تصلي فيه الجماعة باذنه وعن ابي حنيفةؒ فيه روايتان في رواية الحسن عنه يشترط اداء الصلاة فيه بالجماعة باذنه اثنان فصاعدا كما قال محمدؒ والصحيح رواية الحسن كذا في فتاوی قاضي خان ويشترط مع ذالک ان تکون الصلاة باذان واقامة جهرا لا سرا حتى لو صلى جماعة بغير اذان واقامة سرا لا جهرا لا يصير مسجدا عندهما كذا في محيط والكفاية.

الجواب صحیح: مفتی عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ　　　　واللہ اعلم بالصواب: صفی اللہ محسن خیلوی

۲ ربیع الاول ۱۴۳۵ھ　　　　فتوی نمبر:۳۹۱۶

﴿بانی مسجد کی وفات کے بعد مسجد کے اختیارات کا حکم﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں مفتیان کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ہماری جامع مسجد تاج کے بانی ومتولی انتقال کر گئے، ان کی حیات میں مسجد کے تمام اختیارات ان کو حاصل تھے تو اب ان کے انتقال کے بعد یہ اختیارات کس کو منتقل ہونگے؟ بینوا توجروا۔

﴿جواب﴾ مسجد کے بانی ومتولی کو تمام اختیارات شرعاً حاصل ہوتے ہیں، لہٰذا ان کے انتقال کے بعد تمام اختیارات ان کی اولاد میں نسل در نسل منتقل ہونگے اور وہی مسجد کے امور میں جائز اور مناسب تصرفات کرنے کی مجاز ہونگے۔

لما في البحر الرائق:(۵/۲۴۹-۲۵۰،طبع ایچ ایم سعید)

والباني احق بالامامة والاذان وولده من بعده وعشيرته اولى بذلک من غيرهم وفي المجرد عن ابي حنيفة رضي الله عنه ان الباني اولىٰ بجميع مصالح المسجد ونصب الامام والمؤذن اذا تأهل للامامة.

ولما في حلبي كبير:(ص۵۴۰،طبع نعمانيه)

رجل بنى مسجدا وجعله لله فهو أحق بمرمته وعمارته وبسط البواري والحصير

والتقلید والاذان والاقامة والامامة فیه ان کان اهلا لذلک وان لم یکن فالرأی فی ذلک الیه وکذا ولد الباني وعشیرته من بعده اولیٰ من غیرهم.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفااللہ عنہ
واللہ اعلم بالصواب: محمد ضیاءالدین

۲۵ جمادی الاولیٰ ۱۴۲۸ھ
فتویٰ نمبر: ۹۱۶

﴿مسجد سے روکنے کا حکم﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علمائے اسلام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ہمارے علاقہ میں ایک حافظ صاحب نے اپنی زمین مسجد کیلئے وقف کردی اور پھر کچھ عرصہ کے بعد وہاں قائم کردہ مسجد سے اہل محلہ کو منع کرنا شروع کردیا اور انکا کہنا ہے کہ اہل محلہ مجھے تنخواہ نہیں دے رہے ہیں، یاد رہے کہ اس مسجد پر بطور امام انکا تقرر ہوا تھا۔ اب استفسار طلب مسئلہ یہ ہے حافظ صاحب کا اہل محلہ کو مسجد سے روکنا کہاں تک درست ہے؟
مستفتی: عبدالصمد صاحب

﴿جواب﴾ حافظ صاحب نے زمین مسجد کیلئے وقف کردی تھی اور اس پر باقاعدہ مسجد کی تعمیر ہوئی اور باجماعت نماز بھی اس میں پڑھی گئی ہے تو یہ زمین اب تا قیامت مسجد ہی رہیگی، اب یہ جگہ چونکہ حافظ صاحب کی ملکیت سے نکل گئی اس لئے اسکو کوئی حق نہیں ہے کہ وہ کسی نمازی کو روکے، اہل محلہ اسکی اقتداء میں نماز پڑھنا چاہتے ہیں تو اس کو مناسب تنخواہ دیا کریں اور اس کی امامت اگر پسند نہیں تو دوسرے امام کا بندوبست کریں۔ اور چند بااثر نمازی لوگوں پر مشتمل کمیٹی تشکیل دیں۔ اور اس حافظ صاحب سے جھگڑے، فساد کا اگر اندیشہ ہے تو عدالت میں درخواست دائر کریں۔

حافظ صاحب کو چاہئے کہ قرآن کی آیت: "ومن اظلم ممن منع مساجدالله ان یذکر فیها اسمه وسعیٰ فی خرابها" کے مطلب کو سمجھیں۔ اور اس وعید کا مصداق نہ بنیں۔

لما فی صفوة التفاسیر: (۱/۸۹ طبع مدنیه لاهور)

(ومن اظلم ممن منع مساجدالله ان یذکر فیها اسمه) استنکار واستبعاد لأن یکون أحد أظلم ممن فعل ذالک أی لااظلم احد ممن منع الناس مع عبادة الله تعالیٰ فی بیوت الله، وعمل لخرابها بالهدم کما فعل الرومان ببیت المقدس، أو بتعطیلها من العبادة کما فعل کفار قریش (أولئک ماکان لهم ان یدخلوها الا خائفین) أی ماینبغی لأولئک ان یدخلوها الاوهم فی خشیة وخضوع فضلا عن التجرؤ علیٰ تخریبها او تعطیلها (لهم فی الدنیا خزی) ای اولئک المذکورین هوان وذلة فی الدنیا (ولهم فی الآخرة عذاب عظیم) وهو عذاب النار۔.

ولمافی تفسیر المظہری:۱/۱۱۵،طبع رشیدیہ کوئٹہ

من اظلم والمعنی لااحد اظلم ممن منع مساجد الله انماورد لفظ الجمع وان کان المنع واقعاعلی مسجد لان الحکم عام وان کان المورد خاصا ـ وسعی فی خرابہابالتعطیل عن ذکرالله فانہم لما منعوامن یعمرہ بالذکرفقد سعوا الی خرابہا۔

ولمافی تفسیرالقرطبی:۲/۷۷،طبع بیروت

وقیل المراد من منع من کل مسجد الی یوم القیامة وھو الصحیح لان اللفظ عام ورد بصیغة الجمع فتخصیصہاببعض المساجد وببعض الاشخاص ضعیف والله تعالی اعلم خراب المساجد قد یکون حقیقتا کتخریب بخت نصر والنصاری بیت المقدس وقد یکون مجاز کمنع المشرکین المسلمین حین صدور سول الله عن المسجد الحرام وعلی الجملة فتعطیل المساجد عن الصلوة واظہار شعائرالاسلام فیہاخراب لہا ـ ولذالک قلنالایجوز نقض المسجد ولابیعہ ولاتعطیلہ وان خربت المحلہ۔

الجواب صحیح: مفتی عبدالرحمٰن عفااللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: عزیز احمد خضداری غفرلہ ولوالدیہ

۱۱ربیع الاول ۱۴۳۵ھ — فتوی نمبر: ۳۹۸۸

﴿مسجد سے درخت اکھاڑنے کا مسئلہ﴾

﴿سوال﴾ ہماری مسجد میں ایک جانب کھجور کا پرانا درخت کھڑا ہے مسجد کے بعض منتظمین اکھاڑنے پر آمادہ ہیں جب کہ بعض منع کرتے ہیں شرعی مسئلہ بتا کر ہماری الجھن کو دور کیجئے۔

﴿جواب﴾ واضح رہے مسجد خانہ خدا مسلمانوں کی عبادت گاہ اور دین اسلام کا امتیازی شعار ہے، اس کا صاف ستھرا رکھنا، آداب کا لحاظ کرنا ہر مسلمان کی ذمہ داری ہے، اسلئے مسجد میں درخت لگانا اور درخت کو برقرار رکھنا ضرورت کے وقت جائز ہے، بلاضرورت جائز نہیں ہے۔

مذکورہ صورت میں درخت اگر مسجد کی ضرورت یا کسی خاص فائدے کیلئے لگایا تھا اور اب بھی وہ ضرورت یا فائدہ اس کی وجود پر منحصر ہے تو برقرار رکھنا چاہیے اور اگر اس کے وجود سے کوئی فائدہ نہیں لیا جا سکتا بلکہ نمازی اس کی وجہ سے تنگی محسوس کرتے ہیں، صفیں بھی ٹیڑھی رہتی ہیں وغیرہ تو ایسی صورت میں مسجد کا متولی اور انتظامیہ کسی مصلحت سے اس درخت کو اکھاڑ سکتے ہیں۔

لمافی الشامی:(۱/۶۶۱ طبع ایچ ایم سعید)

قال فی الخلاصة: غرس الاشجار فی المسجد لاباس به اذاکان فیه نفع للمسجدبان کان المسجد ذانز والاسطوانات لاتستقر بدونہاوبدون ھذا لایجوزاہ ـ لان فیه شغل ماعد للصلاة ونحوھا، وان کان المسجد واسعا اوکان فی الغرس نفع بثمرته والالزم ایجار

قطعة منه ولا يجوز ابقاءه ايضا لقوله عليه الصلاة والسلام "ليس لعرق ظالم حق" لان الظلم وضع الشئ فی غير محله وهذا كذلك.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: رشید عالم مروت

۱۸ جمادی الثانی ۱۴۲۸ھ — فتوی نمبر: ۱۰۰۲

﴿مسجد کے اوپر مدرسہ بنانے کا حکم﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء دین اس مسئلہ کے متعلق کہ ایک جگہ مسجد کی چھت کے اوپر بچوں کی تعلیم کیلئے درسگاہ بنائی گئی ہے جس میں غیر رہائشی بچے پڑھتے ہیں کیا اس درسگاہ کو مستقل مدرسہ قرار دیا جاسکتا ہے یا نہیں؟ مستفتی: محمد جعفر صاحب بلدیہ ٹاؤن کراچی

﴿جواب﴾ مسجد کی چھت کے اوپر تعمیر کی گئی درسگاہ مسجد کے تابع اور حکم میں ہے، مسجد کے تمام آداب اس میں ملحوظ ہونگے، اس کو مستقل مدرسہ قرار نہیں دیا جاسکتا، جہاں تک مسجد میں تعلیم کا مسئلہ ہے تو اس میں گنجائش ہے، تاہم مسجد میں مار پیٹ اور آداب مسجد کے منافی عمل سے بچنا ضروری ہے۔

لما فی التنویر مع الدر: (۳۵۸/۴، طبع سعید)

لو بنیٰ فوقه بيتا للامام لا يضر لانه من المصالح، اما لو تمت المسجدية ثم اراد البناء منع.

ولما فی الدر مع الرد: (۶۶۳/۱، طبع ایچ ایم، سعید)

(و) كره تحريما (الوطء فوقه والبول والتغوط) لانه مسجد الى عنان السماء.

وفی الشامية: وكذا الى تحت الثرى.

ولما فی الدر مع الرد: (۶۶۳/۱، طبع سعید)

وجعل المسجدين واحدا وعكسه لصلاة لا لدرس.

وفی الشامية: (قوله لا لدرس اوذكر) لانه مابنی لذلك وان جاز فيه.

ولما فی اعلاء السنن: (۱۷۹/۵-۱۸۰، طبع دار الكتب العلمية بيروت)

عن عثمان مرفوعا اجنبوا صبيانكم مساجدكم (رواه الديلمی) واعلم ان المتعلمين ولولم يكونوا اطفالا اصغارا بل كانوا بالغين يغلب منهم عدم اداء حقوق المسجد فی حال جلوسهم فيه فيكره جلوسهم فی المسجد للتعليم الا لضرورة شديدة او باداء حقوق المسجد.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: عبدالوہاب لقمانی عفا اللہ عنہ

۱۷ صفر الخیر ۱۴۳۱ھ — فتوی نمبر: ۲۲۴۰

﴿ایک مسجد کو دو حصوں میں تقسیم کرنا﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام کہ ہمارے محلے کے لوگوں میں تنازعہ ہوا اب

فریقین مسجد کو دو حصوں میں تقسیم کرنا چاہتے ہیں تو کیا مسجد کو دو حصوں میں تقسیم کرنا جائز ہے؟ اور دونوں میں ایک وقت کی نماز الگ الگ جماعت کیساتھ صحیح ہوگی؟ مستفتی: رضوان اللہ حقانی

﴿جواب﴾ کسی مصلحت سے مسجد کو دو حصوں میں تقسیم کرنا اور ہر ایک حصہ میں الگ الگ جماعت کا اہتمام کرنا جائز ہے لیکن ایک ہی محلے کے نمازیوں میں یہاں تک اختلاف ہونا کہ مسجد کو تقسیم کرنے کی بھی نوبت آرہی ہے، انتہائی افسوس ناک ہے چاہیے کہ دونوں فریق علماء کرام کے سامنے اختلاف کی وجہ بیان کریں اور شرعی حل تلاش کریں۔

اختلاف کی بنیاد پر مسجد اگر تقسیم ہوئی تو ایک ہی محلے کے لوگوں میں نسلوں تک بغض وعناد رہے گا جو کہ بے شمار گناہ اور بڑے فساد کا باعث رہے گا، اسلئے ایمان اور سمجھداری کا تقاضہ ہے کہ کسی طرح اختلاف کو ختم کریں۔

لمافی الهندية:(۵/۳۲۰،طبع رشيديه)

اهل محلة قسموا المسجد وضربوا فيه حائطا ولكل منهم امام على حدة ومؤذنهم واحد لاباس به والاولى ان يكون لكل طائفة مؤذن۔

ولمافی للدر المختار:(۱/۶۶۲-۶۶۳،طبع سعيد)

ولهم نصب متول وجعل المسجدين واحدا وعكسه لصلاة لا لدرس.

ولمافی الاشباه والنظائر:(ص ۳۲۰،طبع قديمی)

ولاهل المحلة جعل المسجد الواحد مسجدين والاولى ان يكون لكل طائفة مؤذن.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ　　　　واللہ اعلم: حبیب الرحمٰن سواتی

۲۸ ذی الحجہ ۱۴۲۹ھ　　　　فتویٰ نمبر: ۱۸۰۰

﴿مسجد میں چندہ کی رقم خرچ کرنے کے بعد اسکی واپسی کا مطالبہ کرنا درست نہیں﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میں نے اپنی زمین مسجد کے لئے وقف کی اور ایک قاری صاحب کو کہا کہ وہ اس پر مسجد بنائیں اور خود ہی اس کے امام، متولی اور منتظم بن جائیں، قاری صاحب نے مسجد کا کچھ حصہ چندے وغیرہ کی رقم سے تعمیر کیا اور پھر مزید تعمیر سے انکار کردیا اور کہا کہ میں کہیں اور مسجد بنانا چاہتا ہوں اور جو رقم اس نے مسجد کی تعمیر پر خرچ کی تھی اس کی واپسی کا مطالبہ کردیا۔

پوچھنا یہ ہے کہ کیا قاری صاحب کو اس رقم کا جو کہ تقریباً ساڑھے چار لاکھ روپے بنتی ہے،

مطالبہ کرنا درست ہے؟ اور اگر وہ رقم ان کو اس نیت سے دے دوں کہ جب کوئی اور تعمیر کرنا چاہے گا تو اس سے میں وہ رقم واپس لے لوں گا تو کیا ایسا کرنا جائز ہے؟ واضح رہے کہ مسجد میں ابھی تک نماز نہیں پڑھی گئی ہے۔

﴿جواب﴾ مسجد کی تعمیر کے لئے لوگوں نے قاری صاحب کو چندہ دیا اور قاری صاحب نے وہ چندہ مسجد میں خرچ بھی کر دیا، اب قاری صاحب اور ان کے علاوہ کسی چندہ دینے والے کے لئے بھی جائز نہیں کہ اس کا مطالبہ کرے، قاری صاحب کا کوئی حق نہیں ہے جس کا وہ آپ سے یا کسی اور سے مطالبہ کرے، بالفرض آپ یا کوئی بھی قاری صاحب کو اس غرض سے یہ رقم دیدے کہ بعد میں مسجد کی آمد یا انتظام سنبھالنے والوں سے وصول کر لے گا، یہ جائز نہیں اور نہ ہی اس طرح آپ کو مسجد یا انتظامیہ سے اس کے مطالبے کا حق حاصل ہوگا۔

لمافی البحر:(۵/۲۱۲،طبع سعید)

قیم المسجد اشتری شیئا لمؤنة المسجد بلا اذن الحاکم بماله لایرجع علی الوقف، وظاهره انه لارجوع له مطلقاً الاباذن القاضی سواء کان انفق لیرجع اولا سواء رفع الی القاضی اولا سواء برهن علی ذالک اولا.

ولمافی البحر:(۵/۲۵۱،طبع سعید)

قال ابویوسف هو مسجد ابداً الیٰ قیام الساعة لایعود میراثاً ولایجوز نقله ونقل ماله الیٰ مسجد اٰخر سواء کانوا یصلون فیه اولا وهو الفتویٰ کذا فی الحاوی القدسی وفی المجتبیٰ واکثر المشایخ علیٰ قول ابی یوسف ورجح فی فتح القدیر قول ابی یوسف بانه الاوجه.

ولمافی الهدایة:(۲/۶۲۲،طبع رحمانیه)

ومن اتخذ ارضه مسجداً لم یکن له ان یرجع فیه ولا یبیع ولا یورث عنه لانه یحرز عن حق العباد وصار خالصاً لله تعالی وهذا لان الاشیاء کلها لله تعالیٰ واذا اسقط العبد ماثبت من الحق رجع الیٰ اصله فانقطع تصرفه عنه کمافی العتاق.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: فیاض احمد

۱۲ صفر ۱۴۳۰ھ — فتویٰ نمبر: ۱۸۹۶

﴿مسجد کے فنڈ سے مستری اور مزدور کو چائے پلانے کا حکم﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ہم چند ساتھی مسجد کی کمیٹی کے رکن ہیں، مسجد سرکاری زمین پر "جو حکومت نے مسجد کے لئے مختص کی تھی" بنی ہے اور بنائی کسی

ٹرسٹ نے ہے، اب مسجد کا کچھ سامان خراب اور کچھ پرانا ہو گیا ہے اور ہم نیا لگوانا چاہتے ہیں۔

پہلی بات یہ ہے کہ ہم وہ پرانا سامان جو کچھ خراب اور کچھ پرانا ہے اسکو مسجد کے لئے بیچ سکتے ہیں جس کے بارے میں غالب گمان ہے کہ وہ دوبارہ مسجد کے کام میں نہیں آئے گا۔

دوسری بات یہ ہے کہ بعض اوقات ہم مسجد میں مستری سے کام کراتے ہیں تو کیا اس مستری کو مسجد کے فنڈ سے چائے وغیرہ پلا سکتے ہیں؟ اور کیا کمیٹی کے ارکان اور محلے کے دوسرے آدمی جو رضا کارانہ طور پر مستری کیساتھ کام میں لگے ہوں تو ان کو مسجد کے فنڈ سے چائے پلا سکتے ہیں؟

﴿جواب﴾ مسجد میں نیا سامان لگانے کے لئے مسجد کا خراب سامان اور پرانا سامان مسجد کی انتظامیہ کے مشورے سے فروخت کیا جاسکتا ہے اور مسجد میں کام کرنے والے مستری کو مناسب اجرت دینا جائز ہے اور اجرت کے علاوہ عرف میں چائے، کھانا وغیرہ بھی اگر رائج ہے تو دینے میں کوئی حرج نہیں ہے اور رضا کارانہ طور پر کام کرنے والوں کو بھی دینا چاہیے، اس لئے کہ ان چیزوں کی حیثیت اجرت اور مزدوری کی نہیں ہوتی بلکہ یہ چیزیں اکرام کے طور پر دیجاتی ہیں، اس لئے رضا کارانہ طور پر کام کرنے والوں کو نہ دینا مروت کے خلاف ہے اور ایسے لوگوں کو دینے میں مسجد کا فائدہ بھی مضمر ہے۔

لمافی الدرمع الرد:(۳۵۷/۴،طبع سعید کراچی)

ارادأهل المحلة نقض المسجدوبناء ه أحكم من الأول أن الباني من أهل المحلة لهم ذلك والالابزازية وأما أهلها فلهم أن يهدموه ويجددوابناء ه ويفرشوا الحصير ويعلقوا القناديل لكن من مالهم لا من مال المسجد الابأمر القاضي.

ولمافي التنويرمع الدر:(۳۷۷/۴،طبع سعيد)

(وصرف)الحاكم اوالمتولي حاوي(نقضه)أوثمنه ان تعذراعادة عينه(الى عمارته ان احتاج والاحفظه ليحتاج)الااذاخاف ضياعه فيبيعه ويمسك ثمنه ليحتاج.

وفي الشامية:(قوله فيبيعه)فعلى هذايباع النقض في موضعين:عندتعذرعوده وعندخوف هلاكه بحر.

ولمافي البحرالرائق:(۲۵۱/۵ ،طبع سعيد كراچي)

أماالحصروالقناديل فالصحيح من مذهب أبي يوسفؒ أنه لايعودالى ملك متخذه بل يحول الى مسجد آخر أويبيعه قيم المسجدللمسجد.

ولمافي الشامي:(۳۶۹/۴،طبع سعيد)

فعلى هذااذاعمل المباشروالشادفي العمارة يعطيان بقدرأجرة عملهمافقط، وأما

ما لیس فی قطعه ضرر بین فانه لا یعطی شیئا أصلا من العمارة اھ.

الجواب صحیح: عبد الرحمٰن عفا اللہ عنہ واللہ اعلم بالصواب: ذیشان احمد طارق

۸ ربیع الاول ۱۴۳۲ھ فتویٰ نمبر: ۲۹۸۰

﴿مسجد کے ملبہ کو نامناسب جگہ استعمال کرنے کا حکم﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے کہ ہمارے ہاں ایک مسجد کی پرانی تعمیر کو شہید کر کے نئی تعمیر بنائی اور پرانی تعمیر کا ملبہ کسی کو بیچ دیا، پوچھنا یہ ہے کہ خریدنے والے کے لئے مسجد کی اینٹیں وغیرہ گھر کے باتھ روم میں استعمال کرنا جائز ہے یا نہیں؟

﴿جواب﴾ مسجد کا ملبہ انتظامیہ کے فیصلہ سے باقاعدہ خریدا ہو تو یہ چیزیں آپ کی ملکیت ہو گئی ہیں، گھر کی تعمیر وغیرہ میں استعمال کرنا جائز ہے لیکن باتھ روم یا دیگر نامناسب جگہوں میں اس کا استعمال کرنا مساجد کے احترام کے منافی ہے، اس لئے اس کا خیال رکھیں۔

لما فی الدر مع الرد: (۲/۳۵۹-۳۶۰، طبع)

(ومثله حشیش المسجد وحصره مع الاستغناء عنهما)

وفی الشامیة: وبه علم ان الفتوی علی قول محمد فی آلات المسجد---سئل شیخ الاسلام عن اهل قریة رحلوا وتداعی مسجدها الی الخراب---ان یبیع الخشب بامر القاضی ویمسک الثمن لیصرفه الی بعض المساجد او الی هذا المسجد؟ قال: نعم.

ولما فی البحر: (۵/۲۵۱، طبع سعید)

واذا رای حشیش المسجد فرفعه انسان جاز ان لم یکن له قیمة فان کان له ادنی قیمة لا یأخذه الا بعد الشراء من المتولی او القاضی او اهل المسجد او الامام.

ولما فی الدر المختار: (۱/۱۷۸، طبع سعید)

ولا ترمی براية القلم المستعمل لاحترامه کحشیش المسجد وکناسته لا یلقی فی موضع یخل بالتعظیم.

الجواب صحیح: عبد الرحمٰن عفا اللہ عنہ واللہ اعلم بالصواب: ذیشان احمد طارق

۳۰ محرم الحرام ۱۴۳۲ھ فتویٰ نمبر: ۲۸۳۳

﴿مسجد کی زمین کو بیچنا جائز نہیں ہے﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک پرانی مسجد ہے جہاں کوئی نماز پڑھنے کے لئے نہیں آتا، علاقے والوں کا ارادہ ہے کہ اس غیر آباد مسجد کی زمین کو

فروخت کرکے آبادی میں مسجد بنائیں تو کیا مسجد کی زمین کو فروخت کرکے اسکا معاوضہ اور سامان ملبہ وغیرہ دوسری نئی مسجد میں لگانا درست ہے؟

مستفتی: ذبیح اللہ احکی مسجد

﴿جواب﴾ جب ایک مرتبہ شرعی مسجد بن جائے تو تا قیامت وہ مسجد ہی رہے گی چاہے بعد میں کوئی اسمیں نمازیں پڑھے یا نہ پڑھے، لہٰذا اسکی زمین کو بیچنا جائز نہیں ہے، البتہ اسکے سامان اور ملبہ کے ضائع ہونے کا قوی اندیشہ ہو تو نئی مسجد میں منتقل کرنے کی گنجائش ہے۔

لمافی التنویر مع الدر:(۴/۳۵۸طبع سعید)

(ولوخرب ماحوله واستغنى عنه يبقى مسجداعندالامام والثانى)ابداالى قيام الساعة (وبه يفتى)حاوى القدسى.

وفى الشامية:(قوله ولوخرب ماحوله)اى ولومع بقائه عامرا—(قوله عندالامام والثانى)فلايعودميراثاولايجوزنقله ونقل ماله الى مسجدآخرسواء كانوايصلون فيه أولاوهوالفتوى حاوى القدسى وأكثرالمشايخ عليه وهوالاوجه فتح اه بحر......(قوله وعن الثانى)جزم به فى الاسعاف حيث قال ولوخرب المسجدوماحوله وتفرق الناس عنه لايعودالى ملك الواقف عندابى يوسف فيباع نقضه باذن القاضى وبه علم ان الفتوى على قول محمدفى آلات المسجدوعلى قول ابى يوسف فى تابيد المسجداه.

ولمافى الشامى:(۴/۳۶۰طبع سعيد)

قلت لكن الفرق غيرظاهرفليتأمل والذى ينبغى متابعة المشايخ المذكورين فى جواز النقل بلافرق بين مسجدأوحوض كماأفتى به الامام ابوشجاع والامام الحلوانى وكفى بهماقدوة ولاسيمافى زماننافان المسجدأوغيره من رباط أوحوض اذالم ينقل ياخذ انقاضه اللصوص والمتغلبون كماهومشاهدوكذلك أوقافه ياكلهاالنظارأوغيرهم ويلزم من عدم النقل خراب المسجد الاخرالمحتاج الى النقل اليه وقدوقعت حادثة سألت عنهافى اميرأراداان ينقل بعض احجارمسجدخراب فى سفح قاسيون بدمشق ليبلط بهاصحن الجامع الاموى فافتيت بعدم الجوازمتابعة للشرنبلالى ثم بلغنى ان بعض المتغلبين أخذتلك الاحجارلنفسه فندمت على ماافتيت به ثم رأيت الان فى الذخيرة قال وفى الفتاوى النسفى—أوفى هذاالمسجدقال نعم.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ　　　　واللہ اعلم بالصواب: عزیز الرحمٰن

۲۶ رجب المرجب ۱۴۲۹ھ　　　　فتویٰ نمبر: ۱۷۰۸

﴿مسجد کی اشیاء ذاتی استعمال میں لانا جائز نہیں﴾

﴿سوال﴾ مسجد کی اشیاء جیسے پنکھا، بتی وغیرہ یا جو سامان نمازیوں کے لئے رکھا جاتا ہے،

امام یا مؤذن اپنے مصرف میں لاسکتا ہے یا نہیں؟ جبکہ متولی مسجد اسکی اجازت نہ دے۔

﴿جواب﴾ مسجد کی اشیاء جیسے پنکھا، بتی وغیرہ یا جو سامان نمازیوں کے لئے رکھا جاتا ہے وہ سب مال وقف ہے امام یا مؤذن کے لئے اپنے ذاتی استعمال میں لانا جائز نہیں۔

لمافی الشامی:(۴/۴۳۳،طبع سعید)

فان شرائط الواقف معتبرة اذا لم تخالف الشرع وهو مالک فله ان یجعل ماله حیث شاء.

ولمافی خلاصة الفتاوی:(۴/۴۲۳،طبع رشیدیه)

متولی المسجد لیس له ان یحمل سراج المسجد الی بیته وله ان یحمل من البیت الی المسجد. وکذافی البحر الرائق:(۵/۲۵۰،طبع سعید)

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ　　　واللہ اعلم بالصواب: ظہور احمد شمس

۵ رجب المرجب ۱۴۲۹ھ　　　فتویٰ نمبر: ۱۶۵۷

﴿حرام پیسہ مسجد میں لگانے کا حکم﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک آدمی سرکاری ملازم ہے اور وہ ڈیوٹی انجام دیئے بغیر گھر میں بیٹھ کر گورنمنٹ سے تنخواہ وصول کرتا ہے، اسکے لئے یہ تنخواہ جائز ہے؟ اور اس تنخواہ کے پیسے کو مسجد میں لگا سکتے ہیں یا نہیں؟　　　مستفتی: اعجاز صاحب

﴿جواب﴾ ایسا آدمی جو سرکاری ملازم ہو اور ڈیوٹی انجام دیئے بغیر گورنمنٹ سے تنخواہ وصول کرتا ہو، اسکے لئے یہ تنخواہ حرام ہے اور حرام پیسہ مسجد کی تعمیر میں لگانا جائز نہیں۔

لمافی فتح القدیر:(۸/۱۲۲،طبع رشیدیه)

(قوله والاجیر الخاص الذی یستحق الاجر بتسلیم نفسه فی المدة وان لم یعمل) ای سلم نفسه ولم یعمل مع التمکن اما اذا امتنع من العمل ومضت المدة اولم یتمکن من العمل ومضت المدة لم یستحق الاجر لانه لم یوجد تسلیم النفس.

ولمافی الشامی:(۱/۶۵۸،طبع ایچ ایم سعید)

(قوله لو بماله الحلال) قال تاج الشریعة: اما لو انفق فی ذلک مالا خبیثا ومالا سببه الخبیث والطیب فیکره لان الله تعالی لا یقبل الا الطیب فیکره تلویث بیته بمالا یقبله اھ شرنبلالیة.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ　　　واللہ اعلم بالصواب: اسرار عزیز

۱۷ ربیع الثانی ۱۴۲۸ھ　　　فتویٰ نمبر: ۷۷۸

﴿مسجدوں کو صاف رکھنے کا حکم﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں مفتیان کرام کہ موسم بہار میں ہمارے علاقے کی اکثر مسجدوں میں پرندے گھونسلے بنالیتے ہیں، اس سے مسجد میں گندگی پھیلتی ہے اور نمازیوں کو بھی تکلیف ہوتی ہے تو کیا مسجد کو گندگی سے بچانے کے لئے ان گھونسلوں کو ہٹایا جاسکتا ہے یا نہیں؟

﴿جواب﴾ مسجد اللہ کا گھر ہے، اس کی صفائی ستھرائی کا خیال رکھنا ہر مسلمان کیلئے ضروری ہے، اول تو پرندوں کو گھونسلے بنانے کا موقع نہیں دینا چاہیے، انتظامیہ یا اہل محلہ کی غفلت اور سستی سے پرندوں نے گھونسلے بنالئے اور ان کی وجہ سے مسجد میں گندگی پھیلتی ہے اور نمازیوں کو تکلیف ہوتی ہے تو گھونسلوں کو ہٹانے میں کوئی حرج نہیں ہے بشرطیکہ پرندوں نے بچے نہ دیئے ہوں اور اگر بچے دے دیئے تو ایسا انتظام کرنا چاہیے کہ بچے بھی ضائع نہ ہوں اور مسجد بھی صاف رہے۔

لما فی الدر المختار:(۲/۴۲۷،طبع امدادیه)ولا باس برمی عش خفاش وحمام لتنقیته.

وفی الشامية:قوله:(لتنقيته) جواب سوال حاصله انه صلى الله عليه وسلم قال:"اقروا الطير على مكانتها"فازالة العش مخالفة للأمر،فاجاب بأنه للتنقية وهي مطلوبة،فالحديث مخصوص بغير المساجد.

ولما فی الهندية:(۵/۳۲۱،طبع رشیدیه)

ولو كان في المسجد عش خطاف أو خفاش يقذر المسجد لاباس برميه بما فيه من الفراخ.

الجواب صحیح:عبد الرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم:صلاح الدین چترالی

۱۹ ربیع الثانی ۱۴۲۷ھ — فتویٰ نمبر:۱۰۵

﴿مسجد کے اوپر بیت الخلاء بنانا درست نہیں﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ مسجد کے اوپر بیت الخلاء بنانا شرعا درست ہے یا نہیں؟

مستفتی محمد اکرم کوہاٹی

﴿جواب﴾ مسجد کے اوپر بیت الخلاء بنانا جائز نہیں ہے، ایک جگہ جب شرعی مسجد قرار پاگئی ہے تو زمین کا یہ حصہ اونچائی کی انتہاء تک اسی طرح نیچے گہرائی کی انتہاء تک مسجد ہی ہے، اس جگہ مسجد کے منافی کوئی بھی تعمیر وغیرہ جائز نہیں۔

لما فی قوله تعالیٰ (سورة الجن آية ۱۸ پاره ۲۹)﴿وان المسجد لله فلا تدعوا مع الله احدا﴾

ولمافی الدر المختار، (۱/۱۵۶ مطبع سعید)

"وکره تحريما (الوطء فوقه، والبول والتغوط) لأنه مسجد الى عنان السماء.

ولمافی الهداية، (۱/۱۴۶ مطبع رحمانیه)

ویکره المجامعة فوق المسجد والبول والتخلی لأن سطح المسجد له حکم المسجد، حتی یصح الاقتداء منه بمن تحته ولا یبطل الاعتکاف بالصعود فیه ولا یحل للجنب الوقف علیه

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفااللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: عزیز اللہ آغا عفی عنہ

۲۵ جمادی الاولیٰ ۱۴۳۳ھ — فتویٰ نمبر: ۳۲۲۵

﴿مسجد میں ٹوپی رکھنے کا حکم ہے﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے کہ مسجد کی ٹوپی پہن کر نماز پڑھنا کیسا ہے اور مسجد میں ٹوپی رکھنے کا کیا حکم ہے؟ بعض لوگ منع کرتے ہیں اور بعض کہتے ہیں کہ ننگے سر نماز پڑھنے سے تو بہتر ہے اس لیے ٹوپیاں رکھنی چاہیے۔ مستفتی: حاجی نصیر احمد

﴿جواب﴾ اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ ننگے سر نماز پڑھنا مکروہ ہے، عمامہ یا ٹوپی پہن کر نماز پڑھنی چاہئے لیکن ٹوپی یا عمامہ وغیرہ کا انتظام کرنا مسجد والوں کی کوئی ذمہ داری نہیں ہے یہ تو نمازی کی اپنی ذمہ داری ہے کہ وہ نماز جیسی بڑی عبادت کو اہمیت دیتے ہوئے ایسی تمام چیزوں کا خود ہی انتظام کرتا رہے۔ سر پر عمامہ سجانا یا کم از کم ٹوپی رکھنا یہ مسلمان کا عام لباس ہے نماز کے علاوہ اوقات میں بھی ننگے سر گھومنا مسلمانوں کی تہذیب نہیں ہے یہ تو غیروں کو دیکھ کر یہاں رائج ہوا ہے، کل کو خدا نہ کرے، نیکر، شرٹ (shirt) اور ٹی شرٹ پہننا بھی عام ہو جائے تو ایسے نمازیوں کے لیے شلوار قمیص کا مساجد میں انتظام کرنا پڑے گا۔ دین اسلام محترم ہے اور اس کے احکامات واجب الاحترام ہیں اور جو احترام نہیں کرتا ایسے رسمی مسلمانوں سے دین اسلام اور اس کے صحیح معنوں میں پیروکار بھی مستغنی ہیں ایسے لوگوں کی ہدایت کی فکر ہونی چاہیے کہ یہ بھٹکے ہوئے کس طرح اپنے بھولے ہوئے راستے پر واپس لوٹ آئیں مساجد میں ٹوپیاں اور شلواروں قمیصوں کا انتظام کرنا سراسر حکمت کے خلاف ہے۔ اس کے علاوہ مساجد کی ٹوپیوں کا استعمال جس طرح ہوتا ہے صرف ایک سر پر نہیں روزانہ کئی سروں پر رکھی جاتی ہے، اور نماز پڑھ لی تو جہاں ڈال دیا، رکھ دیا پوری مسجد اسکی جگہ ہے، اور عموماً اسکی خاص کوئی علامت بھی ہوتی ہے تاکہ کوئی چرا کر نہ

لے جائے، اور ایسی ٹوپی پہن کر کوئی سمجھدار شرفاء اور پر وقار مجلس میں نہیں جاسکتا اسکو خلاف عزت واحترام جانتا ہے تو خالق کائنات، بادشاہوں کے بادشاہ کے سامنے ایسے لباس میں کھڑے ہونے کو ایماندار آدمی کیسے گوارہ کریگا؟ اس لیے فقہاء کرام نے ایسے لباس میں نماز کو مکروہ قرار دیا ہے لہذا مساجد میں ٹوپیاں رکھنا اور ان میں نماز پڑھنا کوئی اچھا عمل نہیں ہے اس سے گریز کرنا چاہئے۔

لما في قوله تعالىٰ:(سورة الاعراف، آیت نمبر:۳۱)﴿يا بني آدم خذوا زينتكم عند كل مسجد﴾

ولما في احكام القرآن لجصاص:(۳/۱۵ طبع:قديمي)

وقوله تعالىٰ:(خذوا زينتكم عند كل مسجد)يدل على انه مندوب في حضور المسجد الى اخذ الثوب نظيف ما يتزين به وقد روى عن النبي ﷺ انه قال: "ندب الى ذالك في الجمع والاعياد".

ولما في مراقي الفلاح:(ص ۱۳۰، طبع:قديمي)

وتكره(الصلاة في ثياب بذلة)ثوب لا يصان عن الدنس ممتهن وقيل ما لا يذهب به الى الكبراء "ورأى عمرؓ رجلاً فعل ذالك فقال أرأيت لو كنت ارسلتك الى بعض الناس أكنت تمر في ثيابك هذه فقال:لا فقال عمرؓ:الله أحق ان تتزين له "وتكره وهو (مكشوف الرأس)تكاسلاً لترك الوقار.

ولما في حلبي كبير:(ص ۳۴۹ طبع سهيل اكيڈمي)

(وكذا يكره ان يصلى في ثياب بذلة)وهو ما لا يصان ولا يحفظ من الدنس ونحوه(او)في ثياب (المهنة)وهي الخدمة والعمل تكميلا لرعاية الادب في الوقوف بين يديه تعالىٰ بما امكن من تجميل الظاهر والباطن.

ولما في الشامي:(۲/۴۰۷ طبع:امداديه)

(وصلاته في ثياب بذله)الخدمة والابتذال ــــــــ قال في البحر وفسرها في شرح الوقاية بما يلبسه في بيته ولا يذهب به الى الاكابر والظاهر ان الكراهة تنزيهية اهـ.

الجواب صحیح:عبدالرحمٰن عفااللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب:تنویر الرحمٰن غفرلہ ولوالدیہ

۱۴جمادی الاولیٰ ۱۴۳۳ھ — فتویٰ نمبر:۲۷۴۱

﴿درس ووعظ کی وجہ سے محلہ کی مسجد کو چھوڑ کر دوسری مسجد میں جانا ہے﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں مفتیانِ کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ اپنے گھر کے پاس والی مسجد کو چھوڑ کر دوسری مسجد میں جانا اس لئے کہ وہاں درس ووعظ ہوتا ہے اور جمعہ کی تقریر اچھی

ہوتی ہے کیا ایسا کرنے سے اپنی نزدیک والی مسجد کو آباد نہ رکھنا لازم آئے گا یا نہیں؟ جیسا کہ بعض لوگ کہتے ہیں کہ اپنی نزدیک والی مسجد آباد رکھو ورنہ گناہ ہوگا۔ مستفتی: ایک متعلم

﴿جواب﴾ بلاشبہ حق تو قریب والی مسجد ہی کا زیادہ ہے، لیکن قریب والی مسجد میں اگر درس و وعظ نہیں ہوتا اور دوسری مسجد میں یہ سہولت ہو تو اس اضافی فائدہ کیلئے دور کی مسجد میں جانا جائز ہے اس میں کوئی کراہت نہیں ہے۔

لما فی حلبی کبیر: ۶۱۳ ،طبع سہیل)

وذکر قاضی خان وصاحب منیة المصلی وغیرهما ان الاقدم افضل فان استویا فی القدم فالاقرب افضل...... والافضل ان یختار الذی امامه اصلح وافقه فان الصلوة مع الافضل افضل...... ومسجد استاذه لدرسه او لسماع الاخبار افضل بالاتفاق۔

ولما فی حاشیة الطحطاوی: ۲۸۷ ،طبع قدیمی)

واختلفوا هل الافضل مسجد حیه ام جماعة المسجد الجامع وان استوی المسجدان فاقدمهما افضل فان استویا فاقربهما فان استویا خیر العامی والفقیه یذهب الی اقلهما جماعة لیکثروا والتلمیذ یذهب الی مجلس استاذه۔

ولما فی الدر مع الرد: ۱/۶۵۹ ،طبع سعید)

(ومسجد استاذه لدرسه اولسماع الاخبار افضل اتفاقا) وذکر فی الخانیة ومنیة المصلی وغیرهما ان الاقدم افضل فان استویا فی القدم فالاقرب ولو استویا فیهما وقوم احدهما اکثر فان کان فقیها یقتدی به یذهب للاقل جماعة تکثیرا لها بسببه والا تخیر والافضل اختیار الذی امامه افقه واصلح ومسجد حیه وان قل جمعه افضل من الجامع وان کثر جمعه (قوله افضل اتفاقا) ای من الاقدم وما بعده لاحرازه فضیلتی الصلاة والسماع۔

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ واللہ اعلم بالصواب: عمر فاروق لاہوری

۷ جمادی الثانی ۱۴۳۳ھ فتویٰ نمبر: ۳۷۷۳

﴿ہیروئنچی اور پاگل لوگوں کو مسجد سے روکنا جائز ہے﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ہماری مسجد میں کچھ ایسے لوگ آجاتے ہیں جو پوری طرح ہوش وحواس میں نہیں ہوتے (یعنی نشہ کی حالت میں ہوتے ہیں) اگر وہ لوگ جماعت کی نماز میں شامل ہو جائیں، قیام کی حالت میں ہیں تو قیام میں ہی رہتے ہیں یہاں تک کہ جماعت کی نماز ختم ہو جاتی ہے، سجدے میں جاتے ہیں تو سجدے میں ہی سوتے رہتے ہیں۔ کپڑے ان کے نہایت ہی گندے اور تعفن والے ہوتے ہیں اور نہ جانے پاکی

کی حالت میں ہوتے ہیں یا ناپاکی کی۔ بہت سے لوگ ان سے گھن محسوس کرتے ہیں، ان ہی لوگوں کی وجہ سے ہمیں مسجد کا ایک دروازہ مستقل بند کرنا پڑا ہے۔ پوچھنا یہ ہے کہ ان لوگوں کو مسجد میں آنے سے روکا جاسکتا ہے یا نہیں اور ان پر کتنی سختی کر سکتے ہیں۔ جبکہ ہماری مسجد کے کچھ لوگ کہتے ہیں کہ ان کو مسجد میں داخل ہونے کی بالکل اجازت نہیں دینی چاہئے کچھ لوگ کہتے ہیں کہ ان کو روکا نہ جائے بلکہ آنے دیا جائے۔ مستفتی: مولوی عبدالکریم صاحب، امام سنہری مسجد کراچی

﴿جواب﴾ مساجد شعائر اسلام میں سے ہیں ان کا احترام ہر مسلمان کی ذمہ داری ہے۔ مساجد کو گندگی، ناپاکی، بدبو اور اذیت دینے والی تمام چیزوں سے پاک رکھنے کا حکم ہے۔ اس لئے ایسے بچوں کو مسجد میں لانا سخت منع ہے، جن سے مسجد میں پیشاب وغیرہ کرنے کا اندیشہ ہو، اسی طرح پاگل لوگوں کو بھی مسجد سے دور رکھنے کا مستقل حکم ہے۔ چنانچہ ایک حدیث میں آیا ہے "جنبوا مساجدکم صبیانکم و مجانینکم" کہ تم اپنی مساجد سے (ناسمجھ) بچے اور پاگل لوگوں کو دور رکھو۔ نشہ کی حالت میں آدمی پاگل سے کچھ کم نہیں ہوتا اس لئے نشئی لوگوں کو خصوصاً جب وہ نشہ کی حالت میں ہوں، مساجد میں داخل ہونے سے ایسے افراد کو روکنا انتظامیہ کی ذمہ داری ہے، مزید یہ کہ نشہ کی حالت میں نماز پڑھنے کو قرآن کریم نے منع فرمایا ہے، اس حالت میں نماز ہوتی نہیں ہے، لھذا ایسی حالت میں ان کا نماز پڑھنا اور جماعت میں شامل ہونا نماز ادا کرنے کے لئے نہیں ہے، بلکہ دیگر نمازیوں کے لئے پریشانی کا باعث بنتے ہیں۔ اس لئے منع کرنا ضروری ہے۔ البتہ ایسی حکمت عملی اختیار کریں کہ جھگڑے یا شور شرابے کی نوبت نہ آئے۔

لما فی سورۃ النساء آیت ۴۳

﴿یاایھا الذین امنوا لا تقربوا الصلاۃ و انتم سکاری حتی تعلموا ما تقولون ولا جنباً الا عابری سبیل حتی تغتسلوا ـــــ﴾

ولما فی الدر المختار مع رد المحتار:(۵۱۸/۲، طبع رشیدیه)

ویحرم ادخال صبیان و مجانین حیث غلب تنجیسھم و الا فیکرہ ـــــ واختلف فیه السلف ،فقیل لا باس ،وقیل یخرج اذا احتاج الیه ،وھو الاصح ،حموی عن شرح الجامع الصغیر للتمرتاشی .قوله:(ویحرم ـــــ الخ) لما اخرجه المنذری مرفوعا (جنبوا مساجدکم صبیانکم ومجانینکم ـــــ)

ولما فی حلبی کبیر:(ص،۶۱۰ طبع سھیل اکیڈمی)

قال الله تعالی انما یعمر مساجد الله من امن بالله والیوم الاخر ـــــ وتتناول ما استرم

منها وكنسها و تنظيفها و تنويرها بالمصابيح وتعظيمها و اعتيادها للعبادة و الذكر و صيانتها عما لم تبن له من احاديث الدنيا واشغالها ـــــــ يجب ان تصان عن ادخال الرائحة الكريهة لقوله عليه السلام "من اكل الثوم و البصل والنكرات فلا يقربن مسجدنا فان الملائكة تتاذى مما يتاذى منه بنو آدم متفق عليه ـــــــ و رفع الصوت و ادخال المجانين والصبيان لغير الصلاة و نحوها.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفااللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: محمد حامد یاسین، بھکر

۴ رجب المرجب ۱۴۳۴ھ — فتویٰ نمبر: ۳۸۲۵

﴿مسجد کی زمین یا دیوار وغیرہ مسجد کے علاوہ مقصد کے لئے استعمال منع ہے﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علمائے کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ مسجد کے ساتھ متصل زمین میں مسجد کے مصالح کے لیے ایک مکان تعمیر کرنا ہے تو آیا اسکی چھت (لینٹر) مسجد کی دیوار پر رکھنا جائز ہے کہ نہیں؟ یا اس کے لیے الگ دیوار یا پلر کھڑا کریں۔

﴿جواب﴾ مسجد کی دیوار پر کسی مکان، یا دکان وغیرہ کا لینٹر یا گاڈر وغیرہ رکھنا جائز نہیں ہے اگر چہ وہ مکان مسجد کے مصالح کے لیے ہی کیوں نہ ہو لہذا اس مکان کی چھت کے لیے الگ پلر یا دیوار کھڑی کریں مسجد کی دیوار یا زمین اس کے لیے استعمال نہ کریں۔

لما في الدر المختار: ۳۵۸/۴ كتاب الوقف مطلب في احكام المسجد طبع سعيد

ولا يوضع الجذع على جدار المسجد وان كان من اوقافه اھ.

وفيه ايضاً۔

قلت: وبه علم حكم ما يضعه بعض جيرانه المسجد من وضع جذوع على جداره فانه لا يحل ولو دفع الاجرة.

ولما في البحر الرائق ج۵/ ۲۵۰ فصل في احكام المسجد طبع سعيد

ولا يوضع الجذع على جدار المسجد وان كان من اوقافه.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفااللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: محمد تنویر غفرلہ ولوالدیہ

۱۱ صفر الخیر ۱۴۳۴ھ — فتویٰ نمبر: ۳۵۴۲

﴿شیطان مسجد میں داخل ہوسکتا ہے﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہے علمائے کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ شیطان مسجد میں آسکتا ہے یا نہیں؟ جبکہ بعض لوگ کہتے ہیں کہ آسکتا ہے اور بعض کہتے ہیں نہیں آسکتا۔

﴿جواب﴾ شیطان کا مسجد میں داخل ہونا احادیث مبارکہ سے ثابت ہے، بلکہ احادیث

سے تو یہ بھی ثابت ہے کہ جب اقامت ختم ہو جاتی ہے تو شیطان نمازی کے پاس آتا ہے اور اسکی نماز میں خلل ڈالنے کی کوشش کرتا ہے اور اس کو مختلف وسوسے ڈالتا رہتا ہے، لہذا اس کے مسجد میں داخل ہونے کی تردید کی کوئی وجہ نہیں۔

لما فی الصحیح المسلم(۱/۱۶۸ باب فی فضل الاذان طبع قدیمی).

عن ابی ھریرۃؓ ان النبی صلی الله علیه وسلم قال اذا نودی للصلوۃ ادبر الشیطان وله ضراط حتی لا یسمع التاذین فاذا قضی التاذین اقبل حتی اذا ثوب بالصلوۃ ادبر حتی اذا قضی التثویب اقبل حتی یخطر بین المرء ونفسه یقول له اذکر کذا واذکر کذا لم یکن من قبل حتی یظل الرجل ما یدری کم صلی۔

ولما فیه ایضاً(۱/۲۰۵ باب فی جواز لعن الشیطان فی اثناء الصلوۃ).

عن ابی الدرداءؓ قال قام رسول الله صلی الله علیه وسلم فسمعناه یقول اعوذ بالله منک ثم قال العنک بلعنة الله ثلاثاً وبسط یده کانه یتناول شیأ، فلما فرغ من الصلوۃ قلنا یا رسول الله قد سمعناک تقول شیئا لم نسمعک تقوله قبل ذالک ورأیناک بسطت یدک قال ان عدو الله ابلیس جاء بشهاب من نار لیجعله فی وجهی فقلت اعوذ بالله منک ثلاث مرات ثم قلت العنک بلعنة الله التامة فلم یستاخر ثلاث مرات ثم اردت اخذه والله لولا دعوة اخینا سلیمان علیه السلام لا صبح موثقا یلعب به ولدان اهل المدینه.

ولما فی مشکوۃ المصابیح:(۹۸ باب تسویة الصفوف، طبع سعید).

وقال رسول الله صلی الله علیه وسلم سووا صفوفکم وحاذوا بین مناکبکم ولینوا وسدوا الخلل فان الشیطان یدخل فی ما بینکم بمنزلة الخذف یعنی اولاد الضان الصغار رواه احمد

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: شاہد خان سواتی

۲۵ ربیع الاول ۱۴۳۲ھ — فتویٰ نمبر: ۳۰۸۱

﴿مسجد کے اندر وضو خانہ بنانا جائز نہیں ہے﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ہمارے گاؤں میں ایک آدمی نے مسجد کیلئے زمین وقف کی، اور اسکے اردگرد اکثر حصہ دیواروں کا بنایا گیا، اور باقاعدہ طور پر وہاں باجماعت نماز پڑھانا شروع ہو گیا، ابھی وہ واقف کہہ رہا ہے کہ اس مسجد کے اندر وضو خانہ بھی بنائیں گے، حالانکہ شروع میں یہ نیت نہیں تھی، تو کیا اس مسجد کے اندر وضو خانہ بنانا درست ہے؟ برائے کرم شریعت کی روشنی میں رہنمائی فرمائیں۔ مستفتی: عبداللہ

﴿جواب﴾ مسجد کے اندر وضو خانہ بنانے کی کوئی گنجائش نہیں ہے، متولی چاہے تو وضو خانہ

کے لئے الگ مزید زمین لیکر اس میں تعمیر کرے، یہ جگہ اب پوری مسجد بن گئی، اب کوئی ایک ٹکڑا بھی مسجد سے الگ کرنے کی گنجائش نہیں ہے۔

لما فی البحر: ۲۴۸/۵ طبع سعید

ومن بنى مسجدا لم يزل ملكه عنه حتى يفرزه عن ملكه بطريقه ويأذن بالصلاة فيه واحد زال ملكه.

ولما فی التنویر مع الدر: ۳۵۸/۴ طبع سعید

لو بنى فوقه بيتا للإمام لا يضر لانه من المصالح أما لو تمت المسجدية ثم أراد البناء منع ولو قال عنيت ذالك لم يصدق تاتاخانية، فاذا كان هذا في الواقف فكيف بغيره فيجب هدمه ولو على جدار المسجد.

ولما فی البحر: ۳۲/۲ طبع سعید

ويكره الوضوء والمضمضة في المسجد الا أن يكون موضع فيه اتخذ للوضوء ولا يصلى فيه ومثله في الهندية: ۱۲۱/۱ طبع قديمى كتب خانه

ولما فی التنویر مع الدر: ۶۶۰/۱، ۶۶۱ طبع سعید

ويكره الاعضاء مطلقا ـــ والوضوء الا فيما أعد لذالك. وفي الشامية تحت (قوله والوضوء) لأن ماءه مستقذر طبعا فيجب تنزيه المسجد عنه، كما يجب تنزيهه عن المخاط والبلغم، بدائع (قوله الا فيما أعد لذالك) أنظر هل يشترط اعداد ذالك من الواقف أم لا: وفي حاشية المدني عن الفتاوى العفيفية: ولا يظن أن ما حول بئر زمزم يجوز الوضوء أو الغسل من الجنابة فيه، لأن حريم زمزم يجرى عليه حكم المساجد فيتعامل معاملتها من تحريم البصاق والمكث مع الجنابة.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ | واللہ اعلم بالصواب: محمد زبیر غفرلہ ولوالدیہ

۷ جمادی الثانی ۱۴۳۴ھ | فتویٰ نمبر: ۳۷۵۰

﴿مسجد کے آداب ملحوظ ہوں تو طلبہ کی رہائش کی گنجائش ہے﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلے کے بارے میں، کہ ہمارے گاؤں تارشیر خان میں مسجد کیلئے وقف زمین پر ایک حافظ صاحب نے طلباء کی رہائش کے لئے تہہ خانہ بنایا، پھر بعد میں ایک عالم نے اسکے اوپر مسجد بنالی، اب مسئلہ یہ ہے کہ علاقے کے ایک اور عالم کہہ رہے ہیں کہ یہ تہہ خانہ مسجد کے حکم میں ہے، اس لئے آپ کو چاہئے کہ طلباء کو یہاں نہ ٹھہرائیں، اور اگر آپ ٹھہرانا چاہتے ہو تو آپ پر لازمی ہے کہ مدرسہ کے پیسوں سے ماہانہ کرایہ مسجد کے فنڈ میں جمع کریں، اب پوچھنا یہ ہے کہ کیا اس عالم کی بات صحیح ہے، حالانکہ حافظ صاحب کہہ رہے ہے کہ

میں نے پہلے سے تہہ خانہ طلباء کی رہائش کی نیت سے بنایا تھا؟ برائے کرم شریعت کی روشنی میں رہنمائی فرمائیں نوازش ہوگی۔ مستفتی: مولوی برکت اللہ مروت

﴿جواب﴾ مسجد کا تہہ خانہ بھی مسجد ہی ہے، ادب واحترام کا لحاظ رکھتے ہوئے اس میں قرآن کریم کی تعلیم دینا بلا کراہت جائز ہے، اور دوسری جگہ رہائش کا انتظام اگر مشکل ہو تو بغیر کرایہ کے طلباء کی رہائش رکھنا بھی جائز ہے، البتہ طلباء کو وقتاً فوقتاً سمجھایا کریں کہ وہ ہر بار مسجد میں داخل ہوتے ہوئے نفلی اعتکاف کی نیت کیا کریں، اور لیٹنے سے پہلے نیچے بچھائونے وغیرہ کا انتظام کریں۔

لما في التنوير مع الدر: ۱/۶۵۶ طبع سعيد

وكره تحريما الوطء فوقه والبول والتغوط، لأنه مسجد الى عنان السماء. وفي الشامية تحته: وكذا الى تحت الثرى.

ولما في البحر: ۲۵۱/۵ طبع سعيد

وحاصله ان شرط كونه مسجدا ان يكون سفله وعلوه مسجدا لينقطع حق العبد عنه لقوله تعالى وان المساجد لله بخلاف ما اذا كان السرداب أو العلو موقوفا لمصالح المسجد فانه يجوز اذلا ملك فيه لأحد بل هو من تتميم مصالح المسجد فهو كسرداب بيت المقدس هذا هو ظاهر المذهب.

ولما في أوجز المسالك: ۲۲۰،۲۲۹/۳ طبع دار الكتب العلمية بيروت

وقد ورد مرفوعا نصاً عن سهل بن سعد فقال: من دخل مسجدي هذا ليتعلم خيراً أو يعلمه كان كأجر حاجّ تاماً حجته. قال الشيخ تحته: (أو يعلّمه) أي يعلم الغير احدا قال القاري: فيه دلالة ظاهرة على جواز التدريس في المسجد ــــ وأجاز ابو حنيفة ومحمد بن مسلمة من اصحاب مالك: رفع الصوت فيه بالعلم والخصومة وغير ذالك ممّا يحتاج اليه الناس، لأنه مجمعهم ولا بد لهم منه وكره بعض المالكية تعليم الصبيان في المسجد وقال انه من باب البيع، وهذا اذا كان بأجرة، فان كان بغير أجرة منع أيضاً من وجه آخر وهو ان الصبيان لا يحترزون من القذر والوسخ فيؤدي ذالك الى عدم تنظيف المساجد وقد أمر رسول الله صلى الله عليه وسلم بتنظيفها وتطييبها وقال: "جنّبوا مساجدكم صبيانكم" وفي البحر: ويجوز الجلوس في المسجد لغير الصلاة، ولا بأس به للقضاء كالتدريس والفتوى.

ولما في اعلاء السنن: ۱۴۸،۱۴۷/۳ طبع دار الكتب العلمية بيروت

قلت: رأيت كثيرا من العلماء يدرسون في المسجد على الأجرة فليتنبهوا وليجتنبوا والحيلة في ذالك ان يجلسوا بنية الاعتكاف فيزول المحذور ــــ واعلم ان المتعلمين ولو لم يكونو

أطفالا صغاراً بل كانوا بالغين يغلب منهم عدم اداء حقوق المسجد فى حال جلوسهم فيه يكره جلوسهم فى المسجد للتعليم الا لضرورة شديدة أو باداء حقوق المسجد.

ولما فى البحر: ۲۵۰/۵ طبع سعيد

يجوز لاهل المحلة ان يجعلوا المسجد الواحد مسجدين فلهم ان يجعلوا المسجدين واحدا لاقامة الجماعة، أما للتذكير أو للتدريس فلا ، لانه ما بنى له وان جاز فيه ـــــ ويجوز الدرس فى المسجد وان كان فيه استعمال اللبود والبوارى المسبلة لاجل المسجد لو علم الصبيان القرآن فى المسجد لا يجوز ويأثم وكذا التأديب فيه أى لا يجوز التأديب فيه اذا كان بأجر وينبغى أن يجوز بغير أجر ـــــ وكذا لا يجوز التعليم فى دكان فى فناء المسجد هذا عند أبى حنيفة وعندهما يجوز اذا لم يضر بالعامة ـــــ ولا بأس بأن يترك سراج المسجد فيه من المغرب الى وقت العشاء ولا يجوز ان يترك فيه كل الليل الا فى موضع جرت العادة فيه بذالك كمسجد بيت المقدس ومسجد النبى صلى الله عليه وسلم والمسجد الحرام أو شرط الواقف تركه فيه كلّ الليل كما جرت العادة به فى زماننا ويجوز الدرس بسراج المسجد ان كان موضوعا فيه لا للصلاة بأن فرغ القوم من الصلوة وذهبوا الى بيوتهم وبقى السراج فيه قالوا لا بأس بان يدرّس بنوره الى ثلث الليل لانهم لو أخّروا الصلاة الى ثلث الليل لا بأس به فلا يبطل حقه بتعجيلهم وفيما زاد على الثلث ليس لهم تأخيرها فلا يكون لهم حق الدرس .

ولما فى الشامى: ۳۸۵/۳ طبع سعيد

والحاصل: ان الواقف اذا أطلق أو عيّن الاستغلال ، وان قيد بالسكنى تقيد بها ، وان صرح بهما كان لهما جريان على كون شرط الواقف كنص الشارع.

ولما فى الهندية: ۴۳۱/۲ طبع قديمى كتب خانه

واذا أراد ان يصرف شيئاً من ذالك الى امام المسجد أو الى مؤذن المسجد فليس له ذالك الا اذا كان الواقف شرط ذالك فى الوقف كذا فى الذخيرة.

ولما فى الشامى: ۳۶۰/۴ طبع سعيد

(قوله اتحد الواقف والجهة) بأن وقف وقفين على المسجد أحدهما على العمارة والآخر الى امامه أو مؤذنه والامام والمؤذن لا يستقر لقلة المرسوم للحاكم الدين أن يصرف من فاضل وقف المصالح والعمارة الى الامام والمؤذن باستصواب أهل الصلاح من أهل المحلة.

ولما فى الشامى: ۶۶۲/۱ طبع سعيد

قال فى المصفى الجلوس فى المسجد للحديث مأذون شرعا، لأن اهل الصفة كانوا يلازمون المسجد وكانوا ينامون ويتحدثون ، ولهذا لا يحل لأحد منعه، كذا فى الجامع البرهانى. أقول يؤخذ من هذا أن الامر الممنوع منه اذا وجد بعد الدخول بقصد العبادة لا يتناوله.

والله اعلم بالصواب: محمد زبیر غفرلہ ولوالدیہ

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ

فتویٰ نمبر:

۱۰ صفر الخیر ۱۴۳۳ھ

﴿ایک مسجد کی کارآمد چیز دوسری مسجد کو نقل کرنا جائز نہیں ہے﴾

﴿سوال﴾ میرے والد صاحب مسجد کے متولی ہیں، میرے بڑے بھائی نے مسجد کیلئے لاؤڈ اسپیکر خریدا ہے، اب ہم دوسری جگہ منتقل ہو گئے ہیں، محلے والے اسکی بیٹری وغیرہ کا خیال نہیں رکھتے اور چوری ہونے کا بھی خطرہ ہے، لہٰذا یہ لاؤڈ اسپیکر ہم اپنی دوسری مسجد میں منتقل کر سکتے ہیں یا نہیں؟

﴿جواب﴾ ایک مسجد کو وقف کی ہوئی چیز جب تک کارآمد ہے، دوسری مسجد کو دینا جائز نہیں ہے، البتہ اس مسجد کی ضرورت نہ رہے تو انتظامیہ کے فیصلے سے دوسری مسجد میں منتقل کرنا جائز ہے مذکورہ مسجد کے متولی آپکے والد ہیں، اسکی ذمہ داری ہے کہ لاؤڈ اسپیکر، بیٹری وغیرہ کی نگہداشت کریں خود نہیں کر سکتے تو کسی دوسرے کو یہ ذمہ داری سونپ دیں جو بخوشی قبول کرے اگر ایسی کوئی صورت نہیں بن سکتی تو لاؤڈ اسپیکر، بیٹری وغیرہ بیچ کر اسکے پیسوں سے مسجد کی دوسری ضرورت پوری کرے جسکے ضائع ہونے کا اندیشہ نہ ہو۔

لما فی التنویر مع الدر:(۴/۳۵۸، طبع سعید)

لو خرب ما حوله واستغنی عنه بقی مسجداً عند الامام والثانی) ابداً الی قیام الساعة (وبه یفتی)

وفی الشامیة:(قوله لو خرب ما حوله)ای ولو مع بقائه عامراً وكذا لو خرب ولیس له ما یعمر به وقد استغنی الناس عنه لبناء مسجد اٰخر (قوله عند الامام والثانی) فلا یعود میراثاً ولا یجوز نقله ونقل ماله الی مسجد آخر سواء كانوا یصلون فیه او لا وهو الفتوی حاوی القدسی.

ولما فی البحر الرائق:(۵/۲۵۱، طبع سعید)

وقال ابو یوسفؒ هو مسجد ابداً الی قیام الساعة لا یعود میراثاً ولا یجوز نقله ونقل ماله الی مسجد آخر سواء كانوا یصلون فیه او لا وهو الفتوی كذا فی حاوی القدسی وفی المجتبی واكثر المشایخ علی قول ابی یوسفؒ ورجح فی فتح القدیر قول ابی یوسفؒ بانه الاوجه قال واما الحصر والقنادیل فالصحیح من مذهب ابی یوسفؒ انه لا یعود الی ملك متخذه بل یحول الی مسجد آخر او یبیعه قیم المسجد للمسجد.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ　　　　واللہ اعلم بالصواب: اسلام بادشاہ بھیٹنی

۲۳ ربیع الاول ۱۴۳۰ھ　　　　فتویٰ نمبر ۲۱۱۰

﴿مسجد کے فرش یا دیوار سے تیمم کرنا مکروہ ہے﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں مفتیان کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ مسجد کے فرش یا دیوار کے ساتھ تیمم کرنا جائز ہے یا نہیں؟

مستفتی: عبدالواجد صاحب رائیونڈ

﴿جواب﴾ تیمم ہر اس چیز کے ساتھ کرنا جائز ہے جو زمین کی جنس میں سے ہو اور پاک ہو،

البتہ وہ مٹی جو مسجد کی دیوار کے ساتھ لگی ہوئی ہو یا فرش پر ہو تو اس سے بھی تیمم ہو جاتا ہے لیکن مکروہ ہے کیونکہ تیمم نجاست حکمی کے زائل کرنے کا سبب ہے اور مسجد کی مٹی کی طرف ازالۂ حدث کی نسبت کرنا مسجد کے آداب کے خلاف ہے، اسلئے مسجد کے فرش یا دیوار سے تیمم کرنے کو فقہاء کرام نے مکروہ لکھا ہے لیکن اگر مسجد کی مٹی کسی کونے میں جمع کر دی گئی ہو تو اس سے تیمم کرنے میں کوئی کراہت نہیں ہے۔

لمافی قاضیخان:(۱/۶۵،طبع قدیمی)

ویکرہ مسح الرجل من طین والردغة باسطوانة المسجداوبحائطه وان مسح بتراب فی المسجدان کان ذلک التراب مجموعافی ناحیة غیر منبسط لاباس به وان کان منبسطامفروشایکرہ لانه بمنزلة ارض المسجد.وفی خلاصة الفتاوی:(۱/۲۲۱،طبع رشیدیه)

ولمافی الولوالجیة:(۱/۵۳،طبع فاروقیه پشاور)

ویکرہ مسح الرجل من الطین والرذغة باسطوانة المسجدوحائط من حیطانه لان حکمه حکم المسجدوان مسح ببری المسجداوبقطعة حصیرملقاة فیه لاباس به لان حکمه لیس حکم المسجدولاله حکم حرمة المسجدکذاقالواوالاولی ان لایفعل وان مسح بتراب فی المسجدفان کان مجموعالاباس به وان کان منبسطایکرہ هوالمختاروالیه ذهب ابوالقاسم الصفار لان له حکم الارض فکان من المسجدوان مسح بخشبة موضوعة فی المسجدلاباس به لانه لیس لهذاالخشبة حکم المسجدفلایکون لهاحرمة المسجد.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفااللہ عنہ　　　　واللہ اعلم بالصواب: محمد سجاد

۱۴۲۹/۱۲/۱۹ھ　　　　فتوی نمبر: ۱۷۹۳

﴿مسجد کی بجلی اپنی دکان میں قیمتاً استعمال کرنے کا حکم﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام کہ ہمارے گاؤں میں ایک شخص نے مسجد کے میٹر سے اپنی دکان کے لئے بجلی لگائی ہے اور ہر ماہ آدھا بل ادا کرتا ہے، کیا اس شخص کے لئے ایسا کرنا جائز ہے۔ براہ کرم شرعاً اس مسئلہ کا حکم بیان فرما کر ممنون فرمائیں۔　　　مستفتی: محمد حنیف کرک

﴿جواب﴾ انتظامیہ نے مسجد کے مفاد میں دکاندار کو مسجد کے میٹر سے بجلی لینے کی اجازت اگر دی ہے اور دکاندار کی بجلی کا خرچہ کم اور مسجد کا زیادہ ہے، اس کے باوجود دکاندار آدھا بل برداشت کر رہا ہے تو اسمیں کوئی قباحت نہیں ہے۔

لمافی الخانیة بهامش الهندیة:(۳/۳۲۲،طبع رشیدیه)

قال الفقیه ابو جعفر رحمه الله تعالی اذالم یذکرالواقف فی صک الوقف اجارة الوقف

فرای القیم ان یوجرها ویرفعهامزارعة فماکان أدرّعلی الوقف وانفع للفقراء فعل.

ولما فی البحر:(۵/۲۲۹،طبع سعید)

قیم یبیح فناء المسجد لیتجر فیه القوم اویضع فیه سرر الاجرها لیتجر فیها الناس فلا باس اذاکان لصلاح المسجد.

ولما فی التنویر مع الدر:(۴/۴۰۲،طبع سعید)(ویوجر)باجر(المثل)(فلا)یجوز(بالاقل)

ولما فی الشامی:(۴/۴۰۷،طبع سعید)

فلاعلم صحة ایجار الموقوف علیه اذاکان معینابهذه الشروط ویشترط ایضاان یوجرباجرة المثل والاالم یصح کمامرعن قاری الهدایة.

الجواب صحیح:عبدالرحمٰن عفااللہ عنہ واللہ اعلم بالصواب:نثارمحمودکوہاٹی عفااللہ عنہ

۲۷صفر۱۴۳۰ھ فتویٰ نمبر:۱۹۴۵

﴿مسجد میں سلام کرنے کاحکم﴾

﴿سوال﴾ کیافرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کے ہمارے گاؤں میں اکثر لوگ مسجد میں آکرزور سے سلام کرتے ہیں اور مسجد میں لوگ ذکرواذکار،تلاوت،نوافل اور دعاؤں میں مشغول ہوتے ہیں،پوچھنا یہ ہے کہ اس صورت میں سلام کاجواب دیناواجب ہے؟ جبکہ بعض اوقات ہمیں سلام کرنے والے کے سلام کیطرف توجہ بھی نہیں ہوتی جسکی وجہ سے سلام کا جواب رہ جاتاہے۔

مستفتی:صابرگل کوہاٹی شکردرہ

﴿جواب﴾عام حالات میں جواب دینااگرچہ واجب اور باعث اجروثواب ہے،تاہم بعض جگہوں پرجواب دیناواجب نہیں رہتامثلاً تلاوت کرنے والے کو،اسی طرح ذکروفکر،دعا اورتسبیحات میں مشغول لوگوں کوکوئی سلام کرے توان پرجواب دیناواجب نہیں ہے،مسجد میں چونکہ انسان عموماًذکرہی میں مشغول رہتاہے،اس لئے جواب دیناکوئی ضروری نہیں ہے اور بہتر یہ ہے کہ مسجد میں عام لوگوں کوسلام نہ کریں،البتہ کوئی آپکی طرف متوجہ ہے توصرف اسی کوسلام کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں ہے۔

لمافی الشامی:(۱/۶۱۸،طبع سعید)

وفی شرح الشرعة:صرح الفقهاء بعدم وجوب الردفی بعض المواضع :القاضی اذاسلم علیه الخصمان،والأستاذالفقیه اذاسلم علیه تلمیذه أوغیره أوان الدرس،وسلام السائل،والمشتغل بقرأة القرآن،والدعاء حال شغله،والجالسین فی المسجدلتسبیح او قرأة اوذکرحال التذکیراه.وفی البزازیة لایجب الردعلی الامام والمؤذن والخطیب عند

الثانی، وهو الصحیح اھ. وینبغی وجوب الرد علی الفاسق، لأن كراهة السلام علیه للزجر فلا تنافی الوجوب علیه تأمل.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: نثار محمود کوہاٹی عفا اللہ عنہ

۲۷ جمادی الثانی ۱۴۳۰ھ — فتویٰ نمبر: ۲۳۳۳

﴿مسجد تنگ ہونے کی وجہ سے دوسرے محلے کے لوگوں کو اس مسجد سے منع کرنا﴾

﴿سوال﴾ ہمارے محلے میں ایک چھوٹی سی مسجد ہے جسکے اندرونی ہال میں تین صفیں ہیں اور باہر برآمدے میں دو صفیں ہیں عام دنوں میں نمازیوں کی تعداد کم ہوتی ہے لیکن رمضان المبارک میں مسجد بالکل بھر جاتی ہے، خاص طور پر نماز تراویح میں اور چند لوگ دوسرے محلے کے بھی اپنی مسجد چھوڑ کر یہاں نماز تراویح پڑھنے آجاتے ہیں جنکی وجہ سے پریشانی زیادہ ہوتی ہے۔

اگر یہ لوگ نہ آئیں تو محلے والوں کیلئے مسجد کافی ہے، اب کچھ لوگوں نے ان دوسرے محلے والوں کو اس مسجد میں آنے سے منع کر دیا کہ جگہ تنگ ہو جاتی ہے، کیا ان لوگوں کا یہ فعل درست ہے؟ کسی کو مذکورہ وجہ کی بنا پر مسجد میں آنے سے منع کیا جا سکتا ہے؟

﴿جواب﴾ دوسرے لوگوں کی وجہ سے اگر اہل محلہ کیلئے مسجد میں جگہ تنگ پڑ رہی ہو تو اہل محلہ کو چاہیے کہ وہ ایسے طریقے سے ان لوگوں سے معذرت کر لیں جس سے انکی ایسی دل آزاری نہ ہو کہ جسکی وجہ سے وہ نماز ہی چھوڑ دیں۔

اور بہتر صورت یہ ہے کہ اگر ممکن ہو تو مسجد میں توسیع کر دی جائے تا کہ نہ تو منع کرنے کی نوبت آئے اور نہ کسی کی دل آزاری ہو۔

لما فی الدر مع الرد: (۱/ ۶۶۲ طبع سعید)

بل ولأهل المحلة منع من لیس منهم عن الصلاة فیه۔ (قوله بل ولأهل المحلة الخ) قال فی القنیة: وكذا الأهل المحلة أن یمنعوا من لیس منهم عن الصلاة فیه اذا ضاق بهم المسجد.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم: شاہد اسحاق عفا اللہ عنہ

۵ جمادی الثانی ۱۴۲۷ھ — فتویٰ نمبر: ۳۷۳

﴿مسجد میں دنیاوی باتیں کرنا کیسا ہے؟﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلے کہ بارے میں کہ مسجد میں دنیاوی باتیں

کرنا جائز ہے یا نہیں؟ بینوا توجروا۔

﴿جواب﴾ مسجد میں دنیاوی باتوں کی غرض سے بیٹھنا اور باتیں کرنا درست نہیں کیونکہ مسجد دنیاوی امور کیلئے نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کی عبادت کیلئے بنائی گئی ہے، البتہ اگر کوئی آدمی عبادت کی غرض سے مسجد میں داخل ہوا تو اسے بھی حتی الوسع کوشش کرنی چاہیے کہ دنیاوی باتوں سے بچے لیکن اگر باتیں کرنے کی نوبت آجائے تو ایسی باتوں سے اجتناب کرے جن میں منکرات "غیبت، جھوٹ، فحش باتیں وغیرہ" شامل ہوں، اتفاق سے دنیاوی جائز باتیں ہو جائیں تو اس کی گنجائش ہے۔

لمافی الدر مع الرد:(۲/۴۴۶ طبع امدادیه)

والكلام المباح وقيده في الظهيرية بأن يجلس لأجله لكن في النهر الاطلاق أوجه. وفي الشامية: قوله: (بأن يجلس لأجله) فانه حينئذ لا يباح بالاتفاق لأن المسجد مابني لأمور الدنيا وفي صلاة الجلابي: الكلام المباح من حديث الدنيا يجوز في المساجد وان كان الاولى أن يشتغل بذكر الله تعالىٰ، كذافي التمرتاشي هندية. وقال البيري مانصه: وفي المدارك ومن الناس من يشتري لهو الحديث المراد بالحديث الحديث المنكر لما جاء "الحديث في المسجد يأكل الحسنات كما تأكل البهيمة الحشيش" انتهى فقد أفاد أن المنع خاص بالمنكر من القول أما المباح فلا. قال في المصفى: الجلوس في المسجد للحديث مأذون شرعا لأن أهل الصفة كانوا يلازمون المسجد وكانوا ينامون ويتحدثون ولهذا لا يحل لأحد منعه كذافي الجامع البرهاني أقول يؤخذ من هذا أن الأمر الممنوع منه اذا وجد بعد الدخول بقصد العبادة لا يتناوله. (الاطلاق أوجه) بحث مخالف للمنقول مع مافيه من شدة الحرج.

ولمافي اعلاء السنن:(۵/۱۸۶ طبع دار الكتب العلمية بيروت)

قوله: عن أنس الخ وعن عبدالله الخ قال المؤلف: دلالتهما على كراهة كلام الدنيا في المسجد ظاهرة وفي "البحر الرائق" وصرح في "الظهيرية" بكراهة الحديث أي كلام الناس في المسجد لكن قيده بأن يجلس لأجله وفي "فتح القدير": الكلام المباح فيه مكروه يأكل الحسنات (قلت: قوله يأكل الحسنات جزء من الحديث الذي لا أصل له وسنذكره عن قريب) وينبغي تقييده بما في "الظهيرية" أما ان جلس للعبادة ثم بعدها تكلم فلا (۲:۴۹) قلت: ينبغي أن يتقي منه حق الاتقاء ثم بعد ذلك ان تكلم فيه لا بأس به فان في الحذر كل الحذر منه حرج عظيم وما جعل الله في الدين من حرج وفي "نفع المفتي والسائل" وأما حديث: "من تكلم في المسجد بكلام الدنيا أحبط الله أعماله" قال الصنعاني: انه موضوع وكذا "الحديث في المسجد يأكل الحسنات كما تأكل البهيمة الحشيش" قال الفيروز آبادي: لم يوجد كذافي "موضوعات الشوكاني".

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ　　　　واللہ اعلم: شاہد اسحاق عفا اللہ عنہ

۱۲ جمادی الثانی ۱۴۲۷ھ　　　　فتویٰ نمبر: ۴۰۲

﴿مسجد کے احاطہ میں لگے ہوئے درخت کے پھلوں کا حکم﴾

﴿سوال﴾ اکثر مساجد کے احاطہ میں پھل دار درخت لگے ہوتے ہیں اور ان درختوں پر پھل بھی آتا ہے تو کیا نمازیوں کیلئے یا دوسرے لوگوں کیلئے ان درختوں سے پھل کھانا جائز ہے؟

﴿جواب﴾ مسجد کے احاطہ میں اگر درخت اسی لئے لگائے گئے ہیں کہ سب لوگ ان سے پھل کھائیں تو نمازیوں اور غیر نمازیوں سب کیلئے کھانا درست ہے اور اگر مسجد کیلئے لگائے گئے ہیں یا کچھ حال معلوم نہیں تو ان کو فروخت کر کے رقم مسجد کے کاموں میں صرف کرنی چاہیے۔

لما فی الدر المختار:(۴/۴۳۲،طبع سعید)

غرس فی المسجد اشجاراً تثمر ان غرس للسبیل فلکل مسلم الاکل والا فتباع لمصالح المسجد الخ.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم: شاہد اسحاق عفا اللہ عنہ

۲۳ جمادی الاولی ۱۴۲۷ھ — فتویٰ نمبر: ۳۲۷

﴿مسجد نبوی ﷺ کی موجودہ توسیع کا حکم﴾

﴿سوال﴾ حدیث پاک میں جو مسجد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں نماز پڑھنے کی فضیلت بیان ہوئی ہے "صلاۃ فی مسجدی ھذا خیر من الف صلاۃ فیما سواہ الا المسجد الحرام" (بخاری شریف: ۱/۱۵۹، طبع قدیمی) کیا یہ فضیلت صرف اسی حصہ کیلئے ہوگی جو نبی ﷺ کے زمانے میں مسجد میں شامل تھا یا بعد میں جو توسیع ہوئی اسکے لئے بھی یہ فضیلت ہوگی؟

﴿جواب﴾ یہ فضیلت صرف اسی حصہ کے ساتھ خاص نہیں جو حصہ نبی علیہ الصلاۃ والسلام کے زمانہ میں مسجد نبوی شمار ہوتا تھا بلکہ بعد میں جو توسیع کی گئی یہ فضیلت اسکے لئے بھی ہے۔

لما فی التنویر مع الدر:(۱/۶۲۶،طبع سعید)

فائدۃ: لما کان الاعتبار للتسمیۃ عندنا لم یختص ثواب الصلاۃ فی مسجدہ علیہ الصلوۃ والسلام بما کان فی زمنہ فلیحفظ. وفی الشامیۃ: قولہ (فائدۃ لما کان الخ) استنبط ھذہ الفائدۃ من مسألۃ الاقتداء شیخ الاسلام العینی فی شرح البخاری کما فی أحکام الاشارۃ من الاشباہ. وأصل ذلک قولہ صلی اللہ علیہ وسلم فی الحدیث الصحیح "صلاۃ فی مسجدی ھذا خیر من الف صلاۃ فیما سواہ الا المسجد الحرام" ومعلوم أنہ قد زید فی المسجد النبوی، فقد زاد فیہ عمر ثم عثمان ثم الولید ثم المھدی والاشارۃ بھذا الی المسجد المضاف المنسوب الیہ صلی اللہ علیہ وسلم ولا شک ان جمیع

المسجد الموجود الآن يسمى مسجده صلى الله عليه وسلم فقد اتفقت الاشارة والتسمية على شئ واحد فلم تلغ التسمية فتحصل المضاعفة المذكورة في الحديث فيما زيد فيه وخصها الامام النووي بما كان في زمنه صلى الله عليه وسلم عملا بالاشارة واما حديث "لو مد مسجدي هذا الى صنعاء كان مسجدي" فقد اشتد ضعف طرقه فلا يعمل به في فضائل الاعمال كما ذكره السخاوي في المقاصد الحسنه وكان وجهه أنه جعل الاشارة لخصوص البقعة الموجودة يومئذ فلم تدخل فيها الزيادة ولا بد في دخولها من دليل قلت ويؤيده ماسيأتي في الأيمان من باب اليمين بالدخول عن البدائع لو قال لا ادخل هذا المسجد فزيد فيه حصة فدخلها لم يحنث مالم يقل مسجد بني فلان فيحنث وكذا الدار لانه عقد يمينه على الاضافة وذلك موجود في الزيادة وقد يجاب بأن مانحن فيه من قبيل الثاني ويؤيده أن في بعض طرق الحديث بدون اسم الاشارة وعلى ذكرها فهي لا لتخصيص البقعة بل لدفع أن يتوهم دخول غير المسجد المدني من بقية المساجد التي تنسب اليه صلى الله عليه وسلم التي ذكرها اصحاب السير.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفااللہ عنہ — واللہ اعلم: شاہد اسحاق عفااللہ عنہ

۲۸ محرم الحرام ۱۴۲۷ھ — فتویٰ نمبر: ۲۶

﴿غیر مسلم کا مسجد میں آنا کیسا ہے؟﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں مفتیان کرام اس مسئلہ کے متعلق کہ ایک چھوٹی سی مسجد ہے جس کے اندر ایک چھوٹا سا کمرہ ہے جس میں ایک عالم دین کی رہائش ہے کچھ دنوں پہلے موصوف عالم بیمار ہوئے تو ان کی ایک سکھ معالج نے تشخیص کی، اس پر مذکورہ عالم کو تردد تھا کہ ایک غیر مسلم کا مسجد میں آنا درست ہے یا نہیں؟ جبکہ مسجد کے ساتھ یا باہر کوئی ایسی جگہ نہ تھی جہاں یہ ان کو ٹھہراتے، شرعاً اس کا کیا حکم ہے؟ کیا اس کا مسجد سے گزر کر جانا درست تھا یا نہیں؟ مستفتی: حسین

﴿جواب﴾ مصالح مسجد یا دوسرے اہم اور ضروری کام کی بناء پر کافر، ذمی کے مسجد میں داخل ہونے میں کوئی حرج نہیں، مذکورہ عالم کو تردد نہیں ہونا چاہیے۔

لما في الشامي: (۶/۵۷۵، طبع امدادیہ)

ولا بأس أن يدخل الكافر وأهل الذمة المسجد الحرام وبيت المقدس وسائر المساجد لمصالح المسجد وغيرها من المهمات اه ومفهومه أن في دخوله لغير مهمة بأسا وبه يتجه ما هنا، فافهم.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفااللہ عنہ — واللہ اعلم: محمد عزیز چترالی

۲۲ جمادی الثانی ۱۴۲۷ھ — فتویٰ نمبر: ۲۵۳

﴿مسجد کے مصالح میں شامل کمرے کا حکم﴾

﴿سوال﴾ گاؤں دیہات میں چونکہ سردی کے موسم میں انتہائی ٹھنڈ ہوتی ہے جس سے بچاؤ کے لئے مسجد کے ساتھ ایک اور کمرہ بھی بعض علاقوں میں بنایا جاتا ہے، نمازی حضرات وضو کرنے کے بعد اُسمیں سلگنے والی آگ سے حرارت حاصل کرتے ہیں اور پھر نماز کیلئے چلے جاتے ہیں، اُس میں اکثر و بیشتر یہ ہوتا ہے کہ لوگ دنیاوی باتیں کرتے ہیں، بعض لوگ غیبت بھی کرتے ہیں، کیا ایسا کمرہ جو مسجد کے ساتھ ملا ہوا ہو یا الگ ہو (مقصد سردی میں آگ کی تپش سے استفادہ ہوتا ہے) اس میں دنیوی باتیں کرنا ممنوع تو نہیں ہے؟ یعنی کیا مسجد کا حکم رکھتا ہے؟ جبکہ بعض لوگ سنتیں بھی وہیں پڑھنے کا اہتمام کرتے ہیں۔

﴿جواب﴾ ایسے کمرے پر مسجد کا حکم لاگو نہیں ہوگا کیونکہ اس کے بنانے کا مقصد اس میں آگ وغیرہ جلانے کے ذریعے سردی سے بچاؤ کا سامان کرنا ہوتا ہے اور مسجد کے بنانے کا مقصد نمازوں کی ادائیگی ہوتا ہے۔

لہٰذا مسئولہ صورت میں مذکورہ کمرہ مسجد کے مصالح میں تو ضرور شامل ہے، تاہم مسجد کے احکام جیسے آداب وغیرہ اس پر مرتب نہیں ہونگے۔

جہاں تک غیبت اور فضول گوئی کا تعلق ہے وہ تو شریعت میں ہے ہی ناپسندیدہ اور غیبت تو حرام ہے جس سے قرآنِ کریم نے شدّ ومد سے منع فرمادیا ہے، نیز دنیوی گفتگو سے بھی احادیثِ مبارکہ میں متعدد بار بچنے کی ترغیب وارد ہوئی ہے۔

لمافی التنویر مع الدر: (۴/۳۵۷-۳۵۸، طبع سعید)

واذا جعل تحته سردابا لمصالحه جاز ولو جعل لغيرها او جعل فوقه بيتا وجعل باب المسجد الىٰ طريق وعزله عن ملكه لا) يكون مسجدا (وله بيعه ويورث عنه)

وفي الشامية: قال في البحر: وحاصله ان شرط كونه مسجدا ان يكون سفله وعلوه مسجدا لينقطع حق العبد عنه لقوله تعالىٰ "وان المساجد لله" بخلاف ما اذا كان السرداب والعلو موقوفا لمصالح المسجد فهو كسرداب بيت المقدس هذا هو ظاهر الرواية.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ　　　　واللہ اعلم: محمد شریف حسین عفا اللہ عنہ

۲۸ ربیع الثانی ۱۴۲۷ھ　　　　فتویٰ نمبر: ۲۲۴

﴿ویران مسجد کو مدرسہ میں تبدیل کرنے کا حکم﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں مفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک پرانی اور ویران مسجد ہے جس میں کوئی نماز نہیں پڑھتا جس کا اکثر حصہ منہدم ہو چکا ہے تو کیا اس کو مدرسہ بنانے کی شریعت میں گنجائش ہے یا نہیں؟ مستفتی: عزیز اللہ

﴿جواب﴾ جس جگہ ایک مرتبہ مسجد بنائی گئی وہ قیامت تک مسجد ہی کے حکم میں رہے گی، اس کو مسجد کے علاوہ کسی اور مقصد کے لئے استعمال کرنا ہرگز درست نہیں، لہٰذا پرانی مسجد کو مدرسہ میں تبدیل کرنا ناجائز ہے، یہ جگہ مسجد ہی رہے گی اور مسجد کے تمام آداب کا خیال رکھنا ضروری ہے البتہ مدرسہ بنانے سے مراد اس جگہ پڑھائی اگر ہے تو اس میں پڑھائی جائز ہے لیکن یہ مسجد ہی رہے گی۔

لمافی الدر المختار: (۶/۵۴۸ طبع امدادیہ)

ولو خرب ما حوله واستغنیٰ عنه يبقى مسجداً عند الامام والثانی أبداً الی قيام الساعة وبه يفتی.

ولمافی البحر الرائق: (۵/۲۵۱ طبع سعید)

- حكم المسجد بعد خرابه وقد اختلف فيه الشيخان فقال محمد اذا خرب وليس له ما يعمر به وقد استغنی الناس عنه لبناء مسجد آخر أو لخراب القرية أو لم يخرب لكن خربت القرية بنقل أهلها واستغنوا عنه فانه يعود الی ملک الواقف أو ورثته وقال أبو يوسف هو مسجد أبداً الی قيام الساعة لا يعود ميراثاً ولا يجوز نقله ونقل ماله الی مسجد آخر سواء كانوا يصلون فيه أو لا وهو الفتوی.

واللہ اعلم: صلاح الدین چترالی — الجواب صحیح: عبد الرحمن عفا اللہ عنہ

فتویٰ نمبر: ۱۴۳ — ۱۶ ربیع الثانی ۱۴۲۷ھ

﴿مسجد میں اخبارات لانے کا حکم﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام کہ مسجد میں اخبارات لانا اور لگوانا کیسا ہے؟

﴿جواب﴾ مسجد میں اخبارات لانا، لگوانا دونوں جائز نہیں کیونکہ اخبارات میں عموماً تصاویر اور دنیاوی باتیں ہوتی ہیں اور احادیث میں ہے کہ جہاں پر تصاویر ہوں وہاں رحمت کے فرشتے نہیں آتے، اسی طرح جو شخص مسجد کے اندر دنیاوی باتوں میں مشغول ہو تو اللہ تعالیٰ اسکے اعمال کو ضائع کر دیتے ہے اور وہ اخبارات جن میں تصاویر نہ ہوں تو کم از کم وہ دنیاوی باتوں پر مشتمل ہوتے ہیں، اسلئے ایسے اخبارات کو بھی مسجد میں لانا مناسب نہیں ہے۔

لما في اعلاء السنن:(۱۸۶/۵ طبع دار الكتب العلمية)
من تكلم في المسجد بكلام الدنيا احبط الله اعماله.
ولما في الكبيري:(ص ۵۲۸ طبع سهيل اكيڈمي)
والكلام المباح فيه مكروه ويأكل الحسنات كما تأكل البهيمة الحشيش كذا ذكره حديثاً صاحب الكشاف.
ولما في الشامي:(۶۶۲/۱ طبع سعيد) لان المسجد ما بني لامور الدنيا.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ   واللہ اعلم بالصواب: اسرار عزیز دیروی

۲۸ ربیع الاول ۱۴۲۸ھ   فتویٰ نمبر: ۷۱۳

﴿وضاحت از مستفتی مسئلہ در بارہ مسجد میں اخبارات لانا﴾

﴿سوال﴾ آپ کا فتویٰ مورخہ ۲۸ ربیع الاول ۱۴۲۸ھ کو ملا پڑھ کر خوشی ہوئی محترم مولانا صاحب فتویٰ میں اصل جس بات کی ضرورت ہے وہ یہ کہ منتظم مسجد یا مدرسہ خود اخبار منگواتے ہیں جو کہ مدرسہ میں یا مسجد میں آتے ہیں اس مسئلہ پر کچھ پوچھنے کی جسارت اسلئے ہوئی کہ کچھ عرصہ پہلے مسجد میں فجر کی نماز کیلئے داخل ہوئے تو اخبار پہلے آیا پڑا تھا (ابھی جماعت کا وقت نہیں ہوا تھا) بے ساختہ منہ سے نکلا کہ نمازیوں سے پہلے روپے دیکر شیطان کو مسجد میں داخل کر رہے ہیں۔

اخبار بھی وہ تھا جس میں مختلف عورتوں کی نیم عریاں تصاویر ہوتی ہیں، غرض یہ ہے کہ یہ ناجائز ہے، حرام ہے اور قابل سزا اور جرم ہے، آپ نے جو فتویٰ دیا تھا اس میں ایسا لگتا ہے کہ کوئی شخص اگر لے کر آتا ہے مگر یہاں تو امام صاحب اور منتظمہ کمیٹی خود منگواتے ہیں، کیا آپ کے خیال میں یہ وفاق المدارس کی توجہ طلب بات نہیں اور علماء دین کا کیا حق ہے۔

میرے خیال میں امام حضرات، علماء حضرات اپنے گھروں میں اس کی پابندی کریں کیونکہ بچوں اور مہمانوں پر بھی اثر لازمی ہوتا ہے لیکن آج کل سب سے بڑے دو بنیادی ظلم عام ہیں جس کو کچھ حضرات ضرورت کے تحت اجازت دے رہے ہیں۔

(۱) T.V ساری دنیا کے channal خرافات ننگی تصاویر اور اس کے علاوہ بچوں کے پروگرام میں چھوٹے بچوں کو یعنی لڑکے لڑکی کو شراب پیتا دکھا کر بوس و کنار دکھا رہے ہیں۔

(۲) inter net بیوپار کی ضرورت مگر معاشقے اور پھر رشتے، میل ملاپ اگر شادی ہوئی اختلافات میں کوئی بزرگ بیچ بچاؤ نہیں کر سکتا! نتیجہ...... اور دیگر ممالک امریکہ یورپ میں

اتنی طلاقیں اور بدمعاشی ان سے پھیلی ہوئی ہے جس کا اندازہ نہیں لگا سکتے، اب سنا ہے کہ امریکہ کے تھنک ٹینک نے اپنی نئی نسل کی پستی کا سبب ہی بدمعاشی اور عورت مرد کے ملاپ کو بتایا ہے، امریکہ میں اب سنا ہے کہ نئی یونیورسٹیاں لڑکیوں کی علیحدہ شہر میں اور لڑکوں کی علیحدہ شہر میں بن رہی ہیں کیونکہ مخلوط تعلیم بھی تعلیم کے معیار کو تباہ و برباد کر رہی ہیں۔

﴿جواب﴾ (۱) اگر کوئی شخص اپنے آپکو حالات سے باخبر رکھنے کیلئے تصاویر سے نظروں کو بچاتے ہوئے اخبار دیکھے تو یہ ناجائز نہیں ہے، بات صرف مسجد میں اخبار لانے کی ہے اور وہ اس لئے ناجائز ہے کہ اس میں تصاویر اور دنیاوی باتیں ہوتی ہیں، اب چاہے منتظمین مسجد میں سے کوئی لائے یا منتظمین مدرسہ میں سے کوئی لائے ہر صورت میں ناجائز ہے، اس لئے کہ کوئی ناجائز کام کسی خاص آدمی کے کرنے سے جائز نہیں ہو جاتا۔

رہی بات وفاق المدارس کی تو وفاق المدارس علماء حق کا ایک تعلیمی بورڈ ہے جو تعلیمی نگرانی کیلئے بنایا گیا ہے، مسجد یا مدرسہ کے علماء کی نگرانی اس کے ذمہ نہیں ہے یہ تو ہر ادارے کے منتظمین کی ذمہ داری ہے کہ وہ حضرات اس کا نوٹس لیں۔

(۲) ٹی وی کے بارے میں جمہور علماء کا موقف یہ ہے کہ ٹی وی دیکھنا ناجائز اور حرام ہے کیونکہ اس کی وضع ہی معاشرے کو بگاڑنے کیلئے کی گئی ہے اگر چہ اس کے کچھ فائدے بھی ہیں لیکن فائدوں کا پہلو مغلوب اور شر کا پہلو غالب ہے۔

(۳) انٹرنیٹ جہاں بہت سارے خرافات اور مفاسد پر مشتمل ہے تو دوسری طرف اس کے کچھ فوائد اور ضروریات بھی ہیں اگر کوئی شخص خرافات سے بچتے ہوئے ان ضروریات کیلئے اس کو استعمال کرتا ہے تو اس کی گنجائش ہے، لہٰذا بالکل اس کو ناجائز اور حرام کہنا مشکل ہے۔

لمافی قوله تعالیٰ:(سورة لقمان پ ۲۱ آیت ۶)

﴿ومن الناس من یشتری لهو الحدیث لیضل عن سبیل الله بغیر علم ویتخذها هزوا﴾

ولمافی الصحیح لمسلم:(۲/۱۲۲ طبع قدیمی)الا کلکم راع وکلکم مسئول عن رعیته.

ولمافی الهندیة:(۵/۷۷ طبع رشیدیه)

السؤال عن الاخبار المحدثة فی البلدة وغیر ذلک المختار انه لاباس بالاستخبار والاخبار کذا فی الخلاصة.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ واللہ اعلم بالصواب: اسرار عزیز دیروی

۲۳ ربیع الثانی ۱۴۲۸ھ فتویٰ نمبر: ۸۱۱

﴿مسجد میں آرام کی غرض سے بیٹھ کر ذکر کرنا﴾

﴿سوال﴾ کیافرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ مسجد میں آدمی آرام کی غرض سے بیٹھارہے ساتھ ذکر بھی کرتا رہے تو کیا اسکو ذکر کا ثواب ملے گا؟ مستفتی: محمد دین

﴿جواب﴾ مذکورہ بالاصورت میں اسکو ذکر کا ثواب ضرور ملے گااور اعتکاف کی نیت بھی کرلے تو زیادہ بہتر ہے۔

لمافی روح المعانی:(ج۲۲ص۳۰۰،سورۃالاحزاب،ایت۴۱،طبع رشیدیہ)

یاایھاالذین امنوااذکرواالله ذکراکثیرا...... الآیة.

وکذافی جامع الترمذی:(۱۷۳/۲،طبع فاروقی کتب خانہ ملتان)

ولمافی قاضیخان ھامش الھندیة:(۶۶/۱،طبع رشیدیہ)

ولاباس للجلوس فی المسجدلغیرالصلاۃ لکن لوتلف به شیء یضمن.

ولمافی الھندیة:(۳۲۱/۵،طبع رشیدیہ کوئٹہ)

ومن حرمة المسجد..... الخامس عشران یکثرفیه ذکرالله تعالی کذافی الغرائب.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفااللہ عنہ واللہ اعلم بالصواب: بلال احمد غفراللہ لہ

۲۰ربیع الثانی ۱۴۲۸ھ فتویٰ نمبر:۸۰۲

﴿مسجد کے برآمدہ سے باہر متصل صحن کا حکم﴾

﴿سوال﴾ کیافرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ہمارے علاقے میں مسجد کے برآمدہ سے باہر والے حصے کو مسجد کی حدود سے خارج سمجھا جاتا ہے،عموما لوگ اس جگہ کو جوتیاں اتارنے اور مسجد کے دوسرے کاموں میں استعمال کرتے ہیں ہمارے گاؤں کی مسجد کے مذکورہ حصہ پر اہل مسجد ایک باغیچہ بنانے کے خواہشمند ہیں چونکہ گھاس وغیرہ لگانے کے لئے گوبر کا استعمال کرنا ناگزیر ہوتا ہے،اسلئے پوچھنا یہ ہے کہ یہ حصہ مسجد کے حکم میں داخل ہے یانہیں؟

﴿جواب﴾ صورت مسئولہ کے مطابق مسجد بناتے وقت واقف (وقف کرنے والا) نے اگر اس حصہ کو بھی مسجد میں شامل کرنے کی نیت کی ہو تو یہ بھی مسجد کے حکم میں ہوگا،البتہ اس حصہ کو نیت کرتے وقت شامل نہ کیا ہو اور بظاہر ایسا ہی ہوگا،جیسا کہ سوال میں علاقہ کی ترتیب بتائی گئی ہے تو اس صورت میں مسجد کا حکم نہیں ہوگا اور اس میں گھاس وغیرہ لگانے کے لئے گوبر کا استعمال کرنا بھی درست ہوگا۔

لمافی الهندیة:(۴۵۹/۲،طبع رشیدیه)

ولواراد ان یقف ارضه علی المسجد وعمارة المسجد...... یقول وقفت ارضی هذه و یبین حدودها بحقوقها ومرافقها وقفا مؤبدا فی حیاتی وبعد وفاتی الخ.

ولمافی الشامی:(۶۵۶/۱-۶۵۷،طبع سعید)

(قوله ولاتطیینه بنجس)فی الفتاوی الهندیة یکره ان یطین المسجد بطین قد بل بماء نجس بخلاف السرقین اذاجعل فیه الطین لان فی ذلک ضرورة وهوتحصیل غرض لا یحصل الا به کذافی السراجیة اه......(قوله کفناء مسجد)هوالمکان المتصل به لیس بینه و بینه طریق فهوالمتخذ لصلاة الجنازة أوعید فیماذکرمن جوازالاقتداء رحل دخوله لجنب ونحوه.

الجواب صحیح:عبدالرحمٰن عفااللہ عنہ — واللہ اعلم:محمد اسلم چترالی غفرلہ

۱۷ ربیع الثانی ۱۴۲۹ھ — فتویٰ نمبر:۱۳۲۳

﴿کچی پیاز اور لہسن کھا کر مسجد جانے کا حکم﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ کچی پیاز اور لہسن کھانے کا کیا حکم ہے؟ کھانے کے بعد بدون کلی کئے مسجد جانے کا کیا حکم ہے؟ نیز سگریٹ نوشی کے بعد بدبودار منہ کے ساتھ مسجد جانا کیسا ہے؟ مدلل جواب مطلوب ہے۔ مستفتی:محمد ناصر

﴿جواب﴾ کچی پیاز اور لہسن کھانا بلا کراہت جائز ہے،البتہ کھانے کے بعد اگر منہ سے بدبو آئے،اسی طرح سگریٹ نوشی کے بعد بدبودار منہ کے ساتھ مسجد جانا مکروہ ہے،جس سے بچنا چاہیے،مسجد میں نمازیوں کے علاوہ فرشتوں کو بھی بدبو سے تکلیف ہوتی ہے،ویسے تو فقہاء کرام نے ایسی حالت میں عام مجالس میں بھی جانے کو مکروہ لکھا ہے،لہٰذا مسواک یا منجن وغیرہ سے بدبو کو زائل کرنے کے بعد جانا چاہیے۔

لمافی الصحیح لمسلم:(۱۸۳/۲،طبع قدیمی)

عن ابی ایوب الانصاری قال کان رسول اللہ ﷺ اذااتی بطعام اکل منه وبعث بفضلة الی وانه بعث الی یوما بفضلة لم یاکل منها لان فیها ثوما فسالته احرام هوقال لا و لکنی اکرهه من اجل ریحه.

ولمافی الشامی:(۶۶۱/۱،طبع ایچ ایم سعید)

(قوله واکل نحو ثوم)ای کبصل ونحوه مماله رائحة کریهة،للحدیث الصحیح فی النهی عن قربان آکل الثوم والبصل لمسجد.

قال الامام العینی:فی شرحه علی صحیح البخاری،قلت علة النهی اذی الملئکة و

اذی المسلمین ولا یختص بمسجده علیه السلام بل الکل سواء لروایة مساجدنا بالجمع......وانما خص الثوم هنا بالذکر وفی غیره ایضا بالبصل والکراث لکثرة اکلهم لها وکذلک الحق بعضهم بذلک من بفیه بخر او به جرح له رائحة وکذلک القصاب والسماك والمجذوم والابرص اولی بالالحاق.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: محمد اسلم چترالی غفرلہ

۲۰ ربیع الثانی ۱۴۲۹ھ — فتویٰ نمبر: ۱۳۳۶

﴿مسجد میں کرسی پر بیٹھ کر وعظ کرنا درست ہے﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ آج کل اکثر علماء مساجد میں کرسی پر بیٹھ کر وعظ وخطاب فرماتے ہیں، کیا مسجد میں کرسی رکھ کر وعظ کرنا درست ہے؟

﴿جواب﴾ جی ہاں! جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مسجد میں کرسی پر تشریف فرما کر وعظ فرمانا حدیث سے ثابت ہے۔

لما فی فتح الملهم:(۲۸۶/۵-۲۸۷، طبع دار العلوم کراچی)

عن ابی رفاعة قال انتهیت الی النبی صلی الله علیه وسلم وهو یخطب، قال: فقلت: یارسول الله رجل غریب جاء یسئل عن دینه لا یدری ما دینه؟ قال: فاقبل علی رسول الله صلی الله علیه وسلم وترك خطبته حتی انتهی الی فأتی بکرسی قوائمه حدیدا، قال فقعد علیه رسول الله صلی الله علیه وسلم وجعل یعلمنی مما علمه الله ثم اتی خطبته فاتم آخرها.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم: محمد اسلم چترالی غفرلہ

۲۶ رجب المرجب ۱۴۲۹ھ — فتویٰ نمبر: ۱۶۹۷

﴿مسجد ایک دفعہ بن جانے کے بعد کسی بھی غرض سے اسکا گرانا ناجائز اور سخت گناہ ہے﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک مسجد جو کہ کافی عرصہ ہوگیا بنائی گئی ہے کسی کی ملکیت پر قبضہ کر کے نہیں بلکہ باقاعدہ اس کیلئے زمین وقف کی گئی تھی اور آج تک اسمیں پانچوں نمازیں باجماعت ادا کیجاتی ہیں اب ایک کمپنی والے کہتے ہیں کہ ہم یہاں ایک ٹاور بنانا چاہتے ہیں اور اس مسجد کو گرا کر دوسری جگہ اس سے بہتر مسجد بنانا چاہتے ہیں، تو کیا اس مسجد کو گرا کر اسکے بدلے دوسری مسجد بنانا جائز ہے یا نہیں؟ شریعت میں اسکی گنجائش ہے؟ اگر نہیں ہے تو یہاں آباد اور آس پاس کے لوگوں کی ذمہ داری ہے کہ وہ اس کمپنی والوں

کواس طرح کرنے سے روکیں؟ براہ کرم قرآن، حدیث اور فقہ اسلامی کی روشنی میں جواب دیکر ممنون فرمائیں۔
مستفتی: ایک سائل

﴿جواب﴾ دنیا کے چاروں مذاہب کا متفقہ فیصلہ ہے یعنی اس بات پر پوری امت مسلمہ کا اتفاق ہے کہ زمین کے کسی بھی خطہ پر جب ایک بار مسجد بن جاتی ہے اور اسمیں باقاعدہ نماز بھی شروع ہوجاتی ہے تو زمین کے اس حصہ کی نسبت اب صرف اللہ تعالی ہی کیطرف ہوگی اور قیامت تک یہ جگہ اب مسجد ہی رہیگی چاہے مسجد کی تعمیر بھی باقی نہ رہے یا وہاں کے لوگوں کیلئے اس سے بہتر اور بڑی مسجد کا دوسری جگہ انتظام بھی کرلیا جائے۔ وہ جگہ اب مسجد ہی کے استعمال میں آسکتی ہے کسی دوسرے مقصد کیلئے اسکا استعمال ہرگز جائز نہیں۔

مساجد دین اسلام کے شعائر ہیں انکا احترام ایمان کا حصہ ہے، لہذا کسی فرد یا کمپنی کیلئے اسکی کوئی گنجائش نہیں ہے کہ مسجد کو اس غرض سے شہید کرے کہ یہاں ٹاور بنے گا یا کوئی دوسرا مفید عام کام ہوگا۔ یہ خالص شرعی حق ہے اس لئے اہل محلہ کو بھی کوئی حق حاصل نہیں کہ وہ اس کمپنی کے ساتھ اتفاق کریں اور کمپنی کے اس پیشکش کو قبول کرلیں۔ تمام مسلمانوں کی ذمہ داری ہے خصوصا آس پاس کے لوگوں کی کہ وہ اس کمپنی کو اس بڑے ظلم سے روکیں۔ قرآن کریم میں اس شخص کو سب سے بڑا ظالم ٹھہرایا گیا ہے جو مسجد کو نقصان پہنچائے، اس میں عبادت کرنے سے لوگوں کیلئے رکاوٹ بنے خصوصا اس کو گرا کر وہ جگہ دوسرے مقاصد کیلئے اگر استعمال کرے۔ کمپنی والوں کو بھی چاہیئے کہ اللہ تعالی کے عذاب سے ڈریں۔ مسجد کی جگہ ٹاور بنا کر دنیاوی جس فائدہ یا عزت کا یہ لوگ جو خواب دیکھ رہے ہیں اسکی حیثیت محض ایک وہم وخیال سے زیادہ نہیں ہے یہ شیطانی وسوسہ ہے جسکا نتیجہ دنیا وآخرت میں بڑا خطرناک ظاہر ہوگا۔

شرعی حکم بتانے کے ساتھ ساتھ ہم کمپنی والوں کو خیر خواہانہ مشورہ بھی دیتے ہیں کہ یہ لوگ اس ارادہ کو ترک کرلیں، دنیاوی اغراض ومقاصد کو پورا کرنے کیلئے اور بہت سے مواقع ہیں۔

لمافی قوله تعالی سورة البقرة الآية ۱۱۴: ﴿ومن اظلم ممن منع مساجدالله ان يذكر فيها اسمه وسعى فى خرابها اولئك ماكان لهم ان يدخلوها الا خائفين لهم فى الدنيا خزى ولهم فى الآخرة عذاب عظيم﴾

ولمافى احكام القرآن للجصاص (۱/۸۷ قديمى)

قال الجصاص فى تفسير الآية المباركة: ومن اظلم ممن منع مساجدالله ....الخ

ممایدل علی انه عام فی سائر المساجد انه غیر مقصور علی بیت المقدس خاصة اوالمسجد الحرام خاصة اطلاقه ذلک فی المساجد فلایخص شئی منه الابدلالة۔

ولما فی فقه السنة (۳/۳۸۰طبع دارالکتب پشاور)

ومتی فعل الواقف مایدل علی الوقف اونطق بالصیغة لزم الوقف بشرط ان یکون الواقف ممن یصح بان کان کامل الاهلیة من العقل والبلوغ والحریة والاختیار ولایحتاج فی انعقاده الی قبول الموقوف علیه واذالزم الوقف فانه لایجوز بیعه ولاهبته ولاالتصرف فیه بای شئی یزیل وقفیته واذامات الواقف لایورث عنه لان هذاهومقتضی الوقف .ولقول الرسول ﷺ :...."لایباع ولایوهب ولایورث".

ولما فی البخاری (۱/۳۸۸،۳۸۹قدیمی)

عن ابن عمرقال :اصاب عمربخیبرارضافاتی النبی ﷺ فقال اصبت ارضا لم اصب مالا قط انفس عنه فکیف تأمرنی به قال ان شئت حبست اصلهاوتصدقت بهافتصدق عمرانه لایباع اصلهاولایوهب ولایورث۔

ولما فی الفقه الاسلامی وادلته (۱۰/۷۶۷۳طبع رشیدیة

قال الحنفیة المسجدبمجردالقول (ای الوقف)علی المفتی به صفة الابدیة فلاتنسلخ عنه صفة المسجدیة ولواستغنی عنه فلوخرب المسجدولیس له مایعمربه وقداستغنی الناس عنه لبناء مسجد آخریبقی مسجداعند ابی حنیفة وابی یوسف ابد االی قیام الساعة وبرئیهمایفتی فلایعودالی ملک البانی ولایجوزنقله ونقله ماله الی مسجدآخرسواء کانوایصلون فیه ام لاوعلی صفحة ۷۶۶۶قال :ذکرالمالکیة ان الاوقاف بالنسبة لبیعهاثلاثة اقسام :احدهاالمساجدلایحل بیعهابالاجماع وعلی الصفحة بعدهاقال :قال الشافعیة اذانهدم مسجداوخرب وانقطعت الصلوة فیه وتعذرت اعادته اوتعطل بخراب البلدمثلالم یعدالی ملک احدولم یجزالتصرف فیه بحال ببیع اوغیره لان مازال الملک فیه لحق الله تعالی لایعودالی الملک بالاختلال ....ومذهب الحنابلة ......لایجوزنقل المسجدوابداله وبیع ساحته وجعلهاسقایة وحوانیت الاعندتعذرالانتفاع به۔

ولما فی الدرمع الرد (۴/۳۵۸طبع سعید)

ولوخرب ماحوله واستغنی عنه یبقی مسجداعندالامام والثانی ابداالی قیام الساعة وبه یفتی (قوله ولوخرب ماحوله)ای ولومع بقائه وکذالوخرب ولیس له مایعمربه وقداستغنی الناس عنه لبناء مسجدآخر(قوله عندالامام والثانی) فلایعود میراثاولایجوزنقله ونقل ماله الی مسجدآخرسواء کانوایصلون فیه اولاوهوالفتوی۔

ولما فی العالمکیریة (۲/۴۵۷،۴۵۸طبع رشیدیة)

ولوکان مسجدفی محلة ضاق علی اهله ولایسعهم ان یزیدوالیه فسألهم بعض الجیران ان یجعلواذلک المسجدله لیدخله فی داره ویعطیهم مکانه

عوضا ما هو خير له فيسع فيه اهل المحلة قال محمد رحمه الله تعالى لا يسعهم ذلك وعلى صفحة بعدها: في فتاوى الحجة لو صار احد المسجدين قديما وتداعى الى الخراب فاراد اهل السكة ببيع القديم وصرفه في المسجد فانه لا يجوز.

الجواب صحیح: مفتی عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ　　　واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب: عاقل شاہ

۲۹ جمادی الاولیٰ ۱۴۳۵ھ　　　فتویٰ نمبر:

﴿ایک مرتبہ مسجد بن جائے تو تا قیامت مسجد کے حکم میں یہ جگہ ہوگی﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلے کے بارے میں کہ ہم نے ایک جگہ مسجد بنائی تھی پھر کسی وجہ سے اسکو شہید کر کے اسکے متبادل دوسری جگہ مسجد بنائی، پوچھنا یہ ہے کہ سابقہ مسجد کی جگہ مسجد کے حکم میں ہوگی یا نہیں؟ اگر جواب ہاں میں ہے تو پھر اس پر کیا تعمیر کرائی جائے کہ اسکی حرمت برقرار رہے؟ آیا اس جگہ پر رفاہی ٹیوب ویل وغیرہ بنایا جا سکتا ہے؟

﴿جواب﴾ صورت مذکورہ میں سابقہ مسجد کی جگہ تا قیامت مسجد کے حکم میں رہی گی، اس پر کوئی دوسری چیز مثلاً رفاہی ٹیوب ویل وغیرہ تعمیر کرانا جائز نہیں، البتہ اس کے اردگرد علامتی دیوار بنائی جائے تا کہ اسکی حرمت کی حفاظت ہو سکے۔

لما في الهندية: (۲/۴۵۷-۴۵۸، طبع رشيديه كوئٹه)

ان أرادوا أن يجعلوا شيئا من المسجد طريقا للمسلمين فقد قيل ليس لهم ذالك وانه صحيح كذا في المحيط....واذا خرب المسجد واستغنى أهله وصار بحيث لا يصلى فيه عاد ملكا للواقف أو لورثته حتى جاز لهم أن يبيعوها أو يبنوه دارا و قيل هو مسجد أبدا وهو الاصح كذا في خزانة المفتين.

لما في البحر الرائق: (۵/۲۵۱، طبع سعيد)

وقال أبو يوسف هو مسجد أبدا الى قيام الساعة لا يعود ميراثا ولا يجوز نقله ونقل ماله الى مسجد آخر سواء كانوا يصلون فيها أو لا وهو الفتوى كذا في الحاوي.

لما في الشامي: (۴/۳۵۸، طبع سعيد)

(قوله ولو خرب ما حوله) أي ولو مع بقائه عامرا وكذا لو خرب وليس له ما يعمر به وقد استغنى الناس عنه لبناء مسجد آخر قوله (عند الامام والثاني) فلا يعود ميراثا، ولا يجوز نقله ونقل ماله الى مسجد آخر، سواء كانوا يصلون فيه أو لا، وهو الفتوى الخ.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ　　　واللہ اعلم بالصواب: محمد احمد عفا اللہ عنہ

۳۰ ذی الحجہ ۱۴۲۸ھ　　　فتویٰ نمبر: ۱۰۶۸

﴿وقف کے قرآن مجید استعمال کرنے کا حکم﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلے کے بارے میں کہ میں نے جامعہ دار العلوم کراچی میں دوران تعلیم ایک قرآن مجید جامعہ کی مسجد سے اٹھا کر اپنے ذاتی استعمال کے لئے مختص کر دیا اور کمرے میں لا کر رکھ دیا فراغت کے بعد وہ قرآن مجید میں اپنے ساتھ گاؤں لے آیا۔

شریعت میں اس کا کیا حکم ہے کہ اگر یہ قرآن مجید میں اپنے گاؤں کی مسجد میں رکھ دوں تو ایسا کرنا جائز ہے؟ بینوا توجروا۔ مستفتی: محمد جاوید صاحب

﴿جواب﴾ بظاہر یہ قرآن مجید اسی مسجد کے لئے وقف ہوا ہے، اس لئے واپس اسی مسجد میں رکھنا ضروری ہے۔

لما فی الدر مع الرد: (۶/۵۵۸تا۵۵۹، کتاب الوقف، طبع امدادیہ)

فان وقفها على مستحقي وقفه لم يجز نقلها وان على طلبة العلم وجعل مقرها في خزانته التي في مكان كذا ففي جواز النقل تردد.

وفي الشامية: سبل مصحفا في مسجد بعينه للقراءة ليس له بعد أن يدفعه الى أخر من غير أهل تلك المحلة للقراءة...... الذي تحصل من كلامه أنه اذا وقف كتبا وعين موضعها فان وقفها على أهل ذالك الموضع لم يجز نقلها منه لا لهم ولا لغيرهم وظاهره أنه لا يحل لغيرهم الانتفاع بها وان وقفها على طلبة العلم فلكل طالب الانتفاع بها في محلها.

الجواب صحیح: عبد الرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: سید مزمل شاہ

۱۱ ربیع الاول ۱۴۳۰ھ — فتوی نمبر: ۲۲۶۱

﴿مسجد کے چندہ سے کاروبار کرنے کا حکم﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں مفتیان کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ہمارے محلہ کی مسجد کے لئے جو چندہ جمع ہوتا ہے، اس چندہ سے ایک نرسری لگائی گئی ہے، پودوں اور پھولوں کو بیچ کر حاصل ہونے والے نفع سے مسجد کی ضروریات پوری کی جاتی ہیں جبکہ اس نرسری میں کام کرنے والے دو مزدوروں کی تنخواہیں بھی اسی منافع سے ادا کی جاتی ہیں۔

قرآن وسنت کی روشنی میں بتلائیں کہ مسجد کے چندہ سے مسجد کے لئے کاروبار کرنا جائز ہے؟

﴿جواب﴾ مسجد کے چندہ سے کاروبار کرنا اور منافع کو مسجد پر ہی خرچ کرنے کا اگر اہتمام

ہوتو یہ جائز ہے بشرطیکہ یہ کاروبار مسجد کی کمیٹی کے اراکین اور چندہ دہندگان کے مشورہ سے ہو اور اس کام کے لئے رکھے گئے مزدوروں کی اجرت دینا بھی صحیح ہے۔

لما في الهندية:(۲/۲۱۷-۲۱۸،طبع رشيديه)

متولي المسجد اذا اشترى بمال المسجد حانوتاأو دارا ثم باعها جاز اذا كانت له ولاية الشراء هذه المسئلة بناء على مسئلة أخرى أن متولي المسجد اذا اشترى من غلة المسجد دارا أو حانوتا فهذا الدار أو الحانوت هل تلتحق بالحوانيت الموقوفة على المسجد ومعناه أنه هل تصير وقفا؟ اختلف المشائخ قال الصدر الشهيد المختار أنه لا تلتحق ولكن تصير مستغلا للمسجد كذا في المضمرات.

ولما في التاتارخانية:(۵/۵۸۲،طبع قديمي)

الفاضل من وقف المسجد هل يصرف الى الفقراء؟ قيل لايصرف وانه صحيح ولكنه يشترى به مستغلا للمسجد.

الجواب صحیح:عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب:مزمل شاہ

۱۴جمادی الاول ۱۴۳۰ھ — فتویٰ نمبر:۲۲۵۰

﴿مسجد کا پانی گھر میں استعمال نہیں کرنا چاہیے﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلے کے بارے میں کہ ہمارے علاقہ میں اکثر پانی کی کمی رہتی ہے، جب عام کنوؤں میں پانی ختم ہو جاتا ہے تو مسجد کے کنویں سے پانی لینے کے لئے قطاریں لگ جاتی ہیں تو کیا اس صورت میں مسجد کا پانی استعمال کرنا جائز ہے؟

﴿جواب﴾ مسجد کا پانی صرف مسجد کی ضروریات میں ہی استعمال کیا جاسکتا ہے،البتہ مسجد کی ضروریات سے پانی زائد ہو اور چندہ دہندگان بھی راضی ہوں تو مسجد کا پانی استعمال کرنے کی گنجائش ہے۔

لما في البحر الرائق:(۵/۲۵۵،طبع سعيد)

وفي التوضؤ من السقاية:اذا اتخذ للشرب اختلاف المشائخ فيه ولو اتخذها للتوضؤ،لايجوز الشرب منه بالاجماع.

ولما في الهندية:(۲/۲۶۵،طبع رشيديه)

والفجمل السقاية للشرب فاراد أن يتوضأ منها اختلف المشائخ فيه واذا وقف للوضوء لا يجوز الشرب منه وكل ما أعد للشرب حتى الحياض،لايجوز منها التوضوء كذا في خزانة المفتيين.

الجواب صحیح:عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب:مزمل شاہ ستر خیل

۲۹جمادی الاول ۱۴۳۰ھ — فتویٰ نمبر:۲۲۴۴

﴿مسجد میں سوال کرنے کے احکامات﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام مسئلہ ذیل میں کہ ایک آدمی اپنی ذات کے لئے مسجد میں بھیک مانگتا ہے، کیا یہ جائز ہے یا نہیں؟ نیز کوئی شخص اگر اللہ تعالیٰ کے نام پر سوال کرے تو اسکو دینا واجب ہے یا نہیں؟ مستفتی: ولی الرحمٰن لکی مروت

﴿جواب﴾ (۱) مسجد میں سوال کرنا جائز نہیں، البتہ اگر کوئی شخص انتہائی مجبور ہو اور ایسی چیز کا سوال کرے جسکے بغیر زندگی گذارنا مشکل ہو تو اس کے لئے مسجد کے اندر سوال کرنے کی گنجائش معلوم ہوتی ہے لیکن چند شرائط کے ساتھ:

(۱) سائل نمازیوں کے آگے سے نہ گذرتا ہو (۲) لوگوں کی گردنیں نہ پھلانگتا ہو (۳) لپٹ کر سوال نہ کرے اگر سائل مذکورہ شرائط کی پابندی کرے تو اسکو دینا بھی جائز ہے اور اگر پابندی نہ کرے تو اسکا مسجد میں سوال کرنا اور اسکو دینا دونوں ناجائز ہیں۔

لما فی الشامی:(۲/۴۲،طبع امدادیه)

قوله:(ویکره التخطی للسوال الخ)قال فی النهر:والمختاران السائل ان کان لایمر بین یدی المصلی ولایتخطی الرقاب ولایسأل الحافأبل لامر لابدمنه،فلابأس بالسؤال والاعطاء ومثله فی البزازیة،وفیها:ولا یجوزالاعطاء اذالم یکونوا علی تلک الصفة المذکورة.

(۲) اللہ تعالیٰ کے نام پر بھیک مانگنا جائز نہیں ہے کیونکہ اللہ جل جلالہ کے نام کی بلندئ شان کا تقاضا یہ ہے کہ اسکے ذریعے کوئی بہت ہی بڑی چیز مثلاً جنت مانگی جائے، لہٰذا بھیک مانگنے کے لئے اس مقدس نام کو استعمال کرنا خلاف ادب ہے۔

البتہ ایمان اور اللہ تعالیٰ کی محبت کا تقاضا یہ ہے کہ اس حقیقی محسن کے نام کا واسطہ اگر کوئی دے تو اس کو خالی واپس نہیں کرنا چاہیے کچھ دے دینا چاہیے، تاہم دینا واجب نہیں۔

لما فی الفقه الاسلامی :(۲/۹۲۲،طبع دارالفکر بیروت)

ویکره للانسان ان یسال بوجه الله تعالیٰ غیر الجنة،وان یمنع من سأل بالله وتشفع به لخبر:"لایسال بوجه الله الاالجنة" وخبر:"من استعاذبالله فاعیذوه ومن سألکم بالله فاعطوه"الخ

الجواب صحیح: عبد الرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: محمد کاشف عزیز

۱۳ صفر الخیر ۱۴۳۰ھ — فتویٰ نمبر: ۱۸۹۲

﴿بلا ضرورت مسجد میں سونا جائز نہیں ہے﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں مفتیان کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ بغیر کسی عذر کے مسجد میں سونا جائز ہے یا نہیں؟ بعض لوگ گرمیوں کے موسم میں مسجد میں نماز پڑھنے آتے ہیں اور روزانہ کا معمول بنا رکھا ہے کہ نماز پڑھنے کے بعد مسجد کے پنکھے چلا کر وہیں سو جاتے ہیں، مسجد کی انتظامیہ کے روکنے پر وہ لوگ ان سے کہتے ہیں کہ مسجد اللہ کا گھر ہے اس سے ہمیں نہیں روک سکتے گویا مسجد میں سونا اپنا حق واجبی سمجھتے ہیں، شریعت میں اسکا کیا حکم ہے؟ نیز تبلیغی جماعت والوں کا مسجد میں سونا کیسا ہے؟ بینوا توجروا۔ مستفتی: صہیب احمد

﴿جواب﴾ مسجد بے شک اللہ تعالیٰ کا گھر ہے اور عبادت کیلئے مخصوص ہے، لہٰذا اگر کوئی شخص عبادت کی غرض سے مسجد میں آتا ہے تو بلا شبہ اسکو روکنا جائز نہیں ہے لیکن اگر سونے کی غرض سے ہی کوئی مسجد میں آتا ہے تو انتظامیہ کو روکنے کا حق حاصل ہے، مسجد کوئی سرائے نہیں ہے کہ لوگ اس میں سوتے رہیں، البتہ معتکف اور مسافر وغیرہ کیلئے مسجد میں سونے کی گنجائش ہے اور بہتر یہ ہے کہ کچھ دیر تک عبادت اور ذکر کر کے اعتکاف کی نیت سے مسجد میں آرام کریں۔

تبلیغی جماعت والے گھر بار چھوڑ کر دین کی اشاعت کے لئے اللہ تعالیٰ کے راستہ میں نکلتے ہیں اشاعت دین کی خاطر مسجد میں آتے ہیں اور قیام بھی کرتے ہیں صرف سونے کے لئے مسجد میں نہیں آتے، اس کے علاوہ جماعت کے ساتھی اعتکاف کا بھی اہتمام کرتے ہیں، لہٰذا ان کے لئے مسجد میں سونا جائز ہے۔

لما في الدرمع الرد:(۱/۶۶۱،طبع سعید)وأكل ونوم الا لمعتكف وغريب.

وفي الشامية:(قوله أكل ونوم)واذا اراد ذلك ينبغي أن ينوي الاعتكاف فيدخل ويذكر الله تعالى بقدر مانوى،أويصلي ثم يفعل ماشاء .وكذافي الهندية:(۳۲۱/۵،باب آداب المساجد،طبع دار الفكر بيروت)وكذافي لفتاوى سراجية:(ص ۷۱-۷۲،طبع سعيد)

ولما في حلبي كبير:(ص ۶۱۲،طبع سهيل اكيڈمي)

والنوم فيه لغير المعتكف مكروه وقيل لاباس للغريب أن ينام فيه والأولى ان ينوى الاعتكاف ليخرج من الخلاف.

الجواب صحیح: عبد الرحمٰن عفا اللہ عنہ واللہ اعلم بالصواب: محمد سجاد

۲۳ ربیع الاول ۱۴۳۰ھ فتویٰ نمبر: ۲۰۵۷

﴿مسجد میں دنیاوی باتیں کرنا، گمشدہ چیز کا اعلان اور مجنون کا آنا﴾

﴿سوال﴾ مسجد میں دنیاوی باتیں کرنا اور گم شدہ چیز کے اعلان کرنے کا شریعت میں کیا حکم ہے؟ نیز مسجد میں مجنون آسکتا ہے یا نہیں؟ بینوا توجروا۔

﴿جواب﴾ مساجد صرف نماز تلاوت وعظ اور ذکر اللہ کیلئے ہیں، دنیاوی امور کیلئے نہیں، مساجد میں گم شدہ چیز کے اعلان اور دنیاوی باتوں پر سخت وعید احادیث میں آئی ہے، حضرت عمرؓ نے مسجد کے کنارے پر ایک چبوترہ تعمیر کروادیا تھا کہ جسکو اشعار پڑھنا ہو یا بلند آواز سے بولنا ہو وغیرہ تو وہ چبوترہ پر چلا جائے، اسی طرح مجنون چونکہ مسجد کے آداب سے واقف نہیں ہوتا، اسلئے اسے مسجد سے دور رکھنا چاہیے کیونکہ ہوسکتا ہے کہ وہ مسجد میں گندگی پھیلادے۔

لما فی مشکوٰۃ المصابیح:(ص ۷۱، طبع سعید)

قال رسول اللہ ﷺ یاتی علی الناس زمان یکون حدیثھم فی مساجدھم فی امر دنیاھم فلاتجالسوھم فلیس للہ فیھم حاجۃ.

ولما فی مشکوٰۃ المصابیح:(ص ۶۸ طبع سعید)

عن ابی ھریرۃؓ قال قال رسول اللہ ﷺ من سمع رجلا ینشد ضالۃ فی المسجد فلیقل لاردھا اللہ علیک فان المساجد لم تبن لھذا.

ولما فی الشامی:(۱/۶۵۶ طبع سعید)

ویحرم ادخال صبیان ومجانین حیث غلب تنجیسھم والافیکرہ.

وفی الشامیۃ:(قولہ ویحرم الخ)لما اخرجہ المنذری "مرفوعا جنبوا مساجدکم صبیانکم ومجانینکم وبیعکم وشرائکم ورفع أصواتکم وسل سیوفکم.....الخ

ھکذا فی الشامی:(۱/۶۶۰ طبع سعید)وفی المرقاۃ:(۲/۳۸۲ طبع رشیدیہ)

ولما فی مشکوٰۃ المصابیح:(ص ۷۱ طبع سعید)

عن مالک قال بنی عمر رحبۃ فی ناحیۃ المسجد تسمی البطیحاء وقال من کان یرید ان یلغط اوینشد شعرا اویرفع صوتہ فلیخرج الی ھذہ الرحبۃ.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: حبیب الوہاب سواتی عفا اللہ عنہ

۱۲ صفر الخیر ۱۴۲۹ھ — فتویٰ نمبر: ۱۱۸۸

﴿مسجد کو ذاتی ملکیت سمجھنا غلط ہے﴾

﴿سوال﴾ جو لوگ مسجد کو اپنی ذاتی ملکیت سمجھتے ہیں اور یہ کہتے ہیں کہ یہ مسجد ہماری ہے

اوراس میں غریب لوگوں کا کوئی اختیار نہیں ہے، اس لئے کہ ہم نے اس مسجد کو اپنی جائیداد سے خود بنایا ہے تو اس مسجد میں نماز ہوتی ہے یا نہیں؟

مستفتی: عبدالسلام صاحب سواتی

﴿جواب﴾ ایسی مسجد میں نماز بلا شبہ ہو جاتی ہے، ان لوگوں نے مسجد کی نیت سے اپنی ذاتی زمین میں ذاتی خرچے سے مسجد کی تعمیر کروائی ہے اوراذن عام کیساتھ جماعت کا بھی اس میں اہتمام کیا ہے تو اب یہ شرعی مسجد ہے، کسی کی ذاتی ملکیت نہیں رہی لیکن انتظامی امور میں اختیار انہی کا ہے کسی اور کو انتظامی امور میں دخل اندازی سے روکنے کا حق انکو حاصل ہے، البتہ نماز وعبادت سے کسی کو روکیں تو بڑا ظلم ہے۔

لمافی قوله تعالی:(سورة البقرة،آیت ۱۱۴)

ومن اظلم ممن منع مساجدالله ان یذکرفیهااسمه......الآية.

ولمافی التنویرمع الدر:(۳۴۸/۴،طبع سعید)

(ولایتم)الوقف(حتی یقبض)لم یقل للمتولی لان تسلیم کل شئ بمایلیق به ففی المسجدبالافرازوفی غیره بنصب المتولی وبتسلیمه ایاه ابن کمال.

وفی الشامیة:(قوله ففی المسجد بالافراز)ای والصلاة فیه.

ولمافی التنویرمع الدر:(۴/-۳۵۵-۳۵۶-۳۵۷،طبع سعید)

(ویزول ملکه عن المسجدوالمصلی)بالفعل و(بقوله جعلته مسجدا)عندالثانی(وشرط محمد)والامام(الصلاة فیه)بجماعة وقیل:یکفی واحدوجعله فی الخانیة ظاهرالروایة.

وفی الشامیة:وفی القهستانی ولابدمن افرازه ای تمییزه عن ملکه من جمیع الوجوه فلوکان العلومسجداوالسفل حوانیت اوبالعکس لایزول ملکه لتعلق حق العبدبه کمافی الکافی......(قوله وشرط محمدوالامام الصلاة فیه)ای مع الافرازکماعلمته واعلم ان الوقف انمااحتیج فی لزومه الی القضاء عندالامام لان لفظه لاینبئ عن الاخراج عن الملک بل عن الابقاء فیه لتحصل الغلة علی ملکه فیتصدق بهابخلاف قوله جعلته مسجدافانه لاینبئی عن ذالک لیحتاج الی القضاء بزواله فاذااذن بالصلاة فیه قضی العرف بزواله عن ملکه ومقتضی هذاانه لایحتاج الی قوله وقفت ونحوه.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ

واللہ اعلم بالصواب: حبیب الوہاب سواتی

۱۴۲۹/۳/۲۸ھ

فتویٰ نمبر: ۱۲۶۶

﴿مغصوبہ زمین پر مسجد بنا کر نماز پڑھنے کا حکم﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک شخص نے زمین

غصب کی اور اسکا کچھ حصہ مسجد کیلئے وقف کر کے مسجد بنائی آیا یہ شرعی مسجد ہے یا نہیں؟ اور اسمیں نماز پڑھنا جائز ہے یا نہیں؟ مستفتی: اکبر محمد بازخیلہ سواتی

﴿جواب﴾ زمین واقعی اگر غصب کی ہے اور اصل مالک کو اس کا عوض وغیرہ بھی کچھ نہ دیا ہو تو ایسی زمین میں مسجد بنانا فضول ہے یہ شرعی مسجد نہیں کہلائیگی، اس میں نماز اگرچہ ہو جائیگی لیکن مکروہ ہوگی۔

لمافی الدرمع الرد:(۱/۲۷۹-۲۸۰-۲۸۱ طبع سعید)

وکذاتکره فی اماکن کفوق الکعبة ..... وارض مغصوبة اوللغیر ..... الخ.

وفی الشامیة: وفی الشرح المنیة للحلبی: بنی مسجدافی ارض غصب لاباس بالصلوة فیه. وفی الواقعات بنی مسجداعلی سور المدینة لاینبغی أن یصلی فیه لأنه حق العامة فلم یخلص لله تعالی کالمبنی فی أرض مغصوبة اهـ.

ولمافی الهندیة:(۲/۳۵۳ طبع رشیدیه)

ومنها الملک وقت الوقف حتی لو غصب أرضافوقفهاثم اشتراهامن مالکها ودفع الثمن الیه أوصالح علی مال دفعه الیه لاتکون وقفا. هکذافی البحر:(۵/۱۸۸ سعید)

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفااللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: حبیب الوہاب سواتی عفااللہ عنہ

۱۳ جمادی الاولی ۱۴۲۹ھ — فتوی نمبر: ۱۵۱۴

﴿مسجد کی ناقابل استعمال اور بے قیمت اشیاء کو ذاتی استعمال میں لانے کا حکم﴾

﴿سوال﴾ مسجد کی پرانی اشیاء یعنی دریاں اور ٹوپیاں وغیرہ جو مسجد میں وقف کی گئی ہوں، جب وہ پرانی ہو جائیں اور قابل استعمال نہ رہیں اور کباڑ وغیرہ میں بھی انکی کوئی قیمت نہ لگ سکے تو کیا کوئی شخص ایسی اشیاء کو اپنے کسی کام میں لائے تو یہ جائز ہے؟ مستفتی: واجد شاہ

﴿جواب﴾ مسجد کی ایسی اشیاء جو بالکل پرانی ہو گئی ہوں اور انکی کوئی قیمت نہیں لگتی ہو جن کو عام طور پر پھینک دیا جاتا ہے اگر کوئی شخص اپنے کام میں لائے تو یہ جائز ہے بشرطیکہ انتظامیہ کی اجازت سے ہو یا مسجد والوں نے باہر پھینک دی ہوں۔

لمافی البحر:(۵/۲۵۱ طبع سعید)

واذارأی حشیش المسجدفرفعه انسان جازان لم یکن له قیمة فان کان له ادنی قیمة لایأخذه الابعدالشراء من المتولی اوالقاضی اواهل المسجداوالامام وکذاالجنائزالعتق اوالحصر المتقطعة والمنابر والقنادیل المکسرة.

ولما فی الهندية:(۲/۴۵۹،طبع رشیدیه)

حشيش المسجداذاخرج ايام الربيع ان لم يكن له قيمة لابأس بطرحه خارج المسجد ولمن رفعه ان ينتفع كذافي الواقعات الحسامي.

ولما في التاتارخانية:(۵/۸۴۴،طبع قدیمی)

بوارى المسجداذاخلقت فصارت لاينتفع بهافارادالذى بسطهاان ياخذهاويتصدق بهاويشترى مكانهافله ذالك وان كان هوغائبافارااداهل المحلة ان ياخذواالبوارى فتصدقوابهابعدماخلقت لم يكن لهم ذالك ان كان لهاقيمةوان لم يكن لهاقيمة فلابأس بذلك

الجواب صحیح:عبدالرحمٰن عفااللہ عنہ   واللہ اعلم:افتخاراحمدکلکتی

۱۲/۲/۱۴۳۰ھ   فتویٰ نمبر:۱۹۳۷

﴿مساجد میں فوتگی کا اعلان کرنا جائز ہے﴾

﴿سوال﴾ کیافرماتے ہیں علماء کرام دریں مسئلہ کہ ہمارے علاقے میں جب کسی کی فوتگی ہوجاتی ہے تو مساجد میں اعلانات کئے جاتے ہیں تاکہ زیادہ سے زیادہ لوگ نماز جنازہ میں شریک ہوں، پوچھنا یہ ہے کہ شرعاً اس طرح کرنا کیسا ہے؟   مستفتی:اُویس لانڈھی

﴿جواب﴾ اعلان وغیرہ سے میت کی شہرت یادکھلاوامقصود نہ ہوتوشرعاً اعلان میں کوئی قباحت نہیں ہے بلکہ صرف اس مقصد کے لئے اعلان کرنا کہ نماز جنازہ میں زیادہ سے زیادہ لوگ شریک ہوں جائز بلکہ مستحسن بھی ہے، حدیث شریف میں وارد ہے کہ میت پرنماز جنازہ پڑھنے والوں کی شفاعت قبول کی جاتی ہے اور میت کو نفع پہنچتا ہے۔

لمافی حلبی کبیر:(ص۵۱۹-۵۲۰،طبع نعمانیه)

ولابأس بالاذن فى صلوٰة الجنازة وفى بعض النسخ لاباس بالأذان اى الاعلام وهو ان يعلم بعضهم بعضاليقضواحقه كذافى الهداية

قال ابن الهمام سيمااذاكانت الجنازة يتبرك بهاولينتفع الميت بكثرتهم ففى صحيح مسلم وسنن الترمذى والنسائى عن عائشةؓ انه عليه الصلوٰة والسلام قال: مامن ميت يصلى عليه امة من الناس يبلغون مأة كلهم يشفعون فيه الاشفعوافيه وكره بعضهم ان ينادى عليه فى الأزقة والاسواق لانه يشبه نعى الجاهلية والاصح انه لايكره اذالم يكن مع تنويه بذكره وتفخيم بل يقول العبد الفقير الى الله تعالىٰ فلان بن

فلان الفلاني فان نعي الجاهلية ما كان فيه الدوران مع الضجيج وهكذا في الشامي:(۲/۴۳۹،طبع ایچ ایم سعید)

الجواب صحیح:عبدالرحمٰن عفااللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب:ظہوراحمد شمس

۱۰رجب ۱۴۲۹ھ — فتویٰ نمبر:۱۶۵۰

﴿مسجد میں اگربتی جلانے کا حکم﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے متعلق کہ مسجد میں اگربتی جلانا کیسا ہے؟

﴿جواب﴾ مسجد اللہ کا گھر ہے،اسکو پاک وصاف اور معطر رکھنے کا حکم متعدد احادیث میں آیا ہے،لہٰذا مسجد میں لوبان یا عود کی دھونی دینا مستحب ہے اور شرعاً یہ مطلوب بھی ہے،اس مقصد کیلئے اگربتی اگر جلائی جائے تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں بشرطیکہ وہ پاک چیز سے بنائی گئی ہو،ہاں یہ اہتمام کیا جائے کہ اس کی راکھ مسجد کے فرش پر گرنے نہ پائے۔

لما في المرقاة شرح المشكوٰة:(۲/۲۹۳،طبع رشیدیه)

عن عائشة قالت:أمر رسول الله ﷺ ببناء المسجد في الدور،وأن ينظف ويطيب.قال ابن حجر وبه يعلم انه يستحب تجمير المسجد بالبخور خلافا لمالك حيث كرهه فقد كان عبدالله يجمر المسجد اذا قعد عمر على المنبر واستحب بعض السلف تخليق المسجد بالزعفران والطيب وروى عنه عليه السلام فعله.

الجواب صحیح:عبدالرحمٰن عفااللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب:عبدالرزاق عفااللہ عنہ

۱۳رجب المرجب ۱۴۲۹ھ — فتویٰ نمبر:۱۶۸۰

﴿مسجد میں بھیک مانگنا اور مانگنے والوں کو صدقات دینے کا حکم﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلے کے بارے میں کہ بعض لوگ مسجد میں بھیک مانگتے ہیں،کیا مسجد میں سوال کرنے کی گنجائش ہے؟نیز ان بھکاریوں کو صدقات وغیرہ دینا شرعاً کیسا ہے؟

﴿جواب﴾ جس شخص کے پاس ایک دن کیلئے اتنی خوراک موجود ہو جس سے اسکی جان بچ سکے،اسی طرح تندرست جوان آدمی جو کمانے پر قدرت رکھتا ہو اور کمانے کا موقع بھی اسکو ملے تو ایسے آدمی کیلئے سوال کرنا جائز نہیں ہے اور معلوم ہو تو اسکو دینا بھی مناسب نہیں ہے بعض روایات

میں ایسے شخص کو دینا گناہ قرار دیا ہے لیکن حقیقی ضرورت منداور اپنے کومحتاج ظاہر کرنے والے پیشہ ور بھیک مانگنے والوں میں فرق کرنا بڑا مشکل ہوگیا ہے۔

اسلئے مفتی بہ قول کے مطابق کسی بھی مانگنے والے کو دینا ثواب سے خالی نہیں ہے توفیق ہوتو دے دینا چاہیے اور نہ دینے میں بھی کوئی مضائقہ نہیں ہے۔

رہی بات مسجد کے اندر سوال کرنے کی تو واقعی محتاج کیلئے مسجد کے اندر بھی سوال کرنے کی گنجائش ہے بشرطیکہ نمازیوں کی عبادت میں خلل کا باعث نہ ہو۔

لمافی التنویر مع الدر:(۲/۳۰۵-۳۰۶ طبع امدادیہ)

(ولا)یحل ان(یسأل)شیئامن القوت(من له قوت یومه)بالفعل اوبالقوة کالصحیح المکتسب ویأثم معطیه ان علم بحاله لاعانته علی المحرم.....(جاز)ولومحتاجا.

وفی الشامیة:قوله:(ولایحل ان یسأل الخ)قیدبالسوال.....وقال:هواوسع وبه یفتی.قوله: (کالصحیح المکتسب)لانه قادربصحته واکتسابه علی قوت الیوم.بحر.قوله:(ویأثم معطیه الخ)قال الاکمل فی شرح المشارق:.....وأنت خبیربان الظاهران مرادهم ان الدفع الی مثل هذایدعوالی السوال علی الوجه المذکوروبالمنع ربمایتوب عن مثل ذلک فلیتامل اه.

ولمافی الدرالمختار:(۲/۳۳۲ طبع امدادیہ)

ویحرم فیه السوال،ویکره الاعطاء،مطلقا،وقیل:ان تخطی.

الجواب صحیح :عبدالرحمٰن عفااللہ عنہ واللہ اعلم بالصواب :عزیز الرحمٰن چارسدوی عفااللہ عنہ

۲۳ محرم الحرام ۱۴۲۹ھ فتویٰ نمبر:۱۱۳۱

﴿پاگل کو مسجد میں آنے سے روکنا چاہیے﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ: ہمارے گاؤں میں ایک پاگل (مجنون) لڑکا ہے اور وہ کبھی کبھار نماز پڑھنے مسجد آجاتا ہے، کپڑے میلے کچیلے اور گندے ہوتے ہیں، وضو کرنے کے بعد اسکے میلے کچیلے کپڑوں سے پانی مسجد کے فرش پر ٹپکتا رہتا ہے جس سے مسجد کی پاکی کے تلویث ہونے کا قوی اندیشہ ہے۔

پوچھنا یہ ہے کہ کیا ہم اس لڑکے کو مسجد آنے سے روک دیں؟ روکنے کی صورت میں گناہ تو نہیں ہوگا؟ برائے مہربانی شریعت کی روشنی میں وضاحت فرمائیں۔ مستفتی: ایاز چارسدوی

﴿جواب﴾ حدیث مبارکہ میں مجنون اور بچوں کو مسجد سے روکنے کا حکم آیا ہے کیونکہ چھوٹے

بچے اور مجنون مسجد کے آداب کی رعایت نہیں کر سکتے بلکہ ان سے گندگی پھیلانے کا اندیشہ رہتا ہے جبکہ مسجد کو صاف ستھرا اور پاک رکھنے کا حکم ہے۔

لہٰذا صورت مسئولہ میں اسکو مسجد سے روک دینا ضروری ہے اور منع کرنے میں کسی قسم کا کوئی گناہ نہیں ہے، البتہ کوشش یہ کریں کہ اس کے گھر والے خود اس کو روک لیں، اس میں آسانی ہے اور گھر والوں کی دلجوئی بھی۔

لمافی الدر مع الرد:(۲/۴۲۹،طبع امدادیه)

ویحرم ادخال صبیان ومجانین حیث غلب تنجیسهم،والافیکره.

وفی الشامیة:قوله:(ویحرم الخ)لماأخرجه المنذری مرفوعاً"جنبوامساجدکم صبیانکم ومجانینکم،وبیعکم وشراء کم،ورفع اصواتکم،وسل سیوفکم،واقامة حدودکم،وجمروها فی الجمع،واجعلوا علیٰ ابوابهاالمطاهر"بحر..."والافیکره"أی تنزیهاتأمل.

الجواب صحیح:عبدالرحمٰن عفااللہ عنہ واللہ اعلم بالصواب:عزیز الرحمٰن چارسدوی عفااللہ عنہ

۱۵ ربیع الثانی ۱۴۲۹ھ فتویٰ نمبر:۱۳۱۰

﴿مسجد کے چندہ سے قرض لینا﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ مسجد کی اشیاء کو عاریۃً استعمال کرنے کا کیا حکم ہے؟ اگر کوئی شخص مسجد کے چندے کو بطور قرض استعمال کرے تو شرعاً یہ جائز ہے یا ناجائز؟ مستفتی: محمد خورشید آزاد کشمیر

﴿جواب﴾ مسجد کی وہ تمام اشیاء جو مسجد پر وقف ہوں کسی اور مصرف پر خرچ کرنا تو جائز نہیں ہے، اسی طرح مسجد کے چندے کو بطور قرض ذاتی استعمال میں لانا بھی جائز نہیں ہے، البتہ چندہ دینے والے سے اجازت لیکر قرض لے سکتا ہے، لہٰذا اگر کسی شخص نے مسجد کے چندے کو ذاتی مصرف پر خرچ کیا ہو اور چندہ دینے والا بھی معلوم ہو تو اسکو وہ رقم واپس کرے یا اس سے دوبارہ اجازت لیکر مسجد پر خرچ کرے اور اگر چندہ دینے والا معلوم نہ ہو تو اپنی طرف سے اتنی رقم مسجد پر خرچ کر کے استغفار کرتا رہے۔

لمافی البحر:(۵/۲۵۰،طبع سعید)ولیس للمتولی أن یحمل سراج المسجدالی بیته.

ولمافی البزازیة علی هامش الهندیة:(۲/۸۲،طبع رشیدیه)

جمع مالالنفقة المسجدمن الناس وصرفه فی حاجة نفسه ثم أنفق مثلهالایسعه ذلک

فان عرف صاحبه بعينه رده عليه أوجد الاذن منه وان لم يعرف صاحبه بعينه استامر الحاكم مرة لرفع الاثم اما الضمان فواجب على كل حال وان بعذر يرجى فى الاستحسان أن ينجو باتفاق مثله.

ولما فى البحر: (۲۵۱/۵ طبع سعید)

ولو جمع ما لا لينفقه فى بناء المسجد فأنفق بعضه فى حاجتة ثم رد بدله فى نفقة المسجد لا يسعه أن يفعل ذلك فاذا فعله وكان يعرف صاحبه ضمن له بدله أو استاذنه فى صرف عوضه فى المسجد.

الجواب صحیح: عبد الرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: عبد الحکیم کشمیری عفا اللہ عنہ

۱۷ صفر المظفر ۱۴۲۹ — فتویٰ نمبر: ۱۱۹۱

﴿مسجد میں دینی مجلس کے بعد کھانے کا اہتمام کرنا﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ مسجد میں اگر کوئی شخص اس نیت سے دعوت کا اہتمام کرے کہ احباب کو جمع کر کے ان سے دین کی بات بھی ہو جائے اور اس کے بعد سب کی ضیافت بھی مسجد میں ہو جائے تو اس قسم کی دعوت مسجد میں کرنا جائز ہے یا نہیں؟ جبکہ مسجد کے آداب کی بھی پوری رعایت رکھی جاتی ہو اور اس ضیافت میں بچے بھی نہ ہوں۔

نیز دعوت میں اگر کچھ احباب ایسے بھی ہوں جو زمین پر نہ بیٹھ سکتے ہوں تو ان کیلئے مسجد میں رکھی ہوئی کرسی اور ٹیبل پر بیٹھ کر کھانا کیسا ہے؟ اگر یہ سب ناجائز ہے تو رمضان المبارک میں جو افطاری کا اہتمام کیا جاتا ہے یا اس کے علاوہ کسی بھی دینی مجلس کے بعد دعوت کا اہتمام ہوتا ہے اور نکاح کے بعد جو چھوہارے تقسیم کئے جاتے ہیں ان کا کیا حکم ہے؟ مستفتی: ڈاکٹر حازم

﴿جواب﴾ مساجد شعائر اسلام میں سے ہیں عبادت، ذکر اور دیگر اجتماعی دینی امور انجام دینے کیلئے ہوتی ہیں جن کا احترام ہر مسلمان پر واجب ہے۔

مذکورہ بالا اصل مقصودی اعمال کیلئے مسجد میں کوئی فرد یا جماعت آئی ہو اور کھانے کا وقت ہو تو بلا کراہت اس میں کھانا جائز ہے، محض کھانے کیلئے مسجد کو استعمال کرنا مسجد کے اصلی مقصد کے خلاف ہے، اس لئے اس سے گریز کیا جائے، ایسی صورت میں اہتمام کیساتھ اگر اعتکاف کی نیت کی جائے تو کوئی کراہت نہ ہوگی۔

البتہ مسجد کے آداب کا خیال رکھنا ہر دونوں صورتوں میں ضروری ہے ضرورت کیلئے کرسی

وغیرہ کو استعمال کرنا بھی کوئی منع نہیں ہے لیکن دعوت اگر شادی حال کا منظر پیش کرے تو اسکی ہرگز اجازت نہیں ہے اور مسجد میں نکاح کے جو چھوہارے تقسیم کئے جاتے ہیں یہ حضور علیہ ﷺ کے عمل سے ثابت ہے، نیز اس سے مسجد کی تلویث کا بھی کوئی خطرہ نہیں ہوتا، مزید یہ کہ مسجد میں نکاح کا مقصد اعلان ہوتا ہے اور یہ مقصد مسجد میں ہی اچھی طرح حاصل ہوتا ہے، اس لئے جائز ہے۔

لما فی الشامی:(۲/ ۴۴۸،طبع سعید کمپنی)

واعلم:أنه كما لا يكره الأكل ونحوه في الاعتكاف الواجب فكذلك في التطوع كما في كراهية جامع الفتاوى ونصه يكره النوم والأكل في المسجد لغير المعتكف وإذا أراد ذلك ينبغي أن ينوي الاعتكاف فيدخل ويذكر الله تعالى بقدر ما نوى أو يصلي ثم يفعل ما شاء اه.

ولما في الهندية:(۵/ ۳۲۱،كتاب الكراهية، الباب الخامس في آداب المسجد،طبع)

ويكره النوم والأكل فيه لغير المعتكف وإذا أراد أن يفعل ذلك ينبغي أن ينوي الاعتكاف فيدخل ويذكر الله تعالى بقدر ما نوى أو يصلي ثم يفعل ما شاء.

ولما في كنز الدقائق:(ص ۷۱،طبع قديمي)هو لبث في مسجد بصوم ونية واقله نفلاً ساعة

ولما في بدائع الصنائع:(۲/ ۱۱۷،طبع سعيد)

وقد روى ان النبي ﷺ كان يفعل ذلك في حال اعتكافه في المسجد مع ما ان الأكل والشرب والنوم في المسجد في حال الاعتكاف لو منع منه لمنع من الاعتكاف انذلك أمر لا بد منه.

ولما في الشامي:(۱/ ۶۶۱،طبع سعيد)

(قوله وأكل ونوم الخ)وإذا أراد ذلك ينبغي أن ينوي الاعتكاف،فيدخل ويذكر الله تعالى بقدر ما نوى،أو يصلي ثم يفعل ما شاء،فتاوى هندية.

ولما في الحلبي الكبيري:(ص ۶۱۲،فصل في احكام المسجد،طبع سهيل اكيڈمي)

وقيل لا باس للغريب أن ينام فيه والاولى أن ينوي الاعتكاف ليخرج من الخلاف.

ولما في المشكوة:(ص ۲۷۲،باب اعلان النكاح،طبع سعيد)

عن عائشة رضي الله عنها قالت قال رسول الله ﷺ اعلنوا هذا النكاح واجعلوه في المساجد واضربوا عليه بالدف،رواه الترمذي.

الجواب صحیح :عبد الرحمٰن عفا اللہ عنہ	واللہ اعلم بالصواب: علی خان
۷ربیع الاول ۱۴۳۱ھ	فتویٰ نمبر:۲۵۰۳

﴿سود کے پیسوں سے خریدی ہوئی چیز کو مسجد میں استعمال کرنے کا حکم﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک آدمی جو کہ سودی

کاروبار کرتا ہے، اس نے مسجد کیلئے بیٹری اور لائٹ کا بندوبست کیا، اب اس آدمی کی دی ہوئی بیٹری کو مسجد میں استعمال کیا جاسکتا ہے کہ نہیں؟ مستفتی: شیر خان

﴿جواب﴾ مسجد کا خرچہ حلال اور طیب مال سے کرنا چاہئے حدیث شریف میں ہے کہ اللہ تعالیٰ پاک وطیب مال ہی قبول فرماتے ہیں، البتہ بندہ اگر خود اس بات کا اقرار کرتا ہے کہ میں نے حلال مال میں سے مسجد کو بیٹری دی ہے تو بلاتردد اسکی بیٹری مسجد کے استعمال میں لانا درست اور جائز ہے۔

لما فی صحیح البخاری: (۱۸۹/۱، کتاب الزکاۃ، باب الصدقۃ من کسب طیب، طبع قدیمی)

عن ابی هريرة رضی الله عنه قال: قال رسول الله ﷺ من تصدق بعدل تمرة من كسب طيب ولا يقبل الله الا الطيب فان الله يتقبلها بيمينه ثم يربيها لصاحبها كما يربی احدكم فلوّه حتى تكون مثل الجبل.

ولما فی الشامی: (۶۵۸/۱، طبع سعید کمپنی)

(قوله لو بماله الحلال) قال تاج الشريعة: اما لو انفق فی ذلك مالا خبيثا ومالا سببه الخبيث والطيب فيكره، لأن الله تعالى لا يقبل الا الطيب فيكره تلويث بيته بما لا يقبله اه شرنبلالية.

ولما فی الأشباه والنظائر: (ص ۱۱۳، طبع قدیمی)

الثامنة: اذا كان غالب مال المهدی حلالا فلا بأس بقبول هديته وأكل ماله مالم يتبين أنه من حرام وان كان غالب ماله الحرام لا يقبلها ولا يأكل الا اذا قال: انه حلال ورثه أو استقرضه. هكذا فی الهندية: (۳۴۰/۵، طبع قدیمی) وفی البزازية علی هامش الهندية: (۳۶۰/۶، طبع رشيديه)

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ | واللہ اعلم بالصواب: علی خان

یکم صفر الخیر ۱۴۳۱ھ | فتویٰ نمبر: ۲۴۵۵

﴿مسجد کے ملبہ کا حکم﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام مندرجہ ذیل مسئلہ کے بارے میں کہ ہمارے محلّہ کی مسجد کا فرش سیمنٹ کا بنا ہوا ہے اب ارادہ ہے کہ اسکو اکھاڑ کر ماربل لگائیں تو آیا جو ملبہ فرش کا ہوگا اسکو مسجد میں دفن کردیں یا پھر باہر کسی بھی جگہ اسکو دفن کردیں؟ بینوا توجروا۔ مستفتی: محمد شعبان کورنگی

﴿جواب﴾ اگر ملبہ مسجد کے کسی کام میں استعمال نہیں ہو رہا ہے تو اسکو فروخت کرکے اس رقم کو مسجد کی تعمیر وغیرہ یا دوسرے مصرف میں لاسکتے ہیں، فروخت نہ ہو تو کسی پاک جگہ ڈال دینے میں بھی کوئی حرج نہیں ہے۔

لما في الهندية:(٢/٤٦١،طبع رشيديه)

مسجد له مستغلات واوقاف اراد المتولي ان يشتري من غلة الوقف للمسجد دهنا او حصيرا او حشيشا او آجرا و جصا لفرش المسجد او حصى.

ولما في قاضيخان:(ص ١٢٨،طبع قديمي)

وكذا لو اشترى حشيشا او قنديلا للمسجد فوقع الاستغناء عنه.....يباع ويصرف ثمنه الى حوائج المسجد فان استغنى عنه هذا المسجد يحول الى المسجد الاخر والفتوى على قول محمدؒ.وكذا في التنوير مع الدر:(٤/٣٥٩،طبع ايچ ايم سعيد)وكذا في التاتارخانية:(٥/٥٧٧،طبع قديمي)

الجواب صحیح:عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب:محمد زبیر اکرام

١٧ربیع الثانی ١٤٣١ھ — فتوی نمبر:٢٦١٥

﴿ایسی تعمیر جسکے لئے مسجد کی نیت نہ کی ہو،کا حکم﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام کہ زید نے اپنی زمین پر اپنے ملازمین کے لئے ایک کمرہ بنایا تاکہ ملازمین وہاں باجماعت نماز پڑھ سکیں مگر زید نے مسجد کی نیت نہیں کی تھی،عرصہ دراز کے بعد زید اس کمرہ کو گرا کر وہاں دوکانیں تعمیر کرنا چاہتا ہے تو اسکا یہ عمل شرعاً جائز ہے؟

واضح رہے کہ مذکورہ کمرہ کافی عرصہ سے بیکار اور سنسان ہے،اسمیں اب کوئی نماز نہیں پڑھی جاتی۔

﴿جواب﴾ اگر واقعۃً مسجد کی نیت نہیں کی تھی تو اس کمرہ کا حکم مسجد کا نہیں ہے،اس جگہ کو ذاتی استعمال میں لانا جائز ہے۔

لما في التنوير مع الدر:(٤/٣٥٨،طبع سعيد)

(كما لو جعل وسط داره مسجدا واذن للصلاة فيه)حيث لا يكن مسجدا الا اذا شرط الطريق زيلعي.

ولما في التاتارخانية:(٥/٥٧٠،طبع قديمي)

(وفي الملتقط الناصري)واذا بنى مسجدا لا يصير مسجدا حتى يقر بلسانه انه مسجد.

الجواب صحیح:عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب:نعمان اقبال عفا اللہ عنہ

٢٥ربیع الثانی ١٤٣١ھ — فتوی نمبر:٢٦٦٦

﴿نابالغ بچوں کو مسجد میں لانے کا حکم﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام کہ بعض حضرات مسجدوں میں آتے وقت اپنے بچوں کو

بھی ساتھ لے آتے ہیں اور بعض اوقات یہ بچے دوسرے نمازیوں کی نماز میں خلل کا سبب بن جاتے ہیں، پوچھنا یہ ہے کہ آیا چھوٹے بچوں کو مسجدوں میں لانے کی شرعاً اجازت ہے یا نہیں؟

﴿جواب﴾ اگر بچہ سمجھدار ہو، نماز پڑھتا ہو اور مسجد کی پاکی اور اس کے آداب کا لحاظ رکھتا ہو تو ایسے بچوں کو مسجدوں میں لانا پسندیدہ ہے، البتہ بچہ اگر ناسمجھ ہو اور دوسروں کی نماز میں خلل کا باعث ہو تو ایسے بچوں کو مسجدوں میں لانا مکروہ ہے، اس کے علاوہ ایسی عمر کے بچے کو مسجد میں لانا حرام ہے جس سے پیشاب وغیرہ کا اندیشہ ہو۔

لمافی سنن ابن ماجة:(ص ۵۴،طبع قدیمی)

قال النبی ﷺ جنبوا مساجدکم صبیانکم ومجانینکم وشرائکم وبیعکم وخصوماتکم ورفع اصواتکم واقامة حدودکم وسل سیوفکم واتخذوا علی ابوابها المطاهر وجمروها فی الجمع.

ولمافی الدر مع الرد:(۱/۶۵۶،طبع سعید)

ویحرم ادخال صبیان ومجانین حیث غلب تنجیسهم والا فیکره.

وفی الشامیة:(قوله ویحرم الخ) لما اخرجه المنذری "مرفوعاً جنبوا مساجدکم صبیانکم ......الخ

ولمافی الاشباه والنظائر:(ص ۳۲۰،بحث احکام المساجد،طبع قدیمی)

ومنها حرمة ادخال الصبیان والمجانین حیث غلب تنجیسهم والا فیکره.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: نعیم اقبال عفا اللہ عنہ

۲ ربیع الثانی ۱۴۳۱ھ — فتویٰ نمبر: ۲۶۱۱

﴿امام کیلئے مسجد کی چیز باہر استعمال کرنے کا حکم﴾

﴿سوال﴾ ایک آدمی نے مسجد کے نام پر جائے نماز وقف کر دی تو آیا اس جائے نماز کو امام صاحب اپنے کمرے میں ذاتی طور پر استعمال کر سکتے ہیں یا نہیں؟ مستفتی: محمد عارف کراچی

﴿جواب﴾ مسجد کی چیز کو مسجد سے باہر استعمال کرنا جائز نہیں ہے، لہٰذا امام صاحب کا کمرہ اگر مسجد کا حصہ نہیں ہے تو مسجد کی جائے نماز وغیرہ اسمیں استعمال کرنا جائز نہیں ہے، البتہ وقف کرنے والے نے وقف کرتے وقت اسکی اجازت دی ہو تو اسکی گنجائش ہے۔

لمافی الهندیة:(۲/۴۶۲،طبع رشیدیه)

متولی المسجد لیس له ان یحمل سراج المسجد الی بیته وله ان یحمله من البیت الی المسجد.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: احمد علی عفی عنہ

۲۶ ربیع الاول ۱۴۳۱ھ — فتویٰ نمبر: ۲۵۵۴

﴿کتاب الشرکۃ والمضاربۃ﴾

﴿کسی شریک کو بطور ہبہ ملنے والی چیز میں دوسرے شرکاء کا حق نہیں﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ دو بھائی خالد اور حامد بمع اپنے اہل وعیال کے ایک ساتھ رہتے ہیں جنکی اولاد بھی ہیں جو کہ کما بھی رہے ہیں اور ان سب کا کھانا پینا اور ہر قسم کے اخراجات سب مشترک ہیں، اب خالد کی بیوی کو اسکے والد نے ایک گائے ہدیہ میں دی اور گائے سے فائدہ سب مشترک طور پر حاصل کرتے ہیں اور گائے کو چارہ وغیرہ بھی سب کھلاتے ہیں۔

پوچھنا یہ ہے کہ اس گائے پر خالد کی بیوی کی ملکیت ہوگی یا اور دوسرے معاملات کی طرح گائے بھی سب کی مشترک ملکیت ہوگی؟ اور اسی طرح اس گائے سے پیدا ہونے والے بچھڑے کا کیا حکم ہے؟ وہ کس کی ملکیت ہے؟ مستفتی: قاری محمد فیاض دہلی کالونی

﴿جواب﴾ خالد کی بیوی کو اس کے والد نے بطور ھبہ گائے دی ہے تو یہ اسی کی ذاتی ملکیت ہے اور اس گائے کے بچھڑے کی مالک بھی صرف خالد کی بیوی ہے، خالد سمیت گھر کا کوئی دوسرا فرد گائے اور اسکے بچھڑے میں حصہ دار نہیں ہے، خالد کی بیوی کی اجازت سے گائے سے فائدہ مشترک طور پر حاصل کرنے سے یا مشترک طور پر اسکے چارہ کا خرچہ برداشت کرنے سے دیگر افراد گائے یا اسکے بچھڑے میں شریک قرار نہیں پاتے۔

لما فی التنویر مع الدر:(۱۸۸/۵،طبع سعید)

(و)شرائط صحتها(فی الموهوب ان یکون مقبوضا غیر مشاع غیر مشغول)۔۔۔۔حکمها ثبوت الملک للموهوب له غیر لازم)

ولما فی قاضیخان:(۱۵۰/۲،فصل فی هبة الوالد لولده،طبع قدیمی)

رجل اتخذثیابالولده الصغیرثم ارادان یدفع الی ولدله آخرلم یکن له ذلک لانه لما اتخذثوبالولده الاول صار ملکاللاول بحکم العرف فلایملک الدفع الی غیره.

ولما فی الشامی:(۶۸۹/۵،طبع سعید کمپنی)

اتخذلولده الصغیرثوبایملکه وکذاالکبیربالتسلیم بزازیة۔۔۔۔ اتخذلولده ثیابالیس له ان یدفعهالی غیره

ولما فی الشامی:(۲۷۰/۴،طبع سعید)

[تنبیه]افادانه لوانفق الملتقط من ماله فهومتبرع الااذاأذن له القاضی بشرط الرجوع.

ولما فی التنویر مع الدر:(۲۸۱/۲،طبع سعید)

(ولو)كان الالتقاط(فى الصحراء)ان ظن انها ضالة حاوى(وهو فى الانفاق على اللقيط واللقطة متبرع)لقصوره ولايته(الا اذاقال له قاض انفق لترجع)فلولم يذكرالرجوع لم يكن دينافى الأصح.

الجواب صحیح:عبدالرحمٰن عفااللہ عنہ واللہ اعلم بالصواب:علی خان

۲۰ ربیع الاول ۱۴۳۱ھ فتویٰ نمبر:۲۶۳۵

﴿باپ اور بیٹوں کے درمیان مشترکہ تجارت کی ایک صورت کا حکم﴾

﴿سوال﴾ کیافرماتے ہیں مفتیان کرام کہ ہم سات بھائی ہیں والد صاحب سے ہمیں میراث میں کچھ ملانہیں بلکہ ہم ساتوں نے ملکرایک تجارت شروع کی ان میں سے بعض بھائیوں کے بیٹے نہ صرف یہ کہ اپنے اپنے والد کا ہاتھ بٹھاتے رہے بلکہ دیگر چچاؤں کیطرح کام کرتے رہے شرع متین کی رو سے بھائیوں کے ساتھ انکے بیٹوں کو بھی حصہ ملیگا یا نہیں؟ سائل:مطیع اللہ

﴿جواب﴾ ساتوں بھائیوں نے ملکر اپنے ذاتی مشترکہ سرمایہ سے یہ تجارت اگر شروع کی تھی اور بھتیجوں کا ذاتی سرمایہ شامل نہیں تھا تو یہ پورا کاروبار صرف بھائیوں کا مشترک ہے بھتیجوں کا مستقل حصہ اس میں نہیں ہے اگر چہ چچاؤں کیطرح وہ کام کررہے تھے،البتہ چچاؤں کو چاہیے کہ اپنے بھتیجوں کو بھی محنت کا کچھ صلہ دیں تاکہ انکی حوصلہ افزائی ہواور چچاؤں کیلئے باعث اجر ہو۔

لمافی الفتاوی الخیریۃ التی بھامش الفتاوی الحامدیۃ:(۹۲/۲،طبع حقانیہ)

سُئل فی رجل مات عن ابن كبيروابنين صغيرين لاعن تركة فرباهماالكبيرونشا فى خدمته ومن جملة عائلته مع ابنه المقارب لهمافى السن وحصلوا جميعابالكسب والعمل مالاولم يكن لهم مال واختلفوافيه فالكبيريدعيه كله لنفسه وانهم كانوا معينين له بالعمل وابنه يدعى رُبعه بعمله واخواه يدعيان ثُلُثيه بعملهماوان ابنه لا حصة له معهمالكونه معيناوالده فماالحكم فى ذلك(اجاب)ان ثبت كون ابنه واخويه عائلة عليه وامرهم فى كل مايفعلونه اليه وهم معينون له فالمال كله له والقول قوله فيمالديه بيمينه وليتق الله فالجزاء امامه وبين يديه وان لم يكونوابهذا الوصف بل كان كل مستقلابنفسه واشتركوافى الاعمال فهوبين الاربعة سوية بلا اشكال وان كان ابنه فقط هوالمعين والاخوة الثلاثة بانفسهم مستقلون فهوبينهم اثلاثابيقين والحكم دائرمع علته باجماع اهل الدين الحاملين لحكمته.

ولمافی الفتاوی الخیریۃ التی بھامش الفتاوی الحامدیۃ:(۹۲/۲،طبع حقانیہ)

واماقول علمائنااب وابن يكتسبان فى صنعة واحدة ولم يكن لهماشئ ثم اجتمع لهما

مال یکون کله للاب اذاکان الابن فی عیاله فهومشروط کمایعلم من عبارتهم بشروط منهااتحادالصنعة وعدم مال سابق لهماوکون الابن فی عیال ابیه فاذاعدم واحد منها لایکون کسب الابن للاب وانظرالی ماعللوابه المسئلة من قولهم لان الابن اذاکان فی عیال الاب یکون معیناله فیمایصنع فمدارالحکم علی ثبوت کونه معینا له فیه.

ولمافی تنقیح الحامدیة:(۱/۹۵،طبع حقانیه)

ذکرشیخ الاسلام جلال الدینؒ فی اب وابن اکتسباولم یکن لهمامال فاجتمع لهمامن الکسب اموال الکل للاب لان الابن اذاکان فی عیاله فهومعین له الاتری انه لو غرس شجرة فهی للاب وکذاالحکم فی الزوجین.ومثله فی الشامیة:(۴/۳۲۵،طبع سعید)

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ　　　واللہ اعلم: عبیداللہ عابد غفرلہ ولوالدیہ

یکم ربیع الثانی ۱۴۳۰ھ　　　فتویٰ نمبر:۲۱۲۱

﴿ گاڑی، جائیداداور سامان وغیرہ سے شرکت کرنا جائز ہے یا نہیں ﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ آج کل جب کوئی کمپنی وغیرہ قائم ہوتی ہے تو اس پر کروڑوں اور اربوں روپے لگتے ہیں،بعض اوقات کمپنی کے قیام میں شرکت کرنے والے نقد مال کے علاوہ اپنی گاڑی، جائیدادو غیرہ بھی شرکت کے لئے دیتے ہیں۔

پوچھنا یہ ہے کہ نقد مال کے علاوہ سامان،گاڑی یا جائیدادوغیرہ سے بھی شرکت کرنا جائز ہے یا نہیں؟

﴿جواب﴾ گاڑی، جائیداداسی طرح دیگر متعین اشیاء کے مالکان ''اگر الگ الگ ہیں'' تو ایسی اشیاء میں شرکت اس وقت تک نہیں ہوسکتی جب تک ان چیزوں کو مالکانہ طور پر مشترک نہ قرار دیا جائے ،جس کی صورت یہ بھی ہوسکتی ہے کہ جن مالکان کے پاس ایسی اشیاء ہوں اور دوسروں کے پاس نقد روپے تو ایسی اشیاء کی قیمت لگا کر نقد شمار کیا جائے اور اسی نسبت سے کمپنی میں شریک قرار دیا جائے یا ہر ایک شریک اپنے سامان کا ایک حصہ مثلاً آدھا یا تہائی اپنے دیگر شرکاء کے سامان کے عوض فروخت کرے تا کہ تمام شرکاء سامان میں حصہ دار بن جائیں ،اس طرح یہ اشیاء کمپنی کا حصہ ہو جائے گا اور تمام شرکاء ان کے مالک ہو جائیں گے۔

لما فی الهندیه:۲/۳۰۷،طبع رشیدیه

والحیلة فی جواز الشرکة فی العروض وکل ما یتعین بالتعیین ان یبیع کل واحد منهما نصف ماله بنصف مال صاحبه حتی یصیر مال کل واحد منهما نصفین وتحصیل شرکة ملک بینهما ثم یعقدان بعد ذلک عقد الشرکة فیجوز بلا خلاف کذا فی البدائع

......وكذالك اذاكان لاحدهما دراهم وللاخر عروض ينبغي ان يبيع صاحب العروض نصف عروضه بنصف دراهم صاحبه ويتقابضان ثم يشتركان ان شاء مفاوضة وان شاء عنانا كذا في المحيط.

ولما في البدائع :۶/۵۹،كتاب الشركة ،طبع سعيد

(منها)ان يكون رأس المال من الأثمان المطلقة وهي التي لا تتعين بالتعيين في المفاوضات على كل حال وهي الدراهم والدنانير عنانا كانت الشركة او مفاوضة عند عامة العلماء فلا تصح الشركة في العروض وقال مالك" هذا ليس بشرط وتصح الشركة في العروض والصحيح قول العامة ،لان معنى الوكالة من لوازم الشركة والوكالة التي يتضمنها الشركة لا تصح في العروض وتصح في الدراهم والدنانير ......ولو كان من احدهما دراهم ومن الاخر عروض بينهما ثم يعقدان عليهما عقد الشركة فيجوز والامر موكول الى تعامل الناس .

الجواب صحیح :عبدالرحمٰن عفااللہ عنہ
۲۲ ربیع الاول ۱۴۳۲ھ

واللہ اعلم بالصواب : صادق محمد سواتی
فتوی نمبر :۳۰۷۳

﴿مشترکہ کاروبار میں بیٹے باپ کے معاون ہوتے ہیں شریک نہیں﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ حاجی عقیل محمد اوران کے چچازاد بھائی حاجی محمد مشترک تھے جائیداد میں ، ہمارے والد صاحب حاجی عقیل محمد نے اپنے بھائی کے ساتھ جائیداد کی تقسیم کرلی ، کچھ عرصہ کے بعد حاجی محمد انتقال فرماگئے ، ان کا ایک بیٹا حاجی محمد علی رہ گئے ، حاجی عقیل محمد نے حاجی محمد علی کی والدہ یعنی حاجی محمد کے بیوہ کے ساتھ نکاح کرلیا تو انہوں نے حاجی محمد علی کو چونکہ وہ چھوٹا تھا اپنے ساتھ شریک کرلیا یعنی کام کاج میں شریک کرلیا اور خرچ وخوراک میں بھی اپنے ساتھ رکھا۔

1987ء میں مشترک طور پر کراچی میں کام شروع کیا ، کام ایک ساتھ شروع کرنے والے حاجی محمد علی ، محمد اشرف ، محمد قاسم ، محمد اکبر ، محمد حسن ، کل پانچ افراد تھے ، ایک دوسال کے بعد حاجی محمد علی ہم چاروں کے مشورے سے افغانستان گئے اور وہاں گھر اور جائیداد کی ذمہ داری سنبھال لی اور ہم چار بھائی میں سے دو بھائی کبھی افغانستان میں اور کبھی کراچی میں ساتھ کام کرتے تھے اور دو بھائی کم از کم یہاں کراچی میں کام کرتے تھے۔

تقریباً 1996ء میں افغانستان میں ایک زمین خریدلی ، پھر ایک دوسال بعد اور زمین

خرید لی، اس طرح چند بار زمین خرید لی، یہ تمام زمین کراچی کے کاروبار میں کمائی سے خرید لی، اس وقت تک صرف یہی پانچ افراد مشترک کام کرتے تھے، تقریباً 1999ء میں حاجی محمد علی کا بیٹا نادر اور پھر ایک سال بعد تقریباً 2000ء میں دوسرا بیٹا عبدالقادر بھی کراچی میں کام کا ساتھ دے رہے تھے، 2004ء میں ایک مکان کراچی کے کام کی آمدن سے خریدا، پھر 2005ء میں ایک دوکان خریدی۔

2007ء حاجی محمد علی کے دو بیٹے رسول خان، محمد حضرت اور محمد اشرف کا بیٹا محمد اصغر بھی کام کرتے تھے، 2009ء میں مزید ایک دوکان خرید لی، پھر 2012ء میں ایک دوکان مزید اس مشترکہ کام سے خرید لیا، براہ کرم مذکورہ بالا جائیداد اگر تقسیم کرنا چاہیں تو تقسیم کیسے ہوگی، شریعت مطہرہ کی روشنی میں وضاحت فرمائیں۔

وضاحت:

(۱) سب بھائیوں کی رہائش، رہن سہن، کھانا پینا سب کچھ مشترک ہے

(۲) کام شروع کرتے وقت کوئی راس المال نہیں تھا بلکہ محنت مزدوری کر کے کمایا ہے

(۳) اسی مشترکہ کمائی سے بعض بھائیوں کی شادی بھی کی ہے

(۴) جو بیٹے بعد میں شریک ہوئے ہیں انہوں نے بھی محنت مزدوری کی ہے۔

﴿جواب﴾ کراچی میں اس کام کو شروع کرنے والے آپ پانچوں افراد اس کے مالکان ہیں، اس مشترکہ محنت سے آپ پانچوں افراد نے افغانستان میں زمین خرید لی یا کراچی میں جائیداد بنائی، آپ پانچوں افراد اس میں برابر کے حصہ دار ہیں، تقسیم کی صورت میں ان تمام چیزوں کے پانچ برابر حصے بنا کر ہر ایک کو اس کا حق دینا واجب ہے، بعد میں حاجی محمد علی صاحب کے بیٹوں نے بھی اس محنت میں حصہ لیا ہے لیکن باپ کے ساتھ معاون شمار ہوتے ہیں، ان کا مستقل الگ کوئی حصہ نہیں بنتا، البتہ بعد میں اگر باقاعدہ متفقہ اس طرح کا کوئی معاہدہ کیا ہو کہ حاجی محمد علی صاحب یا کسی اور شریک کے بیٹے بھی اگر باقاعدہ محنت کریں گے تو ان کو بھی مستقل شریک کی حیثیت دیں گے تو ایسی صورت میں بیٹوں کی بھی شریک کی حیثیت ہوگی، ورنہ نہیں، ہاں تمام شرکاء بخوشی ان کا بھی کچھ حصہ کرلیں تو بہتر ہے، احسان شمار ہوگا۔

لما فی رد المحتار، کتاب الشرکۃ، باب: الشرکۃ الفاسدۃ، ۴/۳۲۵، طبع: سعید

"تنبیہ: یؤخذ من ھذا ما افتی بہ فی الخیریۃ فی زوج امرأۃ وابنھا اجتمعا فی دار واحدۃ واخذ کل منھما یکتسب علی حدۃ ویجمعان کسبھما ولا یعلم التفاوت بینھما ولا التساوی ولا التمییز فاجاب بینھما سویۃ وکذا لو اجتمعا اخوۃ یعملون فی ترکۃ ابیھم ونما المال فھو بینھم سویۃ ولو اختلفوا فی العمل والرأی".

ولما فی تنقیح الحامدیۃ، ۱/۹۵، طبع: المکتبۃ الحقانیۃ

"(سئل) فی اخوۃ خمسۃ سعیھم وکسبھم واحد وعائلتھم واحدۃ حصلوا بسعیھم وکسبھم اموالا فھل تکون الاموال المذکورۃ مشترکۃ بینھم اخماسا (الجواب) نعم اذ کل واحد منھم یعمل لنفسہ واخوتہ علی وجہ الشرکۃ واجاب الخیر الرملی بقولہ: ھو بینھما سویۃ حیث لا یمیز کسب ھذا من کسب ھذا ولا یختص احدھما بہ ولا بزیادۃ علی لآخر اذ التفاوت ساقط لملتقطی السنابل اذا اختلطا ما التقطا".

ولما فی تنقیح الحامدیۃ، ۲/۱۷

"واما قول علمائنا اب وابن یکتسبان فی صنعۃ واحدۃ ولم یکن لھما شئ ثم اجتمع لھما مال یکون کلہ للاب اذا کان الابن فی عیالہ فھو مشروط کما یعلم من عباراتھم بشروط منھا اتحاد الصنعۃ وعدم مال سابق لھما وکون الابن فی عیال ابیہ فاذا عدم واحد منھا لا یکون کسب الابن للاب وانظر فی ما عللوا بہ المسئلۃ من قولھم لان الابن اذا کان فی عیال الاب یکون معینا لہ فیما یضع فمدار الحکم علی ثبوت کونہ معینا لہ فیہ فاعلم ذالک".

واللہ اعلم بالصواب: تکمیل الدین گلگتی	الجواب صحیح: مفتی عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ
فتویٰ نمبر: ۳۵۶۰	۲۸ صفر الخیر ۱۴۳۴ھ

﴿شرکۃ الوجوہ کی ایک صورت کا بیان﴾

﴿سوال﴾ جناب مفتی صاحب السلام علیکم آپ سے فتوی درکار ہے سوال مندرجہ ذیل ہے:

آج سے تقریباً ۳۳ سال قبل میں اپنے بھائی کی دوکان پر بطور سیلز مین کام کرتا تھا ایک موقع پر انہوں نے خشک دودھ کی بکنگ کرانے پر (جو میں نے کرائی) یہ طے کیا کہ اس میں جتنا نفع ہوگا وہ برابر تقسیم ہوگا مگر انہوں نے ۲۸ ہزار نفع میں میرا حصہ ۱۴ ہزار جو بنتا تھا وہ نہیں دیا اور مختلف حیلے بہانے بنا کر مجھے دوکان سے فارغ کر دیا اور میرے حصے کے پیسوں سے ایک فلیٹ خرید لیا اگلے ہی سال جب میرا پہلا شناختی کارڈ بنا تو میں نے ان کی ناانصافی دیکھتے ہوئے اپنے شناختی کارڈ پر اسی گھر کا پتہ لکھوا دیا جو کہ میری حق تلفی کر کے لیا گیا تھا میں اس گھر میں ایک دن بھی نہیں رہا بلکہ اپنی ماں اور دوسرے بہن بھائیوں کے ساتھ پاکستان چوک پر رہتا رہا،

۱۹۸۸ میں میری شادی کے وقت انہوں نے دریافت کیا کہ کچھ پیسوں کی ضرورت ہے تو مجھ سے لے لو میں نے ان سے کہا کہ میں نوکری کررہا ہوں اگر اسوقت آپ مجھے میرا حق دے دیتے تو دکانیں مل جاتیں مگر اب بھی آپ کوئی دکان دلادیں تو میں اپنا کاروبار شروع کردوں گا مگر دس سال میں مہنگائی بڑھ چکی تھی انہوں نے ۱۴ ہزار دینے کا کہا مگر میں نے منع کردیا اسکے بعد انہوں نے ذکر بھی نہیں کیا سال گزرتے گئے ابھی چند سال قبل ان کو دل کا عارضہ ہوگیا تو ہسپتال میں انجیو گرافی کے وقت مجھ سے بولے تمہارا کوئی حساب ہے تو لے لو میں نے کہا کہ اب مہنگائی کہاں سے کہاں پہنچ چکی ہے اب میں آپ سے مکان لوں گا اگلے ہی مہینے میں ان کا دل کا آپریشن ہوا مگر وہ ایک ہفتے تک بے ہوش رہنے کے بعد انتقال کرگئے میں خاندان میں بدنامی کے ڈر سے اپنا حق لینے کیلئے کچھ نہ بولا مگر اب بات کھل چکی ہے، ان کی فیملی ماشاء اللہ بہت صاحب حیثیت ہے انہوں نے کہا اس بارے میں ہمیں کچھ نہیں معلوم ۱۴ ہزار کا کوئی ثبوت ہے تو لے آؤ، تو میں نے ۳۰ سال پرانا شناختی کارڈ ثبوت کے طور پر پیش کردیا جسمیں میں نے اسی گھر کا پتہ لکھوایا تھا جو میرے حصے کے پیسوں سے خریدا گیا تھا میں نے دوسرے شناختی کارڈ کے فارم میں بھی مستقل پتے کی جگہ اس فلیٹ کا پتہ لکھوایا تھا جب تصدیق کرنے والے شخص نے پوچھا کہ دو پتے کیوں لکھوار ہے ہو تو میں نے کہا کہ میرے اس فلیٹ پر قبضہ ہے تصدیق کرنے والے شخص کے شناختی کارڈ کی کاپی بھی میرے پاس موجود ہے۔

انکے چھوڑے ہوئے ترکے میں سے طارق روڈ پر دو مکانات جائیداد فیکٹری گاڑیاں مال و دولت ہر چیز موجود ہے مگر افسوس کہ میرا حق مجھے نہیں ملا، مجھے اس بات کا فتویٰ لینا ہے کہ

(۱) مجھے اپنی رقم ۱۴۰۰۰ ہزار ہی ملے گی؟

(۲) جو فلیٹ میرے حصے کی رقم سے لیا گیا تھا وہ ملے گا؟

(۳) فلیٹ کی قیمت کے برابر رقم ملے گی؟

(۴) فلیٹ ۳۰ سال رکھنے کا ہرجانہ بھی لاگو ہوگا یا نہیں؟

نوٹ: خشک دودھ پر بڑے بھائی نے کوئی پیسے نہیں لگائے بکنگ کرانے کے بعد دکانداروں سے پیسے لیکر مال اُٹھایا گیا۔

تنقیح: مستفتی نے مذکورہ نوٹ کی یہ وضاحت کی ہے کہ اس وقت ہمارے پاس پیسے نہیں ہوتے تھے لہذا ہم دکانداروں سے دودھ کی بکنگ کر کے دودھ مالکان سے اُدھار دودھ لیتے اور لاکر دکانداروں کو بیچتے اور دکانداروں سے پیسے لیکر اپنا نفع رکھ لیتے اور بقیہ پیسے دودھ مالکان کو دے دیتے۔ مستفتی: سلیم احمد E17/5 چانڈیو ولیج دہلی کالونی

﴿جواب﴾ آپ کے بڑے بھائی کا آپ کے ساتھ ملکر یہ معاملہ کہ ادھار خشک دودھ خرید کر آگے بیچیں گے اور نفع آدھا آدھا تقسیم ہوگا شرکۃ الوجوہ کہلاتا ہے، شرعا یہ جائز کاروبار ہے اور تقسیم نفع جس طرح طے ہوا تھا اس کے مطابق ضروری ہے اور اب صاحب معاملہ آپ کے بھائی کا چونکہ انتقال ہوگیا ہے ان کی اولاد وغیرہ کو اس بات کا یقین کے درجے میں اگر علم ہے کہ چودہ ہزار کا حق آپ کا باقی ہے تو ان پر واجب ہے کہ مرحوم کے ترکے میں سے صرف چودہ ہزار آپ کو دیں اور ان لوگوں کو اگر اس بات کا علم نہیں ہے اور آپ کی بات پر یقین نہیں آرہا تو آپ اپنا حق عدالت کے سامنے دو دیندار آدمیوں کے ذریعے ثابت کریں تو ان پر واجب ہوگا اس کے بغیر حق ثابت نہ ہوگا شناختی کارڈ پر پتہ لکھوانے سے آپ کا حق (چودہ ہزار) ثابت نہ ہوگا اور نہ آپ اس مکان میں حصہ دار بن سکتے ہیں.

لما فی القرآن الکریم پارہ ۱۵ سورۃ بنی اسرائیل ﴿وأوفو ابالعهد ان العهد کان مسئولا﴾

لمافی مشکوۃ المصابیح (۱/۲۵۵)

عن أبی حرۃ عن عمه قال: قال رسول الله ﷺ ألالا تظلموا ألا لا یحل مال امرئ الا بطیب نفس منه رواہ البیهقی فی شعب الایمان

ولما فی تنویر الأبصار (۴/۳۲۳ طبع سعید)

(و) أما (وجوه) هذه رابع وجوه شرکة العقد (ان عقداها علی ان یشتریا) نوعاً اوانواعا (بوجو ههما) ای بسبب وجا هتهما (ویبیعا) فما حصل بالبیع ید فعان منه ثمن ما اشتریا (بالنسیة) وما بقی بینهما

ولما فی الردالمحتار: (۴/۳۲۳)

(قوله اما وجوه) ویقال لها شرکة المفالیس قهستانی (قوله نوعا اوانواعا) افاد انها تکون خاصة وعامة کما فی النهر ولذا حذف المصنف المفعول (قوله أی بسبب وجاهتهما) أفاد وجه التسمية، لان من لا مال له لا یبیعه الناس نسیئة الا اذا کا ن له جاه ووجا هة وشرف عندهم

ولما فی الفقه الاسلامی:(۳۸۸۵/۵)

هی ان یشترك وجیهان عند الناس من غیر ان یکون لهما رأس المال علی ان یشتریا فی ذممهما بالنسیة (أی بمؤجل) ویبیعا بنقد بمالهما من وجاهة عند الناس فیقولا :اشترکنا علی ان نشتری بالنسیئة ونبیع بالنقد علی ان مارزق الله سبحانه من ربح أی (من فرق الأثمان) فهو بیننا علی شرط کذا ، وسمی هذا النوع شرکة الوجوه ،لانه لایباع بالنسیة الا لوجیه من الناس عادة وهی معرفة بالشرکة علی الذمم من غیر صنعة ولا مال

ولما فی تبیین الحقائق ج۳/ص۲۵۳)

قال (ووجوه ان اشترکا بلامال علی ان یشتریا بوجوههما ویبیعا)أی هذه شرکة الوجوه یعنی شرکة العقد شرکة الوجوه ،

قال الشارح :شرکة الوجوه هو ان یشترك الرجلان ولیس لهما مال ولا عمل علی ان یشتریا بالنسیة ویبیعا ها بالنقد ،فما حصل من الربح فهو بینهما فهو جا ئز اه اتقانی

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفااللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: ضیاء الحق اٹکی

۱۷صفر الخیر ۱۴۳۳ھ — فتویٰ نمبر: ۳۱۵۰

﴿شرکت کی ایک صورت﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلے کے بارے میں کہ عمر اور خالد دونوں نے بطور شرکت آدھا آدھا سرمایہ ملا کر ایک میڈیکل لیبارٹری کھول دی عمر اور خالد دونوں اس لیبارٹری میں کام کرتے ہیں خالد چونکہ ماہر فن ہے اور اس نے اپنی مہارت کی وجہ سے نفع میں عمر سے زیادہ حصہ مقرر کیا ہے پوچھنا یہ ہے کیا خالد کیلئے نفع سے زیادہ حصہ مقرر کرنا جائز ہے؟ ۔ الا انکہ دونوں کا سرمایہ برابر برابر ہے۔

مستفتی: گوہر الرحمٰن دیروی

﴿جواب﴾ مذکورہ صورت میں کاروبار کے شریک افراد (پاٹنر) باہمی رضامندی سے کسی ایک کیلئے نفع میں حصہ زیادہ مقرر کریں تو شرعاً اس میں کوئی خرابی نہیں ہے جائز ہے

(لمافی البحر الرائق:(۱۸۴/۵ طبع سعید)

قوله (وتصح مع التساوی فی المال دون الربح وعکسه) وهو التفاضل فی المال والتساوی فی الربح وقال زفر والشافعی لا یجوز (ثم قال ولنا قوله علیه السلام الربح علی ما شرطا والوضیعة علی قدر المالین ولم یفصل ولان الربح کما یستحق بالمال یستحق بالعمل کما فی المضاربة وقد یکون أحدهما احذق وأهدی او اکثر عملا فلا یرضی بالمساواة فمست الحاجة الی التفاضل

لما فی تنویر الابصار مع رد المحتار:(۳۱۲/۴،طبع سعید)

(ومع التفاضل فی المال وعکسه)

وفی الشامیة قوله (التفاضل فی المال دون الربح)ای بان یکون لا حدهما الف وللآخر الفان مثلا واشترطا التساوی فی الربح وعکسه بان یتساوی المالان ویتفاضلان فی الربح ولکن هذا مقید با یشترط الاکثر للعامل منهما اؤللأکثر عملا

ولما فی الهندیة:(۳۲۰/۲،طبع:رشیدیه)

ولو شرطا العمل علیهما جمیعا صحت الشرکة وان قل رأس مال أخدهما وکثر رأس مال الآخر واشرطا الربح بینهما علی السواء او علی التفاضل فان الربح بینهما علی الشرط الوضیعة أبداعلی قدر رؤس اموالهما کما فی المعراج الوهاج

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفااللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: سمیع الرحمٰن دیروی

۲صفرالخیر ۱۴۳۳ھ — فتوی نمبر:۳۴۴۲

﴿شریکین میں سے ایک مرتد ہوجائے تو شرکت باطل ہوجائے گی﴾

﴿سوال﴾ دوآدمی کاروبار میں شریک تھے ان میں سے ایک (نعوذ باللہ) مرتد ہوگیا تو کیا انکی شرکت باقی رہے گی یا باطل ہوجائے گی؟

﴿جواب﴾ مذکورہ صورت میں اگر قاضی نے اس شخص کے مرتد ہونے کا فیصلہ سنادیا تو شرکت باطل ہوجائے گی اوراس شخص کے مرتد ہونے کے بعد قاضی کے فیصلہ سنانے سے قبل شرکت موقوف ہوگی اگر دوبارہ اسلام لے آئے تو باقی رہے گی اوراگر مرگیا یا قتل کردیا گیا تو شرکت منقطع ہوجائے گی۔

لمافی الهندیة:(۳۳۵/۲،طبع رشیدیه)

وتبطل الشرکة بموت أحدهما علم به الشریک أولاولوکان الموت حکمیابان قضی بلحاقه مرتدافان لم یقض به توقف انقطاعهااجماعافان عادقبل الحکم بقیت وان مات أوقتل انقطعت کذافی النهرالفائق.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفااللہ عنہ — واللہ اعلم: شاہد اسحاق عفااللہ عنہ

۱۹ جمادی الثانی ۱۴۲۷ھ — فتوی نمبر:۴۳۰

﴿مشترک کاروبار میں ایک بھائی کا منافع پرذاتی رقم لگانا﴾

﴿سوال﴾ کیافرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ہم سب بھائیوں کا

مشترک کاروبار ہے یعنی ہڈی کا کارخانہ ہے، اب کارخانہ کی رقم ختم ہوگئی ہے، خام مال خریدنے کیلئے ایک بھائی ذاتی رقم دینے کیلئے تیار ہے لیکن وہ کہتا ہے کہ مجھے ہر من پر دس روپے نفع دیا جائے، کیا یہ شریعت میں درست ہے یا نہیں یا اسکی کوئی جائز صورت ہے؟

﴿جواب﴾ مذکورہ معاملہ کیلئے جواز کی ایک صورت ہوسکتی ہے وہ یہ کہ اس معاملہ کو بیع مرابحہ قرار دیا جائے، لہٰذا جو بھائی ذاتی رقم خام مال لینے کیلئے دینا چاہتا ہے اور فی من دس روپیہ منافع کا مطالبہ کرتا ہے، وہ رقم اپنے پاس رکھے یا کسی بھی بھائی کو وکیل بنا کر رقم دیدے پھر وہ خود یا اس کا وکیل اس رقم سے خام مال لیتا رہے اور کمپنی کو دس روپے منافع پر فروخت کرتا رہے، اس طرح اس کیلئے منافع لینا جائز ہے کیونکہ کمپنی کو فرضی شخص قرار دیا گیا ہے۔

جیسا کہ شیخ الاسلام مولانا مفتی محمد تقی عثمانی دامت برکاتہم العالیہ لکھتے ہیں: اور قانون کمپنی کو ایک فرضی شخص قرار دیتا ہے جو بیع وشراء کریگا مدعی اور مدعی علیہ بنے گا دائن اور مدیون ہوگا۔ (جدید معیشت ص ۳۰)

لمافی الهداية:(۴/۷۴، طبع رحمانیه)

المرابحة نقل ماملكه بالعقد الاول بالثمن الاول مع زيادة ربح.

ولمافی الهندية:(۲/۱۶۰، طبع رشيديه)

ولو باع شيأ مرابحة ان كان الثمن مثليا كالمكيل والموزون جاز البيع اذا كان الربح معلوما سواء كان الربح من جنس الثمن الاول ام لم يكن وان لم يكن مثليا كالعروض ان باعه مرابحة ممن لا يملك العرض لا يجوز وان باعه ممن يملك ذلك العرض ان باعه بالعرض الذى فى يده وربح عشرة جاز.

ولمافی التنوير مع الدر:(۷/۳۴۹، طبع امداديه ملتان)

(المرابحة) مصدر رابح وشرعا (بيع ماملكه) من العروض ولو بهبة اوارث أو وصية او غصب فانه اذا ضمنه (بما قام عليه وبفضل) مونة وان لم تكن من جنسه كاجر قصار ونحوه ثم باعه مرابحة على تلك القيمة جاز. مبسوط.

الجواب صحیح: عبدالرحمن عفا اللہ عنہ　　واللہ اعلم بالصواب: بلال

۲۸ جمادی الاولیٰ ۱۴۲۸ھ　　فتویٰ نمبر: ۹۳۲

﴿دو بھائیوں کے درمیان مشترکہ مال کی تقسیم﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلے کے بارے میں کہ دو بھائیوں کا مال تجارت

میں مشترک تھا ان میں سے چھوٹے بھائی کا انتقال ہو گیا اور بیٹے چھوڑے لیکن وہ کم عمر تھے کسی کام کے نہیں تھے، بڑا بھائی بدستور کاروبار چلاتا رہا اور کاروبار سے جو نفع حاصل ہوتا رہا، اس سے اپنے اور چھوٹے بھائی کے بچوں کے تمام اخراجات پورا کرتا رہا، چھوٹے بھائی کے انتقال کے وقت مال تقسیم نہیں ہوا تھا، چند سالوں کے بعد بڑے بھائی کا بھی انتقال ہو گیا۔

سوال یہ ہے کہ یہ مال اور اس سے جو نفع حاصل ہوا ہے یہ دونوں بھائیوں کے ورثاء میں برابر تقسیم ہوگا یا کسی کو کم زیادہ دیا جائیگا؟ مستفتی: محمد اصغر صاحب کورنگی

﴿جواب﴾ بڑے بھائی نے مال مشترک میں تجارت کر کے جو نفع حاصل کیا ہے اور مال بڑھایا ہے وہ دونوں بھائیوں کے ورثاء پر برابر تقسیم کیا جائیگا صرف ایک بھائی کا ترکہ شمار نہیں کیا جائیگا کیونکہ بڑے بھائی کا اس مال میں تصرف کرنا اور آگے اس سے تجارت کرنا تبرع ہے۔

اسلئے کہ ایک اعتبار سے وہ بعض مال میں شریک ہے اور ایک اعتبار سے اپنے چھوٹے بھائی کے بیٹوں کی طرف سے اسمیں عامل ہے، الہٰذا برابر تقسیم ہوگا۔

لما فی کفایت المفتی: (۱۱۵/۸ طبع امدادیہ)

وعمله وتصرفه تبرعا ووجهه انه شريک فی بعضه وعامل بنت اخيه فی بعضه وهی فی عياله وليس ههنا عقد ولا غصب.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: اسرار عزیز دیروی

۱۳ ربیع الثانی ۱۴۲۸ھ — فتویٰ نمبر: ۷۶۵

﴿کوئی ایک شریک ذاتی طور پر عمارت بنوائے تو اسمیں شرکت ہوگی یا نہیں؟﴾

﴿سوال﴾ دو بھائیوں کا مشترک کاروبار تھا، دونوں نے دو پلاٹ خریدے، اس تصریح کیساتھ کہ ایک پلاٹ ایک بھائی کا ہے اور دوسرا پلاٹ دوسرے بھائی کا پھر ایک بھائی کا انتقال ہو گیا، دوسرا بھائی بدستور کاروبار چلاتا رہا اور ساتھ اپنے مرحوم بھائی کی اولاد کی کفالت بھی کرتا رہا جبکہ مرحوم بھائی کی اولاد کوئی کام بھی نہیں کر رہی تھی، اس بھائی نے اپنے پلاٹ پر تعمیر بنائی اور ساتھ یہ صراحت بھی کی یہ میں نے اپنے لئے بنائی ہے۔

اب چونکہ اس بھائی کا انتقال ہو گیا ہے تو کاروبار کے بارے میں استفتاء کرنے پر معلوم ہوا کہ دونوں کے درمیان برابر تقسیم ہوگا لیکن سوال یہ ہے وہ تعمیر جو دوسرے بھائی نے اپنے پلاٹ پر

ذاتی طور تعمیر کرائی ہے اور ساتھ یہ صراحت بھی کی کہ یہ میں نے اپنے لے بنائی ہے کیا اس میں بھی شراکت ہوگی یا نہیں؟ مستفتی: محمد اصغر صاحب کورنگی

﴿جواب﴾ صورت مسئولہ میں دوسرے بھائی نے اپنے پلاٹ پر ذاتی طور سے جو تعمیر بنائی ہے وہ اپنی ضرورت یعنی رہن سہن وغیرہ کیلئے بنائی ہے یہ شراکت سے مستثنیٰ ہے، لہٰذا پہلے بھائی کے بیٹوں کی اسمیں شرکت نہیں ہوگی بلکہ یہ دوسرے بھائی کی ذاتی ملکیت تصور کی جائیگی۔

لمافی البحر الرئق: (۵/۱۷۰ طبع سعید)

(قوله ومايشتريه كل يقع مشتركا الا طعام اهله وكسوتهم) لان مقتضى العقد المساوة ......الا ماستثناه في الكتاب وهو استحسان لانه مستثنى عن المفاوضة للضرورة فان الحاجة الراتبة معلومة الوقوع...... اراد بالمستثنى ماكان من حوائجه فشمل شراء بيت للسكنى أو الاستئجار للسكنى اوللركوب لحاجته كالحج وغيره وكذا الادام...... فلبس الكل على الشركة.

ولما في الولو الجية: (۳/۲۱ طبع فاروقيه پشاور)

وما اشترى طعاما لاهله أو كسوة أو ما لابد منه يكون له خاصة استحسانا لشدة الحاجة اليه.

ولما في التنوير مع الدر: (۴/۳۰۷-۳۰۸ طبع سعيد)

(فما اشتراه احدهما يقع مشتركا الا طعام أهله وكسوتهم) استحسانا لان المعلوم بدلالة الحال كالمشروط بالمقال واراد بالمستثنى ماكان من حوائجه.

وفي الشامية: (قوله ماكان من حوائجه) شمل شراء بيت للسكنى والاستئجار للسكنى أو للركوب لحاجته كالحج وغيره وكذا الادام بحر.

الجواب صحیح: عبد الرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: سرار عزیز عفی عنہ

۱۰ رجب ۱۴۲۸ھ — فتویٰ نمبر: ۱۰۷۳

﴿شرکت عنان کا ایک مسئلہ﴾

﴿سوال﴾ میرے کاروباری حالات کچھ کمزور ہوگئے تھے میرے ایک بھائی برطانیہ میں ہیں، انہوں نے بڑی مقدار میں میرے پاس رقم بھیجدی اور کچھ واضح نہیں کیا کہ یہ رقم ہبہ ہے یا قرض ہے یا مضاربت کے طور پر ہے، ہاں ایک موقع پر انہوں نے کہا تھا کہ میں انشاء اللہ رقم بھیجوں گا، آپ دونوں بھائیوں کیلئے، آپ کام کریں اور بھائی کو بھی منافع میں سے دیا کریں، اللہ کرے اس رقم میں ہمارے لئے برکت ہو تو منافع کا کیا حکم ہے یعنی دوسرے بھائی کا جو حصہ

ہے وہ کتنا ہے؟ اور اصل سرمایہ کا کیا حکم ہے؟ مستفتی: شاہد بھائی ڈیفنس فیز ۲

﴿جواب﴾ مذکورہ رقم کے بارے میں اگر بھائی سے معلوم کیا جائے تو معاملہ صاف ہو جائیگا کیونکہ وہ اصل مالک ہے بھائی سے اگر وضاحت ممکن نہ ہو تو یہ رقم آپ دونوں بھائیوں پر قرض ہے یعنی اصل سرمایہ کا حکم قرض کا ہے، اور مذکورہ رقم سے جو منافع حاصل ہو جائیں تو اس میں دونوں بھائی شریک ہونگے جو ساتھ ساتھ محنت بھی کرے گا اس کو زیادہ حصہ ملے گا مثلاً اگر بھائی نے دس لاکھ روپے بھیجے ہیں تو پانچ لاکھ آپ کا حصہ اور پانچ لاکھ دوسرے بھائی کا حصہ ہے اپنے پانچ لاکھ کا منافع تو آپ ہی کو ملیگا اور بھائی کے پانچ لاکھ کے منافع سے بھی آپکو محنت وعمل کا حصہ ملے گا، عرف میں اتنی رقم میں محنت کرنے والے کا منافع میں جو حصہ فیصدی مقرر ہوتا ہے وہی حصہ آپ کو ملے گا لیکن اس بات کی وضاحت دوسرے بھائی سے کرنا ضروری ہے۔

لما فی الهندية:(۳۷۵/۲،طبع رشیدیه)

رجل عنده دراهم لغيره فقال له صاحب الدراهم اصرفها في حوائجک كان قرضا.....رجل قال لآخر خذ هذا المال واغز في سبيل الله عز وعلا فهو قرض.

ولما فی تنقیح الحامدية:(۱۸/۲،طبع حقانیه)

دفع الى ابنه مالا فاراد اخذه صدق انه دفعه قرضا لانه مملك دفع اليه دراهم فقال له انفقها ففعل فهو قرض كما لو قال اصرفها الى حوائجک ولو دفع اليه ثوبا وقال اكتس به ففعل يكون هبة.

ولما فی الهندية:(۳۲۰/۲،طبع رشیدیه)

لو كان المال منهما في شركة العنان والعمل على احدهما ان شرطا الربح على قدر رؤس اموالهما جاز ويكون ربحه له وضيعته عليه وان شرطا الربح للعامل اكثر من رأس ماله جاز على الشرط ويكون مال الدافع عند العامل مضاربة.

ولما فی الشامی:(۳۱۲/۴،طبع سعید)

وقوله وعكسه :اى بان يتساوى المالان ويتفاضلان فى الربح لكن هذا مقيد بان يشترط الأكثر للعامل منهما اولأكثرهما عملا.

الجواب صحیح: عبد الرحمٰن عفا اللہ عنہ واللہ اعلم بالصواب: فرمان اللہ غفرہ اللہ

۲۱ جمادی الاولیٰ ۱۴۲۸ھ فتویٰ نمبر: ۹۱۹

﴿شرکت ومضاربت کیلئے نقدی ضروری ہے﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ زید وبکر آپس میں

کولڈ رنگ کا کاروبار کرنا چاہتے ہیں، اس طریقے پر کہ زید کا فریزر ہوگا اور بکر کے پیسے ہونگے اور عمل بھی بکر کریگا، نیز بجلی کا خرچہ بھی بکر ہی برداشت کریگا، اسمیں زید نے یہ شرط بھی لگائی کہ خدا نخواستہ اگر فریزر خراب ہو جائے تو اسکی مرمت کا خرچہ دونوں آدھا آدھا برداشت کرینگے بخلاف اسکے کہ اگر بکر کے پیسے ہلاک ہو جائیں تو اسکا نقصان بکر اکیلا برداشت کریگا، پوچھنا یہ ہے کہ شرعاً اس کاروبار کا کیا حکم ہے؟ بینوا توجروا۔

﴿جواب﴾ اس طریقہ سے کولڈ رنگ کا مشترکہ کاروبار شرعاً صحیح نہیں ہے، یہ مضاربت کی باطل صورت ہے مضاربت صحیح ہونے کیلئے ضروری ہے کہ زید نقدی شکل میں مثلاً پیسے وغیرہ دیکر حصہ شامل کرے صرف فریزر یا اس جیسے سامان سے شریک نہیں ہوسکتا، اس کے علاوہ بھی یہ معاملہ فاسد شرائط پر مشتمل ہے، لہٰذا زید و بکر دونوں مضاربت کا صحیح معاملہ کرنا چاہیں تو زید نقد روپے بکر کو دیدے فریزر استعمال میں لانا چاہتے ہیں تو اس کا الگ کرایہ مقرر کرلیں یا باہمی رضامندی سے قیمت طے کریں اور مشترکہ کاروبار کا حصہ بنائیں، اس طرح ہر ایک کا کاروبار میں لگایا ہوا سرمایہ واضح اور معلوم ہونا ضروری ہے اور نفع کا تناسب بھی باہمی رضامندی سے طے کرلیں مگر اس میں یہ شرط ہے کہ جسکا سرمایہ کم ہو اور کاروبار میں اسکے ذمہ کوئی محنت بھی نہ ہو تو اس کے سرمایہ کے تناسب سے زیادہ نفع اس کیلئے مقرر نہ ہو، ورنہ جائز نہ ہوگا اور جو محنت کرتا ہے اسکا سرمایہ اگرچہ کم لگا ہے سرمایہ کے تناسب سے زیادہ نفع بھی لے سکتا ہے۔

مثلاً زید نے بیس فیصد سرمایہ بکر کو دیدیا اور بکر نے اپنی طرف سے مزید اسی فیصد سرمایہ اس میں شامل کردیا تو زید کیلئے بیس فیصد منافع سے زیادہ طے کرنا غلط ہے، اس طرح دونوں نقصان میں بھی شریک ہونگے اور نقصان ہر ایک کو سرمایہ کی نسبت سے برداشت کرنا ہوگا۔

لمافی التنویر مع الدر:(۶/۴۸۱، طبع امدادیہ)

(ولا تصح مفاوضة وعنان بغير النقدين والفلوس النافقة والتبر والنقرة) أي ذهب (ان جرى) ....(التعامل بهما وصحت بعرض ان باع كل منهما نصف عرضه بنصف عرض الآخر ثم عقداها)

ولمافی الشامی:(۶/۴۷۵، طبع امدادیہ)

ثم يقول: فما كان من ربح فهو بينهما على قدر رؤوس أموالهما وما كان من وضيعة أو تبعة فكذلك، ولا خلاف ان اشتراط الوضيعة بخلاف قدر راس المال باطل واشتراط الربح

متفاوتا عندنا صحیح.

ولما فی البحر:(۱۶۲/۵،طبع سعید)

وقوله ولا تصح مفارضة وعنان بغیر النقدین والتبر والفلوس وهکذا فی التاتارخانية.

ولما فی التنویر مع الدر:(۳۱۱/۴-۳۱۲،طبع سعید)

(و)لذا (تصح مع التفاضل فی المال دون الربح وعکسه الخ)

وفی الشامية:(قوله:ومع التفاضل فی المال دون الربح)أی بان یکون لاحدهما ألف وللآخر ألفان مثلا واشترطا التساوی فی الربح ،قوله:وعکسه،أی بأن یتساوی المالان ویتفاضلا فی الربح لکن هذا مقید بأن یشترط الاکثر للعامل منهما أو اکثرهما عملا أما لو شرطاه للقاعد أو لأقلهما عملا فلا یجوز الخ.

الجواب صحیح:عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ　　　　واللہ اعلم بالصواب:محمد احمد عفی عنہ

۲۲ جمادی الاولیٰ ۱۴۲۹ھ　　　　فتوی نمبر:۱۵۰۵

﴿باپ اور بیٹوں کی مشترک کمائی باپ کی ملکیت ہے﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام کہ زید کاروبار کررہا تھا اور اسکے دو بیٹے باپ کیساتھ کاروبار میں لگ گئے کچھ مدت کے بعد باپ یعنی زید نے اس کاروبار سے کچھ رقم جمع کرلی اور زید کا ایک نابالغ بیٹا بھی تھا جو اب بالغ ہوگیا ہے لیکن اس نے کچھ کمایا نہیں ہے۔

اب اگر باپ جمع کردہ رقم تینوں بیٹوں میں برابر سرابر تقسیم کرنا چاہے تو یہ جائز ہوگا یا نہیں؟ اور تیسرے بیٹے (جس نے کچھ کمایا نہیں ہے) کا اس رقم میں کچھ حق بنتا ہے یا نہیں؟

﴿جواب﴾ زید کا کاروبار ہو اور بیٹے اس کیساتھ کاروبار میں لگ گئے ہوں تو اس صورت میں باپ اور بیٹوں کی مشترک کمائی سے جو بھی حاصل ہوجائے وہ سب باپ کی ملکیت شمار ہوگی، لہذا باپ اپنے مال میں جس طرح چاہے تصرف کرسکتا ہے،زندگی میں مال تقسیم کرنا ہو تو تمام اولاد کو برابر دینا چاہیے یہاں تک کہ بیٹیوں کو بھی لڑکوں کے برابر حصہ دینا چاہیے تاہم کسی کو کم یا زیادہ دینا چاہے تو اس کا بھی انہیں اختیار ہے لیکن بیٹیوں کو قانون میراث میں مقررہ حصہ سے کم دینا گناہ ہے اور کم یا زیادہ دینے میں کسی کو تکلیف دینا مقصود نہ ہو ورنہ یہ صورت بھی گناہ کی ہے۔

لما فی الشامی:(۳۲۵/۴،طبع ایچ ایم سعید)

الأب وابنه یکتسبان فی صنعة واحدة ولم یکن لهما شئ فالکسب کله للأب ان کان الابن فی عیاله لکونه معینا له ألاتری لو غرس شجرة تکون للأب...... وفی الخانية زوج

بنيه الخمسة في داره وكلهم في عياله واختلفوا في المتاع فهو للأب وللبنين الثياب التي عليهم لا غير.

ولما في الفتاوى الهندية:(۳۲۹/۲،طبع رشيديه كوئٹه)

أب وابن يكتسبان في صنعة واحدة ولم يكن لهما شئ فالكسب كله للأب اذا كان الابن في عيال الأب لكونه معيناله ألاترى انه لوغرس شجرة تكون للأب.

ولما في الفتاوى الهندية:(۳۹۱/۴،طبع رشيديه كوئٹه)

ولو وهب رجل شيئا الاولاده في الصحة وارادتفضيل البعض على البعض في ذلك ..... وروى المعلى عن ابي يوسف رحمه الله تعالى انه لاباس به اذالم يقصدبه الاضرار وان قصدبه الاضرار سوى بينهم يعطى الابنة مثل مايعطى للابن وعليه الفتوى هكذافي فتاوى قاضي خان.

الجواب صحیح :عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ واللہ اعلم بالصواب :عقیل احمد حقانی عفی عنہ

۲۲ ربیع الثانی ۱۴۳۱ھ فتوی نمبر :۲۶۴۴

﴿مشترکہ کاروبار میں مارکیٹ کے قوانین کی خلاف ورزی کرنا تعدی ہے﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں مفتیان کرام مسئلہ ذیل میں کہ میں اور شیرین محمد نے کاروبار کی غرض سے نصف نصف رقم جمع کی اس نے اس رقم سے رکشہ نقدوں میں خریدا اور اسکو قسطوں میں آگے بیچ دیا رکشہ کے کاغذات خریدنے والے کے حوالے کردیے حالانکہ اصول یہ ہے کہ جب تک خریدار پوری رقم ادا نہیں کرتا کاغذات حوالے نہیں کئے جاتے اور نہ ان کے حوالے کرنے میں اس نے مجھ سے پوچھا بلکہ اپنی مرضی سے حوالے کردیے ہیں ،اب مجھے شیرین محمد سے اپنے پیسوں کے مطالبے کا حق ہے یا نہیں؟ سائل :محمد ہارون نارتھ ناظم آباد کراچی

﴿جواب﴾ مذکورہ صورت میں شیرین محمد کی بلاشبہ غلطی ہے آپ اور شیرین محمد دونوں کو حق حاصل ہے کہ کسی طرح رکشہ والے سے اپنا حق حاصل کریں ،البتہ وہ ایسا غائب ہو کہ اس تک یا رکشہ تک پہنچنے کی کوئی صورت نہیں بنتی یا اس سے اپنا حق وصول کرنا کسی وجہ سے ممکن نہ رہے تو ایسی صورت میں شیرین محمد سے آپ اپنا حق وصول کرسکتے ہیں۔

لما في التنوير مع الدر:(۳۲۰/۴،باب الشركة،طبع سعيد)

(ويضمن بالتعدى) وهذا حكم الامانات..... وفي الأشباه نهى احدهما شريكه عن الخروج وعن بيع النسيئة جاز.

ولما فی التنویر مع الدر:(۳۱۸/۴،طبع سعید)

(ولا یجوز لهما)فی عنان ومفاوضة(تزویج العبدولاالاعتاق والهبة والقرض وکذاکل ما کان اتلافا للمال اوتملیکابغیرعوض)لان الشرکة وضعت للاسترباح وتوابعه وما لیس کذلک لاینتظمه عقدها.

ولما فی الشامی:(۳۱۹/۴،طبع سعید)

ومایکون اتلافاللمال اوتملیکامن غیرعوض فانه لایجوزمالم یصرح به نصاً.

ولما فی شرح مجلة الاحکام العدلیة:(۲۲۲/۳طبع رشیدیه)

(فعل مالایرضی به المودع فی حق الودیعة تعدمن الفاعل)والمتعدی هوالذی یفعل بالودیعةمالایرضی به المودع.

الجواب صحیح:عبدالرحمٰن عفااللہ عنہ — واللہ اعلم:عبیداللہ عابدغفرلہ ولوالدیہ

۷ربیع الثانی ۱۴۳۰ھ — فتویٰ نمبر:۲۱۴۲

﴿شراکت میں مال کا دراہم،دنانیر،روپیہ،پیسہ ہوناضروری ہے﴾

﴿سوال﴾ کیافرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میں نے میڈیکل لیبارٹری کیلئے کرایہ پرجگہ لی اوراس میں لیبارٹری کے متعلق فرنیچرز بنوائے ابھی اورسامان نہیں لایاتھاکہ ایک ساتھی نے کہاکہ لیبارٹری کے متعلق جوسامان ہو.وہ میں لے کے آؤنگااور چلانے والابھی میراہی بندہ ہوگااورمنافع آپس میں آدھاآدھاتقسیم کرینگے،پوچھنا یہ ہے کہ مذکورہ طریقے سے شراکت جائز ہے یانہیں؟اگرجائزنہیں توجائز ہونے کی کونسی صورت ہوسکتی ہے،نیز آپس میں منافع کاآدھاآدھاتقسیم کرناشرعادرست ہے یانہیں؟جبکہ فرنیچرزپرتقریباتیس ہزار ۳۰۰۰۰روپے لگے ہیں اورسامان پرتقریباڈیڑھ لاکھ ۱۵۰۰۰۰روپے۔ مستفتی:ابوہمام شانگلہ

﴿جواب﴾ عقدشرکت میں دونوں جانب یعنی ہرایک پارٹی کی طرف سے مال مشترکہ کا نقد(دراہم،دنانیر،روپیہ،پیسہ)ہوناضروری ہے،مذکورہ صورت میں فرنیچرزاورلیبارٹری کے اوزارکوبنیادبناکرمعاملہ کیاہے.اسلئے صحیح نہیں ہے،البتہ اس معاملہ کودرست کرنے کیلئے فرنیچرزکو چھ حصوں میں تقسیم کرکے پانچ حصوں کولیبارٹری سامان والے کے چھٹے حصے کے بدلے بیچ دے تواسطرح آپ دونوں پورے سامان میں شریک ہونگے گویاکہ کل سامان کے چھ حصوں میں سے ایک حصہ آپکاہوگااورپانچ حصے شریک کے ہونگے۔

خدانخواستہ اگر نقصان ہوا تو وہ بھی اسی تناسب سے تقسیم ہوگا منافع کا آپس میں آدھا آدھا تقسیم کرنا بھی شرعاً درست ہے بشرطیکہ زیادہ مال والے پر عمل کی شرط نہ لگائی گئی ہو، زیادہ مال والے پر عمل کی شرط لگانے کی صورت میں منافع میں سے بھی اس کا حصہ کچھ زیادہ ہونا ضروری ہے خواہ معمولی سا ہو لیکن آدھا آدھا صحیح نہیں ہے، البتہ احسان وتبرع کے درجہ میں وہ بھی محنت کریں تو کوئی منع نہیں ہے لیکن عقد میں مشروط نہ ہو۔

لمافی الهندية:(۲/۳۰۶-۳۰۷،طبع رشيديه)

"الشركة اذاكانت بالمال لاتجوزعندناكانت اومفاوضة الا اذاكان رأس مالهمامن الاثمان التى لاتتعين فى عقودالمبادلات نحوالدراهم والدنانير فامامايتعين فى عقودالمبادلات نحوالعروض والحيوان فلاتصح الشركة بهماسواء كان ذلك رأس مالهماأورأس مال احدهماكذافى المحيط....."والحيلة فى جوازالشركة فى العروض وكل مايتعين بالتعيين...ولوكان بينهماتفاوت بان تكون قيمة عرض احدهمامائة وقيمة عرض صاحبه اربع مائة يبيع صاحب الاقل اربعة اخماس عرضه بخمس عرض الآخرفصارالمتاع كله اخماساًكذافى الكافى.

ولمافى البدائع:(۶/۶۲،طبع سعيد)

والاصل ان الربح انمايستحق عندنااماباالمال واماباالعمل واماباالضمان...بقول النبى ﷺالخراج بالضمان.

ولمافى التنويرمع الدر:(۴/۳۱۲-۳۱۳،طبع سعيد)

"ولذا(تصح)عاماوخاصاومطلقاومؤقتاو(مع التفاضل فى المال دون الربح وعكسه وببعض المال دون بعض وبخلاف الجنس كدنانير)من احدهماو(دراهم من الآخر)وفى الشامية:"قلت وحاصل ذلك كله انه اذا تفاضلافى الربح فان شرطاالعمل عليهما سوية جازولوتبرع احدهماباالعمل.....وقدوقعت حادثة توهم بعض حنفية العصرانهامن هذاالقبيل وليس كذالك هى تفاضلافى المال وشرطاالربح بينهمانصفين ثم تبرع افضلهماماالاباالعمل:فاجبت بان الشرط صحيح لعدم اشتراط العمل على اكثرهمامالاوالتبرع ليس من قبيل الشرط والدليل عليه مافى بيوع الذخيرة.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ	واللہ اعلم بالصواب: محمد شاکر اللہ
۲۰ ربیع الثانی ۱۴۲۹ھ	فتویٰ نمبر: ۱۳۲۷

﴿مشترکہ گاڑی میں اپنا حصہ شریک کو کرایہ پر دینا جائز ہے﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ دو آدمیوں نے مشترکہ

ایک گاڑی خریدی دونوں میں سے ایک نے کہا کہ میں اس گاڑی کا اپنا حصہ آپکو بطور کرایہ دیتا ہوں، دوسرا اس پر راضی ہوگیا، کیا ایسا معاملہ شرعاً درست ہے یا نہیں؟ مستفتی: شاہد عرفان صوابی

﴿جواب﴾ صورت مسئولہ میں ایک شریک کا گاڑی میں سے اپنا حصہ دوسرے شریک کو بطور کرایہ دینا جائز ہے۔

لمافی درر الحکام:(۱/۶۶۲،طبع ماجدیه)

(للمالک ان یؤجر حصته الشائعة من الدار المشترکة ان کانت قابلة للقسمة اولم تکن)لوآجر حصته هذه من شریکه سواء کانت قابلة للقسمة أم غیر قابلة وکانت وقفاً أم غیر وقف ومنقولاً أم غیر منقول فایجاره صحیح.

ولمافی التنویر مع الدر:(۶/۴۸،طبع ایچ ایم سعید)

وتفسد ایضا بالشیوع الااذا آجر کل نصیبه اوبعضه من شریکه فیجوز وجوازه بکل حال وعلیه الفتوی.(وجوازه بکل حال)ای سواء کان من شریکه اولا فیما یحتمل القسمة او لم یکن بشرط بیان نصیبه وان لم یبین لا یجوز فی الصحیح.

ولمافی الهندیة:(۴/۴۴۸،طبع رشیدیه)

واجمعوا انه لوآجر من شریکه یجوز سواء کان مشاعا یحتمل القسمة اولا یحتمل القسمة وسواء کان آجر کل نصیبه منه اوبعضه کذافی الخلاصة.

الجواب صحیح: عبد الرحمٰن عفا اللہ عنہ والله اعلم بالصواب: احمد علی عفی عنہ

۲۰ ربیع الثانی ۱۴۳۱ھ فتوی نمبر: ۲۶۲۸

﴿ادھار مال لیکر مشترکہ کاروبار کرنے کی صورت میں نفع کی تقسیم﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام مندرجہ ذیل مسئلہ کے بارے میں کہ چند افراد مل کر کاروبار کرتے ہیں لیکن ان کے پاس سرمایہ موجود نہیں ہے، وہ کسی کمپنی سے ادھار مال لے کر کاروبار کرتے ہیں اور اپنے درمیان نفع کی شرح کو برابری کے حساب سے تقسیم کرتے ہیں، کیا ان کا اس طرح کاروبار کرنا اور نفع کو تقسیم کرنا درست ہے یا نہیں؟ مستفتی: محمد ارسلان کوٹ غلام محمد

﴿جواب﴾ کاروبار کی مذکورہ صورت ''شرکت وجوہ'' کہلاتی ہے، اس کاروبار میں شریک افراد ایک ساتھ مل کر کسی کمپنی یا شخص سے اگر ادھار مال لیتے ہیں یعنی ہر ایک الگ طور پر ذاتی اثر ورسوخ سے مال نہیں لیتا تو ایسی صورت میں تمام ساتھیوں کو نفع کی تقسیم میں برابر کا حصہ دینا درست ہے، اسلئے کہ ادھار مال میں برابر کے شریک تھے اور اگر ہر ایک ساتھی ذاتی طور پر اپنے

اثر ورسوخ سے مال ادھار حاصل کرتا ہے، ظاہر ہے اس صورت میں کسی کے ذمہ زیادہ اور کسی شریک کے ذمہ کم مال ہوگا، تو نفع بھی اسی نسبت سے تقسیم کرنا ضروری ہے، ہر ایک کو برابر کا حصہ دار قرار دینا جائز نہیں ہے۔

لما فی التنویر مع الدر:(۳۲۲/۴-۳۲۳، طبع سعید)

(و)اما(وجوه).(ان عقداها على ان يشتريا)نوعا اوانواعا(بوجوههما)بسبب وجاهتهما (ويبيعا)فما حصل بالبيع يدفعان منه ثمن ما اشتريا(بالنسيئة)ومابقى بينهما... (على ماشرطا من مناصفة المشترى)بفتح الراء(اومثالثته)ليكون الربح بقدر الملك لئلا يؤدى الى ربح مالم يضمن.

وفى الشامية:لئلا يؤدى الخ علة لمفهوم ماقبله وهو انه لايجوزان يكون الربح مخالفا لقدر الملك وعبارة الكنز،وان شرطا مناصفة المشترى اومثالثته فالربح كذلك وبطل شرط الفضل قال فى النهر لان استحقاق الربح فى شركة الوجوه بالضمان وهو على قدر الملك فى المشترى فكان الربح الزائد عليه ربح مالم يضمن.

ولما فى بدائع الصنائع:(۶۵/۶ طبع ایچ ایم سعید)

والربح بينهما على قدر الضمان فان شرطا لاحدهما فضل ربح على حصته من الضمان فالشرط باطل ويكون الربح بينهما على قدر ضمانهما ثمن المشترى لان الربح فى هذه الشركة انما يستحق بالضمان فيتقدر بقدر الضمان فاذا شرط لاحدهما اكثر من حصته من الضمان و نصيبه من الملك فهو شرط ملك من غير ربح ولا ضمان فلايجوز.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ واللہ اعلم بالصواب: عدنان خدا بخش

۶ ربیع الاول ۱۴۳۱ھ فتویٰ نمبر: ۲۴۹۷

﴿باپ اور بیٹے کے مشترکہ کاروبار کا حکم﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ باپ اور بیٹا ایک کاروبار میں شریک ہیں اور اچھی طرح کمائی حاصل ہوتی ہے تو یہ حاصل ہونے والے منافع باپ اور بیٹے کے درمیان برابر تقسیم ہونگے یا صرف باپ کی ملکیت شمار ہوگی؟ مستفتی: فدا محمد صوابی

﴿جواب﴾ باپ اور بیٹے کے مشترکہ کاروبار میں اگر دونوں کا سرمایہ الگ الگ ہو تو حاصل ہونے والے منافع بھی آپس میں برابر تقسیم ہونگے لیکن اگر کاروبار صرف باپ کا ہے اور بیٹا معین اور مددگار ہے تو حاصل ہونے والے منافع باپ کی ملکیت ہوگی۔

لما فی الشامی:(۳۲۵/۴، طبع سعید)

الاب وابنه يكتسبان فى صنعة واحدة ولم يكن لهما شىء فالكسب كله للاب ان كان

الابن في عياله لكونه معيناله الاترى انه لوغرس شجرة تكون للاب.

ولمافي الفتاوى الخيرية على هامش تنقيح الحامدية:(۹۲/۲مطبع حقانيه)

(سئل)في ابن كبيرذي زوجة وعيال له كسب مستقل حصل بسببه اموال هل هي لوالده خاصة ام تقسم بين ورثته على فرائض الله تعالى حيث كان له كسب مستقل بنفسه. (أجاب)هي للابن تقسم بين ورثته على فرائض الله تعالى حيث كان له كسب مستقل بنفسه.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ   واللہ اعلم بالصواب: احمد علی عفی عنہ

۱۶ ربیع الاول ۱۴۳۱ھ   فتوی نمبر: ۲۵۲۵

﴿شرکت کوکسی میعاد کے پابند کرنا اوراثاثوں کی تقسیم کا طریقہ کار﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں مفتیان کرام اس مسئلہ کے متعلق کہ کیا شرکت کی کوئی میعاد مقرر کی جاسکتی ہے یا نہیں؟ یعنی زیادہ سے زیادہ کوئی ایسی مدت مقرر کی جائے کہ جسکے بعد شرکت خود بخود ختم ہوجائے مثلاً زیداور عمراس طرح شرکت کریں کہ ہم ایک سال کے لئے شرکت کرتے ہیں، اس میں جونفع ہوگا وہ طے شدہ شرح کے مطابق تقسیم ہوگا (ایک سال کے بعد شرکت ختم ہو جائے گی) کیا یہ جائز ہے یا نہیں؟ نیز شرکت کے ختم ہونے کے بعد اثاثے کیسے تقسیم ہونگے؟

﴿جواب﴾ شرکت کو کسی میعاد کے پابند کرنے کے بارے میں احناف کے مذہب کی دوروایتیں ہیں، پہلی روایت یہ ہے کہ شرکت کو کسی میعاد اور وقت کے ساتھ مشروط اور پابند کیا جاسکتا ہے کیونکہ شرکت درحقیقت دوسرے کو وکیل بنانا ہے اور وکالت میں مدت طے کی جاسکتی ہے۔ دوسری روایت یہ ہے کہ شرکت کو کسی میعاد کا پابند نہیں کیا جاسکتا ہے، کیونکہ ایک روایت کے مطابق وکالت میں میعاد کی پابندی صحیح نہیں ہے۔

لیکن اصح قول یہ ہے کہ شرکت کو کسی میعاد کا پابند کیا جاسکتا ہے، لہٰذا صورت مسئولہ میں ایک سال کی مدت مقرر کرنا کہ اسکے بعد شرکت ختم ہو جائے درست ہے، شرکت کے ختم ہونے کے بعد اثاثوں کے تصفیہ کا طریقہ کار یہ ہوگا کہ سب سے پہلے اس کاروبار سے جونفع حاصل ہوا وہ باہمی طے کردہ تناسب کی بنیاد پر تقسیم کیا جائے گا، اسکے بعد جو اثاثے باقی بچیں تو ان میں یہ تفصیل ہے کہ اگر تمام اثاثے نقد شکل میں ہوں تو وہ تمام باسانی شرکاء کے درمیان انکے حصص کے تناسب سے تقسیم کردیئے جائیں، البتہ اثاثے اگر ایسے ناقابل تقسیم ہوں کہ انکو الگ الگ

اجزاء میں تقسیم نہ کر سکتے ہوں مثلاً مشینری وغیرہ تو انہیں فروخت کر کے نقد رقم شرکاء کو حصص کے تناسب سے دی جائے گی۔

لمافی الهندية:(۲/۳۰۲،طبع رشيديه)

وان وقت اهل يتوقت بالوقت المذكور روى بشر عن ابى يوسف عن ابى حنيفة رحمهما الله تعالىٰ انه يتوقت والطحاوى ضعف هذه الرواية وصححها غيره من المشايخ وهو الصحيح.

ولمافی الشامی:(۴/۳۱۲،طبع سعيد)

ثم اذا وقتها فهل تتوقت بالوقت حتى لاتبقى بعد مضيه؟فيه روايتان كمافى توقيت الوكالة وتمامه فى البحرعن المحيط ولم يذكر ترجيحا وجزم فى الخانية بانها تتوقت حيث قال والتوقيت ليس بشرط لصحة هذه الشركة والمضاربة وان وقتا لذالك وقتا بان قال مااشتريت اليوم من شيء فهو بيننا صح التوقيت وبينك نصفين فقال الرجل نعم فان اباحنيفة رحمه الله قال هذا جائز وكذلك قال ابويوسف الخ.

ولمافی شرح المجلة:(۴/۲۶۷،المادة ۱۳۳۳،طبع رشيديه)

كل قسم من شركة العقد يتضمن الوكالة الخ.

ولمافی الاشباه والنظائر:(ص ۱۹۲،طبع قديمى)

مااشتريت اليوم من انواع التجارة فهو بيني وبينك فقال نعم.

ولمافی الشامی:(۶/۲۶۰،طبع سعيد)

(قوله وقسم المال المشترك)اى الذى تجرى فيه القسمة جبرابان كان من جنس واحد.

ولمافی الشامی:(۶/۲۵۳،طبع سعيد)

وركنها هو الفعل الذى يحصل به الافراز والتميز بين الانصباء.

ولمافی الهداية:(۴/۴۱۱،طبع رحمانيه)

الاانهاذاكانت من جنس واحداجبر القاضى على القسمة عن طلب احدالشركاء لان فيه معنى الافرازلتقارب المقاصد..... وان كانت اجناسا مختلفة لايجبر القاضى على قسمتها لتعذر المعادلة باعتبار فحش التفاوت فى المقاصد ولوتراضو عليها جاز لان الحق لهم.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ　　　　واللہ اعلم: عبدالوہاب لقمانی

۲ جمادی الاولیٰ ۱۴۳۱ھ　　　　فتویٰ نمبر: ۲۶۵۵

﴿منافع میں شرکت کا حکم﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں مفتیان کرام اس مسئلہ کے متعلق کہ اگر دو آدمی اس طرح

شرکت کا معاملہ کریں ، ایک کی ریڑھی ہے اور دوسرے کا مال ہے، اور دونوں آپس میں یہ طے کر لیتے ہیں کہ جو کچھ حاصل ہوگا وہ آپس میں نصف نصف تقسیم کرلیں گے مذکورہ معاملہ شرعا درست ہے یا نہیں؟

مستفتی: طاہر حسین صوابی

﴿جواب﴾ عقد شرکت کے لئے ضروری ہے کہ ہر ایک شریک کی جانب سے مال ہو، مذکورہ صورت میں ریڑھی والے آدمی کی طرف سے مال نہیں ہے بلکہ صرف ریڑھی کے منافع ہیں اس لئے اس صورت میں شرکت فاسد ہے ریڑھی جس شخص کی ہے وہ مال میں اپنا حصہ شامل کر دے تو اسی نسبت سے شریک قرار پائے گا اور ریڑھی کے لئے کرایہ متعین کرلیا جائے تو اپنے ساتھی سے اس کے حصہ کے مطابق ریڑھی کا کرایہ الگ وصول کرتا رہے۔

لمافی شرح المجلة:(۲/۲۶۵،المادة ۱۳۲۲،طبع رشیدیه)

اذاکان لواحددابة ولآخرامتعة وتشارکاعلی تحمیل الامتعة وبیعهاعلی ان ماحصل من الربح یکون بینهمامشترکافالشرکة فاسدة والربح الحاصل یکون لصاحب الامتعة، وصاحب الدابة یاخذاجرمثل دابته والدکان ایضامثل الدابة .... وکذالوکان لرجل سفینة فاشترک مع اربعة علی ان یعملوابسفینته وآلاتهاوالخمس لصاحب السفینة والباقی بینهم بالسویة فهی فاسدة والحاصل لصاحب السفینة وعلیه اجرمثلهم کمافی رد المحتارعن البحرلان راس مال احدهماعرض وراس مال الآخرمتعة.ومثله فی الشامیة:(۲/۳۲۶،طبع سعید)

ولمافی الهندیة:(۲/۳۲۲،طبع رشیدیه)

وکذلک لودفع شبکة لیصیدبهاالسمک وبینهماالنصفین فالصیدللصائدولصاحب الشبکة اجرمثلهاکذافی محیط السرخسی.

ولمافی الشامی:(۲/۲۹۹،طبع سعید)

الشرکة لغة الخلط وشرعاعبارة عن عقدبین متشارکین فی الاصل والربح.

ولمافی الهندیة:(۲/۳۵۷،طبع رشیدیه)

وکل شیء لیس یکون منه العمل استاجره احدهمامن صاحبه فهوجائزمثل الجوالق وغیره.وفیهاایضا:ولوکان لاحدهماسفینة فارادنقل الطعام الی بلدفقال احدهماللذی له السفینة اجرنی نصف سفینتک احمل علیهاحصتی من الطعام وحصتک منه فی نصف سفینتک ففعل جاز.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ   واللہ اعلم بالصواب: عبدالوہاب لقمانی

۲۹ ربیع الثانی ۱۴۳۱ھ   فتویٰ نمبر: ۲۶۵۲

﴿شرکت کی ایک صورت کا حکم﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ زید اور عمرو ایک لاکھ روپے ملا کر کاروبار شروع کرتے ہیں، زید اس کاروبار میں پورا پورا وقت دیتا ہے جبکہ عمرو اس میں کوئی وقت نہیں دیتا، اس کاروبار میں جو بھی منافع ہوتا ہے، زید عمرو کو آدھا دیتا ہے اور آدھا خود رکھتا ہے جبکہ عمرو کوئی وقت بھی نہیں دیتا اور زید کو کوئی اعتراض نہیں تو مفتی صاحب معلوم یہ کرنا ہے کہ جو منافع عمرو لے رہا ہے یہ شرعی طور پر جائز ہے یا نہیں؟ مستفتی: محمد تابش کورنگی کوسٹ گارڈ

﴿جواب﴾ مسئولہ صورت میں اس طرح شرکت کر کے کاروبار کرنا اور منافع برابر تقسیم کرنا جائز ہے، البتہ نقصان کی صورت میں بھی دونوں کو برابر نقصان برداشت کرنا ہوگا۔

لمافی تنویر الابصار:(۳۱۲/۴،طبع ایم سعید)

مع التفاضل فی المال دون الربح وعکسه.

وفی الشامیة-والربح بینهما علی ماشرطاوان عمل احدهمافقط(وفی صفحة تالية)ان عدم العمل من احدهمالافرق ان یکون بعذراوبدونه.

ولمافی بدائع الصنائع:(۶۲/۶،طبع سعید)

اذاشرطاالربح علی قدرالمالین متساویااومتفاضلافلاشک انه یجوزویکون الربح بینهماعلی الشرط سواء شرطاالعمل علیهمااوعلی احدهماوالوضیعه علی قدر المالین متساویاومتفاضلالان الوضیعه اسم لجزء هالک من المال فیتقدربقدرالمال وان کان المالان متساویین فشرطالاحدهمافضلاعلی ربح ینظران شرطاالعمل علیهماجمیعاجازوالربح بینهماعلی الشرط فی قول اصحابناالثلاثه.

ولمافی شرح المجلة:(۶۲/۱،طبع سعید)

کیفماشرط تقسیم الربح فی الشرکة الصحیحة فذلک الشرط یراعی علی کل حال.

ولمافی شرح المجلة:(۲۹۴/۴،طبع رشیدیه)

ولوشرطاالعمل علیهماجمیعاصحت الشرکة وان قل راس مال احدهماوکثرراس المال الاخرواشترطاالربح بینهماعلی السواء اوعلی التفاضل فان الربح بینهماعلی الشرط والوضیعة ابداعلی قدرروس اموالهماله فالعقدجائزوالشرط فی حق الوضیعة باطل فان عملاوربحافالربح علی ماشرطاوان خسرافالخسران علی قدررأس مالهما.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ　　　　واللہ اعلم بالصواب: محمد زبیر اکرام

۱۷ صفر ۱۴۳۱ھ　　　　فتویٰ نمبر: ۴۴۴۲

﴿شرکت میں نفع کا تعین ضروری ہے﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام مندرجہ ذیل مسئلہ کے بارے میں کہ زید ایک کاروبار بہت بڑے پیمانے پر کرتا ہے اور بہت رقم اسکی کاروبار میں لگی ہوئی ہے، اب عمرو زید کو ایک لاکھ روپے دیتا ہے کہ یہ رقم اپنے کاروبار میں لگالو اور ہر مہینے مثال کے طور پر پانچ ہزار روپے مجھے منافع دو، کیا یہ معاملہ جائز ہے؟ پہلے ہی منافع طے کرنا کیسا ہے؟ مستفتی: محمد تابش کورنگی

﴿جواب﴾ مذکورہ معاملہ بلاشبہ ناجائز اور حرام ہے البتہ معاملہ کی جائز صورت یہ ہوسکتی ہے کہ پہلے زید کے سرمایہ کا اندازہ لگایا جائے بالفرض کل نولاکھ روپے زید کے لگے ہیں اور ایک لاکھ روپے عمرو دیدے تو اس کاروبار کے کل دس حصے ہوگئے جو بھی منافع آئیں ان میں سے نو حصے تو زید کے اپنے ہوں گے باقی ایک حصہ میں کوئی نسبت باہمی رضامندی سے طے کریں تو یہ مضاربت کہلاتی ہے جو کہ جائز ہے چونکہ کاروبار میں نقصان بھی ہوسکتا ہے تو نقصان بھی دونوں شرکاء کو برداشت کرنا ہوگا، البتہ پہلے حاصل شدہ نفع سے پورا کیا جائیگا اس سے بھی زیادہ نقصان ہوجائے تو سرمایہ کی نسبت سے ہر ایک پاٹنر کو برداشت کرنا ہوگا۔

لما فی العالمگیریۃ: (۳۰۲/۲ طبع رشیدیہ)

وان یکون الربح معلوم القدر فان کان مجهولا تفسد الشرکة وان یکون الربح جزأ شائعا فی الجملہ لا معینا فان عینا عشرة او مائة او نحو ذلک کانت الشرکہ فاسدة.

ولما فی التنویر مع الدر: (۳۰۵/۴ طبع ایچ ایم سعید)

(وشرطها) ای شرکة العقد..... (وعدم ما یقطعها کشرط دراهم مسماة من الربح لاحدهما) لانه قد لا یربح غیر المسمی.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: محمد زبیر اکرام

۱۹ صفر الخیر ۱۴۳۱ھ — فتویٰ نمبر: ۲۴۴۳

﴿مشترک کاروبار کے منافع میں باپ کا تصرف﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں مفتیان کرام اس مسئلے کے بارے میں کہ ایک آدمی اور اس کے چار بیٹوں نے ملکر کاروبار شروع کیا چونکہ کاروبار سے پہلے سب ملکر مزدوری کر کے پیسے کماتے تھے، اس لئے کاروبار میں سب کا پیسہ شامل ہے، اس کاروبار سے کافی نفع ہوا اس آدمی کا ایک

نابالغ بیٹا تھا جو کاروبار میں شامل نہیں تھا۔

اب یہ آدمی منافع میں سے اس چھوٹے بیٹے کو حصہ دینا چاہتا ہے جبکہ یہ بیٹا کاروبار میں شامل نہیں تھا، کیا ایسا کرنا شرعاً جائز ہے؟ واضح رہے کہ سب بیٹے باپ کے ساتھ رہتے ہیں۔

﴿جواب﴾ باپ اور بیٹوں کی مشترک کمائی باپ کی ملکیت سمجھی جاتی ہے اور باپ اس میں تصرف کرنے کا حق رکھتا ہے، لہٰذا باپ اگر نابالغ بیٹے کو منافع میں سے حصہ دینا چاہے تو دینے میں کوئی حرج نہیں ہے، ہاں کاروبار شروع کرتے ہوئے ہر ایک کی کمائی الگ الگ معلوم تھی جس سے کاروبار شروع کیا تو ایسی صورت میں حکم تبدیل ہوگا۔

لمافی الشامی:(۶/۵۰۲،طبع امدادیه)

الأب وابنه يكتسبان في صنعة واحدة ولم يكن لهما شئ فالكسب كله للاب ان كان الابن في عياله لكونه معيناًله الاترى لوغرس شجرة تكون للأب.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم: صلاح الدین چترالی

۶ جمادی الاولیٰ ۱۴۲۷ھ — فتویٰ نمبر: ۲۶۲

﴿مشترکہ کاروبار میں غفلت اور لاپروائی تعدی شمار ہوگی﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ہم دو شریکوں نے مارکیٹ اصولوں کے مطابق گاڑیوں کی خرید وفروخت کا کاروبار شروع کیا جسمیں ہم نقد اور قسطوں پر خرید وفروخت کیا کرتے تھے۔

تاہم میرے شریک نے ایک گاڑی قسطوں پر فروخت کر کے اسکے کاغذات ادائیگی سے پہلے اس کے حوالے کر دیئے حالانکہ قانون یہ تھا کہ قسطوں کے کاروبار میں گاڑی کے کاغذات قسطوں کی ادائیگی کے بعد دیئے جاتے ہیں نہ کہ پہلے۔

اب جبکہ کاغذات تو گاڑی کے خریدار کے پاس ہیں جسکی وجہ سے ہم قانوناً اس سے گاڑی واپس نہیں لے سکتے لیکن میں جب شریک سے اپنے حق کا مطالبہ کرتا ہوں تو وہ کہتا ہے کہ جو رقم آپ مجھ سے مانگ رہے ہیں وہ سود ہے، اس لئے کہ وہ رقم تو گاڑی کا خریدار مجھے نہیں دیتا، برائے مہربانی شریعت کی رو سے یہ بتلائیں کہ میرے شریک کی بات درست ہے یا میری؟

جبکہ غلطی میرے شریک کی ہے؟

﴿جواب﴾ مذکورہ صورت میں اگر گاڑی کے خریدار تک رسائی ممکن نہیں یا قانوناً اب آپ اس سے اپنا حق نہیں لے سکتے تو پھر آپکے لئے اپنے شریک سے اپنے حق کا مطالبہ شرعاً جائز ہے کیونکہ یہ نقصان آپکے شریک کی غفلت اور لاپروائی کی وجہ سے ہوا ہے۔

لما فی التنویر مع الدر:(۳۲۰/۴،باب الشركة،طبع سعيد)

(ويضمن بالتعدى)وهذاحكم الامانات......وفى الأشباه:نهى احدهماشريكه عن الخروج وعن بيع النسيئة جاز.

ولما فيه ايضا:(۳۱۸/۴،طبع سعيد)

(ولايجوزلهما)فى عنان ومفاوضة(تزويج العبدولاالاعتاق والهبة والقرض وكذاكل ما كان اتلافاللمال اوتمليكابغيرعوض)لان الشركة وضعت للاسترباح وتوابعه وما ليس كذلك لاينتظمه عقدها.

ولما فى الشامى:(۳۱۹/۴،طبع سعيد)

ومايكون اتلافاللمال اوتمليكامن غيرعوض فانه لايجوز مالم يصرح به نصاً

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: عبیداللہ عابد غفرلہ ولوالدیہ

۱۹ جمادی الثانی ۱۴۳۰ھ — فتویٰ نمبر: ۲۳۱۴

﴿بیوی کا اپنے زیورات شوہر کو بغرض تجارت دینا﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میں اپنے زیورات اپنے شوہر کو خوشی سے بغرض تجارت دینا چاہتی ہوں، میرے لئے کیا حکم ہے؟ مستفتیہ: بیگم زاہد محمد سواتی

﴿جواب﴾ آپ اپنے زیورات کی خود مالک ہیں، شوہر کو بطور ہدیہ دینا چاہتی ہیں تو دے سکتی ہیں بلاشبہ آپکو ثواب ملیگا اور بغرض تجارت دینے سے آپکا مقصد اگر مضاربت ہے تو اس میں بھی کوئی حرج نہیں۔

زیورات بیچ کر جو پیسہ ملے وہ شوہر کو بطور مضاربت دیدیں تاکہ آپکا پیسہ ہو اور انکی محنت، اس سے وہ جو کماتے رہیں تو تقسیم منافع کیلئے باہمی رضامندی سے کوئی شرح مقرر کرلیں مثلاً ہر ایک کو پچاس (50) فیصد، یا شوہر کو دو تہائی اور ایک تہائی منافع آپ کیلئے ہو، الغرض یہ طے کرنا ضروری ہے لیکن شرح کا تعیین باہمی رضامندی سے کریں، مضاربت کے مزید تفصیلی احکام کسی مقامی

عالم سے معلوم کریں یا جو صورت اپنانا چاہیں تو تفصیل لکھ کر بھیج دیں، ہم ان شاء اللہ تفصیلی جواب دیدیں گے۔

لما فی الدر المختار:(۶۴۵/۵ طبع ایچ ایم سعید)

ھی لغۃ مفاعلۃ من الضرب فی الارض وھو السیر فیھا وشرعا عقد شرکۃ فی الربح بمال من جانب رب المال وعمل من جانب المضارب.

ولما فی الھندیۃ:(۳۱۱/۴ طبع قدیمی)

أما تفسیرھا شرعا: فھی عبارۃ عن عقد علی الشرکۃ فی الربح بمال من أحد الجانبین والعمل من الجانب الآخر حتی لو شرط الربح کلہ لرب المال کان بضاعۃ ولو شرط کلہ للمضارب کان قرضا.

ولما فی الھدایۃ:(۲۶۲/۳ طبع رحمانیہ)

المضاربۃ عقد یقع علی الشرکۃ بمال من احد الجانبین ومرادہ الشرکۃ فی الربح وھو یستحق بالمال من احد الجانبین والعمل من الجانب الآخر.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: عباداللہ

۱۷ صفر الخیر ۱۴۳۲ھ — فتویٰ نمبر: ۲۸۷۴

﴿شرکت فاسدہ میں منافع بقدر رأس المال ہوں گے﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے کہ ایک آدمی مرگیا اور اولاد میں مثلاً ایک بیٹا اور بیٹی ہے اور ترکہ میں نقد رقم چھوڑی، اب بھائی نے ترکہ تقسیم کئے بغیر بہن کی رضامندی سے ان پیسوں سے کاروبار شروع کیا تو کیا منافع میں بہن بھائی کے ساتھ شریک ہوگی یا نہیں؟

﴿جواب﴾ ترکہ میں چونکہ بھائی اور بہن دونوں شریک ہیں اسلئے کاروبار شروع کرنے سے پہلے ضروری تھا کہ ہر ایک وارث کا حصہ الگ کرکے اسکے حوالے کرتے یا کم از کم بھائی اپنی بہن سے اسکے حصے کی رقم کو بطور قرض استعمال کرنے کی اجازت لیتے۔ مذکورہ صورت میں چونکہ ایسی کوئی وضاحت نہیں ہوئی اور بہن کے حصے کی رقم اسکی اجازت سے کاروبار میں لگائی گئی تو یہ شرکت عقد ہوئی، شرکت عقد میں تقسیم منافع کی شرح کو متعین کرنا ضروری ہوتا ہے ورنہ شرکت فاسد ہوتی ہے اور شرکت فاسد میں اگر مال دونوں کا ہے تو منافع کی تقسیم سرمایہ کی نسبت سے ہوتی ہے لہٰذا منافع میں بھائی کے ساتھ بہن شریک ہوگی، بہن کو منافع میں سے ایک تہائی دینا ضروری ہے۔

لمافی درر الحکام شرح مجلة الاحکام: ج ۵۱/۳ تحت المادة (۱۳۳۶)

يشترط بيان الوجه الذی سيقسم فيه الربح بين الشركاء، واذابقی مبهماومجهولا تكون الشركة فاسدة.

ولما فی الفقه الحنفی: (۵۱/۵، طبع: دار القلم، دمشق)

الشركة الفاسدة امان تكون بدون مال اوبمال من الجانبين او من احدهما فالحكم الاولى ان الربح فيها للعامل، وفی الثانية الربح فيهابقدر المال ... الخ

ولمافی درر الحكام ۸۸/۳ تحت المادة (۱۳۶۸ طبع: مكتبه ماجديه)

يقسم الربح والفائدة فی الشركة الفاسدة بنسبة مقدار رأس المال.

ولمافی شرح المجلة ۵۳/۲ تحت المادة (۱۳۳۱) مكتبة رشيدية

شركة العقدتنقسم الى قسمين فاذاعقداثنان اواكثر عقدالشركة بينهمااوبينهم على المساواة وكان مالهما اومالهم الذی ادخلاه فی الشركة فمايصلح ان يكون رأس المال للشركة وكانت حصتهمامتساوية من رأس المال والربح تكون الشركة مفاوضة كمالوتوفی رجل فاتخذاولاده مجموع اموال ماانتقل اليهم من ابيهم رأس المال على ان يشترواويبيعوامن سائر الانواع ويقسم الربح بينهم على التساوی يكون عقدالشركة مفاوضة لكن وقوع هكذاشركة على المساواة التامة نادر، واذااختل شرط من شروط المساواة التامة تكون شركة عنان، المساواة التامة هی ان يتساويافی مالهما ودينهماوتصرفهما، هندية، لان المفاوضة تنبئ عن المساواة.

الجواب صحیح: مفتی عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب: شفقت اللہ

۱۷ ربیع الثانی ۱۴۳۵ھ — فتوی نمبر: ۳۰۸۸

﴿شرکت فاسد کی ایک صورت﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں مفتیان کرام مسئلہ ذیل میں کہ ہم دو شریکوں نے آدھی آدھی رقم ملا کر چھبیس لاکھ کا ایک مکان خریدا، ہم نے آپس میں طے کیا تھا کہ ایک شریک کو مکان کا نفع کرایہ کی صورت میں ملے گا اور دوسرے شریک کو مکان فروخت ہونے کی بعد حاصل شدہ نفع ملے گا، مکان خریدنے کے بعد میں نے اس میں رہائش اختیار کرلی اور دوسرے فریق کو اسکا پندرہ ہزار کرایہ دیدیا، اب جبکہ میں نے مکان کو دوسرے شریک سے پوچھے بغیر ستائس لاکھ میں بیچ دیا ہے تو دوسرے شریک کو مزید کرایہ بھی دینا ہوگا یا اس کو اس کی آدھی رقم واپس کرنا ہوگی؟ شریعت کا کیا حکم ہے؟ بینوا توجروا۔ سائل: نسیم صاحب کراچی

﴿جواب﴾ سوال میں دو معاملوں کا ذکر ہے ایک معاملہ مکان کے خریدنے کا ہے جسمیں

دونوں نصف نصف کے شریک ہیں اور دوسرا معاملہ مکان کے کرایہ کا ہے، جہاں تک پہلے معاملے کا تعلق ہے تو وہ شرکت فاسدہ کی صورت ہے اسلئے کہ شرکت صحیحہ میں نفع کی شرح معلوم ہونا ضروری ہے اور یہاں معلوم نہیں ہے، لہٰذا مکان کے فروخت ہونے کیصورت میں جو نفع حاصل ہوا ہے وہ دونوں شریکوں کے درمیان ان کے حصوں کی نسبت سے تقسیم ہوگا سوال میں ذکر کردہ صورت کے مطابق یہ نفع دونوں میں آدھا آدھا تقسیم ہوگا اور دوسرا معاملہ مکان کے کرائے کا ہے تو ان جیسے مکانات کا عموماً جو کرایہ بنتا ہو کرایہ دار دوسرے شریک کو اس کے حصے کے بقدر کرایہ دیگا، لہٰذا مذکورہ کرایہ اگر زیادہ ہے تو زیادہ واپس کرنا لینے والے کے ذمہ ہے۔

لما فی البدائع:(۵۹/۶،طبع سعید)

ومنها ان یکون الربح معلوم القدرفان کان مجهولا تفسدالشرکة لان الربح هوالمعقود علیه وجهالته توجب فسادالعقد کمافی البیع والاجارة.

ولما فیه ایضا:(۷۷/۶،طبع سعید)

واماالشرکة الفاسدة وهی التی فاتهاشرط من شرائط الصحة...والربح فیهاعلی قدر المالین لانه لایجوزان یکون الاستحقاق فیهابالشرط لان الشرط لم یصح فالحق بالعدم فبقی الاستحقاق بالمال فیتقدربقدرالمال.

الجواب صحیح:عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ　　　　واللہ اعلم:عبیداللہ عابد غفرلہ ولوالدیہ

۲۷ ربیع الاول ۱۴۳۰ھ　　　　فتویٰ نمبر:۲۰۹۹

﴿ کاروبار میں شرکت سرمایہ کی بنیاد پر ہوتا ہے ﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میں اور میرے ایک رشتہ دار نے ایک پلاٹ اس ارادے سے خریدا کہ جب اسکی قیمت بڑھ جائے تو فروخت کریں گے، خریدتے وقت میرے پاس نقد رقم کم اور اسکے پاس زیادہ تھی، انھوں نے اپنے آدھے حصے کے ساتھ میرے حصے کی کچھ رقم ادا کی، اسی وقت میں نے اس سے کہا کہ میں بعد میں آپکی یہ رقم لوٹا دوں گا لیکن میں نے ابھی تک وہ رقم ادا نہیں کی تھی کہ پلاٹ فروخت ہوا، اب وہ کہتا ہے کہ چونکہ میں نے تین چوتھائی قیمت ادا کی تھی، اس لئے میں تین چوتھائی کی نسبت سے نفع لوں گا اور آپکو ایک چوتھائی کی نسبت سے نفع دوں گا، پوچھنا یہ ہے کہ اسکا ایسا کرنا شرعاً صحیح ہے؟

﴿جواب﴾ شروع میں یہ بات اگر واضح تھی کہ پلاٹ میں دونوں آدھے آدھے کے مالک

ہوں گے یعنی سرمایہ کی بنیاد پر حصہ داری نہیں تھی جیسا کہ آپکے سوال سے بھی واضح ہے کہ آپ نے اپنے ساتھی سے کہہ دیا تھا کہ میرے حصے کی زائد رقم آپ نے جو ادا کی وہ لوٹا دوں گا پھر اس نے اسکا انکار بھی نہیں کیا تھا تو ایسی صورت میں اس پلاٹ میں آپ دونوں برابر کے شریک ہیں، اب نفع بھی برابر تقسیم ہوگا، البتہ قرض وصول کرنے کی غرض سے وہ خاص رقم روکنے کا آپکے دوست کو حق حاصل ہے۔

لما فی البحر الرائق:(۱۶۸/۵،طبع سعید)

(قوله وشركة العقدان يقول احدهما شاركتك في كذاويقبل الاخر)بيان للنوع الثاني ومقصوده بيان ركنها من الايجاب والقبول الدالين عليها الاخصوص شاركتك. لانها عقد من العقود فينعقد بمايدل عليه.

ولما فی التنویر مع الدر:(۳۰۵/۴-۳۰۸،طبع سعید)

(حكمها الشركة في الربح)وقال ايضا:(وللبائع مطالبة ايهماشاء بثمنهما)اى الطعام والكسوة(ويرجع الاخر)بما أدى (على المشترى بقدر حصته)ان أدى من مال الشركة.

ولما فی البحر الرائق :(۱۷۶/۵،طبع سعید)

(قوله ورجع على شريكه بحصته منه)اى من الثمن اذا أدى من مال نفسه لانه وكيل من جهته في حصته فاذانقد من مال نفسه رجع عليه.

الجواب صحیح :عبد الرحمٰن عفا اللہ عنہ | واللہ اعلم بالصواب :نثار محمود کوہاٹی

ا ربیع الثانی ۱۴۳۰ھ | فتوی نمبر :۲۱۱۸

﴿بيان طريق المضاربة﴾

﴿مضاربۃ کا طریقہ کار﴾

﴿سوال﴾اعطيت صاحبالي مالاوقلت له اتجرفيه اذاربحت فلك شيء منه فذهب يتجر وأنا اعينه ايضافاذاقل الربح اعطيته شيئاًواذا كثر اعطيته اكثر.هل يجوز هذا؟ وماطريقته المشروعة؟بينوا توجروا.

﴿جواب﴾ان كان اعانتك اياه مشروطاً وقت العقدفلايجوزوان كان تبرعاً فلايضر،لأن هذه مضاربة يجب ان يكون العمل من جانب والمال من جانب .وشرط العمل على رب المال يفسدها.وكذاليس الربح مشاعاً معلوماًبينكماوذالك شرط صحة المضاربة ولم يوجدفلايصح.

لمافی الهداية:(۲/۲۶۲،طبع رحمانيه)

المضاربة عقد يقع على الشركة بمال من أحد الجانبين. ومراده الشركة في الربح وهو يستحق بالمال من أحد الجانبين والعمل من الجانب الآخر. وقال بعد صفحة: وشرط العمل على رب المال مفسد للعقد لأنه يمنع خلوص يد المضارب.

ولمافي التنويرمع الدر:(۵/۶۴۵-۶۴۶،طبع سعيد)

(هي عقد شركة في الربح بمال من جانب) رب المال (وعمل من جانب) المضارب. (وركنها الايجاب والقبول الخ)

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: محمد سلمہ

۲ صفر الخیر ۱۴۳۰ھ — فتویٰ نمبر: ۱۹۸۵

﴿مضاربت میں ماہانہ منافع رأس المال میں شامل کرنا جائز نہیں ہے﴾

﴿سوال﴾ مضاربت کی ایک کمپنی ہر ماہ منافع تقسیم کرتی ہے، کسی رب المال کا نفع راس المال کیساتھ شامل نہیں کرتی مثلاً خالد ایک لاکھ روپیہ بطور مضاربت لگاتا ہے اور اسے ماہانہ 5 ہزار روپیہ تقریباً ملتا ہے تو نفع اس کے حوالے کر دیا جاتا ہے، ایسا نہیں ہوتا کہ نفع راس المال میں شامل کر کے راس المال ایک لاکھ 5 ہزار بن جائے بلکہ اگر وہ نفع کمپنی میں راس المال کے طور پر رکھنا چاہے تو نفع لے کر رکھ لے جب پچاس ہزار بن جائے تو گزشتہ معاہدہ میں ترمیم کر کے راس المال بڑھا دے۔ گزارش طلب بات یہ ہے کہ کیا مضاربت کا یہ طریقہ کار شریعت کی رو سے صحیح ہے؟

﴿جواب﴾ مذکورہ طریقۂ مضاربت میں اگر نفع فیصد کے لحاظ سے متعین کیا گیا ہے تو یہ بالکل صحیح ہے، اور اگر رب المال اور کمپنی کے ذمہ دار لوگ باہمی رضامندی سے ماہانہ نفع راس المال میں جمع کرنا چاہیں تو اس میں بھی کوئی خرابی تو نہیں ہے بشرطیکہ حساب محفوظ ہو۔

لما في تحفة الفقهاء:ص،۲۹۰،۲۹۱،طبع مكتبة المعروفية

واما تفسير المضاربة: فهو دفع المال الى غيره ليتصرف فيه ويكون الربح بينهما على ما شرطا، فيكون الربح لرب المال بسبب ماله لانه نماء ماله وللمضارب باعتبار عمله الذي هو سبب وجود الربح ـــــ ومن شرط صحتها: ان يكون الربح جزءاً مشاعاً من الجملة.

"وفيه ايضاً:ص،۲۹۳"

ومنها: ان قسمة الربح قبل قبض راس المال لا تصح، حتى انهما لو اقتسما الربح ورأس المال في يد المضارب فهلك فما اخذ رب المال من الربح يكون محسوبا من راس

المال ویرجع علی المضارب فیما قبضه حتی یتم راس المال فان فضل فهو ربح بینهما.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ　　　واللہ اعلم بالصواب: محمد زبیر غفرلہ ولوالدیہ

۱۴ جمادی الثانی ۱۴۳۴ھ　　　فتویٰ نمبر: ۳۷۸۹

﴿مضارب کے لئے بھی مزدوری لینا جائز ہے﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام کہ میں نے سود سے بچنے کیلئے کچھ رقم بینک میں رکھنے کے بجائے ایک شخص کو کاروبار کے لئے دی اور یہ طے پایا کہ نفع آدھا آدھا تقسیم ہوگا، اس نے صرف میری دی ہوئی رقم سے سائیکلوں کی خرید وفروخت کا کاروبار شروع کیا کچھ عرصہ تک معاہدہ کے مطابق نفع آپس میں تقسیم ہوتا رہا لیکن اب اسکا کہنا ہے کہ میں نفع کے علاوہ الگ سے مزدوری بھی لوں گا کیونکہ دکان میں بہت سارا کام کرنا پڑتا ہے، پوچھنا یہ ہے کہ کیا شرعاً یہ صحیح ہے یا یہ شخص محض نفع ہی کا مستحق ہے؟ براہ کرم رہنمائی فرما کر ممنون ہوں۔　　　مستفتی: ہیبت خان کوہائی شکردرہ

﴿جواب﴾ اگر مذکورہ شخص صرف آپکی دی ہوئی رقم سے کاروبار چلا رہا ہے تو اسکی حیثیت مضارب کی ہے، اب اگر دکان میں صرف اسی قسم کا کام کرتا ہے جو عام طور پر دکاندار اپنے لئے خود کرتے ہیں یعنی مال منگوا کر دکان میں سیٹنگ اور فروخت کرتا ہے تو اس صورت میں یہ صرف طے کئے ہوئے نفع کا مستحق قرار پاتا ہے، البتہ اگر وہ اسکے ساتھ ساتھ وہ کام بھی کرتا ہو جو عموماً تاجر لوگ مزدوروں سے کراتے ہیں تو اس صورت میں وہ الگ طور پر اسکی اجرت کا مطالبہ کرسکتا ہے، چاہے تو اس کیلئے الگ مزدور رکھ لیں یا دکاندار کے لئے الگ سے مزدوری متعین کرلیں۔

لما فی التنویر مع الدر: (۵/ ۶۴۵ طبع سعید)

وشرعا (عقد شركة فی الربح بمال من جانب) رب المال (وعمل من جانب) المضارب.

ولما فی الهندية: (۴/ ۲۸۵، طبع رشیدیه)

اما تفسيرها شرعا فهی عبارة عن عقد علی الشركة فی الربح بمال من احد الجانبين والعمل من الجانب الآخر.

ولما فی الدر المختار: (۵/ ۶۴۸ طبع سعید)

ومن شروطها: كون نصيب المضارب من الربح حتى لو شرط له من رأس المال او منه ومن الربح فسدت.

ولما فی البحر: (۷/۲۶۴، سعید)

السادس ان یکون المشروط للمضارب مشروطا من الربح.

الجواب صحیح: عبد الرحمٰن عفا اللہ عنہ　　　واللہ اعلم بالصواب: نثار محمود کوہائی عفی عنہ

۲ ربیع الثانی ۱۴۳۰ھ　　　فتوی نمبر: ۲۱۳۴

﴿مضاربت کی ایک صورت﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میں نے خالد صاحب کو پچاس ہزار روپے کاروبار کیلئے دیے، اس پر انہوں نے ایک اسکول شروع کیا اور نفع ونقصان نصف طے ہوا، تقریباً ۲ سال کے عرصے میں ادارہ چلانے میں کامیابی نہ ہوسکی، چنانچہ پچاس ہزار تو بالکل ختم ہوگئے اور ادارہ مزید مقروض ہوگیا، مندرجہ ذیل امور مطلوب ہیں:

(۱) اسکول کے بقیہ سامان کا کیا حکم ہے (۲) اور قرض کون ادا کریگا (۳) رأس المال سارا میرا گیا یا خالد صاحب پر بھی کچھ آئیگا؟　　　مستفتی: عبد العظیم صاحب فیڈرل بی ایریا کراچی

﴿جواب﴾ عرصہ دو سال کے دوران اسکول کی آمدن کو دونوں ساتھیوں میں سے کسی ایک نے بھی اگر ذاتی طور پر استعمال کیا ہے، پہلے اس کا حساب کریں اور اسکول کے باقی موجود سامان کی بھی مارکیٹ ویلیو لگا کر دونوں جمع کریں، اب اس پورے سرمایہ سے پہلے قرض ادا کریں اگر قرض سے زائد ہوگیا تو پچاس ہزار روپے کی حد تک تو اصل سرمایہ کا حق ہے، اس سے بھی زائد ہوجائے تو دونوں شریک برابر تقسیم کریں، بالفرض حساب کرنے کے بعد اسکول کی آمد وسامان دونوں سے قرض ادا نہ ہوسکے تو خسارہ شمار کریں گے جو اصل سرمایہ سے پورا کیا جائیگا، خدانخواستہ نقصان اصل سرمایہ سے بھی زیادہ ہوگیا ہے تو اس آخری صورت میں کچھ تفصیل ہے دوبارہ پوری وضاحت کے ساتھ سوال بھیجدیں انشاء اللہ جواب دیں گے۔

لما فی التنویر مع الدر: (۸/۲۲۵، طبع امدادیہ)

(وما هلک من مال المضاربة یصرف الی الربح) لانه تبع (فان زاد الهالک علی الربح لم یضمن) ولو فاسدة من عمله لانه امین.

ولما فی کنز الدقائق: (ص ۳۲۲، طبع قدیمی)

وما هلک من مال المضاربة فمن الربح فان زاد الهالک علی الربح لم یضمن المضارب

الجواب صحیح: عبد الرحمٰن عفا اللہ عنہ　　　واللہ اعلم بالصواب: محمد طیب حسن زکی

۶ محرم ۱۴۳۰ھ　　　فتوی نمبر: ۸۳۲

﴿نفع ونقصان میں مضارب ورب المال برابر کے شریک ہیں﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس بارے میں کہ میرے ایک رشتہ دار نے مجھے اپنے کاروبار میں شریک کیا اس شرط کے ساتھ کہ دوکان کے کام میں آپ صرف محنت کریں گے جبکہ کاروبار ان کا ہے، میرے ذمے صرف محنت سپرد تھی اور کہا کہ نفع اور نقصان میں تین حصے ہونگے دو حصے میرے (رشتہ دار جسکا کاروبار ہے) اور ایک حصہ آپ کا ہوگا (یعنی میرا) مثلاً اگر مہینے میں ۱۵۰۰۰ ہزار منافع ہو تو ۱۰۰۰۰ روپے ان کے اور ۵۰۰۰ میرے جبکہ کاروبار میں شرکت کے وقت یہ بھی کہا گیا تھا کہ وہ میرے ساتھ دوکان میں وقت دیں گے، واضح رہے کہ مذکورہ دوکان میں ۲ مزدور بھی کام کرتے ہیں، ان کا کھانا بھی میرے رشتے دار کے ذمے تھا لیکن جب میں ان کے ساتھ کاروبار میں شریک ہوا، اس کے کچھ دن بعد مجھے کہا کہ ان کے کھانے میں بھی آپ کا ایک حصہ ہوگا حالانکہ شروع میں اس بات کا ذکر نہ تھا۔

واضح رہے کہ مذکورہ دوکان کیلئے ایک گاڑی بھی ہے جس کے ذریعے سپلائی کی جاتی ہے اور یہ گاڑی شروع وقت سے مالک کی ہے اب جبکہ اس گاڑی کا انجن، ڈینٹ پینٹ ہوا ہے اور مالک کا کہنا یہ ہے کہ گاڑی میں جو رقم خرچ ہوئی ہے وہ بھی میں اور آپ مشترک دیں گے حالانکہ شروع میں ایسی کوئی بات نہیں ہوئی تھی اور مالک دوکان میرے ساتھ دوکان میں وقت بھی نہیں دیتے تو کیا ان مزدوروں کے کھانے میں میرے پیسے ادا کرنا ضروری ہیں، کیا اس گاڑی میں میرے پیسے دینا جائز ہیں۔ برائے کرم مسئلے کا جواب دے کر عند اللہ ماجور ہوں؟ مستفتی: عبدالسلام صاحب

تنقیح: گاڑی کاروبار کی ہے یا مالک کی ذاتی؟

جواب تنقیح: گاڑی کاروبار کی ہے لیکن مالک ذاتی طور پر بھی استعمال کرتا ہے۔

﴿جواب﴾ یاد رہے کہ مضاربت کے صحیح ہونے کی لئے یہ ضروری ہے کہ ایک کی طرف سے عمل ہو اور دوسرے کی طرف سے سرمایہ ہو اور اگر عقد مضاربت میں رب المال (سرمایہ والے) کے لئے بھی عمل کی شرط لگائی گئی تو مضاربت فاسد ہو جاتی ہے، الہٰذا رشتہ دار کیساتھ واقعی شرط کے درجہ میں یہ بھی طے تھا کہ وہ دوکان پر وقت بھی دیگا تو یہ مضاربت فاسد ہوگئی، مضاربت فاسد میں آپ کاروبار میں شریک نہیں ہوں گے، کاروبار مکمل رب المال (جسکی رقم ہے) کا ہوگا،

آپ کو صرف کام کے دنوں کی مزدوری ملیگی۔

البتہ شرط کے درجہ میں نہیں تھا اس لئے آپ خود ہی کام چلاتے رہے رشتہ دار سے آج تک دوکان پروقت دینے کا مطالبہ نہیں کیا تو مضاربت صحیح ہے آپ اس کاروبار میں شریک ہیں اور مزدوروں کے کھانے اور گاڑی کا خرچہ بھی مشترکہ کاروبار سے وصول کیا جائیگا۔

لمافی الفقه الحنفی:(۱۱۹/۲،طبع دار الکلم الطیب)

تحدید راس المال عند العقد و یکون مسلماً الی المضارب لا ید لرب المال فیه،ولا یجوز ان یشترط العمل علی رب المال.فان شرط عمل رب المال فسدت المضاربة،لانه یمنع خلوص ید المضارب ولا یتمکن من التصرف وبعد سطور والمال فی المضاربة الفاسدة غیر مضمون بالهلاك.

ولمافیه ایضا:(۱۲۰/۲ طبع دار الکلم الطیب)

واذا فسدت المضاربة فهی اجارة فاسدة لانه عمل له باجر مجهول فیستحق اجر مثله.

ولمافی شرح المجلة:(۲/۳۳۰-۳۳۱،المادة ۱۴۱۰،طبع رشیدیه)

(تسلیم راس المال الی المضارب شرط) فلا بد من تسلیم المال الی العامل لیتمکن من العمل وشرط العمل علی رب المال ینا فی ذالک فلا یجوز.

ولمافی الهدایة:(۲۷۰/۳ طبع رحمانیه)

وماهلک من مال المضاربة فهو من الربح دون راس المال.

الجواب صحیح :عبد الرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب :محمد طیب حسن زئی

۳۰ جمادی الاولیٰ ۱۴۳۰ھ — فتوی نمبر:۲۲۰۸

﴿مضاربت کے شرائط کی تحقیق﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ اگر مضاربت میں نقصان ہو جائے تو اس کی ذمہ داری کس پر ہوگی؟ مستفتی: ڈاکٹر عبد الرحمٰن صاحب

﴿جواب﴾ مضاربت میں نقصان اگر مضارب کی تعدی (کوتاہی) سے ہو تو اس صورت میں مضارب ضامن ہوگا یعنی نقصان اس کو برداشت کرنا پڑیگا اور اگر نقصان مضارب کی کوتاہی (تعدی) سے نہ ہو بلکہ اتفاق سے ہو جس طرح عام تجارت میں بھی ہو جاتا ہے تو وہ ضامن نہیں ہوگا۔

ولما فی البحر الرائق: (۲۶۲/۷ طبع سعید)

ولا ضمان علیه اذا فسدت بالهلاك بغیر صنعه......

ولما فی البحر الرائق: (۲۲۵/۷، طبع سعید)

ولم یتعد عما عینه ان کان التعین مقیداً من بلد و سلعة و وقت ومعامل کما فی الشرکة فان تعدی صار ضامناً.

ولما فی الکفایة مع فتح القدیر: (۹۷/۸ رشیدیه)

اذا استهلک المضارب رأس المال أو انفقه أو اعطاه رجلاً فاستهلکه لم یکن له ان یشتری علیه شیئا لانه صار مضمونا علیه بالتعدی.

ولما فی البحر الرائق: (۲۶۸/۷، طبع سعید)

(قوله و ما هلک من المال المضاربة فمن الربح فان زاد الهالک علی الربح لم یضمن مضارب لکونه امیناً سواء کان من عمله اولاً.

ولما فی التنویر مع الدر المختار: (۳۲۰/۴ طبع سعید) (و یضمن بالتعدی) وهذا حکم الامانات

الجواب صحیح: عبد الرحمٰن عفا اللہ عنہ　　　واللہ اعلم بالصواب: محمد حامد یاسین، بھکر

۲۶ ربیع الاول ۱۴۳۴ھ　　　فتویٰ نمبر: ۳۶۲۸

﴿مضاربت میں کچھ شرائط کی تحقیق﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ مضاربت میں مندرجہ ذیل شرط لگانا درست ہے یا نہیں؟ شرعی نقطۂ نظر واضح فرمائیں؟

"کمپنی کی مدت مضاربت ۳۱ دسمبر تک ہے اس کے بعد نیا معاہدہ کیا جائے گا، اگر کوئی شخص اس سے پہلے اپنی رقم نکلوانا چاہے تو نکلوا سکتا ہے کمپنی اس بات کی بھرپور کوشش کرے گی کہ رب المال نے جس تاریخ کو مضاربت ختم کرنے کا نوٹس دیا ہے اس کے بعد آنے والے چھ ماہ میں اس کی رقم مع منافع دیدے، لیکن جب تک رب المال کی رقم واپس نہیں ملتی اس کی رقم کاروبار میں استعمال ہوتی رہے گی اور نفع بھی ملتا رہے گا، اور اگر رقم پانچ ملین سے زیادہ ہو تو اس کے ملنے میں چھ سے زیادہ مہینے بھی لگ سکتے ہیں لیکن منافع بھی ملتے رہیں گے" مستفتی: ڈاکٹر عبد الرحمٰن

﴿جواب﴾ مضاربت ایک عقد غیر لازم ہے یعنی مضارب اور رب المال میں سے ہر ایک کو فسخ کرنے کا اختیار ہوتا ہے لیکن دو شرطوں کے ساتھ، ایک یہ کہ عاقدین میں سے جو بھی مضاربت کو فسخ کرنا چاہے تو دوسرے کو اس کا علم ہونا ضروری ہے، دوسری شرط یہ ہے کہ فسخ کرنے کے وقت مال نقدی کی شکل میں ہو سامان نہ ہو، اگر سامان ہو تو اس وقت تک مضاربت فسخ نہیں ہوگی جب تک اس کو بیچ کر نقدی میں تبدیل نہ کرلیا جائے۔

لہذا کمپنی کی طرف سے یہ شرط لگانا کہ رب المال نے جس تاریخ کو مضاربت ختم کرنے کا نوٹس دیا ہے اس کے بعد آنے والے چھ ماہ یا اس سے زیادہ دنوں میں اس کی رقم مع منافع کے واپس کردی جائے گی، اگر اس لئے ہے تاکہ اس مدت میں اس کی رقم سے جو سامان لیا گیا ہو کمپنی اس کو فروخت کر سکے، اور اس کے بعد سرمایہ مع منافع رب المال کے حوالے کر سکے، تو یہ شرط درست ہے شرعاً اس میں کوئی قباحت نہیں ہے۔

لما في بدائع الصنائع: (۱۰۹/۶، طبع: سعيد)

و أما صفة هذا العقد فهو أنه عقد غير لازم و لكل واحد منهما اعني رب المال والمضارب الفسخ لكن عند وجود شرطه و هو علم صاحبه لما ذكرنا في كتاب الشركة، ويشترط أيضاً أن يكون رأس المال عيناً وقت الفسخ دراهم او دنانير حتى لو نهىٰ ربّ المال المضارب عن التصرف و رأس المال عروض وقت النهي لم يصح نهيه و له ان يبيعها لانه يحتاج الى بيعها بالدراهم والدنانير ليظهر الربح فكان النهي والفسخ ابطالاً لحقه في التصرف فلا يملك ذالك.

ولما في الهداية: (۲۶۰/۳، طبع: رحمانية)

قال فان عزل رب المال المضارب و لم يعلم بعزله حتى اشترى وباع فتصرفه جائز لانه وكيل من جهته و عزل الوكيل قسداً يتوقف على علمه و ان علم بعزله والمال عروض فله ان يبيعها ولا يمنعه العزل من ذالك لان حقه قد ثبت في الربح وانما يظهر بالقسمة وهي تبتني على رأس المال و انما ينض بالبيع.

ولما فيه أيضاً: (۲۶۵/۳، طبع سعيد)

قال و كذالك ان وقت للمضاربة وقتاً بعينه يبطل العقد بمضيه لانه توكيل فيتوقت بما وقته والتوقيت مفيد فانه تقييد بالزمان فصار كالتقييد بالنوع والمكان.

الجواب صحيح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ　　　　واللہ اعلم بالصواب: محمد ابرار غفرلہ ولوالدیہ

۸ ربیع الثانی ۱۴۳۴ھ　　　　فتویٰ نمبر: ۳۶۶۶

﴿بڑا بھائی اپنے نابالغ بھائیوں کا مال مضاربت پر دے سکتا ہے﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ہم تین بھائی ایک ساتھ آباؤ اجداد کے زمانے سے شریک رہتے تھے اور ایک ساتھ کاروبار کر رہے تھے، دو پاکستان میں اور ایک ابوظہبی میں اب ان کا وہی انتقال ہوگیا، سوال یہ ہے کہ میت کے لئے ابوظہبی میں اپنے علاقے والوں کی طرف سے عطیہ کے طور پر جو فنڈ جمع ہوتا ہے وہ تو میت کے اہل وعیال کا ہوگا۔

لیکن اگر میت کے اہل وعیال کے مشورہ سے ہم دو بھائی اور میت کے اہل وعیال ایک ساتھ رہے میراث تقسیم کئے بغیر اور مذکورہ رقم جو عطیہ کے طور پر میت کے اہل وعیال کو ملی ہے) اس رقم سے ہم دو بھائی تجارت کریں کیونکہ وہ بچے تجارت وغیرہ نہیں کر سکتے اور ہم سب ایک ساتھ شریک رہیں جیسا کہ پہلے سے شریک چلے آرہے تھے تو کیا یہ شرعا جائز ہے یا مذکورہ صورت میں میراث کی تقسیم ضروری ہے۔

(نوٹ) مرحوم کے پسماندہ گان میں ایک بیوی، چار لڑکے اور دو لڑکیاں ہیں جبکہ مذکورہ اولاد میں سے ایک بچہ اور ایک بچی نابالغ ہے باقی سب اولاد بالغ ہیں، مذکورہ صورت میں اگر میراث کی تقسیم ضروری ہے تو اسکی صورت کیا ہوگی؟ سائل حاجی جمرود

﴿جواب﴾ مذکورہ صورت میں تینوں بھائیوں کی جائیداد وغیرہ جو کہ آباء واجداد سے مشترک ہے کو شرکت املاک کہتے ہیں یہ تو حسب سابق قائم ہے اب دونوں بھائی اور تیسرے مرحوم بھائی کی اولاد چاہیں تو اسکو ویسے ہی جاری رکھیں چاہیں تو تقسیم کریں۔

البتہ ابو ظہبی میں مرحوم کیلئے جو فنڈ جمع ہوا وہ صرف مرحوم کے ورثاء کا حق ہے بھائیوں کا اس میں کوئی حصہ نہیں، اس فنڈ کے مالکان یعنی مرحوم کی اولاد وغیرہ چاہیں تو اپنے چچاؤں کو مضاربت کے طور پر دیدیں جسکے منافع حسب معاہدہ تقسیم کرتے رہیں لیکن رأس المال کے مالک صرف میت کے ورثاء ہی ہونگے یعنی عقد مضاربت کو ختم کرنے کے موقع پر یہ خاص رقم واپس انکو ملنا ضروری ہے اور اگر چاہیں تو سابقہ مشترکہ مال میں بلا امتیاز مخلوط کردیں تو یہ ھبہ کی صورت ہوگی جس کیلئے ھبہ کی شرائط کا لحاظ رکھنا بھی ضروری ہے، لہٰذا نابالغ افراد کا حصہ ھبہ نہیں ہوسکتا اور بالغ افراد میں سے ہر ایک اپنا حصہ متعین کر کے اپنی ہی مرضی سے ھبہ کردے تو اس میں بھی کوئی حرج نہیں ہے۔

لما فی الهندية:(۲/۳۰۱،طبع رشيديه)

الشركة نوعان شركة ملک وهي ان يتملک رجلان شيئامن غير عقدالشركة بينهما.

ولما في الشامي:(۶/۷۲۲،طبع امداديه)

قلت ذكروا مثل هذافي وصي اليتيم،وانه لوتصرف في ماله احدمن اهل السكة من بيع،اوشراء جازفي زماننا للضرورة.وفي الخانية:انه استحسان وبه يفتى.

ولما في الفتاوى الولوالجية:(۵/۲۰۷،طبع فاروقيه پشاور)

لوتصرف واحدمن اهل السكة في مال اليتيم من البيع والشراء وليس لليتيم وصي

وهويعلم انه لورفع الامرالى القاضى فانه ياخذالمال ويفسده فان تصرفه جائز للضرورة.

ولمافى البدائع:(۱۱۸/۶-۱۱۹،طبع سعيد)

(واما)مايرجع الى الواهب فهو أن يكون ممن يملك التبرع لان الهبةتبرع فلايملكها من لايملك التبرع فلاتجوزهبةالصبى......منهاان يكون محوزا فلاتجوزهبةالمشاع فيمايقسم

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفااللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: سلمان احمد

۹ محرم ۱۴۳۰ھ — فتویٰ نمبر: ۱۸۳۶

﴿مضاربت میں مالک کا اپنے لئے کچھ نفع خاص کرنے کا حکم﴾

﴿سوال﴾ خالد نے بکر کو دس لاکھ روپے تجارت کے لئے دیئے اور یہ شرط لگا دی کہ آپ مجھے منافع میں سے ماہانہ ایک ہزار روپے دیتے رہنا سال کے بعد باقی منافع ہم دونوں میں برابر تقسیم ہوگا، سوال یہ ہے کہ خالد کا اپنے لئے ماہانہ منافع خاص کر لینا شرعاً جائز ہے یا نہیں؟

﴿جواب﴾ یہ معاملہ بظاہر اگر چہ مضاربت کا ہے لیکن خالد کا اپنے لئے ایک ہزار روپے منافع میں سے خاص کرنا شرط فاسد ہے، لہٰذا یہ عقد شرعاً ناجائز ہے۔

لمافى الهداية:(۲۶۳/۳،طبع رحمانيه)

ومن شرطهاأن يكون الربح بينهمامشاعالايستحق أحدهمادراهم مسماة من الربح لأن شرط ذالك يقطع الشركة بينهما.

وفى حاشيته(۱۰)زيادةعشرةيعنى اذاقال ان مارزق الله فى ذالك من شئ فللمضارب منه عشرة والباقى من الربح بينناانصفان فهذه مضاربة فاسدة لأن هذا الشرط يوجب قطع الشركة بينهمافى الربح مع حصوله وربمالايربح الامقدارالعشرة.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفااللہ عنہ — واللہ اعلم: صلاح الدین چترالی

۶ جمادی الاولیٰ ۱۴۲۷ھ — فتویٰ نمبر: ۲۹۴

﴿مضارب کا مضاربت کا مال اپنے ذات کیلئے خریدنا﴾

﴿سوال﴾ مضاربت کی ایک کمپنی ہر ماہ کی 5 تاریخ تک نفع تقسیم کرتی ہے اور اس کا طریقہ کار یہ ہے کہ پہلے کمپنی کے بلا واسطہ اخراجات کو منہا کیا جاتا ہے، اس کے بعد اگر مال تجارت موجود ہو تو اس دن مارکیٹ ویلیو کے مطابق اسکی قیمت فروخت لگا کر نفع معلوم کیا جاتا ہے۔ کیا یہ طریقہ مضاربت شریعت کی رو سے جائز ہے؟

مستفتی: ایک مسلم

﴿جواب﴾ مستفتی نے بلا واسطہ اخراجات کی کوئی وضاحت نہیں کی ہے تاہم بلا واسطہ

اخراجات سے اگر ایسے اخراجات مراد ہوں جو کہ کاروبار میں خرید وفروخت سے متعلق رابطہ کرنے پر مثلاً موبائیل کے استعمال پر خرچ ہوں یا درآمد، برآمد کے خرچے ہوں تو ان کا وصول کرنا مضاربت کے مال سے صحیح اور جائز ہے۔اس کے علاوہ مذکورہ بالا شرط کے مطابق مال تجارت کا اس دن مارکیٹ ویلیو کے مطابق قیمت فروخت لگا کر اگر مضارب خود اس چیز کو اپنی ذات کیلئے خریدے اور رب المال کو اس قیمت پر اعتراض نہ ہو تو یہ بھی جائز ہے۔

لما في تحفة الفقهاء :ص ۲۹۲ طبع المكتبة المعروفية كوئله

ومنها:أن المضارب ليس له أن ينفق من مال المضاربة مادام في مصره،واذا سافر أنفق من مال المضاربة لنفقته وكسوته ومركوبه وعلف دوابه ونفقة أجيره ومؤونته ومالا بد في السفر عنه عادة الا مؤونة الحجامة والخضاب والنورة فهو من ماله.

ولما في الهداية :۲۷۰/۳ طبع رحمانية

وان علم بعزله والمال عروض فله أن يبيعها ولا يمنعه العزل من ذالك لأن حقه قد ثبت في الربح وانما يظهر باالقسمة وهي تبتني على رأس المال وانما ينض باالبيع.

ولما في رد المحتار:۵/ ۵۲۲،۵۲۱ طبع سعيد

(قوله الامن نفسه)وفي السراج : لو أمره باالبيع من هؤلاء فانه يجوز اجماعاًالا أن يبيعه من نفسه أو ولده الصغير أو عبده ولا دين عليه فلا يجوز قطعاً وان صرح به الموكل اه منح الوكيل باالبيع لا يملك شراءه لنفسه لأن الواحد لا يكون مشترياً وبائعاً فيبيعه من غيره ثم يشتريه منه وان أمره الموكل أن يبيعه من نفسه وأولاده الصغار أو ممن لا تقبل شهادته فباع منهم جاز بزازيه كذا في البحر ولايخفى ما بينهما من المخالفة ، وذكر مثل ما في السراج في النهاية عن المبسوط ومثل ما في البزازيه في الذخيرة عن الطحاوى وكأن في المسئلة قولين خلافاً لمن ادعى أنه لا مخالفة بينهما.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: محمد زبیر غفرلہ ولوالدیہ

۲۵ جمادی الثانی ۱۴۳۴ھ — فتویٰ نمبر: ۳۸۱۴

﴿قرضہ سے مضاربت کا حکم﴾

﴿سوال﴾ زید کا بکر پر بیس ہزار روپے قرض تھا،زید نے بکر سے کہا کہ ان بیس ہزار روپے سے آپ تجارت کریں، جو میرے آپ کے ذمہ قرض ہیں اور اس راس المال (سرمایہ) سے جو منافع آئے گا وہ ہم دونوں کے درمیان برابر تقسیم ہوگا، کیا مضاربت کی یہ صورت شرعاً درست ہے یا نہیں؟

﴿جواب﴾ مضاربت کی یہ صورت شرعاً درست نہیں ہے کیونکہ عقد مضاربت میں مال کا

نقد دینا ضروری ہے نہ کہ قرض کا مال، البتہ اس طرح عقد کرنا کہ رب المال کا کسی تیسرے آدمی کے ذمے قرض ہو اور وہ مضارب کو اجازت دیدے کہ آپ اُس قرض کو وصول کر کے اس سے تجارت کریں تو یہ صورت درست ہے، تاہم اس سے بچنا بہتر اور اولیٰ ہے۔

لمافی البحر الرائق:(۷/۲۶۳،طبع سعید)

وأما المضاربة بدين فان كان على المضارب فلايصح ومااشتراه له والدين في ذمته وان كان على غيره بأن قال اقبض مالي على فلان ثم اعمل به مضاربة فهوجائزوان كان مكروهالانه شرط لنفسه منفعة قبل العقدكمافي المبسوط۔

ولمافی البدائع:(۶/۸۳،طبع سعید)

(ومنها)ان يكون راس المال عيناًلاديناً،فان كان ديناًفالمضاربة فاسدة ،وعلىٰ هٰذا يخرج ماإذاكان لرب المال علىٰ رجل دين فقال له اعمل بديني الذى فى ذمّتك مضاربة بالنصف ان المضاربة فاسدة بلاخلاف فان اشترى هذاالمضارب وباع له ربحه وعليه وضيعته والدين في ذمّته عندابى حنيفةؒ.

ولمافی الهندية:(۴/۲۸۶،طبع رشيديه)

ومنهاان يكون راس المال عيناًلادينافالمضاربة بالديون لاتجوزحتى ان من كان له على اخرالف درهم فامره صاحب الدين ان يعمل بهامضاربة لاتجوز المضاربة.
وكذافي شرح المجلة:(ص ۴۳۰،طبع رشيديه)والهداية:(۳/۲۶۳،طبع رحمانيه) والدرالمختار: (۸/۴۳۳،طبع امداديه)

الجواب صحیح:عبدالرحمٰن عفااللہ عنہ	واللہ اعلم: صلاح الدین
۱۱ ربیع الثانی ۱۴۲۷ھ	فتوی نمبر:۱۱۴

﴿مضارب طے شدہ عقد کے خلاف اگر کرے تو کیا حکم ہوگا؟﴾

﴿سوال﴾ زید نے عمرو کو کچھ رقم دیکر کہا کہ اس سے تجارت کر کے منافع آپس میں آدھا آدھا تقسیم کریں گے اور عمرو نے زید کو بتائے بغیر یہ رقم آگے تیسرے شخص (بکر) کو دیکر اس کیساتھ آدھے منافع پر بات کرلی اب جو آدھا نفع عمرو کو ملتا ہے اسی سے وہ آدھا زید کو دیتا ہے، کیا یہ معاملہ درست ہے؟ اور اگر عمرو زید (رب المال) کو بتائے اور زید اس پر راضی ہو جائے تو پھر کیا حکم ہے؟

﴿جواب﴾ صورت مسئولہ میں عمرو کا زید (رب المال) کی اجازت کے بغیر کسی کو مضارب بنانا درست نہیں ہے اور نہ ہی مذکورہ طریقہ سے منافع حاصل کرنا جائز ہے، اس لئے کہ رب المال (زید) نے مضارب (عمرو) کیساتھ جس منافع کے نصف پر عقد کرلیا تھا، اسی نصف

پر عمرو نے آگے بکر (مضارب ثانی) کیساتھ عقد کرلیا اور خود اس کے لئے کچھ نہیں بچا کیونکہ منافع کے باقی نصف کا وہ نہ مالک ہے اور نہ مستحق۔

لہٰذا وہ منافع اب رب المال اور مضارب ثانی کے درمیان نصف نصف تقسیم ہوگا بلکہ اجازت ملنے کی صورت میں بھی عمرو کے لئے مذکورہ طریقہ سے منافع لینا جائز نہیں ہے۔

تاہم اگر رب المال (زید) نے منافع کی نسبت مضارب کی طرف کرتے ہوئے اس طرح کہا ہو کہ ''جو کچھ آپکو منافع حاصل ہو یا جو منافع آپ حاصل کریں وہ میرے اور آپ کے درمیان نصف نصف ہوگا تو ایسی صورت میں عمرو کا مذکورہ منافع اپنے لئے لینا جائز ہوگا بشرطیکہ زید کی طرف سے کسی اور کو مضارب بنانے کی اجازت ہو، رہی یہ بات کہ زید (رب المال) کو آگاہ کرنے کے بعد اس معاملہ کا کیا حکم ہے؟ سو اس کے صحیح ہونے میں کوئی اشکال نہیں ہے۔

لمافی الهداية:(۳/ ۲۷۱،طبع رحمانيه)

ونوع لايملكه بمطلق العقد ويملكه اذاقيل له اعمل برأيك وهومايتحمل ان يلحق به فيلحق عندوجودالدلالة وذلك مثل دفع المال مضاربة اوشركة الى غيره وخلط مال المضاربة بماله اوبمال غيره

.ولمافي الشامي:(۵/ ۶۵۳،سعيد)ولوقيل مارزق الله فلي الخ.

ولمافي الهداية:(۳/ ۲۶۹،طبع رحمانيه)

ولوكان قال له على أن مارزق الله تعالى فلي نصفه أوقال له فماكان من فضل فبيني وبينك نصفان وقددفع الى أخرمضاربةبالنصف فلرب المال النصف وللمضارب الثاني النصف ولاشئ للمضارب الاول.....الخ.

ولمافي بدائع الصنائع:(۶/ ۹۷،طبع سعيد)

ولودفع الى الثاني مضاربة بالنصف فنصف الربح للثاني ونصفه لرب المال ولاشئ للمضارب الاول لأنه جعل جميع مايستحقه وهونصف الربح للثاني وصح جعله لانه مالك للنصف.....ولوأضافه الى المضارب فدفعه الاول مضاربة الى غيره بالثلث أوبالنصف أوبالثلثين فجميع ماشرط للثاني من الربح يسلم له وماشرط للمضارب الاول من الربح يكون بينه وبين رب المال نصفين بخلاف الفصل الاول.

الجواب صحیح: عبد الرحمٰن عفا اللہ عنہ　　　　واللہ اعلم: عبد الوہاب عفا اللہ عنہ

۱۵ جمادی الثانی ۱۴۲۷ھ　　　　فتوی نمبر:

﴿مضارب اگر معاہدہ کے خلاف کرے تو؟﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء دین ومفتیان شرع متین اس مسئلہ کے بارے میں کہ زید

نے خالد کو پچاس ہزار روپے عقد مضاربت پر حیدرآبادی چپلوں کی تجارت کے لئے دیئے، خالد نے خلاف معاہدہ کپڑوں کی تجارت شروع کردی اور اس میں خسارہ اٹھانا پڑا، از روئے شریعت نقصان کی ذمہ داری کس پر عائد ہوتی ہے؟ مستفتی: محمد سلیم

﴿جواب﴾ مذکورہ صورت میں خالد (مضارب) نے چونکہ معاہدہ کی خلاف ورزی کی ہے، اس لئے نقصان کی تمام ذمہ داری خالد پر آئے گی اور خالد زید کو تمام رأس المال یعنی پچاس ہزار روپے ادا کرے گا۔

ولما فی بدائع الصنائع: (۹۹/۶، طبع سعید)

ولو قال خذ هذا المال مضاربة بالنصف على أن تشتري به الطعام او قال فاشتر به الطعام أو قال تشتري به الطعام او قال خذ هذا المال مضاربة بالنصف في الطعام فذلك كله سواء وليس له أن يشتري سوى الطعام بالاجماع لما ذكرنا. وفي الهداية: (۲۶۳/۳، طبع رحمانيه)

ولما في شرح المجلة: (۳۵۶/۴، المادة ۱۴۲۱، طبع رشيديه)

(اذا خرج المضارب عن مأذونيته وخالف الشرط يكون غاصباً وفي هذه الحالة يعود الربح والخسار في اخذه واعطائه عليه واذا تلف مال المضاربة يكون ضامناً). يعني لو تجاوز بلدا عينها رب المال او شرى سلعة غير التي عينها او في وقت او مع شخص كذلك، كان غاصباً لانه تصرف في مال الغير بغير أمره وكان ذلك الشراء له وله ربحه وعليه خسرانه- غيرانه يتصدق بالربح عندهما لانه نماء مال الغير وعند ابي يوسف يطيب له الربح. وكذا في الدر المختار: (۴۳۷/۸، طبع امداديه)

الجواب صحیح: عبد الرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم: صلاح الدین ڈیروی

۱۱ ربیع الثانی ۱۴۲۷ھ — فتویٰ نمبر: ۱۱۳

﴿مضارب خلاف شرع کوئی معاملہ کرے گا تو وہی گناہ گار ہوگا﴾

﴿سوال﴾ ہم نے ایک کمپنی کو مضاربت کے طور پر کچھ رقم دی ہے بظاہر لوگ دیندار ہیں امید ہے کہ ناجائز تجارت نہیں کرتے ہونگے اور چونکہ ہمارے لئے تو ہر معاملہ کی نوعیت معلوم کرنا مشکل ہے لہذا اگر کوئی خلاف شرع معاملہ ہوا تو کیا ہم گناہ گار ہونگے؟ کیا یہ طریقہ مضاربت صحیح ہے؟

﴿جواب﴾ مضاربت کا معاملہ اعتماد پر مبنی ہوتا ہے اس وجہ سے ایک شخص دوسرے کو پیسے دیتا ہے تاکہ وہ ان پیسوں سے تجارت کرے جو کہ عین شریعت کے مطابق ہے۔ اور اس کے

پیچھے پڑنا اعتماد کے خلاف ہے جس پر یہ معاملہ مبنی ہے، لہٰذا رب المال کا اس کے پیچھے پڑنا اور اس کے ہر معاملے تک پہنچنا نہ تو ضروری ہے اور نہ ہی اس کا مکلف ہے۔ اور ویسے بھی دین اسلام ایک دوسرے پر اعتماد وحسن ظن کا حکم دیتا ہے اور یہ کہ مسلمان کے افعال وتصرفات کو صحت وسلامتی پر محمول کیا جائے۔ الا یہ کہ فساد وبطلان پر کوئی واضح دلیل قائم ہو، لہٰذا خلاف شرع کام کرنے پر مضارب ہی گناہگار ہوگا آپ لوگ گناہگار نہیں ہوں گے۔

لمافي الهداية: ۲۶۲/۳، طبع رحمانية

وهي مشروعة للحاجة اليهافان الناس بين غني بالمال غبي عن التصرف فيه وبين مهتد في التصرف صفر اليد عنه فمست الحاجة الى مشروع هذا النوع من التصرف لينتظم مصلحة الغبي والذكي والفقير والغني وبعث النبي ﷺ والناس يباشرونه فقررهم عليه وتعاملت به الصحابة ثم المدفوع الى المضارب امانة في يده لانه قبضه بامر مالكه لا على وجه البدل والوثيقة وهو وكيل فيه لانه يتصرف فيه بامر مالكه.

ولمافي البذل المجهود: ۸۳،۸۳/۴ كتاب الضحايا باب اللحم لا يدرى اذكر اسم الله عليه ام لا

حدثنا موسى بن اسمعيل ـــ عن عائشة انهم قالوا يا رسول الله ﷺ ان قوما حديث عهد بجاهلية ياتون بلحمان لاندرى اذكروا اسم الله عليها ام لم يذكروا انأكل منها فقال رسول الله ﷺ سموا الله وكلوا. كانه ﷺ ارشدهم بذالك الى حمل حال المؤمن على الصلاح وحسن الظن به وان كان جاهلا.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ　　　　واللہ اعلم بالصواب: محمد زبیر غفرلہ ولوالدیہ

۱۳ جمادی الثانی ۱۴۳۴ھ　　　　فتویٰ نمبر: ۲۷۹۰

﴿مضاربت میں منافع کی تقسیم کا شرعی طریقہ﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ زید اور عمرو نے مضاربت کا معاملہ کیا زید نے پیسہ لگایا اور عمرو کی محنت ہے، دونوں کا یہ کہنا ہے کہ ہمیں مشکل یہ درپیش ہیکہ ہمارے کام میں آئیٹم بہت زیادہ ہیں اور ایک چیز ہم نے ۱۰۰ روپے میں لی ہے تو کبھی ۱۰۵ میں اور کبھی ۲۰۰ میں اسکو فروخت کرتے ہیں، اسوجہ سے مہینہ کے آخر پورے مہینہ کا منافع معلوم کرنا ممکن نہیں، ایسی صورت میں فیصد کے حساب سے منافع کی تقسیم میں اس بات کا قوی اندیشہ ہے کہ ادائیگی مکمل نہ ہو اور حصہ سے کم رقم دی جائے تو ایسی صورت میں زید اور عمرو باہمی رضامندی سے ہر مہینہ کی رقم متعین کرلیں مثلاً ۱۵۰۰۰ روپے ماہانہ زید کو دیئے جائیں یا پھر ہر مہینہ کچھ رقم

بلا تعیین باہمی رضامندی سے زید کو دی جائے۔مثلاً ہر مہینہ کے آخر میں دونوں جس رقم پر راضی ہو جائیں کبھی ۲۰۰۰۰ اور کبھی ۱۵۰۰۰۔ دونوں میں سے کونسی صورت جائز ہے؟

﴿جواب﴾ سوال میں تجویز کردہ ہر دونوں صورتیں ناجائز ہیں، حاصل ہونے والے منافع کی تقسیم کیلئے باہمی رضامندی سے فیصدی شرح مقرر کرنا ضروری ہے، آپکی تجویز کردہ صورت میں متعین رقم (۱۵۰۰۰ روپے یا ۲۰۰۰۰) اس شرط کے منافی ہے، حساب کرنا کوئی مشکل کام نہیں، ایک ایک چیز کی قیمت فروخت معلوم ہونا کوئی ضروری نہیں ہے، مہینہ کے آخر میں حاصل شدہ منافع کا مجموعہ معلوم ہونا ضروری ہے تاکہ مقرر شدہ شرح کی نسبت سے آپس میں تقسیم کرسکیں۔

لمافی التنویر مع الدر:(۶۴۸/۵،طبع سعید)

(وکون الربح بینهما شائعا)فلو عین قدرا فسدت(وکون نصیب کل منهما معلوما)عند العقد.

ولمافی بدائع الصنائع:(۸۵/۶-۸۶،طبع سعید)

(ومنها)ان یکون المشروط لکل واحد منهما من المضارب ورب المال من الربح جزأ شائعا نصفا أو ثلثا أو ربعا فان شرطا عددا مقدرا بان شرطا ان یکون لاحدهما مائة درهم من الربح او اقل او اکثر والباقی للاخر لا یجوز والمضاربة فاسدة لان المضاربة نوع من الشرکة وهی الشرکة فی الربح وهذا شرط یوجب قطع الشرکة فی الربح لجواز ان لا یربح المضارب الا هذا القدر المذکور فیکون ذلک لاحدهما دون الآخر فلا تتحقق الشرکة فلا یکون التصرف مضاربة.

الجواب صحیح:عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ　　　　واللہ اعلم بالصواب:نعمان اقبال عفا اللہ عنہ

۷ ربیع الاول ۱۴۳۱ھ　　　　فتویٰ نمبر:۲۳۹۵

﴿مضاربت میں نقصان اصل سرمایہ سے پورا کیا جائیگا﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام کہ زید نے بکر کو تجارت کرنے کیلئے رقم دی اور تقسیم منافع میں یہ شرط قرار پائی ہے کہ زید یعنی رقم دینے والا صرف ایک حصہ منافع لے گا اور بکر یعنی کام کرنے والا دو حصے، اسی طرح نقصان میں بھی زید ایک حصہ نقصان اٹھائے گا اور بکر دو حصے، کیا اس طریقے سے معاملہ کرنا شرعاً جائز ہے یا نہیں؟　　　　مستفتی:محمد شعیب

﴿جواب﴾ سوال میں ذکر کردہ صورت عقد مضاربت ہے، نفع ونقصان میں شراکت جس نسبت سے طے ہوئی ہے شرعاً اس میں کوئی قباحت نہیں ہے لیکن ایک بات واضح رہے کہ

مضاربت میں خدانخواستہ نقصان ہو جائے تو اسکی تلافی پہلے حاصل شدہ منافع سے کی جائیگی، بالفرض منافع کی تقسیم کئی بار ہوئی ہو تو اسکی تلافی کیلئے ہر ایک شریک پہلے حاصل کرنے والے منافع کی نسبت سے واپس جمع کریگا اور وہ نقصان پورا کیا جائیگا لیکن تمام منافع واپس جمع کرنے کی صورت میں بھی نقصان کی تلافی خدانخواستہ نہ ہو سکے تو اس صورت میں زائد نقصان اصل سرمایہ کو ہوگا کام کرنے والے کے ذمہ واجب نہ ہوگا۔

لما فی الدرمع الرد:(۶۴۸/۵ طبع ایچ ایم سعید)

کل شرط یوجب جهالة فی الربح اویقطع الشرکة فیه یفسدها والا بطل الشرط وصح العقداعتبارا بالوکالة.

وفی الشامیة:(قوله بطل الشرط)کشرط الخسران علی المضارب.

ولما فی تبیین الحقائق:(۵۲۱/۵،طبع ایچ ایم سعید)

(وکل شرط یوجب جهالة الربح یفسدهاوالالاویبطل الشرط کشرط الوضیعة علی المضارب)ای اذالم یکن مؤدیاالی جهالة الربح لایفسدها بل یبطل الشرط.

ولما فی الفتاوی الهندیة:(۲۸۸/۴ طبع رشیدیه کوئٹه)

قال القدوری فی کتابه کل شرط یوجب جهالة الربح اوقطع الشرکة فی الربح یوجب فسادالمضاربة ومالا یوجب شیًامن ذلک لایوجب فسادهانحوان یشترطاان تکون الوضیعة علیهماکذا فی الذخیرة.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: عقیل احمد حقانی عفی عنہ

۲۲ ربیع الثانی ۱۴۳۱ھ — فتوی نمبر: ۲۶۴۳

﴿مضاربت میں رعایت کا حکم﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ زید مضاربت پر چشمے کا دکان چلا رہا ہے، کیا زید کو اس بات کا اختیار ہے کہ علماء اور طلباء کو کم منافع رکھ کر چشمہ دے یا رب المال کی اجازت ضروری ہے؟ مستفتی: محمد اقبال ڈیروی

﴿جواب﴾ رب المال نے زید کو باقاعدہ رعایت دینے سے اگر روکا نہیں ہے یعنی مضاربت کا معاملہ اگر عام رکھا گیا ہے تو ایسی صورت میں زید کے لئے جائز ہے کہ علماء اور طلباء کو اتنی رعایت کیساتھ اشیاء دیں جتنی رعایت کیساتھ دینا عام تاجروں کے ہاں معروف ہو، البتہ معروف رعایت سے زیادہ رعایت کیساتھ اشیاء دینے کا حق زید کو اس وقت حاصل ہوگا، جب

رب المال اسکی صراحت کیساتھ اجازت دے انکی اجازت کے بغیر زید کو یہ حق حاصل نہیں ہے۔

لما فی التنویر مع الدر:(۶۴۸/۵-۶۴۹ طبع سعید)

(ویملک المضارب فی المطلقة)التی لم تقید بمکان اوزمان اونوع (البیع)ولو فاسدا(بنقدونسیئة متعارفة والشراء والتوکیل بهما والسفر برا وبحرا)

وفی الشامیة:ولیس له ان یعمل بما فیه ضرر ولا ما لا یعمله التجار ولیس لاحد المضاربین ان یبیع اویشتری بغیر اذن صاحبه ولو اشتری بما لا یتغابن الناس فی مثله یکون مخالفا.

ولما فی الهندیة:(۲۹۱/۴-۲۹۲ طبع رشیدیه)

ألاصل أن مایفعله المضارب ثلاثة أنواع نوع یملکه بمطلق المضاربة وهو مایکون من باب المضاربة وتوابعها..... ویملکه اذا قیل له اعمل برأیک وهو مایحتمل ان یلحق به فیلحق به عند وجود الدلالة..... یجوز للمضارب ان یبیع بالنقد والنسیئة کذا فی الکافی ..... وان حط عنه شیئا بعیب مثل مایحط التجار فی مثل ذلک العیب أو یتغابن به الناس فذلک جائز لانه من صنع التجار ولو حط عنه شیئا فاحشا او حط بغیر عیب جاز ذلک علی المضارب خاصة فی قول ابی حنیفة ومحمد رحمهما الله تعالی وهو ضامن لذلک لرب المال.

الجواب صحیح :عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب:احمد علی عفی عنہ

۲۸ ربیع الثانی ۱۴۳۱ھ — فتویٰ نمبر:۲۶۵۸

﴿عقد مضاربت کے فاسد ہونے کی ایک صورت﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میں نے میزان بینک میں اکاؤنٹ کھلوایا ہے اور یہ عزم کیا ہے کہ اس اکاؤنٹ کے منافع غرباء اور محتاج قسم کے لوگوں کو دیا کروں گا، اکاؤنٹ کی تفصیل یہ ہے کہ میں نے مثلاً یکم جنوری کو اگر ایک لاکھ روپے بینک میں جمع کروائے اور دوران ماہ بھی جمع کرتا رہا یہاں تک کہ مہینے کے آخر میں اگر دس لاکھ تک بھی پہنچ جائیں لیکن مجھے منافع صرف ایک ہی لاکھ پر دیئے جائیں گے جبکہ زائد رقم شمار نہیں کی جائے گی اور اگر بالفرض میں نے ۲۶ تاریخ کو پندرہ ہزار روپے کے علاوہ باقی ساری رقم اکاؤنٹ سے نکلوادی اور ۳۱ تاریخ کو اکاؤنٹ میں صرف پندرہ ہزار کی رقم باقی رہ گئی تو مجھے صرف پندرہ ہزار پر منافع ملے گا، ۳۱ تاریخ سے پہلی نکلوائی گئی رقم کے منافع نہیں ملیں گے۔اب پوچھنا یہ ہے کہ شریعت کی روشنی میں اس عقد کی کیا حیثیت ہے؟

مستفتی: ڈاکٹر عبدالرحمٰن ڈی آئی خان

﴿جواب﴾ مذکورہ معاملہ مندرجہ ذیل تین وجوہات کی بناء پر جائز نہیں:

(۱): عقد مضاربت کی شرائط میں سے ایک شرط یہ ہے کہ رأس المال (سرمایہ) معلوم ہو اور یہاں رأس المال میں جہالت آجاتی ہے، یعنی نکالنے اور جمع کرنے کی صورت میں ایک واضح مقدار نہیں رہتی، اس لئے کہ اکاؤنٹ ہولڈر کو اجازت ہوتی ہے کہ جب چاہے رقم نکلوا سکتا ہے، تو مہینے کی آخری تاریخ تک معلوم نہیں، کہ کتنی رقم اکاؤنٹ میں رہے گی،

(۲): اسی طرح ہر وہ شرط جس سے ربح (نفع) میں جہالت آتی ہو اس سے مضاربت فاسد ہو جاتی ہے، اور یہاں بینک والوں کا یہ شرط لگانا کہ ہم آپ کو آخری تاریخ کے اعتبار سے ربح (نفع) دیں گے، یعنی مہینے کی آخری تاریخ کو جتنی رقم اکاؤنٹ میں رہ گئی ہو اس کے اعتبار سے ربح (منافع) دیں گے، چونکہ آخری تاریخ کو معلوم نہیں کہ کتنی رقم اکاؤنٹ میں بچتی ہے، اس لئے کہ اکاونٹ ہولڈر اس بات کا مجاز ہوتا ہے، کہ جب چاہے رقم نکلوا سکتا ہے، تو رأس المال (اصل سرمایہ) میں جہالت آنے کی وجہ سے ربح (منافع) میں بھی جہالت آجاتی ہے، جو کہ جائز نہیں۔

(۳): اسی طرح ہر وہ شرط جو ربح (نفع) میں شرکت کو ختم کرے، اس سے بھی مضاربت فاسد ہو جاتی ہے، اور یہاں بینک والوں کا یہ شرط لگانا کہ اگر آپ نے ۲۶ یا ۲۷ وغیرہ تاریخ کو رقم نکلوائی تو ان ۲۶ یا ۲۷ دنوں کا آپ کو کوئی نفع نہیں ملے گا، ربح (نفع) میں شرکت کو ختم کر دیتا ہے جس کا اثر اصل عقد پر بھی ہو جاتا ہے اور عقد فاسد ہو جاتا ہے۔

اور یاد رہے کہ عقد فاسد کو برقرار رکھنا حکماً سود کے زمرے میں آتا ہے جو کہ حرام اور بہت بڑا گناہ ہے لہذا ایسے معاملات کو فوری طور پر ترک کر دینا ضروری ہے اور اگر ماضی میں کئے ہوں تو ان پر توبہ واستغفار کرنا چاہئے۔

لما فی جامع الترمذی (۱/۱۶۱ فاروقی کتب خانہ)

والمسلمون علی شروطھم الاحرم حلالا اواحل حراما

ولما فی التنویر مع الدر (۶۴۵/۵، ۶۴۶، ۶۴۷، ۶۴۸، سعید)

(هي عقد شركة في الربح بمال من جانب وعمل من جانب وركنها الايجاب والقبول (وشرطها أمور سبعة (كون رأس المال من الاثمان) كما مر في الشركة وهو معلوم للعاقدين (وكون رأس المال عينا لا دينا وكونه مسلما الى المضارب (وكون الربح بينهما شائعا وكون نصيب كل منهما معلوما) عند العقد وفي الجلالية كل شرط يوجب جهالة في الربح او يقطع الشركة فيه يفسدها والا بطل الشرط وصح العقد اعتبارا بالوكالة

ولما فی درر الحکام (۳/۳۵۴ ماجدیه)

(اذا وقت رب المال المضاربة بوقت معین فبمضی ذلک الوقت تنفسخ المضاربة

ولما فی بدائع الصنائع (۶/۸۲،۸۶ سعید)

(ومنها) ان یکون معلوما فان کان مجهولة لاتصح المضاربة لان جهالة رأس المال تؤدی الی جهالة الربح وکون الربح معلوما شرط صحة المضاربة .... والاصل فی الشرط الفاسد اذا دخل فی هذا العقد انه ینظر ان کان یؤدی الی جهالة الربح یوجب فساد العقد لان الربح هو المعقود وجهالة المعقود علیه توجب فساد العقد.

ولما فی الدر والرد (۵/۱۶۸،۱۶۹ سعید)

ولو حکما فدخل ربا النسیئة والبیوع الفاسدة فکلها من الربا

وقال الشامیؒ تحت هذه العبارة "تبع فیه البحر عن البنایة وفیه نظر فان کثیر من البیوع الفاسدة لیس فیه فضل خال عن عوض کبیع ما سکت عن الثمن ،وبیع عرض بخمر او با م ولد فتجب القیمة ویملک بالقبض وکذا بیع جذع من سقف وذراع من ثوب یضره التبعیض ،وثوب من ثوبین والبیع الی النیروز ونحو ذالک مما سبب الفساد فیه الجهالة اوالضرر او نحو ذالک ،نعم یظهر ذالک فی الفساد بسبب شرط فیه نفع لاحد العاقدین مما لا یقتضیه العقد ،ولا یلائمه ویؤید ذالک ما فی الزیلعی قبیل باب الصرف فی بحث ما یبطل بالشرط الفاسد حیث قال :والاصل فیه ان کل ما کان مبادلة مال بمال یبطل بالشروط الفاسدة لا ما کان مبادلة مال بغیر مال او کان من التبرعات لان الشروط الفاسدة من باب الربا وهو یختص بالمعاوضة المالیة دون غیرها من المعاوضات والتبرعات لان الربا هو الفضل الخالی عن العوض وحقیقة الشروط الفاسدة هی زیادة مالا یقتضیه العقد ولا یلائمه فیکون فیه فضل خال عن العوض وهو الربا بعینه.

واللہ اعلم بالصواب: برکت اللہ ٹانکوی الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ

فتوی نمبر: ۶ شعبان ۱۴۳۲ھ

﴿کتاب المزارعة﴾

﴿مزارعت کا حکم اور صحت مزارعت کی شرائط﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ مزارعت کے لئے زمین دینا جائز ہے کہ نہیں؟ اور مزارعت کے صحیح ہونے کی کیا شرائط ہیں؟

﴿جواب﴾ مزارعت کے لیے زمین دینا جائز ہے، اور مزارعت کے صحیح ہونے کے لئے فقہاء کرام نے آٹھ شرائط بیان فرمائی ہیں:

(۱) زمین زراعت کی صلاحیت رکھتی ہو، شور یا زیر آب ہونے کی وجہ سے نا قابل کاشت نہ ہو۔ (۲) زمیندار اور مزارع اہل عقد میں سے ہوں۔ (۳) بٹائی کی مدت متعین ہو۔ (۴) صاحب تخم کی تعیین ہو یعنی بیج کس کی طرف سے ہوگا اور بیج کسی ایک جانب سے ہونا ضروری ہے اگر بیج دونوں کے درمیان مشترک ہوا تو عقد مزارعت فاسد ہو جائے گا۔ (۵) تخم کی جنس کی تعیین ہو۔ (۶) مالک زمین اور بٹائی دار دونوں کے لیے تناسب متعین ہو مثلاً نصف یا تہائی وغیرہ۔

(۷) زمین مزارع کے حوالے کر دی جائے اور مزارع کے لئے اس میں کھیتی سے کوئی چیز مانع نہ ہو۔ (۸) پیداوار میں دونوں شریک ہوں۔

لما فی التنویر مع الدر:(۲۷۵/۶، کتاب المزارعۃ، طبع سعید)

(ولا تصح عند الامام وعندهما تصح، وبه يفتى) للحاجة وقياسا على المضاربة (بشروط) ثمانية (صلاحية الأرض للزرع وأهلية العاقدين، وذكر المدة و) ذكر (رب البذر) ذكر (جنسه و) ذكر (قسط) العامل (الآخر) بشرط (التخلية بين الأرض والعامل و) بشرط (الشركة في الخارج)

ولما فی البحر الرائق:(۱۵۹/۸، کتاب المزارعۃ، طبع سعید)

(وتصح بشرط صلاحية الأرض للزراعة وأهلية العاقدين وبيان المدة ورب البذر وجنسه وحظ الآخر والتخلية بين الأرض والعامل والشركة في الخارج)

ولما فی العالمگیریۃ:(۲۳۸/۵، طبع رشیدیہ)

فان كانت الأرض لأحدهما وشرطا ان يكون البذر منهما ان شرطا العمل على غير صاحب الأرض وشرطا ان يكون الخارج بينهما نصفين كانت فاسدة لأن صاحب الأرض..... لأن هذه مزارعة بجميع الخارج بشرط اعارة نصف الأرض من العامل.

الجواب صحیح: عبد الرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: محمد شعیب پشاوری

۱۱ ربیع الاول ۱۴۳۲ھ — فتویٰ نمبر: ۳۰۰۶

﴿مزارعت کی زمین میں سے کچھ پھل سبزیاں وغیرہ بطور ہدیہ دینے کا حکم﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ زید نے ایک زمین مزارعت پر لی ہے جس میں مختلف قسم کی سبزیاں وغیرہ کاشت کرتا ہے اور فصل کاٹنے سے پہلے کبھی کوئی دوست وغیرہ آ جاتا ہے تو اسکو کوئی سبزی وغیرہ کاٹ کر دے دیتا ہے جبکہ زمین کا مالک بھی اسکو اس طرح کرنے سے نہیں روکتا، اب پوچھنا یہ ہے کہ مالک ارض کی صریحی اجازت کے

بغیر اس طرح ہدیہ دینا زید کے لئے جائز ہے یا نہیں؟ مستفتی: برکت اللہ

﴿جواب﴾ مذکورہ صورت میں جب مالک کی طرف سے دلالۃً اجازت ہے تو صراحۃً اجازت لینے کی ضرورت نہیں ہے، کچھ سبزی پھل وغیرہ تحفۃً دینے میں کوئی مضائقہ نہیں۔

لما فی الدرمع الرد:(۲۰۰/۶ طبع:سعید)

لایجوز التصرف فی مال غیرہ بلااذنہ ولا ولایتہ الا فی مسائل مذکورۃ فی الاشباہ.

وفی الشامیۃ:وفی القنیہ:أخذ أحد الشرکین حمار صاحبہ الخاص، وطحن بہ فمات لم یضمن للاذن دلالۃ قال عرف بجوابہ..... وان لم یوجد صریحا کما لو فعل بحمار ولدہ أو بالعکس أو أحد الزوجین أو أرسل جاریۃ زوجتہ فی حاجتہ فأبقت اھ.

ولما فی شرح المجلۃ:(۲۲۶/۱،طبع رشیدیہ)

وفی القنیۃ:أخذ أحد الشرکین حمار صاحبہ الخاص الخ وفیہ أیضا:ج۲ص۲۱:وأما الاذن دلالۃ،فضابطہ أن الاستعمال الذی لایختلف باختلاف المستعمل کسکنی الدار وخدمۃ العبد وتحمیل الدابۃ،یکون مأذونا فیہ دلالۃ.ومایختلف باختلاف المستعمل کرکوب الدابۃ ولبس الثوب،لایکون مأذونا فیہ.

الجواب صحیح:عبدالرحمن عفااللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب:طاہر زمان راولپنڈی

۲۱صفرالخیر۱۴۳۲ھ — فتویٰ نمبر:۲۸۹۶

﴿عقد مزارعت میں شریک دوسرے کی اجازت کے بغیر کچھ استعمال نہیں کرسکتا﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ عقد مزارعت میں کسان مالک زمین کی اجازت کے بغیر فصل میں سے کچھ حصہ اپنے کام میں لاسکتا ہے یا نہیں؟

﴿جواب﴾ عقد مزارعت اپنے مال کے اعتبار سے عقد شرکت ہے مالک زمین کاشتکار کیساتھ شریک ہے اور شراکت میں دوسرے شریک کی اجازت کے بغیر کوئی چیز استعمال کرنا جائز نہیں، اجازت ضروری ہے صراحۃً ہو یا دلالۃً۔

لما فی فتح القدیر:(۴۷۳/۹، طبع رشیدیہ)

وقالا : ھی جائزۃ لما روی "ان النبی علیہ الصلاۃ السلام عامل اھل خیبر علی نصف مایخرج من ثمر او زرع" ولانہ عقد شرکۃ بین المال والعمل فیجوز اعتبارا بالمضاربۃ و الجامع دفع الحاجۃ.

لما فی الترمذی:(۱۳۵/۲، طبع فاروقی، کتاب خانہ ملتان)

عن سلیمان بن عمرو بن الاحوص قال: حدثنی ابی انہ شھد حجۃ الوداع مع رسول

اللہ ﷺ فحمد اللہ واثنی علیہ وذکر و وعظ ....الا ان المسلم اخو المسلم فلیس یحل لمسلم من اخیہ شیء الا ما حل من نفسہ الخ.

ولما فی مشکوۃ المصابیح:(ص۲۵۵، طبع سعید)

عن ابی حرۃ الرقاشی عن عمہ قال قال رسول اللہ ﷺ الا لاتظلموا الا لایحل مال امری الا بطیب نفس منہ.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ واللہ اعلم بالصواب: محمد امیر ملک قائد آبادی

۲۳ ربیع الاول ۱۴۳۲ھ فتوی نمبر: ۳۰۷۹

﴿عقد مزارعت کی ایک صورت﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں مفتیانِ کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ زید وبکر نے عقدِ مزارعت کی اس طور پر کہ شفتالو کا تخم زید کا اور زمین بکر کی ہوگی اور جب درخت پیوندکاری کے قابل ہو جائیں تو پیوندکاری بھی زید کے ذمہ ہوگی البتہ جو حاصل ہوگا وہ نصف نصف ہوگا، کیا عقدِ مزارعت کی یہ صورت صحیح ہے؟ مستفتی: ایک سائل وزیرستان

﴿جواب﴾ مزارعت کا مذکورہ معاملہ شرعاً درست ہے، شفتالو کے درخت اس صورت میں زید کی ملکیت ہیں، اور ان سے حاصل پھل میں سے آدھا حصہ بکر کو، زید گویا زمین کا کرایہ ادا کر رہا ہے۔

لما فی صحیح البخاری:۱۹۶، طبع دار الکتب العربی.

عن عبد اللہ بن عمرؓ: ان النبی ﷺ عامل خیبر بشطر ما یخرج منہا من ثمر او زرع.

ولما فی شرح فتح القدیر: ۴۶۲/۹، طبع رشیدیہ.

(وان کان الارض لواحد والعمل والبقر والبذر لواحد جازت) لانہ استئجار الارض ببعض معلوم من الخارج فیجوز کما اذا استأجرھا بدراھم معلومۃ.

ولما فی الدر مع الرد:۲۷۸/۶، طبع سعید.

(وکذا) صحت (لو کان الارض والبذر لزید والبقر والعمل للآخر) او الارض لہ والباقی للآخر (او العمل لہ والباقی للآخر) فھذہ الثلاثۃ جائزۃ، (قولہ فھذہ الثلاثۃ جائزۃ) لان من جوزھا انما جوزھا علی انھا اجارۃ، وفی الثانیۃ یکون رب البذر مستأجرا للارض باجر معلوم من الخارج فتجوز کاستئجارھا بدراھم فی الذمۃ.

ولما فی فتاوی الھندیۃ:۲۳۸/۵، طبع رشیدیۃ.

فاحدھا ان تکون الارض من احدھما والبذر والبقر والعمل من الآخر وشرطا لصاحب الارض شیئا معلوما من الخارج جاز لان صاحب البذر یکون مستأجرا الارض بشیء معلوم من الخارج.

ولما فی بدائع الصنائع:۲۷۱/۸طبع بیروت.

ومنها:ان تکون الارض من جانب والباقی کله من جانب وهذا ایضا جائز......لان العامل یصیر مستأجرا للارض .لاغیر.ببعض الخارج، الذی هو نماء ملکه ووهو البذر.

الجواب صحیح:عبد الرحمٰن عفا اللہ عنہ　　　واللہ اعلم بالصواب:عمر فاروق لاہوری

۲۰ ربیع الثانی ۱۴۳۴ھ　　　فتویٰ نمبر:۳۶۸۱

﴿اگر مقررہ وقت پر فصل تیار نہ ہو تو کیا حکم ہے﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ سے متعلق کہ ایک آدمی نے دوسرے کو اپنی زمین ایک خاص مدت کے لیے مزارعت پر دی چنانچہ اس نے فصل لگائی لیکن مدت پوری ہونے پر فصل تیار نہ ہوئی بلکہ مزید ایک مہینہ انتظار کرنا پڑا، اب رب الارض اضافی مدت کی اجرت مانگ رہا ہے، کیا شرعاً رب الارض کا یہ مطالبہ درست ہے یا نہیں اور مزارع کے ذمہ اجرت دینا لازم ہے یا نہیں؟ وضاحت فرمائیں۔　　　مستفتی:سجاول خان

﴿جواب﴾ رب الارض کا مطالبہ درست ہے، مزارع کو چاہیے کہ مدت ختم ہونے سے لیکر فصل تیار ہونے تک کا جو عرصہ ہے اپنے حصہ کی اجرت مثل مالک زمین کو دے جیسا کہ اجارہ میں ہوتا ہے، کیونکہ مزارع نے اپنے حصے کے پکنے اور تیار ہونے کے لیے غیر کی زمین کو مقررہ وقت سے زیادہ مصروف رکھا ہے اس لیے زمین کے مالک کا حق بنتا ہے۔

لما فی التنویر والدر:(۲۸۰/۶طبع:سعید)

(فان مضت المدة قبل ادراك الزرع فعلى العامل اجر مثلنصيبه من الارض الى ادراكه ،أى الزرع كما فى الاجاره.

ولما فی الرد المحتار:(۲۸۰/۶طبع:سعید)

(قوله فان مضت المدة الخ)الاولى الاتيان بالواو بدل الفاء كما فى الملتقى واعلم ان من تتمة الاحكام هذه المسئلة كون نفقة الزرع عليهما بقدر الحصص الى ان يدرك .وعبارة الدر والمغرر:مضت المدة قبل ادراكه فعلى المزارع اجر مثل نصيبه من الارض حتى يدرك الزرع لانه استوفى منفعة بعض الارض لتربية حصته فيها الى وقت الادراك

ولما فی البحر الرائق:(۱۶۳/۸طبع:سعید)

(فان مضت المدة والزع لم يدرك فعلى المزارع اجر مثل ارضه حتى يدرك يعنى يجب على العامل اجر مثل الارض للأخر حتى يستحصد وظاهر العبارة انه يجب عليه جميع الاجره وليس كذلك فلو قال فى نصيبه لكان اولى واسلم لان العقد قد انتهى

بمضی المدۃ وفی القلع ضرر فبقینا باجر المثل الی ان یستحصد فیجب علی غیر صاحب الارض بحصته من الاجرۃ لانه استوفی منفعة الارض بقدرہ۔

ولما فی المبسوط للسرخسی: (۲۳/۳۶، طبع: بیروت)

فان انقضت المدۃ والزرع بقل بعد فالزرع بین العامل ورب الارض نصفان کما کان الشرط بینهما، والعمل فیما بقی علیهما لان العمل کان علی المزارع فی المدۃ وقد انتهت المدہ والعمل بعد ذلک یکون باعتبار الشرکة فی الزرع وهما شریکان فی الزرع فالعمل والمؤنة علیهما کنفقة العبد المشترک بینهما اذا کان عاجزا عن الکسب وعلی العامل اجر مثل نصف الارض لان المزارعة لما انتهت لم یبق للعامل حق فی منفعة الارض وهو یستوفی منفعة الارض بتربیة نصیبه من الزرع فیها الی وقت الادراک فلا یسلم له ذلک بل علیه اجر مثل نصف الارض لصاحبها۔

الجواب صحیح: عبد الرحمٰن عفا اللہ عنہ   واللہ اعلم بالصواب: ضیاء الحق انکی

۲۷ جمادی الثانیہ ۱۴۳۳ھ   فتویٰ نمبر ۱۰۳۲

﴿مزارعت کی ایک صورت﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میرا چاول کا کھیت ہے چاول کی کاشتکاری کیلئے میں نے زید کو آدھے حصہ پر عامل بنا کر زمین اس کو حوالہ کردی علاقے میں پانی کی قلت کی وجہ سے کاشتکاروں کی باریاں مقرر ہیں چنانچہ زید (جو کہ عامل ہے) سستی اور غفلت کی وجہ سے اپنی باری میں نہیں آتا جسکی وجہ سے تقریباً آدھی فصل خراب ہوگئی اب پوچھنا یہ ہے کہ کیا میں زید سے ہلاک شدہ فصل کا ضمان لے سکتا ہوں یا نہیں؟ مستفتی: زبیر خان

﴿جواب﴾ کھیت کا نقصان واقعی مزارع (عامل) کی سستی اور غفلت کی وجہ سے ہوا ہے تو آپ اپنے حصے کے برابر تاوان عامل سے وصول کر سکتے ہیں نقصان کے اندازہ کا فیصلہ قاضی یا علاقے کے تجربہ کار لوگ کریں گے

لما فی تنویر الابصار مع الدر المختار: (۶/۲۸۳، طبع: سعید)

واذا قصر المزارع فی سقی الارض حتی هلک الزرع (بهذا السبب (لم یضمن) المزارع فی المزارعة (الفاسدة) ویضمن (فی الصحیحة) لوجوب العمل فیها کمامر وهی فی یدہ امانة فیضمن بالتقصیر فی السراجیة اکار ترک السقی عمدا حتی یبس ضمن وقت ما ترک السقی تقیمته نابتا فی الارض وان لم یکن للزرع قیمته قومت الارض مزروعة وغیر مزروعة فیضمن فضل ما بینهما ....

ولما فی الفتاوی الهندیة :(۲۸۳/۶،طبع رشیدیه)

لوکان الأکار ترك سقی الارض مع القدرة علیه حتی یبس فانه یضمن قیمة الزرع والمعتبر فی التقویم حین صار الزرع بحال یضره ترك السقی فان لم یکن للزرع قیمة حینئذ فانه تقوم الأرض مزروعة فیضمن نصف فضل مابینهما

ولما فی خلاصة الفتاوی :(۱۹۸/۱،طبع: رشیدیه)

الأکار ترك اسقی حتی فسدالزرع یضمن نصیب رب الا ارض ویعتبر قیمة الزرع یوم ترك السقی فان لم للزرع قیمة فی ذالک الوقت یقوم الارض مزروعة ویقوم غیر مزروعةفیضمن فضل ما بینهما

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: سمیع الرحمٰن ذیروی

۱۷محرم الحرام ۱۴۳۳ھ — فتویٰ نمبر:

﴿مالک زمین کا اپنے لئے بھوسے کی شرط لگانا﴾

﴿سوال﴾ کیافرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ عقد مزاعت میں اگر مالک زمین اپنے لئے یہ شرط لگالے کہ بھوسہ سارا میرا ہوگا اور باقی فصل کو آدھا آدھا تقسیم کرینگے تو کیا یہ شرط لگانا جائز ہے؟ اور اس سے معاملہ فاسد تو نہیں ہوگا؟ بینوا توجروا۔

﴿جواب﴾ بھوسے کے بارے میں فقہاء کرام نے یہ قاعدہ ذکر کیا ہے کہ یہ صاحب بذر یعنی جس کے ذمہ بیج ہو اس کا حق ہے لیکن اگر عرف میں اس کو بھی تقسیم کرنے کا رواج ہو تو تقسیم کرنا بھی جائز ہے، لہٰذا اگر بیج مالک زمین کی طرف سے ہو، تو اس کا اپنے لئے بھوسے کی شرط لگانا جائز ہے، لیکن اگر بیج کاشتکار کی طرف سے ہو تو ایسی صورت میں مالک زمین اپنے لئے بھوسے کی شرط لگانا جائز نہیں ہے، اس سے عقد فاسد ہو جائے گا۔

لمافی التنویرمع الدر:(۲۷۶/۶-۲۷۷،طبع ایچ ایم سعید)

(فتبطل ان شرط لاحدهما قفزان مسماة.....أو)شرط(التبن لاحدهما والحب للآخر.....وان شرط تنصیف الحب والتبن لصاحب البذر)کماهومقتضی العقد(أولم یتعرض للتبن صحت)وحینئذالتبن لرب البذروقیل بینهماتبعاللحب کذاقاله المصنف تبعاللصدروغیره لکن اعتمد صاحب الملتقیٰ الثانی حیث قدمه فقال: والتبن بینهماوقیل لرب البذر.

وفی الشامیة:وقال مشائخ بلخ :التبن بینهماأیضااعتبارًاللعرف فیمالم ینص علیه المتعاقدان .....أقول والحاصل أن مبنی کل من المسألتین علی اعتبارالعرف

کما هو مذهب البلخيين ،لكن انضم الى الاولىٰ مع العرف موافقتها لظاهر الرواية من كون التبن لرب البذر فصارت وفاقية وبقيت الثانية مبنية على مذهبهم فقط.

ولما في الهندية:(۵/۲۹۲،طبع قديمی)

وأما الشروط المفسدة للمزراعة فأنواع...... ومنها شرط التبن لمن لم يكن البذر من قبله.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: عباداللہ غفرلہ ولوالدیہ

۱۸ ربیع الاول ۱۴۳۲ھ — فتویٰ نمبر: ۳۰۶۵

﴿مزارعت کی ایک صورت﴾

﴿سوال﴾ زمین کا مالک کاشتکار کیساتھ مزارعت کا معاملہ اس طرح کرے کہ صرف بیج میری طرف سے ہوگا، باقی سب کام آپکے ذمہ تو شرعاً یہ معاملہ درست ہوگا یا نہیں؟

﴿جواب﴾ مزاعت کا مذکورہ معاملہ شرعاً درست ہے اور یہ ایسا ہے گویا مالک زمین نے کاشتکار کو اجرت پر لیا لیکن یہ ضروری ہے کہ دونوں کا حصہ متعین ہو مثلاً ہر ایک کو پیداوار میں سے آدھا آدھا ملے گا یا ایک کو ایک تہائی اور دوسرے کو دو تہائی وغیرہ۔

لما في التنوير مع الدر:(۶/۲۷۸،طبع ایچ ایم سعید)

(وكذا)صحت(لو كان الارض والبذر لزيد والبقر والعمل للآخر)أو الأرض له والباقي للآخر(أو العمل له والباقي للآخر)فهذه الثلاثة جائزة.

وفي الشامية:(قوله فهذه الثلاثة جائزة)لأن من جوزها انما جوزها على أنها اجارة.ففي الاولى يكون رب البذر والارض مستاجرأ للفاعل وبقره تبعا له لاتحاد المنفعة لان البقر آلة له.

ولما في الهندية:(۵/۲۹۵،طبع قديمی)

والثالث:أن تكون الأرض والبذر من احدهما والعمل والبقر من الآخر فذلك جائز لان صاحب الارض يصير مستاجر اللعامل ليعمل العامل ببقره لصاحب الارض والبذر.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: عباداللہ غفرلہ ولوالدیہ

۱۵ ربیع الاول ۱۴۳۲ھ — فتویٰ نمبر: ۳۰۱۷

﴿فصل کاٹنے کی ذمہ داری عرف کے مطابق ہے﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ہمارے علاقہ میں یہ رواج ہے کہ جب فصل تیار ہو جاتی ہے، تو فصل کے کاٹنے کی ذمہ داری بھی کسان پر ہوتی ہے،

شریعت کی رو سے یہ جائز ہے یا نہیں؟ مستفتی: امیر عثمان گولے خیل ملحقہ کھوہ

﴿جواب﴾ آپ کے علاقہ میں فصل کاٹنے کی ذمہ داری بھی اگر کسان پر ہوتی ہے اور اس طرح مزارعت پر زمین لینا دینا اگر رائج ہے تو یہ شرعاً منع نہیں ہے اور اس میں کوئی قباحت بھی نہیں ہے۔

لما فی التنویر مع الدر: (۶/۲۸۲، طبع سعید)

(وصح اشتراط العمل) كحصاد ودياس ونسف على العامل (عند الثانى للتعامل وهو الاصح) وعليه الفتوى.

ولما فی البحر الرائق: (۸/۱۶۳، طبع سعید)

(فان شرطاه على العامل فسدت) يعنى شرطا العمل الذى يكون بعد انتهاء الزرع كالحصاد..... وهو ظاهر الرواية وعن ابى يوسف انها تصح مع اشتراط ذلك على العامل ومشايخ بلخ كانوا يفتون بهذه الرواية.

ولما فی خلاصۃ الفتاوی: (۴/۱۹۲، طبع رشیدیہ)

اذا شرط على المزارع او على رب الارض الحصاد والدياس والتذرية ورفعه الى البيدر فسدت المزارعة فى ظاهر الرواية من ايهما البذر وفى النوازل المزارعة جائزة على قول ابى يوسف رحمه الله وفيه عن ابى يوسف اذا شرط على المزارع ان يحصده ويجمعه جاز..... قال الفقيه ابو الليث وبه نأخذ.

الجواب صحیح: عبد الرحمٰن عفا اللہ عنہ واللہ اعلم بالصواب: محمد امیر ملک قائد آبادی

۱۳ ربیع الاول ۱۴۳۲ھ فتویٰ نمبر: ۳۰۴۷

﴿مزارعت میں ہر ایک کا حصہ متعین ہونا ضروری ہے﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میں اپنی زمین کو مزارعت پر اس طرح دیتا ہوں کہ زمین، بیج، پانی اور یوریا وغیرہ کا خرچہ میرے ذمہ ہوگا، باقی کھیت کی حفاظت، پانی سے سیراب کرنا، کاٹنا الغرض فصل تیار ہونے تک کی ذمہ داریاں کاشتکار پر ہوں گی، پھر فصل سے حاصل ہونے والی رقم ہم بعض اوقات تین حصوں میں تقسیم کرتے ہیں دو حصے میرے اور ایک حصہ کاشتکار کا ہوتا ہے اور کبھی چار حصوں میں تقسیم کرکے چوتھائی کا شتکار کا ہوتا ہے۔ از روئے شرع ہمارا یہ معاملہ درست ہے یا نہیں؟ برائے مہربانی راہنمائی فرمائیں۔

﴿جواب﴾ سوال میں ذکر کردہ مزارعت کی صورت درست ہے بشرطیکہ عقد کے شروع میں مالک زمین اور کاشتکار ہر دونوں کا حصہ متعین کرلیا جائے، مثلاً حاصل ہونے والی فصل سے

ایک کو دو تہائی اور دوسرے کو ایک تہائی دینا باہمی رضامندی سے طے کر لیں۔

لمافی التنویر مع الدر:(۲۷۸/۶،طبع ایچ ایم سعید)

(وکذا)صحت(لوکان الارض والبذرلزیدوالبقروالعمل للآخر)أوالأرض له والباقی للآخر(أوالعمل له والباقی للآخر)فهذه الثلاثة جائزة.

وفی الشامیة:(قوله فهذه الثلاثة جائزة)لأن من جوزهاانما جوزهاعلی أنهااجارة ففی الاولی یکون رب البذروالارض مستاجراًللعامل وبقره تبعاله لاتحادالمنفعة لان البقرآلته.

ولمافی الهندیة:(۲۹۵/۵،طبع قدیمی)

والثالث:أن تکون الأرض والبذرمن احدهماوالعمل والبقرمن الآخرفذلک جائزلان صاحب الارض یصیرمستاجراللعامل لیعمل العامل ببقره لصاحب الارض والبذر.

لمافی الهدایة:(۲۵/۴طبع رحمانیه لاہور)

ان کانت الارض والبذر لواحدوالبقروالعمل لواحدجازت المزارعة لان البقرآلة العمل فصارکمن استاجرخیاطالیخیط بابرة الخیاط

الجواب صحیح: مفتی عبدالرحمٰن عفااللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: عزیز احمد خضداری غفرلہ ولوالدیہ

۲۹ جمادی الثانی ۱۴۳۵ھ — فتوی نمبر:۴۲۲۲

﴿بیج زمیندار اور کسان میں مشترک ہو تو مزارعت فاسد ہوگی﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام کہ ہمارے علاقے میں کھیتی باڑی (زراعت) کی یہ صورت ہے کہ زمیندار کسان کو زمین فراہم کرتا ہے جبکہ کسان کے ذمہ عمل (کام کرنا) ہل چلانے کا مکمل خرچہ اور گندم کے سیزن میں تھریشر وغیرہ (گندم کی صفائی کیلئے) کا خرچہ ہوتا ہے، باقی اس کے علاوہ ہر چیز کھاد، بیج اور دوائی وغیرہ میں دونوں برابر کے شریک ہوتے ہیں، کیا شرعاً کھیتی باڑی (زراعت) کی یہ صورت درست ہے یا نہیں؟ مستفتی: خالد کوٹ

﴿جواب﴾ زراعت کی مذکورہ صورت میں بیج دونوں کا مشترک ہے، اس لئے یہ ناجائز اور فاسد معاملہ ہے، بیج کسی ایک کا ہو زمیندار کا ہو خواہ کسان کا تو معاملہ جائز ہوگا، اس کے علاوہ تھریشر وغیرہ کا خرچہ کسان کے ذمہ اور باقی دوائی کھیتی باڑی وغیرہ کا خرچہ نصف نصف باہمی رضامندی سے طے کرنا چاہیں تو کر سکتے ہیں۔

لمافی الهندیة:(۲۳۸/۵،طبع رشیدیه)

فان کانت الارض لاحدهماوشرطاان یکون البذرمنهماان شرطاالعمل علی غیر

صاحب الارض وشرطا ان یکون الخارج بینهما نصفین کانت فاسدۃ لان صاحب الارض یصیر قائلا للعامل ازرع ارضی ببذری علی ان یکون الخارج کله لی وازرع ببذرك علی ان یکون الخارج کله لک کان فاسدا لان هذه مزارعة بجمیع الخارج بشرط اعارۃ نصف الارض من العامل.

ولمافی التنویر مع الدر:(۲۷۸/۲، طبع ایچ ایم سعید)

(وکذا)صحت(لوکان الارض والبذر لزید والبقر والعمل للاخر)(اوالارض له والباقی للاخر.

ولمافی التنویر مع الدر:(۲۸۲/۲، طبع ایچ ایم سعید)

(وصح اشتراط العمل)کحصاد ودیاس ونسف علی العامل(عندالثانی للتعامل وهوالاصح)وعلیه الفتوی.

ولمافی بدائع الصنائع:(۱۸۱/۲-۱۸۲، طبع ایچ ایم سعید)

واما بیان حکم المزارعة الصحیحة .. (ومنها)ان کل ماکان من باب النفقة علی الزرع من السرقین وقلع الحشاوۃ ونحو ذلک فعلیهما علی قدر حقهما.

الجواب صحیح :عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ　　　　واللہ اعلم بالصواب: عدنان خدا بخش

۵ ربیع الثانی ۱۴۳۱ھ　　　　فتویٰ نمبر: ۲۵۷۲

﴿مساقات میں پانی وغیرہ کے اخراجات کس کے ذمہ ہونگے ؟﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان شرع دین متین اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک شخص کی زمین ہے دوسرا شخص شفتالوں کی گٹھلیاں لگا رہا ہے (کہ پودے نکلیں گے تو اسکو بیچیں گے منافع مشترک ہوگا) باقی پانی وغیرہ کے خرچے مشترک ہوں گے۔اور نگرانی کیلئے مزدور بھی مشترک ہوگا۔ پوچھنا یہ ہے کہ اس طرح کرنا جائز ہے یا نہیں؟ نیز یہ مساقات کہلائے گا یا نہیں؟

﴿جواب﴾ مذکورہ معاملہ بھی حکما مساقات کی صورت ہے۔اور فی نفسہ جائز ہے مساقات میں درخت کا پھل (حسب وعدہ) دونوں (زمیندار اور عامل) کے درمیان مشترک ہوتا ہے یہاں بھی جو پودے اگ آئے وہ یا انکے منافع دونوں کے درمیان مشترک ہوں گے۔اور جس طرح مساقات میں عامل (کام کرنے والے) کی محنت وعمل سے پھلوں میں ترقی ہوتی ہے اسی طرح یہاں بھی عامل کے عمل سے پودوں میں ترقی ہوتی ہے۔ دراصل مساقات میں درختوں کا پھل حاصل ہونے تک حفاظت اور دیگر تمام تر نگرانی عامل پر ہوتی ہے اسلئے مذکورہ صورت میں نگرانی کیلئے مزدور کی اجرت عامل کے ذمہ ہونا چاہیے تاہم اگر اس علاقہ میں اس طرح کے

معاملے رائج ہیں اور آپس میں ناراضگی وغیرہ کی نوبت نہیں آتی تو شرعا کوئی ممانعت نہیں ہے ایسا معاملہ کر سکتے ہیں.

لما في التنوير مع الرد:(۲۸۹/۶ ،طبع سعيد)

(دفع أرضا بيضاء مدة معلومة ليغرس وتكون الأرض والشجر بينهما لا تصح)(قوله وتكون الأرض والشجر بينهما)قيد به اذلو شرط أن يكون هذا الشجر بينهما فقط صح:

ولما في البحر(۱۶۵/۸ ،طبع سعيد)

ولو أن رجلا دفع أرضه معاملة على أن يغرس العامل فيها أغراسا والغراس بينها فهذا يجوز

ولما في الهندية(۲۷۹/۵، طبع رشيديه)

واذا دفع الرجل الى آخر أرضا بيضاء ليغرس فيها أغراسا على أن الأغراس والثمار بينهما فهو جائز(وبعد اسطر)واذا دفع الرجل الى غيره أرضا بيضاء سنين مسماة على أن يغرسها نخلا أو شجرا أو كرما على أن ما أخرج الله تعالى من شجر أو نخل أو كرم فهو بينهما نصفان فهذا فاسد

ولما في فتاوى قاضي خان:(۵۳/۳، طبع قديمی)

رجل دفع الى رجل أرضا بيضاء سنين معلومة على أن يغرسها نخلا أو شجرا أو كرما على أن ما أخرج الله تعالى من نخل أو شجر أو كرم فهو بينهما نصفين وعلى أن تكون الارض بينهما نصفين فهو فاسد:كذا في البحر ۱۶۶/۸ ،طبع سعيد

ولما في الدر:(۱۹۱/۶، طبع سعيد)

[فروع] ما قبل الادراك كسقي وتلقيح وحفظ فعلى العامل، وما بعده كجذاذ وحفظ فعليهما، ولو شرط على العامل فسدت اتفاقا ملتقى:والأصل أن ما كان من عمل قبل الادراك كسقي فعلى العامل وبعده كحصاد ه عليهما كما بعد القسمة فليحفظ: وفي الشامي،عبارة الهداية:ولو شرط الجذاذ على العامل فسدت اتفاقا لأنه لا عرف فيه اه

ولما في الهداية:(۴۲۹/۴،طبع رحمانيه)

والمعاملة (المساقاة) على قياس هذا ما كان قبل ادراك الثمر من السقي والتلقيح والحفظ فهو على العامل وما كان بعد الادراك كا الجداد والحفظ فهو عليهما ولو شرط الجداد على العامل لا يجوز بالاتفاق لأنه لا عرف فيه وما كان بعد القسمة فهو عليهما لأنه مال مشترك ولا عقد........ولو اراد فصل الفصيل او جد الثمر بسرا والتقاط الرطب فذلك عليهما لانهما انهيا العقد لما عزما على الفصل والجداد بسرا فصار كما بعد الادراك والله اعلم

والله اعلم بالصواب: عمران الحق | الجواب صحيح: مفتی عبد الرحمٰن عفا اللہ عنہ

فتوی نمبر: ۳۰۰۶ | ۹ ربیع الثانی ۱۴۳۵ھ

﴿باب القسمۃ﴾

﴿زمین کو اندازہ سے تقسیم کرنے کا حکم﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ہمارے ہاں عام طور پر لوگ زمینوں کو اسطرح تقسیم کرتے ہیں کہ اندازے سے کسی ایک کونے کیساتھ رسہ پکڑ کر دوسرے کونے تک لے جاتے ہیں اور اسطرح ہر ایک کا علیحدہ علیحدہ حصہ متعین کردیتے ہیں تو یہ طریقہ تقسیم صحیح ہے یا نہیں؟ اگر صحیح نہیں تو صحیح طریقہ کیا ہے؟ مستفتی: رحیم اللہ کوہاٹی لاچی سوڈل

﴿جواب﴾ مذکورہ صورت میں اگر تمام شرکاء اسطرح تقسیم کرنے پر راضی ہیں تو تقسیم صحیح ہے تاہم بہتر یہ ہے کہ شرکاء کے تمام حصے علیحدہ کر کے ہر حصے کو مخصوص نام یا نمبر دیکر قرعہ ڈال دیا جائے جسکے حصے میں جو آئے وہی اسکو دیا جائے۔

لمافی الدر المختار:(۲۶۴/۶،طبع سعید)

القسمة على التفاوت بالتراضي في غيرالاموال الربوية جائزة.

ولمافي الهندية:(۲۵۲/۵،طبع قديمی)

واما حكمها:فتعين نصيب كل واحدمنهم من نصيب صاحبه..... كذافي التبيين.

ولمافي التنويرمع الدر:(۲۶۲/۶،طبع سعيد)

(ويصور القاسم مايقسمه على قرطاس)ليرفعه للقاضي(ويعدله على سهام القسمة ويذرعه،ويقوم البناء،ويفرز كل نصيب بطريقه وشربه ،ويلقب الانصباء بالاول والثانی والثالث)وهلم جرا(ويكتب أساميهم ويقرع)لتطييب القلوب.

ولمافي التنويرمع الدر:(۱۶۸/۵-۱۶۹،طبع سعيد)

(هوفضل خال عن عوض بمعيار شرعي)وهوالكيل والوزن فليس الذرع والعدبربا (مشروط)ذلك الفضل (لاحدالمتعاقدين(وعلته القدر)المعهودبكيل أووزن(مع الجنس فان وجداحرم الفضل)

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ　　　　واللہ اعلم بالصواب: نثار محمود کوہاٹی عفی عنہ

۱۹ جمادی الثانی ۱۴۳۰ھ　　　　فتویٰ نمبر: ۲۳۶۲

﴿کتاب اللقطة﴾

﴿گری پڑی چیز سے متعلق احکام﴾

﴿پانی میں بہہ کر آنے والی لکڑیوں کا حکم﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں مفتیان عظام اس مسئلہ کے متعلق کہ گاؤں، دیہات میں جب سیلاب آتا ہے تو دریا بے تحاشا لکڑیاں بہا کر لاتا ہے، لوگ اپنی محنت اور کوشش سے یہ لکڑیاں نکالتے ہیں اور اپنے استعمال میں لاتے ہیں، کیا شریعت کی رو سے یہ درست ہے؟ واضح رہے کہ ان لکڑیوں کا مالک معلوم نہیں ہوتا۔ مستفتی: رضائی خان

﴿جواب﴾ دریا میں بہہ کر آئی ہوئی لکڑی "لقطہ" کے حکم میں ہوتی ہے، لقطہ کے متعلق حکم یہ ہے کہ ضائع ہونے کا اندیشہ ہو تو اٹھانا ضروری ہے ورنہ مباح۔

صورت مذکورہ میں لکڑیوں کو اگر نہ نکالا جائے تو ضائع ہونے کا قوی امکان ہے کہ دریا ان کو بہا لے جائے گا تاہم لکڑیوں کو نکالا جائے اور حفاظت سے رکھا جائے، مالک مل جائے تو اس کو واپس کر دیا جائے ورنہ صدقہ کر دے خود ضرورت مند ہے تو خود بھی استعمال کر سکتا ہے۔

لما فی البزازیة علی هامش الهندیة:(۲۱۹/۶-۲۲۰ ,طبع رشیدیه)

الملتقطه علی وجهین ان خاف ضیاعها یفترض رفعها والایباح أجمع العلماء علیه والافضل هو الرفع عند عامة العلماء خصوصاً وقیل یحل والافضل الترك والصحیح قول عامة العلماء وایضاً قال:التفاح والكمثری ان وجد فی الماء .....أوالحطب فی الماء ان لم یكن له قیمة یأخذه وأن له قیمة فهو لقطة.

ولما فی التنویر مع الدر:(۶/۴۳۷-۴۳۸,طبع امدادیه)

(فینتفع)الرافع(بها لو فقیرا أو الا تصدق بها علی فقیر ولو علی أصله وفرعه وعرسه الخ)

الجواب صحیح. عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم: محمد عزیز چترالی

۲۱ ربیع الثانی ۱۴۲۷ھ — فتویٰ نمبر: ۱۵۷

﴿چوری مال کا مالک نہ ملے تو بطور صدقہ سید کو بھی دے سکتے ہیں﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک آدمی نے کسی کا مال چوری کیا پھر بعد میں اپنے اس فعل پر نادم ہوا اب چونکہ یہ مال اس کے مالک

کو پہنچانا ضروری ہے اور اگر وہ نہ ملے تو اس کے ورثاء کو پہنچانا ضروری ہے اگر وہ بھی نہ لیں تو اسکو اصل مالک کی طرف سے صدقہ کرنا لازم ہے اب یہ دریافت کرنا ہے کہ یہ مال سید کو بھی دے سکتے ہیں یا نہیں؟

﴿جواب﴾ مذکورہ مال کا حکم لقطہ کی طرح ہے اور لقطے کا حکم یہ ہے کہ جب یقین ہو کہ مالک نہیں ملے گا تو چاہیے کہ فقیر کو دے اور خود اگر فقیر ہے تو خود بھی استعمال کر سکتا ہے اور ارادہ یہی ہو کہ جب اللہ تعالیٰ وسعت دے گا تو اتنا مال صدقہ کروں گا اور سید کو صدقات واجبہ (جن کا دینا فقیر کو لازم ہوتا ہے) جائز نہیں ہوتا جیسے زکوۃ، صدقہ فطر، عشر، کفارہ، نذر البتہ نفلی صدقات دینا جائز ہوتا ہے اور مذکورہ مال چونکہ صدقات واجبہ میں سے نہیں لہذہ سید کو دینا جائز ہے۔

لما فی المحیط البرهانی ۱۶۲/۸ طبع ادارۃ القرآن

ثم اذادفعها الی الامام ،کان للامام الخیار ،ان شاء قبل وان شاء لم یقبل ،وفی هذه الصفحة واذا ردها علی الملتقط فالملتقط بالخیار ان شاء امسکها وادام الحفظ فیها حتی یظهر لها طالب، وان شاء تصدق بها ،علی ان یکون الثواب لصاحبها،وان شاء باعها ان لم یکن دراهم،او دنانیر ،وامسک ثمنها ،فان تصدق،وحضر صاحبها فله الخیار ان شاء نفذ الصدقة ،والثواب له وفی هذه الصفحة وان شاء لم یجز الصدقة وعند عدم الاجازت ان کانت قائمة فی ید الفقیر ،اخذها منه ،وان کانت هالکة، کان له الخیار، ان شاء ضمن الفقیر ،وان شاء ضمن الملتقط فان قیل کیف ضمن الملتقط ،وقد تصدق باذن الشرع؟ قلنا:الشرع ما الزمه التصدق. وانما اذن له بذلک وفی هذه الصفحةوان کان الملتقط محتاجا فله ان یصرف اللقطة الی نفسه بعد التعریف لان الصرف الی فقیر آخر لایصال الثواب الی المالک ،وفی حق هذه المعنی الصرف الی فقیر آخر والصرف الی نفسه سواء

ولما الشامی جلد۲/۵۱ طبع سعید

(قوله وجازت التطوعات الخ)قید بها لیخرج بقیة الواجبات کالنذر والعشروالکفارات وجزاء الصید الا خمس الرکاز فانه یجوز صرفه الیهم کما فی النهر عن السراج

ولما فی فتاوی قاضی خان ۳/۲۸۵ طبع قدیمی کتب خانه

فبعد ذلک فی القلیل ان جاء صاحبها دفعها الیه،وان لم یجی فهو بالخیار ان شاء امسکها حتی یجی صاحبها وان شاء تصدق بها ،فان تصدق ثم جاء صاحبها کان صاحبها بالخیار:ان شاء اجاز الصدقة ویکون الثواب له وان لم یجز الصدقة فان کانت اللقطة قائمة فی ید الفقیر اخذها من الفقیر، وان لم تکن قائمة کان له الخیار :ان شاء ضمن الفقیر وان شاء ضمن الملتقط

ولما فی احکام مال الحرام۲۶ صرف الربح فی حاجت نفسہ

ذکر صاحب الاختیار فی شرح المختار انه وان وجب التصدق به و لکن ان احتاج الیه ، و صرفه فی حاجته بنیة انه یتصدق بمثله فیمابعد جاز له ......والملک الخبیث سبیله التصدق به ولو صرفه فی حاجت نفسه جاز،ثم ان کام غنیا تصدق بمثله وان کان فقیرا لا یتصدق ولکنه مقید بمااذا لم یکن عنده مال اخر لدفع حاجته قال صاحب الهندیة، الا اذا کان لا یجد غیره لانه محتاج الیه،وله ان یصرفه الی حاجت نفسه ،فلو اصاب مالا تصدق بمثله ان کان غنیا وقت الاستعمال وان کان فقیرا فلاشی، علیه وعلله السرخیؒ بقوله :وحاجته تقدم علی حق الفقراء ... وانما قلنا ذلک لان حق الفقراء فی هذه المال بمنزلة حقهم فی اللقطه علی معنی ان له ان یتصدق،وله ان یردها علی المالک ان شاء......وکثیرا ما یقع فی زماننا ان ما کسبه المرء مدی سنین طویلة کله حرام عن طریق الربا اوالرشوة وغیرها من التعاملات المحظوره ولا سبیل الی رد تلک الاموال الی اصحابها،فوجب علیه التصدق بها ثم یوفقه الله سبحانه وتعالی ان یتوب عن الکسب الحرام، ولکن لیس عنده مال سواه لیسد بهاحاجته وحاجت عیاله،فیحتمل ان یعتبر ذلک المرء فقیرا من حیث انه لا یملک من المال الحلال شیئا، وما فی یده لیس مملوکا له شرعا فتجری علیه احکام الفقراء فی هذه المسئله،فیجوز له ان یصرف ذلک المال فی حاجت نفسه الی ان یملک نصاب الزکوة من مال حلال، فاذا ملک النصاب وصار غنیا شرعا،ولکن لا یکفی النصاب لحاجته وحاجت عیاله فحینئذ یجوز له الاقتراض مما عنده من المال المکتسب بطریق الحرام بشرط ان یلتزم اداء مثله الی الفقراء حسبما ذکرنا.

الجواب صحیح :مفتی عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ
صفر الخیر ۱۴۳۵ھ

واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب: شفقت اللہ
فتویٰ نمبر: ۳۸۷۱

﴿سامان چھوڑ کر چلا گیا، مالک معلوم نہیں﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ تقریباً 4 مہینے قبل ایک خریدار میری دوکان میں کچھ اشیاء چھوڑ کر چلا گیا، آج تک وہ اشیاء میری دوکان میں ہیں، اور میں اس خریدار کو نہیں جانتا، تا کہ وہ اس تک پہونچادوں۔ اب پوچھنا یہ ہے کہ میں اس سامان کا کیا کروں؟

مستفتی: محمد الیاس خان خضدار

﴿جواب﴾ ایسی صورت میں یہ اشیاء لقطہ کے حکم میں ہیں، لقطہ کا حکم یہ ہے کہ اصل مالک تک پہنچانے کی پوری کوشش ہونی چاہیئے، مالک تک پہنچانا ممکن نہ ہو جیسا کہ آپ نے ذکر کیا کہ

میں اس کو نہیں جانتا۔ اور اتنا عرصہ گزر جائے کہ اب یقین یا غالب گمان کے درجہ میں آپ جانتے ہیں کہ مالک لوٹ کر نہیں آئے گا، تو ایسی صورت میں وہ چیز یا اسکی قیمت مالک کیطرف سے صدقہ کرنا ضروری ہوتا ہے اور آپ خود اگر فقیر ہیں تو اپنے استعمال میں بھی لا سکتے ہیں، لیکن مالک ملنے کی صورت میں اسکو بتانا ضروری ہوگا، پھر اگر وہ قیمت کا مطالبہ کرے تو ادا کرنا واجب ہوگا، اور صدقہ کا ثواب آپ کو ملے گا۔

لما في الدر مع الرد: ۲۷۹/۴ (طبع ایچ، ایم سعید)

(فينتفع) الرافع (بها لو فقيرا والا تصدق بها على فقير ولو على اصله وفرعه وعرسه)... (قوله فينتفع الرافع) أي من رفعها من الارض: الملتقط واتى بالفاء، فدل على انه انما ينتفع بها بعد الاشهاد والتعريف الى ان غلب على ظنه ان صاحبها لا يطلبها والمراد جواز الانتفاع بها والتصدق، وله امساكها لصاحبها.

لما في الهداية: ۵۹۷/۲ (رحمانيه)

فان جاء صاحبها والا تصدق بها ايصالا للحق الى المستحق وهو واجب بقدر الامكان وذلك بايصال عينها عند الظفر بصاحبها وايصال العوض وهو الثواب على اعتبار اجازته التصدق بها وان شاء امسكها رجاء الظفر لصاحبها. فان جاء صاحبها فهو بالخيار ان شاء امضى الصدقة وله ثوابها وان ضمن الملتقط.

لما في البحر: ۱۵۷/۵ (ایچ ایم سعید)

وينتفع بها لو فقيرا والا تصدق على اجنبي ولابويه وزوجته وولده لو فقيرا.

الجواب صحیح: مفتی عبد الرحمٰن عفا اللہ عنہ　　واللہ اعلم بالصواب: عزیز احمد خضداری غفرلہ ولوالدیہ

۲۱ صفر ۱۴۳۵ھ　　فتوی نمبر: ۳۹۱۵

﴿سیلاب میں قیمتی و غیر قیمتی اشیاء کا بہنا لقطہ کے حکم میں ہے﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء دین اس مسئلہ کے بارے میں کہ ہمارے علاقے میں سیلاب آنے کی وجہ سے لوگوں کی بہت ساری قیمتی و غیر قیمتی اشیاء پانی میں بہہ گئی ہیں، دوسرے علاقے کے لوگوں نے ان اشیاء کو پانی سے نکال دیا، پوچھنا یہ ہے کہ جن لوگوں نے ان اشیاء کو اپنے قبضے میں لیا ہے، کیا ان کے لئے یہ اشیاء استعمال کرنا جائز ہے یا نہیں؟ بینوا توجروا۔

﴿جواب﴾ صورت مسئولہ میں غیر قیمتی اشیاء جو عرفاً و عادۃً مباح سمجھی جاتی ہوں، یہ ان کے لئے جائز ہیں، اپنے استعمال میں لا سکتے ہیں، البتہ وہ چیزیں جو قیمتی ہیں تو یہ لوگ ان کی

تعریف وتشہیر کریں تاکہ اصل مالک وصول کرے، اعلان وتشہیر کے باوجود مالک کا پتہ نہ چل سکا اور غالب گمان ہوا کہ اصل مالک کا ملنا مشکل ہے تو ایسی صورت میں مالک کیطرف سے صدقہ کردیں اور لینے والا خود بھی اگر ضرورتمند ہے تو وہ بھی استعمال کرسکتا ہے لیکن یہ نیت کرنا ضروری ہے کہ اگر کسی بھی وقت اصل مالک ملا تو یہ چیزیں یا انکی قیمت اسکو واپس کردیں گے۔

لمافی التنویر مع الدر:(۲۲۲/۲، کتاب اللقطة، طبع امدادیه)

(..... حطب وجدفی الماء ان له قیمة فلقطة والا فحلال لآخذه) کسائر المباحات الاصلیة درر.

وفی الشامیة: وذکرفی شرح الوهبانیة ضابطاً وهوأن مالایسرع الیه الفساد ولایعتاد رمیه کحطب وخشب فهولقطة ان کانت له قیمة ولوجمع من أماکن متفرقة فی الصحیح کمالووجد جوزة ثم اخری وهکذا حتی بلغ ماله قیمة.

ولمافی هامش الهندیة:(۲۸۹/۳، کتاب اللقطة، طبع رشیدیه کوئٹه)

حطب وجدفی الماء ان لم یکن له قیمة فهوحلال لمن أخذه وان کانت له قیمة یکون لقطة.

ولمافی الولوالجیة:(۲۲۸/۲-۲۲۹، کتاب اللقطة، طبع فاروقیه، پشاور)

بل یعرف القلیل بقدر مایغلب علی ظنه أن صاحبها لایطالبها بعدذلک فان لم یجیء صاحبها ان شاء تصدق وان شاء أمسک فان تصدق بها ثم جاء صاحبها ان شاء أجاز الصدقة ویکون له ثوابها فان اختار الضمان ان کانت قائمة فی یدالفقیر کان له أن یاخذها من الفقیروان کانت هالکة کان بالخیاران شاء ضمن الذی تصدق بها وان شاء ضمن المسکین، لأن الذی تصدق بها سلم ماله بغیراذنه الملتقط اذاأرادأن یصرف اللقطة الی نفسه ان کان فقیراًله ذلک لأن حاجته مقدمة علی حاجة غیره فیمافی یده.

ولمافی الهدایة:(۵۹۲/۲، کتاب اللقطة، طبع رحمانیه)

قال: اللقطة أمانة اذاأشهدالملتقط أنه یاخذهالیحفظهاویردهاعلی صاحبهالأن الأخذعلی هذا الوجه ماذون فیه شرعاًبل هوالأفضل عندعامة العلماء.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفااللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: صادق محمد سواتی غفرلہ ولوالدیہ

۲۱ محرم الحرام ۱۴۳۲ھ — فتویٰ نمبر: ۲۷۹۰

﴿لقطہ کا مالک نہ ملے تو اٹھانے والا اگر مستحق ہے تو استعمال کرسکتا ہے﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں مفتیان کرام اس کے مسئلہ کے بارے میں کہ ایک آدمی کو سڑک پر واقع ایک مسجد سے کچھ رقم ملی اور اس نے بنیت حفاظت اٹھائی، مذکورہ مسجد لب سڑک پر واقع ہے جس میں مسافروں کی گاڑیاں نماز کیلئے کھڑی ہوتی ہیں۔

اٹھانے والاخودغریب آدمی ہے اس نے دس دن تک مسلسل اعلان کیالیکن مالک نہ ملا،اب یہ رقم اٹھانے والاخوداستعمال کرے یامسجد کے متولی کے حوالہ کرے؟اورکب تک اعلان جاری رکھناضروری ہے؟ سائل:عباس خان وزیر بنوں

﴿جواب﴾عام لوگ جہاں جمع ہوتے ہیں وہاں پراعلان کرناضروری ہے،البتہ جب یہ یقین یاغالب گمان ہوجائے کہ مالک اب اس کوتلاش نہیں کررہاہے پھرآپ خوداگرمستحق ہیں تو اپنے استعمال میں لاسکتے ہیں اوراگرآپ مستحق نہیں توکسی غریب پرصدقہ کرناواجب ہے۔

لیکن یہ واضح رہے کہ بعدمیں مالک اگرمل جائے تودونوں صورتوں میں آپ کومذکورہ رقم اس کے حوالے کرناہوگی۔

لمافی التنویرمع الرد:(۲۲۶/۶،طبع امدادیه)

(وعرف الی ان علم ان صاحبهالایطلبهاالخ)

وفی الشامية:لم يجعل للتعريف مدةاتباعا للسرخسیؒ ثم قال:وصححه،فی الهداية وفی المضمرات،والجوهرة وعليه الفتوی.

ولمافی التنويرمع الدر:(۲۲۷/۶-۲۲۸،طبع امدادیه)

(فينتفع بهالوفقيراوالاتصدق بهاعلی فقير)

وفی الشامية:(قوله لوفقيرا)قيدبه لان الغنی لايحل له الانتفاع بهاالابطريق القرض،لكن باذن الامام نقله عن النهر.

الجواب صحیح:عبدالرحمٰن عفااللہ عنہ ۔ واللہ اعلم بالصواب:عبیداللہ عابدغفرلہ ولوالدیہ

۵/۱/۱۴۳۰ھ ۔ فتویٰ نمبر:۱۸۶۲

﴿مسجد میں چپل تبدیل ہوجائے توکیاکرے؟﴾

﴿سوال﴾ کیافرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ اگرکسی شخص کی چپل مسجد سے کوئی پہن کرلے جائے اوراس کی جگہ پردوسری چپل پڑی ہواوریہ شخص یہ سمجھ کرکہ شایدمیری چپلوں کوغلطی سے پہن کراپنی چپل چھوڑگیاہے،ان چپلوں کوپہن کرلے جاتاہے،ایسے شخص کے لئے ان چپلوں کااستعمال میں لاناجائزہے یانہیں؟ مستفتی:محمدابراربلال کالونی

﴿جواب﴾صورت مسئولہ میں اگراس بات کایقین ہوکہ رکھی ہوئی چپل اسی شخص کی ہے جوچپل لےکرگیاہےتوایسی صورت میں ان چپلوں کواستعمال میں لاناجائزہےلیکن لیتے وقت

اس بات کی نیت ہو کہ جب بھی انکا اصل مالک مل جائے گا اس کو یہ چپل لوٹا کر اپنی واپس لے لونگا اور اسی مقصد کے لئے ان چپلوں کو پہن کر مسجد میں آتا ہے لیکن کوشش اور اہتمام کے باوجود اگر اصل مالک کے ملنے کی امید نہ ہو اور اس کی چھوڑی ہوئی چپل اعلیٰ قسم (قیمتی) کی ہو تو ایسی صورت میں تقویٰ اور احتیاط کا تقاضہ یہ ہے کہ دونوں چپلوں کے مابین قیمتوں کا فرق معلوم کر کے اضافی رقم صدقہ کر دی جائے۔

لما فی الشامی:(۴/۲۸۵-۲۸۶،طبع سعید)

وکذلک الجواب فی المکعب اذا سرق اھ وقیدبعضهم بان کان یکون المکعب الثانی کالاول اواجود،فلودونه له الانتفاع به بدون هذاالتکلیف لان أخذالأجود وترک الأدون دلیل الرضاء بالانتفاع به..... قلت:ماذکرمن التفصیل بین الادون وغیرها انمایظهرفی المکعب المسروق امالواخذمکعب غیره وترک مکعبه غلطاًلظلمة او نحوهاویعلم ذلک بالقرائن فهوفی حکم اللقطة ــ وکذالواشتبه کونه غلطاًاوعمداًلعدم دلیل الاعراض هذاماظهرلی فتأمله.وکذافی الهندیة:(۲/۲۹۵،طبع رشیدیه) والبحرالرائق:(۵/۱۵۸،کتاب اللقطة،طبع ایچ ایم سعید)

ولمافی الشامی:(۶/۵۰۱،طبع سعید)

(قوله وقیل اذاایس الخ)کذاعبرفی المنح،وظاهره انه من غیر جنس حقه،والافلومن جنسه فله اخذقدره منه بلاکلام......الخ.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: نعیم اقبال عفا اللہ عنہ

۱۳ ربیع الثانی ۱۴۳۱ھ — فتویٰ نمبر: ۲۶۱۹

﴿اکاؤنٹ میں کسی کی رقم غلطی سے آجائے تو مالک کو لوٹانا ضروری ہے﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک شخص نے بینک میں اکاؤنٹ کھلوایا تھا تو اسکے اکاؤنٹ میں کہیں سے رقم جمع ہوئی تھی اور اس کو پتہ نہیں ہے کہ میرے اکاؤنٹ میں رقم کس طرح آگئی اور کہاں سے آگئی؟

اب پوچھنا یہ ہے اگر یہ شخص بینک والوں سے یہ کہتا ہے کہ میرے اکاؤنٹ میں اتنا پیسہ زیادہ آیا ہے بینک والے فوراً کہیں گے کہ یہ تو ہمارے ہیں تو یہ شخص اگر اس رقم سے کاروبار شروع کرے جب بھی اس کا مالک مل جائے تو اسکے حوالہ کرے گا کیا اس طرح کرنا جائز ہے؟ یا پھر کیا کرے؟

﴿جواب﴾ آپ کو یقینی طور پر معلوم ہے کہ میرے اکاؤنٹ میں کسی دوسرے کا پیسہ جمع

ہو گیا ہے تو آپ پر اس کا مالک تلاش کرنا ضروری ہے۔اس رقم کو استعمال میں لانا ہرگز جائز نہیں ہے بینک نظام میں یہ معلوم کرنا کہ رقم کہاں سے آئی کوئی مشکل نہیں ہے۔بینک کے ذمہ دار افراد کو بتائیں گے تو وہ کہیں گے کہ یہ پیسہ ہمارا ہے یہ بے جا اندیشہ ہے۔ذمہ داری تو بینک والوں کی ہے اور عموماً بینک والوں سے اسطرح کی غلطی ہو جاتی ہے۔بہرحال اگر آپ بینک والوں کو نہیں بتانا چاہتے تو اسٹیٹمنٹ نکلوانا ویسے بھی آپ کا حق ہے۔اسٹیٹمنٹ سے معلوم ہو جائیگا کہ یہ رقم کہاں سے آئی ہے پھر آپ خود ہی مالک تک پہنچانے کی کوشش کریں اور اس کا حق اسکے حوالہ کریں دوسرے کا مال غلطی سے آپ کے ہاتھ آ جائے تو اسکا استعمال ہرگز جائز نہیں ہے۔

لمافی المحیط البرھانی(۸/۱۷طبع ادارۃ القرآن)

ونوع آخر یعلم أن صاحبه یطلبه کالذهب والفضة،وسائر العروض،وأشباهها ،وفی هذاالوجه له أن یأخذها، یحفظها، ویعرفها،حتی یوصلهاالی صاحبها.

ولمافی الهندیه:(۲/۲۹۰رشیدیه)

ونوع آخر یعلم أن صاحبه یطلبه کالذهب والفضه وسائر العروض وأشباهها وفی هذالوجه له أن یأخذها ویحفظها ویعرفها حتی یوصلهاالی صاحبها.

ولمافی المبسوط:(۱۱/۳ دارالمعرفه بیروت)

فأما(النوع الثانی)وهو مایعلم أن صاحبه یطلبه فمن یرفعه فعلیه ان یحفظه ویعرفه لیوصله الی صاحبه.

الجواب صحیح:مفتی عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ　　واللہ اعلم بالصواب:محمد داؤد فاروقی ٹانکوی

۲۴ ربیع الاول ۱۴۳۵ھ　　فتویٰ نمبر:۲۰۱۹

﴿موبائل میں نامعلوم بیلنس پہنچنے کا حکم﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں مفتیان شرع متین مسئلہ ذیل میں کہ بسا اوقات موبائل میں غلطی سے کسی کا بیلنس آ جاتا ہے جبکہ اس کے مالک کا پتہ نہیں چلتا،اس بیلنس کا شرعاً کیا حکم ہے؟ اسکا استعمال شرعاً جائز ہوگا یا نہیں؟　　سائل:عازم ایبٹ آبادی

﴿جواب﴾ موبائل میں بیلنس آنے کی مختلف صورتیں ہوتی ہیں،کمپنی بھی بیلنس بھیجتی ہے لیکن اسکی شناخت ہوتی ہے بعض اوقات دوست احباب بھی عطیہ کیطور پر ایسا کرتے ہیں،بہرحال کمپنی یا دوست کیطرف سے بیلنس پہنچنے کا غالب گمان ہو تو اسکو استعمال کر سکتے ہیں،البتہ غلطی سے

کسی کا بیلنس پہنچنے کا غالب گمان ہو تو اسکو استعمال کر کے اس مقدار کی رقم کو صدقہ کرے اور مالک ملنے کی صورت میں اگر وہ مطالبہ کرے تو اصل رقم اسکو دینی پڑی گی اور صدقہ کا ثواب آپ کو ہوگا۔

لمافی التنویر مع الدر:(۲۷۹/۴، سعید)(فینتفع)الرافع(بھالوفقیرا او الاتصدق بھا علی فقیر)

وفی الشامیۃ:(قولہ لوفقیرا)قیدبہ لان الغنی لا یحل لہ الانتفاع بھا الا بطریق القرض لکن باذن الامام نقلہ عن النھر.

ولمافی التاتارخانیۃ:(۲۰۳/۵،طبع قدیمی)

وفی الفتاوی العتابیۃ سأل رجل عطاء،رجل نام فی المسجدواستیقظ وفی یدہ صرۃ فیھادنانیر؟قال ان الذی صرھافی یدک لم یصرھاالا وھویریدان یجعلھالک.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ واللہ اعلم: عبیداللہ عابد غفرلہ ولوالدیہ

۲۶ صفرالخیر ۱۴۳۰ھ فتویٰ نمبر: ۱۹۳۳

﴿ایسے سامان کا حکم جس کا مالک معلوم نہ ہو﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے ہیں کہ میری الیکٹرک کی دکان ہے جسکو تقریباً بیس پچیس سال ہو گئے، وہاں پر لوگوں کی مختلف اقسام کی موٹر، واشنگ مشین، استری، پنکھے اور مختلف چیزیں ٹھیک ہونے آتی ہیں، بعض مرتبہ ہوتا یہ ہے کہ مشین کا مالک نہیں آتا، اس کو کافی دن ہو جاتے ہیں، اب اس طرح کا بہت سارا سامان جمع ہو گیا جن کے مالک نہیں آئے جسکی وجہ سے دکان بھر گئی، اپنے سامان کو رکھنے میں بھی پریشانی ہوتی ہے، معلوم یہ کرنا ہے کہ اگر مذکورہ اشیاء کو ہم استعمال کریں تو جائز ہے یا پھر ان اشیاء کا کیا کریں؟ واضح رہے کہ یہ سامان نہ ہم مالک کو پہنچا سکتے ہیں اور نہ ہم مالک کو جانتے ہیں۔ مستفتی: محمد عبید کورنگی

﴿جواب﴾ مذکورہ صورت میں یہ سامان آپ کے پاس لوگوں کی امانتیں ہیں اور ان تک پہنچانا مشکل ہو اور آپ کو یقین ہو جائے کہ مالک ان کو لینے نہیں آئیں گے تو پھر مالک کی جانب سے صدقہ کر دیں، انشاء اللہ آپ کے حسن عمل کی وجہ سے آپ کو بھی صدقہ کا ثواب ملے گا اور اگر خود مستحق ہیں تو پھر اپنے استعمال میں بھی لا سکتے ہیں اگر نہیں تو پھر آپ کے لئے استعمال جائز نہیں ہے۔

لمافی قولہ تعالی:(سورۃ النساء آیت ۵۸)ان اللہ یامرکم ان تؤدوا الامنٰت الیٰ اھلھا......الآیۃ.

ولمافی الھدایۃ:(۵۹۷/۲،کتاب اللقطۃ،طبع رحمانیہ)

رای الملتقط یعرفھاالی ان یغلب علیٰ ظنہ ان صاحبھا لا یطلبھابذلک ثم یتصدق بہ

وان کانت اللقطة شيئا لايبقى عرفه حتى اذا خاف ان يفسد تصدق به.

ولما فی الهندية:(۲/۲۹۱،طبع رشيديه)

ان كان الملتقط محتاجا فله ان يصرف اللقطه الى نفسه بعد التعريف كذا فى المحيط وان كان الملتقط غنيا لا يصرفها الى نفسه بل يتصدق على اجنبى او الوالديه او ولده او زوجته اذا كانوا فقراء كذا فى الكافى.

ولما فی التخريج لاحاديث الهداية:(۲/۵۹۷،طبع رحمانيه)

عن ابى هريرة ان النبى ﷺ سئل عن اللقطه فقال لا تحل اللقطة فمن التقط شيئا فليعرفه سنة فان جاء صاحبه فليرده اليه وان لم يأت فليتصدق به فان جاء فليخيره بين الاجر وبين الذى له.

الجواب صحیح:عبدالرحمٰن عفااللہ عنہ | واللہ اعلم بالصواب:محمد زبیر اکرام

۱۳ ربیع الاول ۱۴۳۱ھ | فتویٰ نمبر:۲۵۱۹

﴿لقطہ پر خرچہ کرنے سے مطالبہ کا حق حاصل ہے﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ سے متعلق کہ ایک آدمی صحرا میں رہتا تھا ایک دن اس کے گھر میں کہیں سے بھینس آگئی، اس نے اس کو باندھ لیا اور شہر میں جا کر اعلان بھی کروایا کہ اس رنگ کی بھینس ملی ہے جس کسی کی ہو آکر لے جائے، چنانچہ تین دن کے بعد مالک آیا اور بھینس لے لی لیکن بھینس پکڑنے والے کا مطالبہ تھا کہ تین دن میں نے اس کو جو چارہ وغیرہ کھلایا ہے اس کا خرچہ دے دو تو شرعاً کیا اس آدمی کا مطالبہ درست ہے اور مالک کے ذمے خرچہ ادا کرنا ضروری ہے؟ مستفتی:عبدالغفار تلہ گنگ

﴿جواب﴾ جانور یا اس طرح کی کوئی چیز ضائع ہونے کے اندیشے سے بغرض حفاظت اپنے قبضہ میں اگر کوئی لے لے تو اس کی رکھوالی کے سلسلہ میں جانور وغیرہ پر جو خرچ ہو رہا ہے شرعاً یہ تبرع ہے یعنی اس کا مطالبہ نہیں کیا جا سکتا، البتہ باقاعدہ قاضی حکم دے دے کہ اس پر خرچہ کرتے رہو جب اس کا مالک ملیگا تو اس سے وصول کر لینا تو ایسی صورت میں وصول کرنے کا حق حاصل ہوتا ہے، مذکورہ صورت میں قاضی نے ایسا کوئی حکم چونکہ نہیں دیا اس لیے خرچ کرنے والے کو مطالبہ کا حق حاصل نہیں ہے تاہم مالک دیدے تو بہتر ہے اور اچھے اخلاق کا تقاضا تو یہی ہے کہ وہ شخص چاہے تقاضا نہ کرتا تب بھی دیدیتا۔

لما فی التنوير والدر:(۲/۲۸۱،طبع:سعيد)

(وهو فى الانفاق على اللقيط واللقطة متبرع) لقصور ولايته (الا اذا قال له قاض انفق

لترجع)فلو لم يذكر الرجوع لم يكن ديناً في الاصح

ولما في الرد المحتار:(۲/۲۸۱طبع: سعید)

(قوله الا اذا قال له قاض)ای بعد اقامة البينة من الملتقط كما شرطه في الاصل وصححه في الهداية لاحتمال ان يكون غصباً في يده والبينة لكشف الحال لا للقضاء فلا يشترط لها خصم وان قال لا بينة لي يقول له بين يدي ثقات انفق عليها ان كنت صادقا (قوله لم يكن ديناً في الاصح)لان الامر متردد بين الحسبة والرجوع فلا يكون ديناً بالشك

ولما في العالمگيرية:(۲/۲۰۹ قدیمی کتب خانه)

وما انفق الملتقط على اللقطة بغير اذن الحاكم فهو متبرع كذا في الكافي وباذن القاض يكون ديناً وصورة اذن القاضي ان يقول له انفق على ان ترجع فلو امره به ولم يكن له على ان ترجع لا يكون دينا وهوالاصح كذا في البحر ولا يامره بالانفاق عليها حتى يقيم البينة انها لقطة عنده في الصحيح وان عجز عن اقامة البينة يامره بالانفاق عليها متيدا بان يقول بين جماعة من الثقات ان هذا ادعى ان هذه لقطة ولا ادرى أهو صادق أم كاذب وطلب ان أ مره بالانفاق عليها فاشهدوا انى امرته بالانفاق عليها ان كان الامر كما يقول

ولما في قاضي خان:(۲/۲۸۶ قدیمی کتب خانه)

قال انفق عليها من مال نفسه فان فعل ذلک بامر القاضي يرجع على صاحبه وبغير امر القاضي لا يرجع۔

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: ضیاء الحق انکی

۳ رجب المرجب ۱۴۳۳ھ — فتویٰ نمبر: ۳۲۹۸

﴿کافر کے لقطہ کا حکم﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ اگر کسی کے پاس غیر مسلم کا مال رکھا ہوا ور کوشش کے باوجود اس غیر مسلم کا علم نہ ہو کہ وہ کہاں ہے تا کہ وہ مال اس تک پہنچایا جائے، اب اس مال کا کیا حکم ہے؟ مستفتی: محمد ظہیر مسجد ابوبکر ڈیفنس فیز ۲ کراچی

﴿جواب﴾ سب سے پہلے اس مال کے مالک یا اس کے ورثاء کا پتہ لگایا جائے اگر انتہائی کوشش کے باوجود مال کے مالک یا اس کے ورثاء کا پتہ نہ چلے تو پھر ایسی صورت میں اس کے مال کو بیت المال میں جمع کرادیا جائے، اسلامی حکومت نہ ہونے کی وجہ سے چونکہ بیت المال نہیں ہے، اس لئے اس غیر مسلم کے مال کو کسی رفاہی ادارے (ٹرسٹ) وغیرہ میں جمع کرادیا جائے جو کہ انسانیت کی خدمت کیلئے کام کر رہا ہو۔

لمافی الهندية:(۲/ ۲۹۰ مطبع رشيديه)

كل لقطة يعلم انها كانت لذمي لاينبغي ان يتصدق ولكن يصرف الى بيت المال لنوائب المسلمين كذافي السراجية.

ولمافي التنوير مع الدر:(۲/ ۲۷۹ مطبع ايچ ايم سعيد)

(فينتفع)الرافع(بها لوفقيرا...... الااذاعرف انها لذمي فانها توضع في بيت المال)

وفي الشامية:(قوله توضع في بيت المال)للنوائب بحر ط.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: عدنان خدابخش

۱۱ ربیع الثانی ۱۴۳۱ھ — فتویٰ نمبر: ۲۵۸۰

﴿کتاب البیوع﴾

﴿اندازے سے لینا دینا جائز ہے بشرطیکہ وزن کا عقد میں ذکر نہ ہو﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک آدمی دوکاندار کے پاس آتا ہے کہ 200 روپے کا آٹا دیدو، دوکاندار اندازے سے آٹا اٹھا کر دیتا ہے کہ یہ 200 کا ہے اور گاہک اس کو لے جاتا ہے، غرض سوال یہ ہے کہ کیا اس طرح بغیر تولے اندازے کے ساتھ بیچنا جائز ہے یا نہیں؟ مستفتی: مولوی نور محمد عبد الخیل ڈیرہ اسماعیل خان

﴿جواب﴾ خریدار نے آٹے کا خاص وزن یا مقدار بول کر دینے کو اگر کہا نہیں ہے تو اندازے سے لینا دینا جائز ہے۔

لما فی الهداية:(۳/۲۱ طبع :رحمانية لاهور)

قال: والاعواض المشار اليها لا يحتاج الى معرفة مقدارها فى جواز البيع لان بالاشارة كفاية فى التعريف وجهالة الوصف فيه لاتفضى الى المنازعة .

ولما فيها ايضاً ــــ

قال ويجوز بيع الطعام والحبوب مكايلةً ومجازفة ، وهذا اذا باعه بخلاف جنسه لقوله عليه السلام اذا اختلف النوعان فبيعوا كيف شئتم بعد أن يكون يداً بيدٍ.

ولما فى الشامى:(۴/۲۵۰، طبع :سعيد كراچى)

قال فى البحر: وقوله غيرمشار اليه قيد فيهما لان المشار اليه مبيعاً كان أو ثمناً لايحتاج الى معرفة قدره و وصفه ، فلوقال بعتُك هذه الصبرة من الحنطة أو هذه الكورجة من الارز والشاشات و هى مجهولة العدد بهذه الدراهم التى فى يدك وهى مرئية فتقبل جاز ولزم ،لان الباقى جهالة الوصف يعنى القدر وهولا يضرّ اذ لا يمنع من التسليم والتسلم.

الجواب صحیح: مفتی عبد الرحمٰن عفا اللہ عنہ

واللہ اعلم بالصواب: محمد ابرار غفرلہ ولوالدیہ

۵ جمادی الثانی ۱۴۳۳ھ

فتویٰ نمبر: ۲۷۶۶

﴿ادھار پر عام قیمت سے زیادہ پر بیچنا جائز ہے﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علمائے کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میں جیولری کا کام کرتا ہوں، سونا نقد بھی فروخت کرتا ہوں اور ادھار پر بھی، ادھار کی صورت یہ ہوتی ہے کہ گاہک اگر پندرہ دن کی ادھار پر خریدتا ہے تو اس کو اصل قیمت سے تین ہزار سے زیادہ پر فروخت کرتے ہیں

اور اگر ایک مہینہ کے ادھار پر خریدتا ہے تو پھر اصل قیمت سے چھ ہزار سے زیادہ پر فروخت کرتے ہیں، تو کیا یہ جائز ہے یا نہیں؟ نیز اگر پندرہ دن یا مہینہ پر چند دن گذر بھی جائے تو اس پر مزید کوئی اضافی (سود) پیسے نہیں لیے جاتے۔ مستفتی: عبدالرؤف پنجاب

﴿جواب﴾ اس مسئلے میں تفصیل یہ ہے کہ اگر معاملہ کرتے وقت کوئی قیمت متعین نہ کرے بلکہ یوں کہے کہ اگر پندرہ دن کے ادھار پر لوگے تو تین ہزار کے اضافی قیمت پر ملے گا اور اگر مہینہ کے ادھار پر لوگے تو چھ ہزار اصل قیمت سے زیادتی پر تو یہ صورت جائز نہیں ہے بوجہ جہالت ثمن کے، اور اگر اس طرح معاملہ نہ کرے بلکہ پہلے سے یہ معلوم کر کے کہ یہ شخص ادھار لے گا اور پھر قیمت میں بنسبت نقد کے کچھ بڑھا دے تو یہ جائز ہے بشرطیکہ عوضین میں سے کسی ایک پر مجلس عقد میں قبضہ ہو جائے۔

کسی چیز کو نقد بیچنے پر کم قیمت لینا اور ادھار بیچنے پر زیادہ قیمت لینا اس وقت جائز ہے جب معاملہ کرتے وقت ایک ہی بات ہو اور قیمت بالکل متعین کر لی جائے اور ادائیگی کی مدت بھی متعین کر لی جائے، اور اگر سونے چاندی کو کاغذی نوٹ کے ذریعے ادھار پر دیا جا رہا ہو تو اس میں یہ شرط ہے کہ عوضین میں سے کسی ایک پر مجلس عقد میں قبضہ ہو جائے۔

لما فی جامع الترمذی:(کتاب البیوع قدیمی)

عن ابی هریرة رضی الله عنه قال:نهی رسول الله ﷺ عن بیعتین فی بیعة۔حدیث ابی هریرة حدیث حسن صحیح،والعمل علی هذا عند اهل العلم،وقد فسر بعض اهل العلم قالوا:بیعتین فی بیعة ان یقول ابیعک هذا الثوب بنقد بعشرة ونسیئة بعشرین،ولا یفارقه علی احد البیعتین،فاذا فارقه علی احد هما فلا بأس اذا کانت العُقدة علی واحد منهما ،

ولما فی المبسوط للسرخسی:(۸۰۷/۳،کتاب البیوع باب بیوع الفاسدة)

واذا عقد العقد علی انه الی اجل کذا بکذا وبالنقد بکذا او قال الی شهر بکذا او الی شهرین بکذا فهو فاسد لانه لم یعاطه علی ثمن معلوم،ونهی النبی ﷺ عن شرطین فی بیع وهذا هو تفسیر الشرطین فی بیع، ومطلق النهی یوجب الفساد فی العقود الشرعیة وهذا اذا افترقا علی هذا ،فان کان یتراضیان بینهما ولم یفترقا حتی قاطعه علی ثمن معلوم واتما العقد علیه فهو جائز لانهما ما افترقا الا بعد تمام شرط صحة العقد.

ولما فی الشامی:(۱۸۰/۵،باب الربوا طبع سعید)

سئل الحانوتی عن بیع الذهب بالفلوس نسیئة،فاجاب بانه یجوز اذا قبض أحد البدلین.

ولما فی المبسوط للسرخسی:(۲۳/۱۴،باب البیع)وبیع الفلوس بالدراھم لیس بصرف

ولما فی البزازیۃ:(۲۱۱/۱،طبع قدیمی)

ولو اشتری مائة فلوس بدرھم یکفی التقابض من أحد الجانبین۔

ولما فی رد المختار :(۱۴۲/۵،طبع سعید)

ویزاد فی الثمن لأجله اذا ذکر الأجل بمقابلة زیادة الثمن۔

ولما فی بحوث فی قضایا فقھیه معاصرة ص۱۲۔

أما الائمه الاربعة وجمھور الفقھاء والمحدثین فقدأجاروا البیع المؤجل بأکثر من سعر النقد بشرط أن یبعث العاقدان بأنه بیع مؤجل بأجل معلوم،وبثمن متفق علیه عند العقد،فأما اذا قال البائع:أبیعک نقدأ بکذا ونسیئة بکذا،وافترقا علی ذلک،دون أن یتفقا علی تحدید واحد من السعرین،فان مثل ھذا البیع لایجوز،ولکن اذا عین العاقدان أحد الشقین فی مجلس العقد،فالبیع جائز۔

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ
واللہ اعلم بالصواب: محمد تنویر عفا اللہ عنہ

یکم جمادی الاولیٰ ۱۴۳۴ھ
فتوی نمبر: ۳۷۱۷

﴿خریدار کے قبضے میں مبیع کا نقصان ہوجائے تو خود ذمہ دار ہے﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علمائے کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میں نے قسطوں پر ایک ڈالسن خریدی اور ابھی قسطوں کی ادائیگی مکمل نہیں ہوئی کہ ڈالسن مجھ سے دیوار کے ساتھ لگ گئی اور اس کو کافی نقصان پہنچ گیا اب یہ نقصان فروخت کرنے والے پر آئے گا یا مجھ پر؟

﴿جواب﴾ بیع چاہے نقد رقم سے ہو یا قسطوں کے ساتھ ایجاب وقبول کر لینے کے بعد بیع تام ہوجاتی ہے اور مبیع مشتری کی ملکیت میں داخل ہوجاتی ہے،اس کے بعد مبیعہ کو جو بھی نقصان پہنچے گا وہ مشتری (خریدار) پر ہوگا فروخت کرنے والے پر نہیں ،لہٰذا صورت مسئولہ میں جب آپ نے ڈالسن پر قبضہ کرلیا تو اب آپ اس کے مالک بن گئے اس کے بعد جو بھی نقصان اس کو پہنچے گا وہ آپ کے ذمہ ہوگا فروخت کنندہ پر نہیں ہوگا۔

لما فی الھدایه:(۲۰/۳، کتاب البیوع طبع رحمانیه)

واذا حصل الایجاب والقبول لزم البیع ولا خیار لواحد منھما الا من عیب او عدم رؤیة۔

ولما فی شرح المجلة:(۲۲۳/۲،۲۲۴، الفصل الخامس المادة،۲۹۳،۲۹۲)

المبیع اذا ھلک فی ید البائع قبل ان یقبضه المشتری یکون من مال البائع ولاشیء علی المشتری ،واذا ھلک المبیع بعد القبض ھلک من مال المشتری والا شیء علی البائع۔

ولما في الفقه الاسلامي وأدلته:(۵/۳۲۷۹،طبع رشيديه)

اذا هلك بعض المبيع بعد القبض:فان كان الهلاك بآفة سماوية أو بفعل المشترى أوالمبيع نفسه أو بفعل اجنبى فالهلاك على المشترى.

ولما في الهدايه:(۳/۳۲،طبع رحمانيه)

فان هلك في يده هلك بالثمن،وكذا اذا دخله عيب بخلاف اذا كان الخيار للبائع.

الجواب صحیح:عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب:محمد تنویر عفا اللہ عنہ

۳ جمادی الاولیٰ ۱۴۳۴ھ — فتویٰ نمبر:۳۷۲۱

﴿زمین کی بیع میں درخت تبعاً داخل ہوتے ہیں﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علمائے کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میں نے ایک آدمی سے زمین خریدی اس میں درخت بھی تھے اور خریدنے کے وقت اس کا کوئی تذکرہ نہیں ہوا تھا ،اب وہ درخت میں نے کاٹ لیئے پھر ۲ دو مہینے بعد وہ شخص آیا اور کہنے لگا کہ میں نے تو آپ پر صرف زمین فروخت کی تھی درخت نہیں اور مزید ۱۰ دس ہزار روپے کا مطالبہ کر رہا ہے تو کیا اس آدمی کا یہ مطالبہ کرنا درست ہے یا نہیں؟ مستفتی:وقار احمد مردان

﴿جواب﴾ زمین کے فروخت کرنے کی صورت میں درخت خود بخود عقد بیع میں داخل ہوجاتے ہیں اگرچہ اس کا کوئی تذکرہ نہیں ہوا ہو،لہذا مذکورہ صورت میں اس آدمی کا مطالبہ کرنا درست نہیں ہے ہاں اگر عقد کرتے وقت درختوں کو مستثنیٰ کرتے تو پھر یہ بائع کی ملکیت ہوتی اور مطالبہ کرنا درست ہوتا۔

لما في البحر الرائق:(۵/۲۹۲،كتاب البيع، طبع سعيد)

ويدخل البناء والشجر في بيع الارض بلا ذكر لكونه متصلاً بها للقرار فيدخل تبعاً

ولما في الهنديه:(۳/۳۳،طبع رشيديه)

اذا باع ارضاً او كرماً ولم يدخل الحقوق والاالمرافق فانه يدخل تحت البيع ماركب فيها للتابيد نحو الغرس والاشجار والابنية ثم ان محمدا رحمه الله تعالى ذكر ان الشجر يدخل في بيع الارضين من غير ذكر ولم يفصل بين المثمرة وغير المثمرة ولا بين الصغيرة والكبيرة والاصح ان الكل يدخل من غير ذكر كذا في الفتاوى الصغرى سواء كانت للحطب او غيره وهو الصحيح كذا في الخلاصة.

ولما فی الهدایة:(۴/۲۶، کتاب البیوع)

ومن باع ارضا دخل ما فیها من النخل والشجر وان لم یسمه لانه متصل به للقرار فاشبه البناء

الجواب صحیح: عبد الرحمٰن عفا اللہ عنہ　　　واللہ اعلم بالصواب: محمد تنویر عفا اللہ عنہ

۲۰ جمادی الثانیہ ۱۴۳۴ھ　　　فتوی نمبر: ۲۸۰۰

﴿منقولہ چیز قبضے سے قبل فروخت کرنا جائز نہیں ہے﴾

﴿سوال﴾ خالد ایک گاڑی بیس ہزار روپے میں بک کراتا ہے اور وہ گاڑی اس کو چھ مہینے پہلے بک کرائی ہے، خالد نے گاڑی ابھی نکالی نہیں ہے، کیا خالد مذکورہ گاڑی کو نکالے بغیر منافع پر رسید فروخت کرسکتا ہے یا پورے پیسے جمع کر کے پھر گاڑی کو بیچ سکتا ہے؟　　　مستفتی: محمد جمیل

﴿جواب﴾ جو چیز خریدی جائے جب تک اس کو وصول کر کے اس پر قبضہ نہ کرلیا جائے اس کا آگے فروخت کرنا جائز نہیں، لہٰذا مذکورہ صورت میں خالد جب تک گاڑی پر قبضہ نہ کرلے اس سے پہلے رسید فروخت نہیں کرسکتا، اس نے پورے پیسے جمع کئے ہوں یا نہیں۔

لما فی الهدایة:(۳/۷۰، طبع رحمانیه)

فصل ومن اشتری شیئا مما ینقل ویحوّل لم یجز له بیعه حتی یقبضه لأنه ﷺ نهیٰ عن بیع مالم یقبض ولأن فیه غرر انفساخ العقد علیٰ اعتبار الهلاك. كذافی البحر.

الجواب صحیح: عبد الرحمٰن عفا اللہ عنہ　　　واللہ اعلم: صلاح الدین ڈیروی

۲۴ ربیع الثانی ۱۴۲۷ھ　　　فتوی نمبر: ۱۸۸

﴿ادائیگی رقم کے بعد بیچی ہوئی چیز کو کم قیمت پر خریدنا جائز ہے﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں مفتیان کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میں نے زید سے ایک جوتا تیس روپے کا خریدا اور پھر میں نے اسے عمرو کو پچاس روپے کے عوض بیچ دیا پھر میں نے اسکو عمرو سے واپس تیس روپے کا خریدا، تینوں صورتوں میں رقم خریداری کے وقت ہی ادا کردی، کیا اسطرح خرید وفروخت کرنا جبکہ رقم کی ادائیگی ساتھ ساتھ ہو جائز ہے؟　مستفتی: محمد حنیف کراچی

﴿جواب﴾ سوال میں ذکر کردہ صورت جائز ہے کیونکہ اسمیں تینوں معاملے الگ الگ ہوئے ہیں اور ہر ایک میں رقم کی ادائیگی بھی ہوئی ہے، البتہ اگر رقم ادا نہ کی ہوتی تو پھر بیچی ہوئی چیز کو قیمت فروخت سے کم پر اسی شخص سے خریدنا جائز نہ ہوتا۔

لمافی التنویر مع الدر: (۷/۲۶۷-۲۶۸، باب البیع الفاسد، طبع امدادیہ)

(و) فسد (شراء ما باع بنفسه أو بوكيله بالأقل) من قدر الثمن الأول (قبل نقد) كل (الثمن) الأول. (فان اختلف) جنس الثمن أو تعيب المبيع (جاز مطلقا) كما لو شراه بأزيد أو بعد النقد.

وفي الشامية: قوله: (وفسد شراء ما باع الخ) اي لو باع شيئاً وقبضه المشتري ولم يقبض البائع الثمن فاشتراه بأقل من الثمن الأول لا يجوز زيلعي ... والحاصل أن نقد كل الثمن شرط لصحة الشراء لا للفساد، لأنه يفسد قبل نقد الكل أو البعض، فتأمل.

ولما في الهندية: (۳/۱۳۲، طبع رشیدیہ)

وفي فتاوى العتابية لو قبض الثمن ثم اشتراه بأقل جاز.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم: عبدالرحمٰن غفرلہ ولوالدیہ

۱۲ ربیع الاول ۱۴۳۰ھ — فتوی نمبر: ۲۰۲۸

جو چیز اپنے پاس موجود نہ ہو اس کو فروخت کرنے کا حکم

سوال: کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ہم چمڑے کا کاروبار کرتے ہیں اور اس سے اشیاء تیار کرتے ہیں، چمڑے کی صفائی کے دوران جو کچرا نکلتا ہے وہ بھی قابل استعمال ہوتا ہے اور اس کی بھی خرید وفروخت ہوتی ہے، ہم اس غرض سے کہ جگہ صاف رہے کچرا ایک سال کے لئے ایڈوانس اندازے سے فروخت کردیتے ہیں۔

اس کی صورت یہ ہوتی ہے کہ مثلاً ہم ایک شخص سے یہ معاہدہ کرتے ہیں کہ دس ہزار روپے کے عوض وہ ہم سے سال بھر کچرا اٹھاتا رہے اور ہم یہ رقم معاملہ کے وقت وصول کرلیتے ہیں، واضح رہے کہ کچرا کبھی کم نکلتا ہے اور کبھی زیادہ، پوچھنا یہ ہے کہ ہمارا اس طریقہ سے معاملہ کرنا شرعاً درست ہے یا نہیں؟ اگر درست نہیں تو اس کی صحیح صورت کیا ہوسکتی ہے؟ مستفتی: فیصل جنید کراچی

جواب: خرید وفروخت کا معاملہ صحیح ہونے کی شرط یہ ہے کہ جو چیز فروخت ہورہی ہے وہ بیچنے والے کے پاس موجود ہو یا کم از کم مارکیٹ میں موجود ہو تاکہ خود بیچنے والے کے پاس اگر نہ ہو تو دوسری جگہ سے لے کر خریدار کو دے سکے، اس کے علاوہ مقدار اور وقت ادائیگی کی تعیین بھی ضروری ہے، لہٰذا آپ کے اس معاملہ کی صحیح صورت یہ ہوسکتی ہے کہ دونوں شرائط کا لحاظ کرتے ہوئے کچرے کی مقدار اور سپردگی کی مدت بھی طے کرلیا کریں۔

مثلاً اس طرح سودا کریں کہ ایک مہینے کے اندر کم از کم اتنا کچرا خریدنے والے کو ملے گا اور

بعد میں اگرچہ زیادہ نکلے تو وہ اس کو ہبہ کردیا کریں تو یہ معاملہ بیع سلم میں داخل ہوکر درست سمجھا جائیگا۔

لمافی الهداية:(۴/۱۰۰،طبع رحمانيه)

ولا يصح السلم عند أبي حنيفة الا بسبع شرائط جنس معلوم..... ونوع معلوم..... وصفة معلومة ..... ومقدار معلوم ..... واجل معلوم..... ومعرفة مقدار رأس المال..... وتسمية المكان.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: محمد کاشف عزیز غفرلہ

۳۰ ربیع الاول ۱۴۳۰ھ — فتویٰ نمبر: ۲۱۰۷

﴿جواز التصرف في المبيع قبل القبض﴾

﴿قبضہ سے پہلے مبیع میں تصرف کرنا جائز ہے﴾

﴿سوال﴾ انا نشترى السيارة المعيوبة بالثمن المؤجل فنرممها ونزينها ثم نبيعها ونعطى من هذا الثمن ما كان علينا من الدين يعنى للبائع الاول هل يجوز هذه المعاملة ام لا؟ بينوا توجروا. مستفتيه ام زينت الله

﴿جواب﴾ نعم يجوز هذه المعاملة لاستجماع اركانها وشرائطها فانه لما رضى البائع لتأجيل الثمن وقبضتم المبيع فلكم الاختيار في بيعه والتصرف فيه وعليكم اداء ثمنه عند حلول الاجل والله اعلم .

لمافي قوله تعالى:(سورة البقرة، آيت ۲۷۵)وأحل الله البيع وحرم الربوا..... الأية.

ولمافي الفقه الاسلامي:(۵/۳۸۵،طبع رشيديه)فان كان مؤجلا فلا يثبت حق الحبس لانه سقط بالتأجيل.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: محمد غفرلہ ولوالدیہ

۷ ربیع الاول ۱۴۳۰ھ — فتویٰ نمبر:

﴿کانے کی بیع کے ایک صورت کا حکم﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علمائے کرام اور مفتیان عظام درج ذیل مسئلہ کے بارے میں کہ گھاس، کانے وغیرہ کی گٹھڑی قیمت طے کرکے خریدنا جبکہ ان میں کافی فرق ہوتا ہے اور انکی مقدار معلوم نہیں ہوتی اسی طرح مٹی، پتھر اور ریت کا ٹیلہ اور ٹرالی منگوانا معلوم قیمت پر کیسا ہے؟

﴿جواب﴾ کانے، نرکل، گھاس وغیرہ کے بنڈل اور گٹھوں میں اگرچہ کچھ نہ کچھ فرق

ہوتا ہے لیکن اس قدر تفاوت اور فرق عرف میں برداشت کیا جاتا ہے یعنی لوگ اس سے تسامح برتتے ہیں آپس میں ناراضگی اور جھگڑے کا کوئی اندیشہ نہیں ہوتا لہٰذا یہ جائز معاملہ ہے اسی طرح ریت، پتھر، اور مٹی کے ٹرالے وغیرہ منگوانے کا بھی یہی حکم ہے۔

(لما فی تنویر مع الدر: ۲۱۱/۵، ۲۱۲، طبع ایچ ایم سعید)

(و) لا فی (حطب) بالحزم ورطبة بالجرز الا اذا ضبط بما لایؤدی الی نزاع وجاز وزنا فتح

(ولما فی الرد: ۲۱۲/۵ طبع ایچ ایم سعید)

(قوله الا اذا ضبط) بأن بین الحبل الذی یشد به الحطب والرطبة وبین طوله وضبط ذلک بحیث لایؤدی الی النزاع. زیلعی

(ولما فی العالمگیریة المعروف بالهندیة: ۱۸۵/۳ طبع رشیدیه)

واذا أسلم فی الجذوع ضربا معلوما وسمی طوله وغلظه و أجله والمکان الذی یوفیه فیه فهو جائز وکذلک الساج وصنوف العیدان والخشب والقصب واعلام الغلظ فی القصب باعلام ما یشد به الطن بشبر أوذراع أونحو ذلک فعند ذلک لا تجری المنازعة بینهما کذافی المبسوط.

(ولما فی البنایة: ۸۱/۱۱، طبع، حقانیة ملتان)

ولا فی الحطب حزما ولا فی الرطبة جرزا للتفاوت الا اذا عرف ذلک بأن یبین له طول ما یشد به الحزمة أنه شبر أو ذراع فحینئذیجوز اذاکان علی وجه لا یتفاوت.

(ولما فی فتح القدیر: ۲۰/۷، طبع، رشیدیه)

قوله: ولا فی الحطب حزما) أو أ، قارا لأن هذا مجهول لایعرف طوله وعرضه وغلظه فان عرف ذلک فهوجائز کذافی المبسوط.

(ولمافی الهدایة: ۹۸/۳، طبع رحمانیه)

ولا فی الجلود عددا ولافی الحطب حزماولا فی الرطبة جرزاللتفاوت الا اذا عرف ذلک بأن یبین له طول مایشد به الحزمة أنه شبر أو ذراع فحینئذیجوز اذا کان علی وجه لا یتفاوت.

الجواب صحیح: مفتی عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: محمد سلمان غفرلہ ولوالدیہ

۸ صفر الخیر ۱۴۳۵ھ — فتویٰ نمبر ۳۸۸۲

﴿درخت کے پتوں کو بمع شاخوں فروخت کرنا﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ہمارے گاؤں میں لوگ درختوں کے پتوں کی خرید وفروخت کرتے ہیں، طریقہ کار یہ ہوتا ہے کہ بائع مشتری کو کہتا ہے کہ تم اس سال اس درخت کے پتے پانچ سو روپے میں لے لو، ابھی پتوں کی نشوونما مکمل نہیں ہوتی

جب پتوں کی نشو ونما مکمل ہو جاتی ہے تو مشتری بوقت ضرورت بقدر ضرورت وقتاً فوقتاً کاٹ کر لے جاتا ہے کیونکہ تمام پتے ایک ہی مرتبہ کاٹ کر نہیں لئے جاسکتے اگر ایسا کیا جائے تو پتے خشک ہو کر بے کار ہو جاتے ہیں اور جانوروں کے کھانے کے قابل نہیں رہتے بعض مرتبہ ایسا بھی ہوتا ہے کہ موسم کی خرابی یعنی بارشیں وغیرہ کم ہونے کی وجہ سے پتے اس مقدار سے کم آتے ہیں جتنی مقدار کا بائع اور مشتری اندازہ لگا کر قیمت طے کرتے ہیں اور ظاہر ہے کہ مشتری اس کو اپنا نقصان سمجھتا ہے لیکن بائع عام طور پر اس قیمت میں کمی نہیں کرتا اس تفصیل کے بعد مندرجہ ذیل سوالوں کے بارے میں جواب مطلوب ہے:

(۱) کیا یہ طریقہ بیع کا جائز ہے؟ (۲) موسم کی خرابی کی وجہ سے پتے کم نکلنے کی صورت میں مشتری کو قیمت میں کمی کا اختیار ہوگا؟ (۳) اگر مذکورہ طریقہ درست نہیں تو متبادل جائز اور صحیح صورت کیا ہوگی؟ براہ کرم مسئلے کا حل بیان فرما کر ثواب دارین حاصل کریں۔

(نوٹ) پتوں کے کاٹنے کا خاص موسم ہوتا ہے اور چھوٹی چھوٹی شاخوں کے ساتھ کاٹے جاتے ہیں۔ بینوا توجروا۔ مستفتی: نعمان احمد ایبٹ آباد

﴿الجواب﴾ پتوں کی فروخت کا مذکورہ طریقہ اصل مسئلہ کی رو سے صحیح نہیں ہے، اس لئے کہ اس صورت میں بائع اور مشتری کے درمیان جھگڑے کا اندیشہ ہوتا ہے لیکن چونکہ آجکل عام طور پر اسطرح کی بیوعات ہوتی رہتی ہیں اور لوگوں میں کوئی جھگڑا وغیرہ بھی نہیں ہوتا، لہٰذا ضرورت اور عموم بلوی کی وجہ سے متاخرین نے جس طرح پھلوں کی باغات میں پکنے سے پہلے فروخت کے جواز کا فتوی دیا ہے، اس لئے ضرورت کیوجہ سے پتوں کی بیع کی مذکورہ صورت بھی جائز معلوم ہو رہی ہے۔

لمافی تکملة فتح الملهم: (۲۹۲/۱، طبع دار العلوم کراچی)

ان تباع سائر ثمار الشجر او البستان فی حین ظهر بعضها ولم یظهر بعضها وفیه خلاف بین مشائخنا الحنفیة فظاهر المذهب انه لایجوز ایضا ولکن افتی شمس الائمة الحلوانی رحمه الله بانه لو کان الخارج اکثر جاز البیع فی الجمیع وبه افتی الامام الفضلی بل یظهر من عبارته انه لایشترط کون الخارج اکثر بل یجعل الموجود اصلا فی البیع ومایحدث بعد ذلک تبعا له ویقول استحسن فیه لتعامل الناس فانهم تعاملوا بیع ثمار الکرم بهذه الصفه، ولهم فی ذلک عادة ظاهرة وفی نزع الناس من عادتهم حرج حکاه ابن الهمام فی الفتح (۱۰۵/۵) ثم قال وقد رایت روایة فی نحو هذا عن محمد رحمه الله وهو بیع الورد علی الاشجار فان الورد متلاحق ثم جوز البیع فی الکل بهذا الطریق

وھوقول مالک رحمہ اللہ. والحاصل ان ھذہ الصورۃ وان کانت غیرجائزۃفی اصل المذھب غیران فیھاسعۃ عندعموم البلوی وفی ھذہ الصورۃ یقول العلامۃ ابن عابدین الشامی رحمہ اللہ ولایخفی تحقق الضرورت فی زماننالاسیمافی دمشق الشام کثیرۃ الاشجاروالاثمارفانہ لغلبۃ الجھل علی الناس لایمکن التزامھم باالتخلص باحدالطرق المذکورہ وفی نزعھم عن عادتھم حرج کماعلمت ویلزم تحریم اکل الثمارفی ھذہ البلدان اذلاتباع الاکذلک والنبی ﷺانمارخص فی السلم للضرورۃ مع انہ بیع المعدوم فحیث تحققت الضرورۃ ھناایضاامکن الحاقہ بالسلم بطریق الدلالۃ فلم یکن مصادماللنص فلذاجعلوہ من الاستحسان.]

ولمافی الھندیۃ:(۱۰۷/۳،طبع رشیدیہ)

اشتری اوراق التوت ولم یبین موضع القطع لکنہ معلوم عرفاصح ولوترک الاغصان فلہ ان یقطعھافی السنۃ الثانیۃ ولوترکھامدۃ ثم اراد قطعھافلہ ذلک ان لم یضرذلک بالشجرہ کذافی البحرالرائق......قال الفقیہ ابوجعفران اشتری الاوراق باغصانھاوبین موضع القطع لایکون للمشتری ان یردالبیع بحکم ذھاب الوقت ویجبرعلی جزھاالاان یکون قطع الاغصان یضربالشجرۃ فحینئذیخیرالبائع ان شاء فسخ البیع وان شاء رضی بالقطع.

اوردوران سال پتے اس مقدار سے اگرکم نکل آئیں جس مقدارکااندازہ لگاکر بائع اور مشتری نے قیمت طے کی تھی تو بعد میں مشتری کوخیار مغبون کااگرچہ متاخرین نے صحیح ہونے کا فتوی دیا ہے لیکن اختیار تب ہے جب مشتری کوغبن بائع کی طرف سے ہوجبکہ یہاں مشتری بیع کرتا ہے تو یہ پوری صورت حال اسکے سامنے ہے اسکے باوجود بیع کرتا ہے،لہٰذا آنیوالے ممکنہ نقصان اورخسارے کوبرداشت کرنے پرپہلے سے گویاراضی ہے مزید یہ کہ مذکورہ صورت میں غبن بائع کی طرف سے بھی نہیں ہے،اس لئے مشتری قیمت میں کمی کامطالبہ نہیں کرسکتا۔

لمافی تکملۃ فتح الملھم:(۳۸۰/۱،طبع دارالعلوم کراچی)

والفتی المتاخرون من الحنفیۃ باثبات الخیارلمن غبن فاحشابتغریرالبائع فامااذالم یغرہ البائع فلاخیارلہ.

الجواب صحیح :عبدالرحمٰن عفااللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب :نثارمحمودکوہائی شکردرہ

۲۹محرم الحرام ۱۴۳۰ھ — فتوی نمبر:۱۹۳۸

﴿بیع مرابحہ میں خیانت ظاہرہوجائے تو واپس لوٹانے کااختیار ہے﴾

﴿سوال﴾ کیافرماتے ہیں علماء کرام کہ ایک شخص نے دکاندار سے بوٹ خریدنا چاہا،دکاندار

نے کہا کہ یہ بوٹ ہم نے خود بارہ سو کا لیا ہے اور آپ سے صرف سو روپے منافع لیتا ہوں، اس نے بوٹ خریدا، بعد میں معلوم ہوا کہ دکاندار نے بارہ سو کا نہیں ہزار روپے کا خریدا تھا اور تین سو روپے منافع وصول کیا ہے تو کیا شرعاً دکاندار کو بوٹ واپس کیا جا سکتا ہے یا نہیں؟

﴿جواب﴾ یہ بیع مرابحہ کی صورت ہے جس کا مدار امانت و دیانت پر ہوتا ہے، بیع مرابحہ میں ایسی خیانت ظاہر ہو جائے تو مشتری کو واپس لوٹانے کا اختیار ہوتا ہے بشرطیکہ مشتری کے پاس اس چیز میں کوئی خاص تبدیلی نہ آئی ہو، پیسہ کم کرنے کا اختیار نہیں ہوتا۔

لہٰذا بوٹ کے جوڑے میں استعمال کیوجہ سے کوئی خاص تبدیلی نہیں آئی ہو تو واپس کر سکتے ہیں اور اپنی پوری رقم لے سکتے ہیں۔

لمافی الهداية:(۷۵/۳،طبع رحمانيه)

فان اطلع المشترى على خيانة فى المرابحة فهو بالخيار عند أبى حنيفة رحمه الله ان شاء اخذه بجميع الثمن وان شاء تركه.

ولمافى الهندية:(۱۶۲/۳،طبع رشيديه)

وان خان فى المرابحة فهو بالخيار ان شاء اخذ بكل الثمن وان شاء تركه.

ولمافى الفقه الحنفى وادلته:(۵۲/۲،طبع دار الكلم الطيب)

فان علم بخيانة فى التولية اسقطها من الثمن لانه لو لم يسقط فى التولية لاتبقى تولية وفى المرابحة ان شاء اخذه بجميع الثمن وان شاء رده فلو هلك قبل ان يرده او حدث فيه ما يمنع الفسخ يلزمه جميع الثمن.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ　　　　واللہ اعلم بالصواب: حبیب الرحمٰن سواتی

۲۶ صفر المظفر ۱۴۳۰ھ　　　　فتویٰ نمبر: ۲۰۰۶

﴿ثمن اول معلوم نہ ہو تو بیع مرابحہ درست نہیں﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلے کے بارے میں کہ میرے ایک دوست نے بیل خریدا دوسرا شخص اس سے کہتا ہے کہ مجھے قیمت سے پانچ ہزار کی زیادتی پر فروخت کر دے، جبکہ اس دوسرے شخص کو بیل کی قیمت کا علم نہیں ہے، تو کیا اس طرح بیع کرنا جائز ہے؟

﴿جواب﴾ بیع کے وقت خریدار کو خریدی ہوئی چیز کی قیمت کا علم ہونا ضروری ہے، اور یہ حکم بیع مرابحہ میں زیادہ تاکید سے ہے، لہٰذا اس دوسرے شخص کو اسی مجلس میں بیل کی قیمت اگر معلوم

نہیں ہوئی تو یہ بیع شرعاً معتبر نہیں ہے۔

لما فی التنویر مع الدر:(۱۳۲/۵،طبع:سعید)

(ولی رجلا شيئا) ای باعه تولية (بما قام عليه او بما اشتراه) به (ولم يعلم المشترى بكم قام عليه فسد) البيع لجهالة الثمن (وكذا حكم المرابحة وخير) المشترى بين اخذه وتركه (لو علم فی مجلسه) والا بطل.

ولما فی الشامیہ:(۵۰۵/۴،طبع:سعید)

واما الثالث وهو شرائط الصحة.......... ومعلومية الثمن بما يرفع المنازعة.

ولما فی الهندیہ:(۳/۳،طبع:رشیدیہ)

منها ان يكون المبيع معلوما والثمن معلوما علما يمنع من المنازعة فبيع المجهول جهالة تفضى اليها غير صحيح.

ولما فی الهدایة:(۷۸/۳، طبع: رحمانیہ)

(ومن ولى رجلا شيئا بما قام عليه ولم يعلم المشترى بكم قام عليه فالبيع فاسد) لجهالة (فان اعلمه فی المجلس فهو بالخيار ان شاء اخذه وان شاء تركه) لان الفساد لم يتقرر فاذا حصل العلم فی المجلس جعل كابتداء العقد صار كتاخير القبول الى اخر المجلس

ولما فی الفتح القدیر:(۲۶۸/۶،طبع:رشیدیہ)

ومن ولى رجلا شيئا بما قام عليه ولم يعلم المشترى بكم قام عليه فالبيع فاسد لجهالة الثمن، فان اعلمه البائع، يعنی فی المجلس) ما قام به عليه (فهو بالخيار، ان شاء رد البيع وان شاء وقبل) لان الفساد، وان كان فی صلب العقد لكنه لم يتقرر) انما يتقرر بمضی المجلس ــــ (كتاخير القبول الى اخر المجلس) فانه يجوز ويتصل بالايجاب السابق اول المجلس كذا هذا يكون سكوته عن تعيين الثمن فی تحقق الفساد موقوفا الى اخره.

الجواب صحیح: مفتی عبدالرحمٰن عفا اللہ — واللہ اعلم بالصواب: ریحان اللہ دیروی

عنہ ۲۵ صفر الخیر ۱۴۳۴ھ — فتویٰ نمبر: ۳۵۵۰

﴿نسوار کا کاروبار کرنا جائز ہے﴾

﴿سوال﴾ نسوار کا کاروبار کرنا جائز ہے یا نہیں؟ مستفتی: قاری ارشد خندان سواتی

﴿جواب﴾ نسوار کا استعمال مناسب نہیں ہے لیکن بلاشبہ یہ کوئی نشہ آور چیز نہیں ہے، اس لئے اسکا کاروبار جائز ہے۔

لما فی التنویر مع الدر:(۴۵۴/۶،طبع سعید)

(وصح بيع غير الخمر) مما مر ومفاده صحة بيع الحشيشة والافيون.

وفی الشامیة:(قوله:وصح بیع غیر الخمر)ای عنده خلافا لهما فی البیع والضمان لکن الفتوی علی قوله فی البیع وعلی قولهما فی الضمان.

واللہ اعلم بالصواب: حبیب الرحمٰن سواتی — الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفااللہ عنہ

فتویٰ نمبر:۱۸۲۸ — ۶ محرم الحرام ۱۴۳۰ھ

﴿بچوں کے کھلونے بیچنا جائز ہے﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام کہ میں بچوں کے کھلونے وغیرہ بیچ کر اپنا گزارہ کرتا ہوں جن میں جاندار وغیرہ کی تصاویر بھی ہوتی ہیں، آیا ایسے کھلونے وغیرہ بیچنا جائز ہے یا نہیں؟

﴿جواب﴾ بچوں کے کھلونوں میں اگرچہ تصاویر ہوتی ہیں لیکن خرید وفروخت جائز ہے۔

لما فی الشامی:(۲۵۰/۱،طبع سعید)

(اشتری ثورا اوفرسا من خزف لاجل استئناس الصبی لایصح)ولا قیمة له(فلا یضمن متلفه وقیل بخلافه)یصح ویضمن قنیة،وفی أخر حظر المجتبیٰ عن ابی یوسف یجوز بیع اللعبة وان یلعب بها الصبیان اھ.

واللہ اعلم بالصواب: حبیب الرحمٰن سواتی — الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفااللہ عنہ

فتویٰ نمبر:۱۸۵۰ — ۱۷ محرم ۱۴۳۰ھ

﴿مبیع کا مقدار سے زائد ہونے کا حکم﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک شخص نے دو کنال زمین فروخت کی اور ہر کنال کی قیمت بھی متعین کرلی کہ فی کنال پچاس ہزار روپے کا ہے، بیع کے بعد مذکورہ زمین کی پیمائش کی گئی تو وہ متعین مقدار سے دو مرلے زیادہ نکلی، اس صورت میں زائد زمین مشتری کا حق ہے یا بائع کا؟ بینوا توجروا۔ مستفتی: جمال الدین

﴿جواب﴾ مذکورہ صورت میں متعین مقدار سے زائد زمین بائع کا حق ہے، البتہ مشتری کو یہ اختیار حاصل ہے کہ یا تو وہ اس زمین کو چھوڑ دے یا پھر مزید رقم ادا کرکے کل زمین لے لے لیکن بائع کو یہ حق حاصل نہیں ہے کہ وہ مشتری سے متعین مقدار کی رقم لے لے اور زائد زمین اپنے پاس رکھ لے۔

لما فی البحر الرائق:(۲۹۱/۵،طبع سعید)

(قوله ولو قال کل ذراع بکذا ونقص اخذ بحصتها أو ترك وان زاد أخذ كله كل ذراع بكذا أو

فسخ) لما قدمنا انه وان كان وصفا اذا أفرد بثمن صار أصلا وارتفع عن التبعية فنزل كل ذراع منزلة ثوب فاذا وجدها ناقصة خير لانه لو أخذها بكل الثمن لم يكن آخذا كل ذراع بدرهم ولو وجدها زائدة لم تسلم له لصيرورتها أصلا فخير بين أن يأخذ الزائد بحصته ، بين أن يفسخ لرفع الضرر عن التزام الزائد.

ولما في الهداية:(۳/۲۲،طبع رحمانيه)

ولو قال بعتكها على أنها مائة ذراع بمائة درهم كل ذراع بدرهم فوجدها ناقصة فالمشتري بالخيار ان شاء اخذها بحصتها من الثمن وان شاء ترك وان وجدها زائدة فهو بالخيار ان شاء اخذ الجميع كل ذراع بدرهم وان شاء فسخ البيع.

لانه ان حصل له الزيادة في الذرع تلزمه زيادة الثمن فكان نفعا يشوبه ضرر فيتخير وانما يلزم الزيادة لما بينا انه صار اصلا ولو اخذه بالاقل لم يكن اخذا بالمشروط.(ومثله في النهر الفائق:(۳/۳۵۱،طبع قديمى)

الجواب صحيح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم: صلاح الدین ڈیروی

۲۵ جمادی الاولی ۱۴۲۷ھ — فتوی نمبر: ۳۳۶

﴿ٹیکس کی وجہ سے قیمت میں زیادتی﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام کہ ہم کمپنی سے بیس لاکھ میں مثلاً گاڑی قسطوں پر لیتے ہیں پھر دوسرے کے ہاتھ پچیس لاکھ میں قسطوں پر فروخت کرتے ہیں، مہینے کے بعد کمپنی کہتی ہے کہ ہمارے اوپر ٹیکس مزید بڑھ گیا، یہ گاڑی اکیس لاکھ کی ہوگئی تو جس کو ہم نے پچیس لاکھ میں گاڑی دی ہے قسطوں پر آیا ہم اس کے لئے قیمت بڑھا سکتے ہیں؟ مستفتی: امان اللہ کنڈی

﴿جواب﴾ سودے کے موقع پر بائع اور خریدار کے درمیان جو قیمت طے ہو جاتی ہے بس وہی واجب الادا ہے، اس میں کمی بیشی کرنا دوسرے فریق کی مرضی کے بغیر جائز نہیں ہے۔

لہٰذا مذکورہ صورت میں کمپنی کے لئے یہ جائز نہیں ہے کہ وہ گاڑی کی قیمت میں اضافہ کر دے اسی طرح یہ خریدار اگر آگے کسی دوسرے شخص کو فروخت کر دیتا ہے تو وہ بھی از خود اس کی طے شدہ قیمت پر اضافہ نہیں کر سکتا۔

لما في الهداية:(۳/۲۰،طبع رحمانيه)

واذا حصل الايجاب والقبول لزم البيع ولا خيار لواحد منهما الا من عيب وعدم رؤية.

ولما في البحر الرائق:(۵/۲۵۸،طبع سعيد)

وأما شرط العقد فموافقة القبول للايجاب بان يقبل المشتري ما أوجبه البائع بما أوجبه

فان خالفه بان قبل غير ما أوجبه أو بعض ما أوجبه أو بغير ما أوجبه أو ببعض ما أوجبه لم ينعقد لتفرق الصفقة وانه لا يجوز الا في الشفعة بان باع عبدا وعقارا فطلب الشفيع أخذ العقار وحده فله ذلك وان تفرقت الصفقة على البائع..... الا فيما اذا كان الايجاب من المشتري فقبل البائع بانقص من الثمن أو كان من البائع فقبل المشتري بازيد انعقد فان قبل البائع الزيادة في المجلس جازت كما في التاتار خانية.

ولما في الهندية:(۲/۳،طبع رشيديه)

أما شرائط الانعقاد فانواع:منها في العاقد......ومنها في العقد وهو موافقة القبول للايجاب بان يقبل المشتري ما أوجبه البائع بما أوجبه فان خالفه بان قبل غير ما أوجبه أو بعض ما أوجبه أو بغير ما أوجبه أو ببعض ما أوجبه لم ينعقد الا فيما اذا كان الايجاب من المشتري فقبل البائع بانقص من الثمن أو كان من البائع فقبل المشتري بازيد انعقد فان قبل البائع الزيادة في المجلس جازت.وكذا في الرد على الدر:(۷/۱۲،طبع امداديه)

الجواب صحیح:عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم:صلاح الدین ڈیروی

۲۱ ربیع الاول ۱۴۲۷ھ — فتویٰ نمبر:۵۸

﴿زمین کے بدلے زمین کا سودا جائز ہے﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ زمین کے بدلے زمین کا سودا کرنا کیسا ہے کیا یہ صحیح ہے؟ از روئے شریعت اس کی وضاحت فرمائیں۔

﴿جواب﴾ زمین کے بدلے زمین کا سودا کرنا از روئے شریعت بالکل درست اور صحیح ہے۔اور دونوں کی زمین مقدار میں برابر ہونا بھی کوئی ضروری نہیں ہے اس لئے کہ زمین اموال ربویہ میں سے نہیں ہے۔

لما في الفقه الاسلامي وادلته (۵/۳۷۰۱/ مكتبه رشيديه)

كما لا ربا في الاموال القيمية مثل انواع الحيوان والبسط والطنافس والاثاث والاراضي والشجر والدور .فلا يحرم فيها الزيادة . فيجوز فيها اخذ كثير مقابل قليل من جنسه . لان القيميات ليست من المقدرات اي مما لا تخضع في مبادلتها كيلي او وزني.

ولما فيه ايضا (۵/ ۳۷۰۸/ مكتبه رشيديه)

واما الاموال القيمية كافراد الحيوان والبسط والطنافس والاشجار والاراضي والدور. فلا يجري فيها ربا الفضل لانها ليست من المقدرات اي التي تجمع بين افرادها وحدة مقياس ومقدار معين . فيجوز اعطاء الكثير منها في مقابل القليل من جنسه كبيع غنمة بغنمتين لان ربا الفضل زيادة احد المتجانسين على الاخر في المقدار والكمية والقيميات ليست من المقدرات.

ولما فيه ايضا (٥/٢٤٠٧/ مكتبه رشيديه)

وعلى هذا فان الا موال المثلية (المكيلات والموزونات) هي التي يجري فيها الربا. اما الاموال القيمة كالحيوان والدور وانواع الطنافس والجواهر و اللآلي فلا يجري فيها الربا. فيجوز مبادلة الكثير بالقليل كغنمة بغنمتين. لان القيميات ليست من المقدرات اى التي تجمع بين افرادها وحدة مقياس ومقدار.

الجواب صحیح: مفتی عبدالرحمٰن عفی اللہ عنہ واللہ اعلم بالصواب: مختتم غفرلہ ولوالدیہ

۱۲ صفرالخیر ۱۴۳۵ھ فتویٰ نمبر: ۳۹۴۹

﴿زمین کے بغیر زمین پر موجود چشمے کی خرید وفروخت﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں مفتیان کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ زید کی زمین میں پانی کا میٹھا چشمہ ہے، علاقے کے لوگ اس پانی کو پائپ لائن کے ذریعے اپنے گھروں تک لانا چاہتے ہیں، اب زید نے زمین کے بغیر صاف پانی کو ان لوگوں کے ہاتھوں فروخت کردیا، اب سوال یہ ہے کہ اس طرح کا معاملہ شرعاً جائز ہے یا نہیں؟ مستفتی: نظام الدین

﴿جواب﴾ زمین کا حق شرب زمین کے توابع میں شامل ہے، اس لئے بغیر زمین کے صرف پانی فروخت کرنے کو فقہاء کرام نے ناجائز قرار دیا ہے، لہٰذا زید کا اس طرح معاملہ کرنا شرعاً درست نہیں ہے۔

لمافي التنوير مع الدر: (٥/٨٠، طبع سعيد)

(وكذا) بيع (الشرب) وظاهر الرواية فساده الاتبعا خانية وشرح وهبانية.

وفي الشامية: (قوله وكذا بيع الشرب) أى فانه يجوز تبعاً للارض بالاجماع..... قال: هو والمصنف هناك ولايباع الشرب، ولا يوهب ولا يؤجر ولا يتصدق به لانه ليس بمال متقوم في ظاهر الرواية وعليه الفتوى.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ واللہ اعلم: صلاح الدین چترالی

۱۶ رجب ۱۴۲۷ھ فتویٰ نمبر: ۵۴۰

﴿مشتری اور بائع آپس میں کمی زیادتی کرسکتے ہیں؟﴾

﴿سوال﴾ بعض دفعہ خرید وفروخت میں بائع اور مشتری کے درمیان ایک معاملہ طے پاتا ہے، اسکے بعد مشتری اپنی طرف سے ثمن میں زیادتی کر کے دیتا ہے یا بائع جو طے ہوا تھا اس

سے کم ثمن لیتا ہے یا مبیع میں زیادتی کر کے دے دیتا ہے، کیا ایسا کرنا جائز ہے؟

﴿جواب﴾ خرید و فروخت میں آدمی اتنے ہی مال کے مطالبے کا حق رکھتا ہے جو باہم طے پایا ہے، ہاں اگر معاملہ طے پانے کے بعد مشتری تبرعاً اپنی طرف سے قیمت میں کچھ اضافہ کر دے یا بائع اپنی طرف سے سودے میں کچھ اضافہ کر دے یا قیمت میں کچھ کمی کر دے تو کوئی مضائقہ نہیں۔

لما فی الهداية:(۸۰/۳،طبع رحمانيه)

ويجوز للمشترى ان يزيد للبائع فى الثمن ويجوز للبائع ان يزيد للمشترى فى المبيع ويجوز ان يحط عن الثمن ويتعلق الاستحقاق بجميع ذلك .فالزيادة والحط يلتحقان باصل العقد عندنا.

الجواب صحیح: عبد الرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم: شاہد اسحاق عفا اللہ عنہ

۲۳ جمادی الثانی ۱۴۲۷ھ — فتویٰ نمبر: ۴۵۸

﴿قبضہ سے پہلے کسی چیز کو فروخت کرنا جائز نہیں ہے﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام کہ ہم مختلف اشیاء کی خرید و فروخت کرتے ہیں، خرید و فروخت کے وقت مال سامنے نہیں ہوتا بلکہ نام یا مارکہ ذکر کر کے مال بکتا ہے، اس طرح کا معاملہ کرنا جائز ہے یا نہیں؟ یا مال کا سامنے ہونا ضروری ہے؟ خریدار مال خرید لیتا ہے، اس کے بعد قبضہ میں آنے سے پہلے ہی اس کو آگے بیچنا شروع کر دیتا ہے، اس طرح کرنا جائز ہے یا نہیں؟

﴿جواب﴾ بغیر دیکھے مال خریدنا جائز ہے لیکن دیکھنے کے بعد اگر مال مطلوبہ معیار کا نہ نکلا تو خریدار کو معاملہ ختم کرنے کا اختیار ہوگا اور بائع کو بخوشی قبول کرنا ہوگا، البتہ جس چیز پر قبضہ نہیں ہوا اس کو آگے فروخت کرنا جائز نہیں، قبضہ کے بعد فروخت کرنے کی اجازت ہے۔

لما فی البحر الرائق:(۲۶/۶،طبع سعيد)

(قوله شراء مالم يره جائز)أى صحيح لما رواه ابن ابى شيبة من اشترى شيئالم يره فله الخيار اذارآه ان شاء اخذه وان شاء تركه وجهالته بعدم الرؤية لاتفضى الى المنازعة لانه لولم يوافقه يرده فصار كجهالة الوصف فى المعاين المشار اليه واطلاق الكتاب يقتضى جواز البيع سواء سمى جنس المبيع أولا وسواء أشار الى مكانه أواليه وهو حاضر مستور أولا الخ.

ولما فی الهداية:(۷۸/۳،طبع رحمانيه)

ومن اشترى شيئا مماينقل ويحول لم يجزله بيعه حتى يقبضه لانه نهى عن بيع مالم

یقبض ولان فیه غرر انفساخ العقد علی اعتبار الهلاك.

ولما فی الهدایة: (۴۷/۳، طبع رحمانیه)

ومن اشتری شیئا لم یره فالبیع جائز وله الخیار اذا راٰه ان شاء اخذه بجمیع الثمن وان شاء رده.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ　　　واللہ اعلم: صلاح الدین ڈیروی

۱۵ جمادی الاولیٰ ۱۴۲۷ھ　　　فتوی نمبر: ۳۲۰

﴿سونے کے فروخت کرنے کی ایک صورت﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ہم سے بعض اوقات لوگ سونا خرید لیتے ہیں، اور وصول کیے بغیر ہمارے پاس چھوڑ کر کہتے ہیں کہ بعد میں لے لوں گا، پھر بعد میں وہی سونا ہم پر بیچ دیتے ہیں، کیا یہ معاملہ شرعاً جائز ہے۔ اسی طرح بعض اوقات ہمارے پاس سونا نہیں ہوتا تو ہم کچھ اجرت کے ساتھ دوسرے سے خریدار کے کہنے پر جسکا کمیشن بھی لیتے ہیں خرید لیتے ہیں، پھر وہ آدمی وہی سونا ہمارے پاس بطور قرض رکھوا دیتا ہے، بعد میں جب قیمت بڑھ جاتی ہے تو خریدار کہتا ہے کہ میرا سونا بیچ دو، تو بیچنے پر بھی ہم کمیشن لیتے ہیں۔ اب مسئلہ یہ ہے کہ اس سونے کی قیمت قرض رکھواتے وقت اگر پچاس ہزار تھی تو اب ہم اس کو اکسٹھ ہزار پر بیچ دیتے ہیں، تو کیا ہمارے لئے یہ اجرت لینا اور خریدار کے لئے یہ اضافی گیارہ ہزار روپیہ لینا جائز ہے؟

﴿جواب﴾ سونا چاندی پیسوں کے ساتھ خریدنا، بیچنا جائز ہے، بشرطیکہ دونوں عوض میں سے کسی ایک پر مجلس میں قبضہ ہو، دونوں طرف ادھار ہی ادھار ہو تو جائز نہیں ہے۔ لہٰذا مذکورہ دونوں معاملوں میں آپ خریدار سے اسی مجلس میں پیسے اگر وصول کر لیتے ہیں تو دونوں جائز صورتیں ہیں، اور بعد میں سونے کی قیمت بڑھ جائے تو واپس آپ کو یا آپ کے ذریعہ کسی تیسرے شخص کو نفع کے ساتھ فروخت کرنا بھی جائز ہے، اور حاصل ہونے والا نفع، اسی طرح آپ کے لئے وکالت پر اجرت (کمیشن) لینا بھی جائز ہے، بشرطیکہ پہلے سے یہ کمیشن طے شدہ اور معلوم ہو۔

پہلی صورت میں بیع قبل القبض اگرچہ ہے لیکن مبیع عین نہیں ہے بلکہ دین ہے، اور جس کے ذمہ ہے اس کو فروخت کیا جا رہا ہے فقہاء کرام نے اسکو جائز قرار دیا ہے، البتہ "بیع الدین لا علی من علیہ الدین" یعنی تیسرے شخص کو فروخت کرنا قبضہ سے پہلے جائز نہیں ہے، اور دوسرے معاملہ میں آپ وکیل ہیں اور وکیل کا قبضہ مؤکل کا قبضہ شمار ہوتا ہے، اس لئے تیسرے

شخص کو فروخت کرنا جائز ہے۔ بیع قبل القبض لازم نہیں آتا۔

لما فی المبسوط ۲۵،۲۴/۱۴ طبع :دار المعرفه بیروت

واذاشترى الرجل فلوساً بدراهم ونقدالثمن ولم تكن الفلوس عندالبائع فالبيع جائز،لان الفلس الرائجة ثمن كالنقود وقد بينا ان حكم العقد فى الثمن وجوبها ووجودها معاً ولا يشرط قيامها فى ملك بائعها لصحة العقد كما لا يشرط ذالك فى الدراهم والدنانير۔۔۔۔وانما يجب التقابض فى الصرف بمقتضى اسم العقد وبيع الفلوس بالدراهم ليس بصرف ،وكذالك لو افترقا بعد قبض الفلوس قبل قبض الدراهم ۔۔۔۔وان لم يتقابضا حتى افترقا بطل العقد ،لانه دين بدين،والدين بالدين لا يكون عقدا بعد الافتراق.

ولما فى المبسوط ايضا،۳۸/۱۴

وان اقرضه درهما ثم اشترى به فلوسا بعينها او بغيرها فهو جائز ان قبضها قبل ان يفترقا ،لا ن الفلوس الرائجه لا تتعين عند المقابله بخلاف جنسها فان فارقه قبل القبض بطل لانه دين بدين.

ولما فى البزازيه ۲۱۱/۱۰ طبع قديمى

ولو اشترى مائة فلوس بدرهم يكفى التقابض من احدالجانبين.

ولما فى البزازيه ايضا ۳۹۲/۱

اذا تجانس القبضان تنا وبا بان كانا قبض اما نة او ضما ن ،وان اختلفا نا ب المضمون عن غيره لا غيره ، بيانه ان الشى حتى كان فى يده بغصب او عقد فاسد فاشتراه من المالك صحيحا ينوب القبض الاول عن الثانى حتى لو هلك قبل ان يصل الى منزله وتمكن من قبضه هلك عليه.

ولما فى البدائع ۱۴۸/۵، طبع: سعيد

ويجوز بيعه ممن عليه لان المانع هو العجز عن التسليم ولا حاجة إلى التسليم ههنا ونظيره بيع المغصوب انه يصح من الغاصب.

ولما فى الهدايه ۱۹۰/۳، طبع :رحمانيه

فان هلك المبيع فى يده قبل حبسه هلك من مال الموكل ولم يسقط الثمن ،لان يده كيد الموكل.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ

واللہ اعلم بالصواب: محمد زبیر غفرلہ ولوالدیہ

یکم ربیع الاول ۱۴۳۴ھ

فتویٰ نمبر: ۳۵۶۹

﴿ایجنٹ خود نہ بائع ہوتا ہے اور نہ خریدار بلکہ واسطہ﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک کمپنی نے اپنے مال کو

فروخت کرنے کے لئے کچھ ایجنٹ رکھے ہیں جن کو نفع کا دس فیصد ملتا ہے۔ غرض مسئلہ یہ ہیکہ اگر کوئی ایجنٹ کسی کے لئے مال دلواتے وقت اپنے نفع میں کچھ کمی کردے مثلاً اپنا نفع 10 فیصد کے بجائے 2 فیصد لے تو کیا یہ جائز ہے؟ کیا یہ معاملہ بیع قبل القبض نہیں ہے؟ مستفتی: ولی محمد کوئٹہ

﴿جواب﴾ ایجنٹ یا دلال خریدار اور بائع کے درمیان واسطہ ہوتا ہے وہ خود نہ خریدار ہوتا ہے اور نہ بائع۔ اس لئے مذکورہ صورت بیع قبل القبض کی نہیں ہے، بلکہ ایجنٹ کو جو کمیشن ملنے والی تھی بائع نے ایجنٹ کی اجازت سے مبیع کی قیمت میں کمی کردی، لہذا یہ جائز معاملہ ہے اس میں شرعاً کوئی قباحت نہیں ہے۔

لما فی الهداية: ۸۰/۳ طبع رحمانية

ويجوز للمشترى أن يزيد للبائع فى الثمن ويجوز للبائع أن يزيد للمشترى فى المبيع، ويجوز أن يحط عن الثمن ويتعلق الاستحقاق بجميع ذالك ۔۔ ولنا أنهما بالحط والزيادة يغيران العقد من وصف مشروع الى وصف مشروع وهو كونه رابحاً أو خاسراً أو عدلا ولهما ولاية الرفع فأولى أن يكون لهما ولاية التغير.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: محمد زبیر عفا اللہ عنہ

۲۵ جمادی الثانی ۱۴۳۴ھ — فتوی نمبر: ۳۸۱۱

﴿بلٹی کراونے کے بعد مال گم ہو جائے تو نقصان کس کے ذمے ہوگا؟﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میں ایک دوکاندار آدمی ہوں، اور میں نے لاہور سے کچھ مال منگوایا، اور آدھے پیسے بھی بھیج دیئے، تو لاہور والے دوکاندار نے بلٹی پر وہ مال بھیج دیا، پھر راستہ میں وہ مال غائب ہوگیا، ابھی لاہور والا دوکاندار مجھ سے بقایا پیسے مانگ رہا ہے، حالانکہ میرے تو آدھے پیسے گئے اور سامان بھی نہیں ملا، تو گزارش یہ ہے کہ یہ مال کس کے کھاتے سے ضائع ہوگیا؟ مستفتی: ولی محمد کوئٹہ

﴿جواب﴾ مال بلٹی کر کے غائب ہوا، غائب ہونے کی کوئی وجہ بھی تو ہوگی، راستہ میں ڈاکو لوگوں نے اسلحہ کے زور پر مال لوٹ لیا ہو، یا چوری ہونے کے شواہد موجود ہوں، یا کسی آسمانی آفت کی وجہ سے مال ضائع ہوگیا ہو، تو ایسی تمام صورتوں میں بلٹی کرانے والے کا مال ضائع ہوگیا ہے، لاہور والے دوکاندار کے ذمہ ہے کہ آپکی تمام رقم جو انہوں نے وصول کی ہے واپس کردے، البتہ

بلٹی کا انتظام آپ نے خود اگر کیا تھا، یا بائع یعنی لاہور والے دوکاندار نے آپ کے حکم سے مال بلٹی کیا تھا، تو ایسی صورت میں آپکا مال ضائع ہوگیا ہے، بقایا رقم ادا کرنا بھی آپکے ذمہ ہے۔

اور غائب ہونے کی کوئی معقول وجہ بلٹی کمپنی والوں کے پاس اگر نہیں ہے یا مال بردار گاڑی کے ڈرائیور وغیرہ کی بد احتیاطی واضح ہے تو پورے مال کا تاوان ادا کرنا بلٹی کمپنی والوں کے ذمہ ہے۔

لما فی الفقه الاسلامی: ۳۲۹۵/۵ طبع رشیدیه

البیع بالمراسلة أو بواسطة رسول یصح اتفاقا ویکون مجلس التعاقد هو مجلس بلوغ الرسالة من العاقد الأول الی العاقد الثانی.

ولما فی الهندیة: ۱۹/۳ طبع رشیدیه

اذا قال المشتری للبائع ابعث الی ابنی واستأجر البائع رجلا یحمله الی ابنه فهذا لیس بقبض والأجرة علی البائع الا أن یقول استاجر علی من یحمله فقبض الأجیر یکون قبض المشتری ان صدقه أنه استأجر ودفع الیه وان أنکر استئجاره والدفع الیه فالقول قوله. کذا فی التاتارخانیه

ولما فی الهندیه: ۵۰۰/۴ طبع رشیدیه

وحکم الأجیر المشترك أن ما هلك فی یده من غیر صنعة فلا ضمان علیه فی قول أبی حنیفة رحمه الله تعالی وهو قول زفر والحسن وأنه قیاس سواء هلك بأمر یمکن التحرز عنه کا لسرقة والغصب أو بأ مر لایمکن التحرز عنه کا لحرق الغالب والغارة الغالبة والمکابرة وقال ابو یوسف ومحمد رحمهما الله تعالی ان هلك بأمر یمکن التحرز عنه فهو ضامن وان هلك بأمر لایمکن التحرز عنه فلا ضمان کذا فی المحیط ـــوبقولهما یفتی الیوم لتغیر أحوال الناس وبه یحصل صیانة أموالهم کذا فی التبیین

الجواب صحیح: عبد الرحمٰن عفا اللہ　　　واللہ اعلم بالصواب: محمد زبیر غفرلہ ولوالدیہ

۷ جمادی الثانی ۱۴۳۴ھ　　　فتویٰ نمبر: ۳۷۴۷

﴿صفقۂ واحدہ میں بیع کے بعد مبیع پر قبضے کا حکم﴾

﴿سوال﴾ ایک آدمی نے اڑھائی، اڑھائی لاکھ میں دو گاڑیاں ایک مالک سے ایک ہی سودے میں خریدیں پھر چار لاکھ ادا کر کے ایک گاڑی قبضہ میں لینے کا مطالبہ کر رہا ہے لیکن مالک اس پر راضی نہیں، وہ کہتا ہے کہ پورے پانچ لاکھ روپے لیکر دونوں گاڑیاں ایک ساتھ حوالہ کرونگا، کیا مالک کا ایسا کرنا صحیح ہے؟ بینوا توجروا۔

﴿جواب﴾ جب ایک ہی سودے میں دونوں گاڑیوں کی خرید وفروخت ہوئی ہے تو مالک

کیلئے اسکی اجازت ہے کہ وہ کل قیمت وصول کرنے تک دونوں گاڑیوں کو اپنے پاس روکے رکھے۔

لما فی الشامی:(۵۶۱/۴،مطلب فی حبس المبیع،طبع سعید)

[تنبیه]للبائع حبس المبیع الی قبض الثمن،ولوبقی منه درهم ولوالمبیع شیئین بصفقة واحدة،وسمی لکل ثمنافله حبسهماالی استیفاء الکل،ولا یسقط حق الحبس بالرهن ولا بالکفیل،ولا بابرائه عن بعض الثمن حتی یستوفی الباقی.

الجواب صحیح:عبدالرحمٰن عفااللہ عنہ والله اعلم:شاہد اسحاق عفااللہ عنہ

۳ جمادی الاولیٰ ۱۴۲۷ھ فتوی نمبر:۲۴۷

﴿نقد رقم قرض دینے کے بجائے کوئی چیز مہنگی دینے کا حکم﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں مفتیان کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک آدمی نے کسی سے تین ہزار روپے قرض لینا چاہا،اس نے بجائے قرض دینے کے ایک کپڑا ساڑھے تین ہزار روپے میں اس کو ادھار پر فروخت کیا جبکہ بازار میں اس کپڑے کی قیمت تین ہزار روپے ہے، ضرورتمند نے کپڑا لیکر بازار میں تین ہزار روپے میں فروخت کردیا،اس صورت میں قرض دینے والے کو جو پانچ سو روپے زائد ملے گا شرعاً اس کی کیا حیثیت ہے؟ مستفتی:ناصر علی لانڈھی

﴿جواب﴾ قرض دینے کیلئے مذکورہ ترتیب اختیار کرنے میں اگرچہ ضرورتمند کی خیرخواہی کیساتھ ساتھ نفع خوری کا جذبہ بھی نمایاں نظر آرہا ہے لیکن بیع کی جملہ شرائط کی رعایت کرنے کی وجہ سے یہ عقد جائز ہے اور ادھار بیچنے کی صورت میں نقد کی نسبت زیادہ پیسہ وصول کرنا بھی جائز ہے،فقہاء کرام نے اس کی تصریح کی ہے،لہٰذا ایسا معاملہ کرنا شرعاً منع نہیں ہے۔

لما فی فتح القدیر:(۳۲۴/۶،طبع رشیدیه)

کان یحتاج المدیون فیأبی المسؤل أن یقرض بل أن یبیع مایساوی عشرة بخمسة عشرالی أجل فیشتریه المدیون ویبیعه فی السوق بعشرحالة ولاباس فی هذافان الاجل قابله قسط من الثمن والقرض غیرواجب علیه دائمابل هومندوب فان ترکه لمجرد رغبة عنه الی زیادة الدنیافمکروه أولعارض یعذربه فلا ـ ومالم ترجع الیه العین التی خرجت منه لایسمی بیع العینة لانه من العین المسترجعة لاالعین مطلقاًو الافکل بیع بیع العینة.

ولما فی الشامی:(۳۲۶/۵،طبع سعید)

فان لم یعد کما اذاباعه المدیون فی السوق فلاکراهة فیه بل خلاف الأولی،فان الأجل قابله قسط من الثمن والقرض غیرواجب علیه دائمابل هومندوب ومالم ترجع الیه العین التی خرجت منه لایسمی بیع العینة لأنه من العین المسترجعة لاالعین مطلقا

والافکل بیع بیع العینۃ اھ.

ولمافی البحرالرائق:(۲۳۵/۶،طبع سعید)

ومعناہ الامرببیع العینۃ مثل أن یستقرض من تاجرعشرۃ فیأبی فیبیع منہ ثوبایساوی عشرۃ بخمسۃ عشر مثلار غبۃ فی نیل الزیادۃ لیبیعہ المستقرض بعشرۃ ویتحمل خمسۃ سمی بہ لمافیہ من الاعراض عن الدین الی العین وھومکروہ لمافیہ من الاعراض عن مبرۃ الاقراض مطاوعۃ لمذموم البخل.

الجواب صحیح:عبدالرحمٰن عفااللہ عنہ　　　واللہ اعلم بالصواب:رضوان اللہ حقانی

یکم ربیع الثانی ۱۴۳۰ھ　　　فتویٰ نمبر:۲۱۲۳

﴿سامان تجارت پرآنے والے اخراجات کو قیمت خرید میں شمار کرنا جائز ہے﴾

﴿سوال﴾ کیافرماتے ہیں مفتیان کرام کہ ایک دوکاندار دوسرے شہر سے دوکان کا سامان خرید کرلاتا ہے تواب اس پر جوآنے جانے کاخرچ ہوا ہے وہ اصل قیمت خرید میں شامل کر کے فروخت کرسکتا ہے یانہیں؟اورشرعاًاس کا کیاحکم ہے؟　　　مستفتی:ناصرعلی لانڈھی

﴿جواب﴾ سامان تجارت پرآنے والے اخراجات کو قیمت خرید میں شمار کرمزید نفع حاصل کرنا بلاشبہ جائز ہے اوریہی تو تجارت کا مقصد ہے لیکن بعض اوقات چیز کی قیمت خرید واضح طور پر بتانے کی ضرورت پڑجاتی ہے تو ایسی صورت میں اضافی اخراجات ملاکر قیمت بتانا جھوٹ ہوگا جس سے بچنا ضروری ہے،البتہ اس طرح کہا جائے کہ یہ چیز مجھے اتنے میں پڑی ہے تو اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔

لمافی التنویرمع الدر:(۱۳۵/۵،طبع سعید)

(ویضم)البائع(الی رأس المال أجرالقصّار والصبغ)......(والطراز والفتل وحمل الطعام)وسوق الغنم وأجرۃ الغسل والخیاطۃ(وکسوتہ)وطعام المبیع بلااسرف......الخ.

ولمافی الھدایۃ:(۷۵/۳،طبع رحمانیہ)

ویجوزان یضیف الیٰ رأس المال اجرۃ القصّار والطراز والصبغ والفتل واجرۃ حمل الطعام ویقول قام علیّ بکذاولایقول اشتریتہ بکذاکیلایکون کاذباً.

ولمافی البحرالرائق:(۱۰۹/۶،طبع سعید)

(ولہ أن یضم الی رأس المال أجرالقصّار والصبغ والطراز والفتل وحمل الطعام وسوق الغنم ویقول قام علیّ بکذا)ولایقول اشتریتہ لانہ کذب وھوحرام.

الجواب صحیح:عبدالرحمٰن عفااللہ عنہ　　　واللہ اعلم بالصواب:رضوان اللہ حقانی

۳۰ربیع الاول ۱۴۳۰ھ　　　فتویٰ نمبر:۲۱۲۲

﴿مردار کی کچی کھال بیچنا جائز نہیں ہے﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں مفتیان کرام کہ مردار کی کھال بیچنا جائز ہے یا نہیں؟

﴿جواب﴾ مردار کی کچی کھال بیچنا جائز نہیں ہے، البتہ دباغت کے بعد بیچنا جائز ہے۔

لما فی الهداية:(۵۷/۳،طبع رحمانيه)

(ولا بيع جلود الميتة قبل أن تدبغ)لأنه غير منتفع به قال عليه السلام ولاتنتفعوا من الميتة باهاب وهو اسم لغير المدبوغ على مامر فى كتاب الصلوة(ولا بأس ببيعها والانتفاع بها بعد الدباغ)لانها طهرت بالدباغ.

ولما فی الفتاوى السراجية:(ص۹۷،طبع سعيد)لايجوز بيع جلود الميتة قبل أن يدبغ.

الجواب صحیح: عبد الرحمٰن عفا اللہ عنہ والله اعلم بالصواب: محمد سجاد غفرلہ

۷ ربیع الثانی ۱۴۳۰ھ فتویٰ نمبر: ۲۱۴۵

﴿حلال جانوروں کے خون کی بیع جائز نہیں ہے﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام دریں مسئلہ کہ حلال جانوروں کا خون جو ذبح کے وقت نکلتا ہے اس کی بیع وشراء جائز ہے یا نہیں؟ بینوا توجروا۔ مستفتی: محمد خان

﴿جواب﴾ جانور حلال ہو یا حرام، ذبح کے وقت جو خون اس سے نکلتا ہے اس کی خرید و فروخت جائز نہیں ہے۔

ولما فی التنوير مع الدر:(۲۳۵/۷،طبع امداديه)

(بطل بيع ماليس بمال)والمال مايميل اليه الطبع ويجرى فيه البذل والمنع،درر فخرج التراب ونحوه(كالدم)المسفوح فجاز بيع كبد وطحال.وفى الهداية:(۵۰/۳،رحمانيه)

ولما فی البحر الرائق:(۷۰/۶،طبع سعيد)

قوله:(لم يجز بيع الميتة والدم)لانعدام المالية التى هى ركن البيع فانهما لايعدان مالا عند احد وهو من قسم الباطل،والمؤلف رحمه الله تعالىٰ لما استعمل الفاسد فى الباب للأعم عبر بعدم الجواز الشامل للباطل والفاسد.

ولما فی بدائع الصنائع:(۳۰۵/۵،طبع سعيد)

واما البيع الباطل وذلك نحو بيع الميتة والدم والعذرة والبول وبيع الملاقيح والمضامين وكل ماليس بمال.

الجواب صحیح: عبد الرحمٰن عفا اللہ عنہ والله اعلم: صلاح الدین ڈیروی

۹ جمادی الثانی ۱۴۲۷ھ فتویٰ نمبر: ۳۹۲

﴿تقسیم سے پہلے اپنے حصے کی زمین کو بیچنے کا حکم﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ پانچ آدمیوں کے درمیان ایک مشترکہ زمین ہے، ہر ایک کا حصہ تقریباً ایک سو بیس گز بنتا ہے، ان میں سے ایک حصہ دار اپنا حصہ فروخت کرنا چاہتا ہے تو کیا مشترکہ زمین میں سے وہ اپنا حصہ کسی دوسرے کے ہاتھ فروخت کرسکتا ہے؟ بینوا توجروا۔ مستفتی: محمد ارشد

﴿جواب﴾ مذکورہ صورت میں مشترکہ زمین میں سے اپنا معلوم حصہ کسی دوسرے کو فروخت کرنا جائز ہے اگر چہ تقسیم نہ ہوئی ہو لیکن اگر فروخت کرتے وقت یہ معلوم نہ ہو کہ میرا اتنا حصہ بنتا ہے مثلاً اسی گز یا سو گز وغیرہ، تو ایسی صورت میں یہ بیع جہالت کی وجہ سے ناجائز ہوگی۔

لما فی الهداية: (۱۰۵/۲، طبع رحمانیه)

ويجوز بيع احدهما نصيبه من شريكه في جميع الصور ومن غير شريكه بغير اذنه الا في صورة الخلط والاختلاط فانه لايجوز الا باذنه.

ولما في تنوير الابصار: (۳۰۰/۲، طبع سعيد)

(فصح له بيع حصته ولو من غير شريكه بلا اذن الا في صورة الخلط)

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ | واللہ اعلم: صلاح الدین ڈیروی

۵ جمادی الثانی ۱۴۲۷ھ | فتویٰ نمبر: ۳۷۱

﴿جس دودھ میں چھپکلی گری ہو، اس دودھ کا بیچنا﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام دریں مسئلہ (۱) کہ میں ایک دودھ فروش آدمی ہوں اگر ایک من دودھ میں چھپکلی زندہ یا مردہ نکلے تو ایسا دودھ پاک ہوگا یا ناپاک؟ اور ایسا دودھ ہم کسی اور کو فروخت کر سکتے ہیں یا نہیں؟ (۲) چوہا اگر ایک من دودھ میں زندہ یا مردہ نکلے تو اس کا کیا حکم ہوگا۔

﴿جواب﴾ (۱) مذکورہ صورت میں اگر دودھ میں سے ایسی چھپکلی نکل آئے جس میں بہنے والا خون نہیں ہے خواہ زندہ نکل آئے یا مردہ اس سے دودھ ناپاک نہیں ہوتا، اس کو استعمال کر سکتے ہیں، ہاں اگر طبی لحاظ سے ایسا دودھ مضر اور نقصان دہ سمجھا جائے تو ایسا دودھ نہ خود استعمال کر سکتے ہیں نہ کسی اور کے ہاتھ فروخت کر سکتے ہیں اور اگر چھپکلی ایسی ہے جس میں بہنے والا خون ہے تو وہ اگر زندہ نکلے تب بھی دودھ پاک ہوگا اور اگر مردہ نکل آئی تو دودھ ناپاک ہے اس کو کسی دوسرے

کے ہاتھ فروخت کرنا جائز نہیں ہے۔

لما فی شرح العنایۃ حاشیۃ فتح القدیر:(۱/۸۸،طبع رشیدیہ)

(وموت مالیس لہ نفس سائلۃ)یموت فیہ مالیس لہ دم سائل کالبق والذباب والزنابیر والعقرب ونحوھا فی الماء لاینجسہ عن سلمان أنہ قال فیہ ای فی مثل ہذہ الحادثۃ فانہ علیہ السلام(سئل عن اناء فیہ طعام اوشراب یموت فیہ مالیس لہ دم سائل فقال ھوالحلال أکلہ وشربہ والوضوء منہ)ولان المنجس ھواختلاط الدم المسفوح باجزائہ عندالموت الخ.

ولما فی فتح القدیر:(۱/۱۰۷،طبع رشیدیہ)

وقال أیضاوان ماتت فیھافأرۃ اوعصفورۃ اوصعوۃ اوسودانیۃ اوسام(ابرص)حاصل ھذہ المسائل ان الحیوان الواقع فی البئرلایخلو من اوجہ سبعۃ اماان یکون فأرۃ اونحوھااودجاجۃ اونحوھااوشاۃ اونحوھاوکل منھااماان یخرج حیااومیتاوالمیت اما ان یکون منتفخااولافالخرج حیالاینجس فی الفصول کلھاالاالخنزیرلکونہ نجس العین وماأخرج میتافی الوجہ الاول وھومااذاکان المیت فیھافأرۃ أوعصفورۃاوسام ابرص الکبیرمن الوزغ ولم ینتفخ(نزح)منھامابین عشرین دلواالی ثلاثین بحسب کبر الدلو وصغرھا.

(۲)اگر چوہا ایک من دودھ کے اندر سے زندہ نکل آئے توایسادودھ مکروہ تنزیہی ہے، احتیاط اس میں ہے کہ دوسرے کے ہاتھ فروخت نہ کرے اوراگر مردہ چوہا پایا گیاتو دودھ ناپاک ہے اس کودوسرے کے ہاتھ فروخت کرنا شرعاً جائز نہیں ہے۔

لما فی الھدایۃ علی صدر فتح القدیر:(۱/۱۰۷،طبع رشیدیہ)

(وان ماتت فیھافأرۃ أوعصفورۃ الی ان قال فزح منھامابین عشرین دلواالی ثلاثین بحسب کبرالدلو وصغرھا فی القدیس(قولہ نزح جمیع مافیھا)ھذااذامات والحاصل ان المخرج حیاان کان نجس العین اوفی بدنہ نجاسۃ معلومۃ نزحت کلھا وان کان نجس السئورفقط اومشکوکہ فان لم یدخل فاہ الماء فلابأس وان أدخلہ نزح الکل فی النجس بخلاف المکروہ فانہ غیرمسلوب الطھوریۃ الخ.

ولما فی التنویرمع الدر:(۱/۲۲۲،طبع سعید)

(وسواکن بیوت)طاھرللضرورۃ(مکروہ)تنزیھافی الاصح ان وجدغیرہ.

وفی الشامیۃ:(قولہ وسواکن بیوت)أی مالہ دم سائل کالفأرۃ والحیۃ والوزغۃ،بخلاف مالادم لہ کالخنفس والصرصروالعقرب فانہ لایکرہ کمامر،وتمامہ فی الامداد(قولہ: طاھرللضرورۃ)بیان ذلک ان القیاس فی الھرۃ نجاسۃ سؤرھالانہ مختلط بلعابھا المتولدمن لحمھاالنجس،لکن سقط حکم النجاسۃ اتفاقابعلۃ الطواف المنصوصۃ بقولہ صلی اللہ علیہ وسلم "انھالیست بنجسۃ،انھامن الطوافین علیکم والطوافات"

......یعنی انها تدخل المضائق ولازمه شدة المخالطة بحیث یتعذر صون الأواني منها، وفي معناها سواكن البیوت للعلة المذكورة، فسقط حكم النجاسة للضرورة وبقیت الكراهة لعدم تحامیها النجاسة.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم: صلاح الدین ڈیروی

۲۵ رجب ۱۴۲۷ھ — فتویٰ نمبر: ۵۵۷

﴿معیوب مبیع کو واپس کرنا کیسا ہے؟﴾

﴿سوال﴾ کیا شیشے کے ایسے پیالے بیچنا جن میں چائے ڈالنے سے وہ ٹوٹ جاتے ہیں، جائز ہے؟ اُن کے عیب کے بارے میں خریدتے وقت ہمیں بالکل ہی پتہ نہیں ہوتا تاہم جب ہمارے گاہکوں کی طرف سے شکایت آتی ہے، تب ہمیں پتہ چلتا ہے اور پھر ہم واپس کریں تو بائع واپس لیتا بھی نہیں، کیا ہمارے لئے مذکورہ پیالیوں کا بیچنا جائز ہے؟ نیز کیا ہم اُنہیں بطورِ زکوٰۃ مدرسہ وغیرہ کو دے سکتے ہیں؟۔ مستفتی: امجد

﴿جواب﴾ شیشے کے مذکورہ پیالے اگر اکثر معیوب (یعنی چائے وغیرہ ڈالنے سے ٹوٹ جاتے) ہوں تو انہیں مشتری کو اطلاع کیے بغیر آگے بیچنا آپ کے لئے ناجائز ہے کیونکہ اس میں دھوکہ ہے، ایسی صورت میں گاہک کو وہ پیالے واپس کرنے کا حق حاصل ہے، تاہم اگر آپ کے اطلاع کرنے کے باوجود وہ خرید لے تو اُسے واپس کرنے کا حق حاصل نہیں، نیز اس صورت میں مذکورہ پیالیوں (وغیرہ) کو زکوٰۃ کے طور پر دینا بھی جائز ہے۔

دوسری صورت یہ ہے کہ اکثر پیالے معیوب نہ ہوں بلکہ ایک آدھ ایسے (ٹوٹنے والے) نکل آئے تو کوئی حرج نہیں، البتہ اس صورت میں بھی گاہک نقصان کے لئے رجوع کر سکے گا، اس صورت میں مذکورہ پیالوں کو زکوٰۃ کے طور پر دینا بھی درست ہے۔ واللہ اعلم۔

لما في جامع الترمذي: (۱/۱۵۷، طبع فاروقي ملتان)

عن أبي هريرةؓ أن رسول الله ﷺ مر على صبرة طعام فادخل يده فيها فنالت أصابعه بللا......فقال من غشّ فليس منا.

ولما في الدر المختار: (۵/۴۷، طبع سعيد)

أفروع لا يحلّ كتمان العيب في مبيع اوثمن لان الغش حرام......الخ.

ولما في التنوير مع الدر: (۵/۲۶، طبع سعيد)

(باع ما اشتراه فرد) المشتری الثانی (علیه بعیب رده علی بائعه لورد علیه بقضاء)

ولما فی الهدایة: (۳/۴۵، طبع رحمانیه)

ومن اشتری بیضا او بطیخا فکسره فوجده فاسدا فان لم ینتفع به رجع بالثمن کله وان کان ینتفع به یرجع بنقصان العیب.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفااللہ عنہ — واللہ اعلم: محمد شریف حسین چترالی عفااللہ عنہ

۲۷ جمادی الثانی ۱۴۲۷ھ — فتویٰ نمبر: ۴۷۹

﴿پھل آنے سے پہلے باغات کی بیع درست نہیں﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماءِ کرام کہ ہمارے علاقے (سوات) میں باغات پھل آنے سے پہلے بیچ دیے جاتے ہیں، زیادہ ترسیب اور آڑو کے باغات ہیں جو کہ ناجائز ہے۔

تاہم بعض مقامی علماءِ کرام نے اس سلسلے میں ایک جائز صورت یہ تجویز کی ہے کہ "بیع کے وقت بائع خریدار سے یہ کہدے کہ میں یہ باغ آپ کو بیچتا ہوں زمین کے مکمل تصرف کیساتھ حالانکہ پہلے بھی زمین کا تصرف ہوتا تھا، کیا مذکورہ صورت میں بیع درست ہو جائیگی؟

دوسرا یہ کہ بیع کے وقت پیشگی کے طور پر کچھ رقم خریدار بائع کو دیتا ہے مثلاً بیس لاکھ کا باغ ہے تو پانچ لاکھ روپے پہلے دیدیے اب اگر کسی سماوی آفت کی وجہ سے پھل نہ آئے یا بہت کم آئے تو مشتری اگر بائع کو باغ واپس دینا چاہے تو وہ پانچ لاکھ روپے اس کو واپس نہیں دیئے جائیں گے۔ بیع کے وقت یہ شرط لگادی جاتی ہے کہ ندامت کی صورت میں وہ واپس نہیں کی جائیگی۔ کیا ایسا کرنا درست ہے؟ وضاحت فرمائیں۔ مستفتی: محمد رفیق

﴿جواب﴾ مسئولہ صورت میں چونکہ پھل آنے سے پہلے انہیں بیچا جارہا ہے اس لئے یہ معاملہ ناجائز ہے۔

لما فی الدر المختار: (۷/۸۵ طبع امدادیه) اما قبل الظهور فلا یصح اتفاقا.

باقی رہا وہ طریقہ جو آپ کے مقامی علماء کرام نے تجویز فرمایا ہے وہ مذکورہ معاملے کے جائز ہونے کے لئے کافی نہیں ہے، کتب فقہ میں اس کا کوئی حوالہ نہیں ملا اور یہ شرط لگانا کہ بائع پیشگی وصول کردہ رقم واپس نہیں کریگا، غیر معتبر ہے، لہٰذا بائع پر لازم ہے کہ وہ پیشگی وصول کردہ رقم معاملہ فاسد ہونے کی صورت میں مشتری کو واپس کردے۔ واللہ اعلم۔

لمافی الشامی:(۸۱/۷،طبع امدادیہ)

لان استیجار الارض لایتاتیٰ هنالان الاشجار باقیة علیٰ ملک البائع وقیامهافی الارض مانع من صحة استیجار الارض،الاان یاخذهااولامعاملة کمامر۔لانهاتصیرفی تصرفه اوتکون الاشجار علی المسناة فانهاحینئذلاتمنع صحة اجارة الارض کمایعلم من بابها.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفااللہ عنہ واللہ اعلم: محمد شریف حسین چترالی عفااللہ عنہ

۹ ربیع الثانی ۱۴۲۷ھ فتویٰ نمبر: ۱۰۴

﴿پھل ظاہر نہ ہوں تو بیع کی جگہ مساقات کا معاملہ کریں﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ بارے میں کہ درختوں پر پھل ظاہر ہونے سے پہلے اس کی بیع صحیح ہے یا نہیں؟ ہمارے علاقے میں ایسے پھلوں کی بیع کئی سالوں تک ہوتی ہے۔

﴿جواب﴾ پھل اگر درختوں پر ظاہر نہ ہوں تو معدوم اور نا معلوم ہیں شریعت معدوم اور نا معلوم چیز کی بیع کو منع کرتی ہے۔آپ کے علاقے میں اس طرح کی بیع اگر لوگ کرتے ہیں تو علمائے کرام کو چاہیے کہ وہ لوگوں کو اس کے بارے میں بتائیں کہ یہ عقد شرعا جائز نہیں ہے اس سے خریدار اور بائع دونوں گناہ گار ہورہے ہیں۔اور ساتھ متبادل جائز صورت بھی بتادیا کریں۔

ایک صورت یہ ہے کہ جب درختوں پر پھل ظاہر ہوں تو اس وقت سودا کریں پہلے نہ کریں اور اگر پہلے ہی کرنا چاہتے ہیں یا کئی سالوں کیلئے باغ لینا چاہتے ہیں تو مساقات کی ترتیب اختیار کریں،مساقات کا مطلب یہ ہے کہ جس کو پھل لینا مقصود ہو،وہ درختوں کو پانی دینے، صاف کرنے ،حفاظت کرنے اور اسی طرح دیگر متعلقہ تمام خدمات انجام دینا اپنے ذمہ لے اور اس کے بدلے حاصل ہونے والے پھل میں سے خاص حصہ لینے کا وہ مطالبہ کرے،مثلا دو تہائی یا زیادہ جتنا باہمی رضامندی سے چاہیں طے کریں ،تو یہ مساقات کا معاملہ ہے۔اور شرعا جائز ہے لیکن ظاہر ہے مالک کو بڑی رقم کا مطالبہ کرنا ہوگا،جس کیلئے بعد میں باغ والی زمین بھی کرایہ پر لینے کا عقد کریں عامل اس پر گندم یا کوئی اور چیز کاشت کرنا چاہے تو زمین استعمال میں لاسکے گا اور اس بہانہ مالک کو مطلوبہ رقم بھی مل سکتی ہے،اس لئے کہ شرعا کرایہ طے کرنے میں کوئی حد بندی نہیں ہے باہمی رضامندی سے زیادہ یا کم طے کرسکتے ہیں اور یاد رہے کہ مساقات کے معاملہ کیلئے کچھ شرائط ہیں جن میں قدرے تفصیل ہے۔اس لئے مقامی علماء

سے معلوم کریں اور چاہے تو اس کے لئے الگ استفتاء لکھ کر بھیج دیں تو شرائط کی بھی تفصیل لکھ کر ان شاء اللہ ارسال کردیں گے۔

لما فی الصحیح المسلم ل:(۱۱/۲ طبع: قدیمی)

عن عبداللہ ابن جابرؓ نہی رسول اللہ ﷺ عن المحاقلة والمزابنة والمعاومة والمخابرة قال احدھما بیع السنین ھی المعاومة وعن الثنیا ورخص فی العرایا.

ولما فی فتح القدیر:(۶/۲۶۴،طبع: رشیدیہ،کوئٹہ)

(ومن باع ثمرة لم یبدو صلاحھا) لاخلاف فی عدم جواز بیع الثمار قبل ان تظھر۔۔۔الخ

ولما فی الدرالمختار :(۴/۵۵۵،طبع: سعید کراچی)

(ومن باع ثمرة بارزة) اما قبل الظھور فلا یصح اتفاقا۔۔الخ

ولما فی الشامی :(۶/۸،طبع: سعید کراچی)

وفی فتاوی الحانوتی :التنصیص فی الاجارة علی بیاض الارض لایفید الصحة حیث تقدم عقد الاجارة علی عقد المساقات،اما اذا تقدم عقد المساقات بشروطه کانت الاجارة صحیحة کما صرح فی البزازیة.

ولما فی الشامی :(۴/۵۵۷،۵۵۸ طبع: سعید کراچی)

یشتری الموجود من الثمر بکل الثمن ،ویحل له البائع ماسیوجد لان استئجار الارض لایتأتی ھنا،لان الاشجار باقیة علی ملک البائع ،وقیامھا فی الارض مانع من صحة استئجار الارض الان یأخذھا ولامعاملة کما مر لانھا فی تصرفه اوتکون الاشجار علی المسناة فانھا حینئذ لاتمنع صحة اجارة الارض۔۔الخ

ولما فی حاشیة الطحطاوی علی الدر:(۳/۲۲)

(قوله والحیلة)ای فی بیع الاثمار مع بقائھا علی الاشجار وھی المخلصة من الفساد الحرمة .(قوله ان یأخذ)المشتری الشمر (قوله معاملة) ای مساقاة۔۔(قوله علی ان له)ای للبائع قال فی شرح الملتقی وینبغی ان یقول المشتری للبائع بعد مادفع الثمن اخذت منک ھذاالشجر معاملة علی ان لک جزء من الف جزء ولی الف جزء الاجزاء ای من الثمر۔الخ

ولما فی بدائع الصنائع :(۸/۲۸۴تا۲۹۰ ،طبع: دارالکتب العلمیة ،بیروت)

(تعریف وتوضیح وحکم وشرائط المساقاة)

المساقاة لغة :مفاعلة من السقی، لان اھل الحجاز اکثرحاجة شجرھم الی السقی،لانھم یستقون من الاٰبار فسمیت بذالک.

واصطلاحا:دفع الشجرالی من یصلحه بجزء من ثمرة اماحکم المعاملة الصحیحة (عند من یجیزھا)فالانواع منھا:ان کل ماکان من عمل المعاملة ممایحتاج الیه الشجر،اولکرم ،والرطاب،واصول الباذنجان من:السقی واصلاح النھر، والحفظ،

والتلقيح للنخل، فعلى العامل لانها من توابع المعقود عليه فيتناوله العقد، وكل ما كان من باب النفقة على الشجر والكرم ـــ والشجر والرطاب ونصب العرايش ونحو ذلك فعليهما على قدر حقيهما لان العقد لم يتناوله، لا مقصوداً، ولاضرورة وكذالك الجذاذ والقطاف لان ذالك يكون بعد انتهاء العمل فلايكون من حكم عقدالمعاملة.

منها: ان يكون الخارج بينهما على الشرط.

منها:انه اذالم يخرج الشجر شيئافلاشيء لواحد منهما.

منها:ان هذالعقدلازم من الجانبين ،حتى لايملك احدهما الامتناع والفسخ من غيررضاصاحبه الامن عذر.

منها:جواز الزيادة على الشرط والحط عنه وانعدم الجوازوالاصل فيه مامرفى كتاب المزارعة ان كل موضع احتمل انشاء العقد احتمل الزيادة والا فلا،والحط جائز فى الموضعين واصله بالزيادة فى الثمن والمثمن فاذادفع نخلابالنصف معاملة فخرج الثمر،فان لم يتناه عظمه جازت الزيادة منهماايهماكان لان الانشاء للعقد فى هذه الحالة ،فكانت الزيادة جائزة.

ولوتناهى عظم البسرجازت الزيادة من العامل لرب الارض شيئا،ولاتجوز الزيادة من رب الارض للعامل شيئالان هذه الزيادة فى الاجرة لان العامل اجيروالمحل لايحتمل الزيادة.

منها:ولاية جبرالعامل على العمل الامن عذر.

منها:ان العامل لايملك ان يدفع الى غيره معاملة الااذاقال له رب الارض اعمل فيه برايك لان الدفع الى غيره اثبات الشركة فى مال غيره بغيره اذنه فلايصح.

واماالشرط المصححةلهاعلى قول من يجيزها۔الخ

منها:ان يكون العاقدين عاقلين ،فاماالبلوغ فليس بشرط وكذالحريةالخ

منها:الايكونامرتدين فى قول ابى حنيفةعلى قياس قول من اجاز المعاملة ،حتى لوكان احدهمامرتداوقعت المعاملة ثم ان كان المرتد هو الدافع ،فان اسلم ،فالخارج بينهم على الشرط وان قتل اومات على الردة اولحق ،فالخارج بين الدافع المسلم وبين ورثته العامل المرتد ،على الشرط بالاجماع ۔الخ

هذااذاكانت المعاملة بين مسلم ومرتد ،فاما ان كانت بين مسلمين ثم ارتدااوارتد احدهما فالخارج على الشرط ـــ ويجوز معاملة المرتدة دفعاواخذابالاجماع .

ومنها:ان يكون المدفوع من الشجرالذى فيه ثمرة معاملة فيمايزيد ثمرة بالعمل فان كان المدفوع نخلافيه طلع او بسرقد احمراواخضرالاانه لم يتناه عظمه جازت المعاملة وان كان قد تناهى عظمه الا انه لم برطب فالمعاملة فاسدةلانه اذاتناهى عظمه لايؤثر فيه العمل بالزيادة عادة فلم يوجد العمل المشروط عليه فلايستحق الخارج بل يكون كله لصاحب النخل .

ومنها:ان تكون حصة كل واحد منهما من بعض الخارج مشاعامعلوم القدر.

ومنها:ان یکون الخارج لهما فلو شرطا ان یکون لاحدهما فسدت۔۔الخ

ومنها:ان یکون محل العمل وهو الشجر معلوما۔۔الخ

ومنها:التسلیم الی العامل وهو التخلیة حتی لو شرطا العمل علیهما فسدت لانعدام التخلیة فاما بیان المدة فلیس بشرط لجواز المعاملة استحسانا ویقع علی اول ثمرة تخرج ه فی اول السنة ۔۔الخ۔۔۔ ولو دفع ارضا لیزرع فیها الرطاب او دفع ارضا فیها اصول رطبة نابتة ولم یسم المدة فان کان شیئا لیس لابتداء نباته ولا لانتهاء جذه وقت معلوم فالمعاملة فاسدة وان کان وقت جذه معلوم یجوز ویقع علی جذه الاولی کما فی الشجرة المثمرة.

الجواب صحیح:مفتی عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ　　　　　واللہ اعلم بالصواب:شفقت اللہ

۴ ربیع الاول ۱۴۳۵ھ　　　　　فتویٰ نمبر:۳۹۰۴

﴿"میں خرید لوں گا" بیع نہیں ہے بلکہ وعدہ بیع ہے﴾

﴿سوال﴾ حضرت مفتی صاحب:السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔میرے پاس ایک گاہک آکر یہ کہتا ہے کہ آپ کچھ جوتے مثلاً دوسو جوڑے اعلیٰ کوالٹی کے الگ کرلیں میں ایک اور گاہک لاؤں گا جو ان کو خرید لے گا اگر کچھ خرید لئے اور کچھ بچ گئے تو بقیہ میں خود خرید لونگا اور اگر اس نے بالکل نہ خریدے تو میں بھی نہیں خریدوں گا،آیا یہ معاملہ درست ہے یا نہیں؟

﴿جواب﴾ مذکورہ معاملہ کی حیثیت صرف وعدہ کی ہے،ابھی تک مستقل بیع نہیں ہے اور اس میں کوئی خرابی نہیں ہے۔

الجواب صحیح:عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ　　　　　واللہ اعلم:عبدالرحمٰن غفرلہ

۲۴ ربیع الاول ۱۴۳۰ھ　　　　　فتویٰ نمبر:۲۰۷۶

﴿آٹے کے بدلے آٹا اُدھار لینا﴾

﴿سوال﴾ ہمارے علاقے میں یہ دستور چلا آرہا ہے کہ پڑوسی ایک دوسرے کو گھریلو اشیاء مثلاً آٹا،چینی،پتی اور گھی وغیرہ قرض دیا کرتے ہیں جبکہ وزن وغیرہ کچھ نہیں کیا کرتے،البتہ برتن کا حساب ضرور ہوتا ہے،تاہم برتنوں کی بھرائی میں فرق یعنی کمی،زیادتی کا احتمال ہوا کرتا ہے اور کبھی کبھار برتن کی مقدار کے حساب سے ہٹ کر محض تخمیناً مذکورہ لین دین ہوتا ہے،کیا شرعی اعتبار سے مذکورہ دونوں صورتیں درست ہیں؟　　　　　مستفتی:عبدالحمید صاحب

﴿جواب﴾ پڑوسیوں کا مندرجہ بالا معاملہ اگر باقاعدہ ناپ تول کے ساتھ ہو تو درست

ہے، اسی طرح اگر کسی برتن کے ذریعے ناپ کر (اندازہ کر کے) مذکورہ اشیاء کا تبادلہ کیا جائے جس کا مقررہ وقت تک ضائع ہو جانے کا اندیشہ نہ ہو تو جائز ہے مثلاً گھر کے کسی برتن سے ناپ کر کے دیدیا اور پھر اسی برتن سے ناپ کر واپس وصول کر لیا۔

گندم، آٹا وغیرہ کا تھوڑی مقدار میں تبادلہ کرنا اگرچہ اندازے سے ہی ہو، ناپ تول اور وزن کر کے نہ ہو، جیسے اگر ایک کلو سے کم گندم غلہ وغیرہ اندازے سے ایک دوسرے کو دیا جائے تو بھی جائز ہے۔

لمافی الدرمع الرد:(۵/۱۶۶،طبع سعید)

وفی الاشباہ:کل قرض جرنفعاً حرام۔ وفیہا استقراض العجین وزنا یجوز وینبغی جوازہ فی الخمیر بلا وزن سئل رسول اللہ ﷺ عن خمیرۃ یتعاطاہا الجیران أیکون ربا فقال "ما راٰہ المسلمون حسنا فہو عنداللہ حسن وما راٰہ المسلمون قبیح فہو عنداللہ قبیح"۔

وفی الشامیۃ:واحترز بالوزن عن المجازفۃ،فلا یجوز بحر۔

ولمافی التنویر مع الدر:(۷/۲۰۶-۲۰۷،طبع سعید)

(وحل)بیع ذلک(متماثلا)لامتفاضلا(وبلا معیار شرعی)اذ الشرع لم یقدر المعیار بالذرۃ وبمادون نصف صاع(کحفنۃ بحفنتین)وثلاث وخمس مالم یبلغ نصف صاع۔

ولمافی الہدایۃ:(۳/۲۲،طبع رحمانیہ)

ویجوز بانا بعینہ لا یعرف مقدارہ وبوزن حجر بعینہ لا یعرف مقدارہ، لان الجہالۃ لا تفضی الی المنازعۃ لما انہ یتعجل فیہ التسلیم فیندر ہلاکہ قبلہ۔

الجواب صحیح:عبدالرحمٰن عفااللہ عنہ　　　واللہ اعلم:محمد شریف حسین چترالی عفااللہ عنہ

۲۳ ربیع الثانی ۱۴۲۷ھ　　　فتویٰ نمبر:۱۸۰

﴿ادھار کا ایک مسئلہ﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام دریں مسئلہ کہ زید نے خالد کو حیدرآبادی چپلیں بیس ہزار روپے میں فروخت کیں اور کہا کہ ایک ماہ کے اندر رقم ادا کر دینا لیکن دس دن کے بعد زید خالد کے پاس آیا اور کہا کہ آپ مجھے ابھی رقم دیدیں اور میں اس رقم میں سے پانچ سو روپے آپ کے لئے چھوڑ رہا ہوں، کیا اس طرح کرنا جائز ہے؟　　　مستفتی:افضال احمد،کورنگی

﴿جواب﴾ دین میں بشرط تعجیل (یعنی یہ شرط لگانا کہ مجھے ابھی ادا کر دو) کمی کرنا جائز نہیں کیونکہ دائن پیشگی لینے کے واسطے رقم چھوڑ رہا ہے اور مدیون بھی اس وجہ سے رقم کم ادا کر رہا ہے کہ

اس سے مقررہ وقت سے پہلے مطالبہ کیا جارہا ہے تو رقم اجل کا عوض ہوئی اور اجل کا معاوضہ لینا حرام ہے، لہٰذا مذکورہ صورت میں خالد کیلئے زید جو پانچ سو روپے چھوڑ رہا ہے حلال نہیں۔

لمافی الهداية:(۲/۲۵۶،طبع رحمانیه)

ولوكانت له الف مؤجلة فصالحه على خمس مائة حالة لم يجز لان المعجل خير من المؤجل وهوغير مستحق بالعقدفيكون بازاء حطه عنه وذلك اعتياض عن الاجل وهوحرام.

ولمافي الكفاية مع فتح القدير:(۷/۷۷،طبع رشيديه)

(قوله:اعتياض عن الاجل وهوحرام)وهذالان الاجل صفة كالجودة والاعتياض عن الجودة لايجوزفكذاعن الاجل ألاترى أن الشرع حرم ربا النسئة وليس فيه الامقابلة المال بالاجل شبهة فلان يكون مقابلة المال بالاجل حقيقة حراماأولى..... والاصل فيه ان الاحسان متى وجدمن الطرفين يكون محمولاً على المعاوضة كهذه المسئلة فان الدائن اسقط من حقه خمس مائة والمديون اسقط حقه في الاجل في الخمس المائة الباقية فيكون معاوضة بخلاف مااذاصالح من ألف على خمس مائة فانه يكون محمولا على اسقاط بعض الحق دون المعاوضة لان الاحسان لم يوجدالامن طرف رب الدين.

ولمافي التنوير مع الدر:(۵/۶۳۰ طبع سعيد)

(أوعن ألف مؤجل على نصفه حالا! ... والاصل ان الاحسان ان وجدمن الدائن فاسقاط وان منهمافمعاوضة.

وفي الشامية:(قوله:حالا)لانه اعتياض عن الاجل وهو حرام......(قوله فمعاوضة)أى ويجرى فيهاحكمهافان تحقق الرباأوشبهته فسدت والاصحت ط قال طيان صالح على شيئي هوأدون من حقه قدراًأووصفاًأووقتا وان منهما:أى من الدائن والمدين بان دخل في الصلح مالايستحقه الدائن من وصف كالبيض بدل السودأوماهوفي معنى للوصف كتعجيل للمؤجل أوعن جنس بخلاف جنسه(وكذافي البحرالرائق: (۷/۱۵۶، طبع سعيد)

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ   واللہ اعلم: صلاح الدین ڈیروی

۱۴ جمادی الثانی ۱۴۲۷ھ   فتویٰ نمبر: ۴۰۰

﴿اناج کو اناج کے بدلے ادھار لینا﴾

﴿سوال﴾ ہمارے علاقے میں یہ معاملہ بہت عام ہے کہ کسی کی فصل جلدی پک جاتی ہے اور کسی کی بعد میں، اب ہوتا یہ ہے کہ جس کی فصل پہلے تیار ہوئی تو ضرورتمند لوگ اس سے اناج لیتے ہیں اس شرط کے ساتھ کہ جب ہماری فصل تیار ہوگی تو آپ کو اتنا ہی واپس کردینگے، براہ کرم مسئلہ کی وضاحت فرمائیں کہ از روئے شرع جائز ہے یا نہیں؟ کہیں اس میں ربا تو نہیں؟

﴿جواب﴾ مذکورہ معاملہ شریعت کی رو سے درست ہے بشرطیکہ باقاعدہ وزن کر کے دیا اور

لیا جائے یعنی تخمینے اور اندازے سے ایسا معاملہ نہ کیا جائے جس میں کمی بیشی کا بھی احتمال ہوتا ہے اگر وزن کر کے برابر، برابر لین دین کیا جائے تو کوئی سود نہیں ہے۔ واللہ اعلم۔

لما فی الدر مع الرد:(۵/۱۶۷ مطبع سعید)

وفیها استقراض العجین وزنا یجوز وینبغی جوازه فی الخمیرة بلا وزن سئل رسول الله ﷺ عن خمیرة یتعاطاها الجیران ایکون ربا؟ فقال "ما رآه المسلمون حسنا فهو عندالله حسن وما رأه المسلمون قبیحا فهو عندالله قبیح.

وفی الشامیة:(قوله استقراض العجین وزنا یجوز)هو المختار مختار الفتاوی واحترز بالوزن عن المجاوزة، فلا یجوز. بحر ط.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ واللہ اعلم: محمد شریف حسین عفا اللہ عنہ

۲۹ جمادی الثانی ۱۴۲۷ھ فتویٰ نمبر: ۵۰۶

﴿شیئرز کی بیع کا حکم﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلے کے بارے میں کہ اسٹاک ایکسچینج میں جو شیئرز بکتے ہیں اُنہیں زائد قیمت پر بیچ کر منافع حاصل کرنا جائز ہے یا نہیں؟ مستفتی: ولید کورنگی

﴿جواب﴾ مذکورہ شیئرز کو زائد قیمت پر بیچنا اور نفع حاصل کرنا جائز ہے بشرطیکہ اُس کمپنی کے اثاثے سیال (Liquid assets) یعنی نقد رقم نہ ہوں، بلکہ فکسڈ (Fixed assets) اثاثے ہوں، یعنی کمپنی نے کوئی بلڈنگ وغیرہ بنالی ہو، یا زمین وغیرہ خریدی ہو، غرض کوئی بھی (جائز) کاروبار کھول لیا ہو، نیز اسٹاک ایکسچینج (Stock exchenge) سے شیئرز کی خرید و فروخت کے لئے ایک شرط یہ بھی ہے کہ کمپنی کی بنیاد حلال کاروبار پر رکھی گئی ہو یعنی سود، قمار وغیرہ کے لئے نہ بنائی گئی ہو لیکن بعد میں اگر کسی درجہ میں وہ کمپنی حرام کام جیسے سود وغیرہ میں ملوث ہو (لیکن اُس کا اکثر لین دین حلال امور ہی پر مشتمل ہو) تو شرط یہ ہے کہ شیئرز ہولڈر کمپنی کے سالانہ میٹنگ (GeneralMeeting) میں آواز اٹھائے "کہ ہم سود وغیرہ کے (حرام) کاروبار کو جائز نہیں سمجھتے" اور اس کی اجازت نہیں دیتے۔

چوتھی شرط جو دراصل تیسری شرط ہی کا ایک حصہ ہے یہ کہ "منافع کی تقسیم کے موقع پر شیئرز ہولڈر پر لازم ہے کہ وہ انکم اسٹیٹ (income state) سے معلوم کرلے کہ آمدنی کا کتنا فیصد حصہ ناجائز طور پر حاصل ہوا ہے مثلاً سودی ڈپازٹ سے حاصل ہوا ہے تو اسی نسبت

اپنے پاس حاصل شدہ نفع سے صدقہ کردے۔

لمافی قوله تعالیٰ:(سورة البقرة،ایت۲۷۶)﴿یمحق الله الرّبا ويربی الصّدقات..... الأیة﴾

الجواب صحیح:عبدالرحمٰن عفااللہ عنہ — واللہ اعلم:محمد شریف حسین عفااللہ عنہ

۱۴۲۷ھ — فتوی نمبر:۵۱۱

﴿قسطوں کی ادائیگی میں تاخیر پر جرمانہ لینا ناجائز اور حرام ہے﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام مندرجہ ذیل مسئلہ کے بارے میں کہ میں مسمی امان اللہ کنڈی پرانی اور نئی گاڑیوں کا کاروبار کرتا ہوں اور قسطوں پر گاڑی دیتا ہوں کچھ نقد اور کچھ قسط پر پھر کوئی قسط اگر مقررہ تاریخ سے آؤٹ ہو جائے تو پانچ سو روپے جرمانہ ہوتا ہے جس کو ہم لیٹ فیس کہتے ہیں کیا یہ فیس لینا جائز ہے؟ مستفتی:امان اللہ کنڈی

﴿جواب﴾ صورت مسئولہ میں گاڑی بیچنے والے کو یہ حق حاصل ہے کہ اگر خریدار نے مقررہ وقت پر قسطیں ادا نہ کی تو اپنی قسطیں قانونی ذرائع سے وصول کرلے یا سودا کرتے وقت قسطوں کی وصولی کے لئے ضمانت طلب کرنے کی شرط لگالے یا خریدار کی کوئی چیز اپنے پاس بطور رہن رکھوائے تاکہ خریدار اس رہن کے دباؤ کی وجہ سے وقت مقررہ پر قسط ادا کرنے کا اہتمام کرے لیکن بائع کو یہ حق ہرگز حاصل نہیں ہے کہ مقررہ وقت پر قسط ادا نہ کرنے کی صورت میں پانچ سو روپے جرمانہ وصول کرلے،اس طرح کرنا حرام و ناجائز ہے اور سود میں داخل ہے۔

لمافی البحر الرائق:(۶/۱۱۴-۱۱۵،طبع سعید)

لان للأجل شبها بالمبيع الاترى انه يزاد فی الثمن لأجل الأجل ثم قال بعد سطور:ان الاجل فی نفسه ليس بمال فلايقابله شیئی حقيقة اذالم يشترط زيادة الثمن بمقابلته قصدا ويزاد فی الثمن لاجله اذاذكر الاجل بمقابلة زيادة الثمن قصدا فاعتبر مالا فی المرابحة احترازا عن شبهة الخيانة ولم يعتبر مالا فی حق الرجوع عملا بالحقيقة.

ولمافی الهداية:(۳/۲۵۷،طبع رحمانيه)ذلك اعتياض "عن الاجل وهو حرام.

ولمافی الهداية:(۳/۷۸،باب المرابحة والتولية،طبع رحمانيه)

الايرى انه يزاد فی الثمن لاجل الاجل(باب المرابحة والتولية.

ولمافی الشامی:(۷/۳۶۲،طبع امداديه)

قوله:(لزم كل الثمن حالا)لان الاجل فی نفسه ليس بمال فلايقابله شیئی حقيقة اذالم يشترط زيادة الثمن بمقابلته قصدا،ويزاد فی الثمن لاجله اذاذكر الاجل بمقابلة زيادة

الثمن قصداً، فاعتبر ما الأقل في المرابحة احترازاً عن شبهة الخيانة، ولم يعتبر ما الأقل في حق الرجوع عملاً بالحقيقة. بحر.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ　　　واللہ اعلم: صلاح الدین ڈیروی

۲۱ ربیع الاول ۱۴۲۷ھ　　　فتویٰ نمبر: ۵۷

﴿ایک ملک کی کرنسی کے تبادلہ میں تفاضل ناجائز ہے﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں مفتیان اس مسئلہ کے بارے میں کہ زید کو بس کنڈیکٹر ہونے کی بناء پر دوران سفر مسافروں سے کرایہ لینے کے وقت ریزگاری کی زیادہ ضرورت پڑتی ہے تو وہ کسی دوکاندار وغیرہ کو ایک ہزار دس روپے نوٹ کی شکل میں دے کر اس سے صرف ایک ہزار روپے ریزگاری کی شکل میں لیتا ہے، اسی طرح زید عیدی وغیرہ بانٹنے یا کسی اور غرض کے لئے دوکاندار وغیرہ کو ایک ہزار دس روپے پرانے نوٹ کی شکل میں دے کر اس سے صرف ایک ہزار روپے نئے نوٹوں کی شکل میں لیتا ہے تو یہ معاملہ شرعاً کیسا ہے؟　　مستفتی: محمد معاذ گاشکوڑ سواتی

﴿جواب﴾ مذکورہ دونوں صورتوں میں یہ معاملہ سود ہونے کی بناء پر شرعاً ناجائز اور حرام ہے کیونکہ قانونی طور پر نئے اور پرانے نوٹ، اسی طرح سکوں اور نوٹوں کی قیمت برابر ہے، البتہ اگر سخت ضرورت ہو تو یہ صورت اختیار کی جائے کہ ایک ہزار دس روپے کے پرانے نوٹوں کے عوض ایک ہزار روپے کے نئے نوٹوں کے ساتھ اور کوئی معمولی چیز وصول کرے۔

اسی طرح ایک ہزار دس روپے کے نوٹوں کے عوض ایک ہزار روپے کے سکوں کے ساتھ اور کوئی معمولی چیز وصول کرے مثلاً: ایک یا دو روپے کی ٹافی یا پان یا چاکلیٹ وغیرہ دیدیں تو یہ اگرچہ حیلہ ہی ہے لیکن ضرورت کی خاطر کرنے کی گنجائش معلوم ہو رہی ہے۔

لما في الشامي: (۲۱۲/۷، کتاب البيوع، باب الربا طبع امدادیه)

قوله: (وجيد مال الربا ورديئه سواء) اى فلا يجوز بيع الجيد بالردى، مما فيه الربا الا مثلاً بمثل لاهدار التفاوت في الوصف هداية.

ولما في تبيين الحقائق: (۵۵۱/۴، كتاب الصرف طبع سعيد)

قال رحمه الله تعالى: فلو تجانسا شرط التماثل والتقابض وان اختلفا جودة وصياغة والاشرط التقابض يعني اذا بيع جنس الاثمان بجنسه كالذهب بالذهب او الفضة بالفضة يشترط فيه التساوي والتقابض قبل الافتراق ولا يجوز التفاضل فيه وان اختلفا في الجودة والصياغة.

ولما فی الهدایة:(۲/۱۱۱،کتاب الصرف طبع رحمانیه)

فان باع فضة بفضة أو ذهبا بذهب لا یجوز الا مثلا بمثل وان اختلفت فی الجودة والصیاغة،لقوله علیه السلام الذهب بالذهب مثلا بمثل وزنا بوزن یدا بید والفضل ربوا (الحدیث)وقال علیه السلام :جیدها وردیها سواء.

ولما فی شرح فتح القدیر:(۷/۱۴۰،کتاب الصرف طبع رشیدیه کوئٹه)

ولو تبایع فضة بفضة الخ ولو باع عشرة دراهم وشیئا معه بخمسة عشر درهما فاما ان یکون له قیمة أولا ،والأول اما ان تبلغ قیمته الفضة أولا،فان کان مما لا قیمة له کالتراب مثلا لا یجوز البیع لأن الزیادة لم یقابلها عوض فتحقق الربا،وان کانت قیمته تبلغ الفضة کثوب یساوی خمسة جاز بلا کراهة وان لم تبلغ فهو جائز مع لکراهة.

الجواب صحیح :عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ واللہ اعلم بالصواب :صادق محمد سواتی غفرلہ ولوالدیہ

۲۰ محرم الحرام ۱۴۳۲ھ فتویٰ نمبر:۲۷۷۶

﴿پچاس روپے سے کم ایزی لوڈ کرنے پر ایک روپیہ سروس چارج لینا جائز ہے﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علمائے کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ جو لوگ ایزی لوڈ کا کام کرتے ہیں تو جب کوئی پچاس (50) روپے سے کم لوڈ کروائے تو ان سے ایک (۱) روپیہ سروس چارج لیتے ہیں یعنی اگر کوئی تیس (30) روپے کا ایزی لوڈ کروائے تو اس سے تیس (30) روپے لیکر انتیس (29) روپے کا ایزی لوڈ کرتے ہیں۔اسی طرح پچاس (50) روپے سے کم میں سہولت فراہم کرنے کا (۱) روپیہ سروس چارج لیتے ہیں۔ مستفتی:سعید الرحمٰن کراچوی

﴿جواب﴾ صورت مسئولہ میں دوکانداروں کا خریداروں سے ایک (۱) روپیہ لینا جائز ہے اور یہ خریداروں کو ایزی لوڈ کی سہولت فراہم کرنے کی اجرت ہے،البتہ اس بات کا لحاظ رہے کہ خریداروں کو تحریری یا زبانی طور پر بتانا ضروری ہے یا عرف عام میں یہ مشہور ہو چکا ہو کہ دوکاندار پچاس (50) روپے سے کم ایزی لوڈ کرنے پر ایک (۱) روپیہ سروس چارج لیتے ہیں یعنی مثلاً تیس (30) روپے کا ایزی لوڈ کروانے پر انتیس (29) روپے کا لوڈ کرتے ہیں اور ایک روپیہ سروس چارج لیتے ہیں۔

لما فی قوله تعالیٰ:(سورة المطففین،آیت ۱-۲-۳)

ویل للمطففین الذین اذا اکتالوا علی الناس یستوفون واذا کالوهم اووزنوهم یخسرون..... الآیة.

ولما فی الشامی:(۵/۶، کتاب الاجارة،طبع سعید)

قوله:(کون الاجرة والمنفعة معلومتین)اماالاول فکقوله بکذادراهم اودنانیرالخ.

ولما فی الهدایة:(۲۹۵/۳،کتاب الاجارات،طبع رحمانیه)

الاجارة عقدیردعلی المنافع بعوض وقدشهدت بصحتهاالآثاروهی قوله علیه السلام اعطواالاجیراجره قبل ان یجف عرقه.

ولما فی الهدایة مع حاشیته:(۱۹/۳-۲۰،کتاب البیوع،طبع رحمانیه)

(ولهذاینعقدبالتعاطی)والمرادههنااعطاء المبیع والثمن من الجانبین بلاایجاب وقبول وقیل یکفی فی التعاطی الاعطاء من احدالجانبین کمن وضع فلسااواخذقطعة حلواء مقدرة به.

الجواب صحیح:عبدالرحمٰن عفااللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب:محمد شعیب پشاوری

۱۸صفرالخیر۱۴۳۲ھ — فتویٰ نمبر:۲۸۸۱

﴿میڈیکل سٹور کھولنے کا سرٹیفیکیٹ کرایہ یا عاریت پر دینا جائز نہیں﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام کہ میرا میڈیکل سٹور ہے جو میں نے باقاعدہ ایک سالہ ڈپلومہ حاصل کر کے اور حکومت سے منظوری لے کر کھولا ہے جب کہ میرے علاقے میں کچھ دیگر میڈیکل سٹورز ہیں جن کے پاس منظور شدہ سرٹیفیکیٹ نہیں ہیں اور جب سرکاری افسران تفتیش کے لئے آتے ہیں تو یہ حضرات مجھ سے میرا سرٹیفیکیٹ کرایہ پر لے کر جاتے ہیں اور افسران کو دکھا کر واپس لے آتے ہیں۔

پوچھنا یہ ہے کہ آیا اس طرح سرٹیفیکیٹس کو کرایہ پر دینا جائز ہے یا نہیں؟ نیز اگر عاریت پر دے تو کیا تب بھی جائز ہوگا یا نہیں؟ جبکہ وہ میرے ہی سرٹیفیکیٹ کی بنیاد پر اپنی دکان چلا رہے ہیں۔

﴿جواب﴾ صورت مسئولہ میں سرٹیفیکیٹ کرایہ یا عاریت پر دینا جائز نہیں کیونکہ اس میں جھوٹ، دھوکہ اور ملکی قانون کی خلاف ورزی ہے اس لئے کہ سوال میں جو مذکور ہے کہ باقاعدہ ایک سالہ ڈپلومہ حاصل کر کے اور حکومت سے منظوری لے کر میڈیکل سٹور کھولا گیا ہے تو اس سے پتہ چلتا ہے کہ میڈیکل سٹور کھولنے کے لیے جو سرٹیفیکیٹ درکار ہوتا ہے وہ خاص تعلیمی صلاحیت کا امتحان پاس کرنے پر ملتا ہے، لہٰذا کسی ایسے شخص کو جو اس صلاحیت کا حامل نہ ہو دینا جائز نہیں کیونکہ اس میں جھوٹی گواہی بھی ہے۔

لمافی قوله تعالیٰ:(سورة النساء،آیت ۵۹)

یاایهاالذین اٰمنوا أطیعوا الله وأطیعوا الرسول وأولی الأمر منکم.....الأیة۔

ولمافی قوله تعالیٰ:(سورة الحج،آیت ۳۰)﴿واجتنبوا قول الزور.....الأیة﴾

ولمافی صحیح البخاری:(۱/۳۶۲،باب ماقیل فی شهادة الزور،طبع قدیمی)

عن انس قال سئل النبی صلی الله علیه وسلم عن الکبائر فقال.....وشهادة الزور.

ولمافی الشامی:(۲/۲۶۳،مطلب فی وجوب طاعة الامام،طبع سعید)

(قوله افترض علیه اجابته)والاصل فیه قوله تعالیٰ واولی الامر منکم وقال صلی الله علیه وسلم "اسمعوا واطیعوا ولو امر علیکم عبد حبشی اجدع" وروی "مجدع" وعن ابن عمر انه علیه الصلاة والسلام قال "علیکم بالسمع والطاعة لکل من یؤمر علیکم ما لم یأمرکم بمنکر".

الجواب صحیح:عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب:محمد شعیب پشاوری

۲۳محرم الحرام ۱۴۳۲ھ — فتویٰ نمبر:۲۸۱۳

﴿ادھار فروختگی پر زیادہ قیمت مقرر کرنے کا حکم﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام درج ذیل مسئلہ کے بارے میں کہ ایک شخص کے پاس لوگ اپنی ضرورت کے لئے آتے ہیں تو وہ ان سے پوچھتا ہے کہ تمہیں کیا چیز چاہیے تو وہ انکی ضرورت کے مطابق چیز خرید کر ان لوگوں کو معینہ مدت تک اصل رقم سے زائد رقم پر دیتا ہے مثلاً ۳۰۰۰ روپے کا موبائل خرید کر ضرورت مند سے کہتا ہے کہ مجھے تین ماہ میں ۴۵۰۰ روپے ادا کرو گے لیکن اگر معینہ مدت سے زائد مدت گزر جائے تب بھی وہ اتنی ہی رقم لیتا ہے جو شروع میں طے ہو چکی تھی (یعنی ۴۵۰۰)(۱) کیا یہ معاملہ شرعاً درست ہے؟(۲) کیا ادھار فروختگی کی صورت میں نقد فروختگی کے مقابلے میں مال کی قیمت زیادہ مقرر کرنا ربوا (سود) کے دائرے میں آتا ہے یا نہیں؟

﴿جواب﴾(۱) صورت مسئولہ میں یہ معاملہ شرعاً درست ہے بشرطیکہ یہ شخص کاروباری ہونے کی حیثیت سے معروف ہو یا ضرورت مند جانتا ہو کہ یہ شخص وکیل کی حیثیت سے میرے لئے نہیں خریدتا بلکہ کاروباری کی حیثیت سے خریدتا ہے اور یہ بھی واضح رہے کہ اس صورت میں ضرورت مند لینے کا پابند نہیں ہے۔

(۲) ادھار فروختگی کی صورت میں نقد فروختگی کے مقابلے میں مال کی قیمت زیادہ مقرر کرنا ربا (سود) کے دائرے میں نہیں آتا بلا شبہ ادھار فروختگی کی صورت میں عموماً قیمت زیادہ ہوتی

ہے لیکن اس بات کا خیال رہے کہ بہت مہنگے دام نہ ہوں یعنی ضرورت مند کی مجبوری کا غلط فائدہ اٹھانے کے مترادف نہ ہو نیز مدت و قیمت اس درجہ متعین ہو جائے کہ نزاع یعنی جھگڑے کا اندیشہ بھی نہ رہے۔

لمافی البحر الرائق:(۱۱۵/۶،باب المرابحة والتولية،طبع سعيد)

الأجل في نفسه ليس بمال ولا يقابله شيء من الثمن حقيقة اذا لم يشترط زيادة الثمن بمقابلته قصداً،ويزاد في الثمن لأجله اذا ذكر الأجل بمقابلة زيادة الثمن قصداً.انتهى.

ولمافی بدائع الصنائع:(۱۸۷/۵،طبع سعيد)

لا مساواة بين النقد والنسيئة لأن العين خير من الدين والمعجل أكثر قيمة من مؤجل.

ولمافی الخلاصة:(۲۰/۳،جنس آخر فيما يتعلق بالثمن،طبع رشيديه)

رجل باع شيئاً على انه بالنقد بكذا وبالنسيئة بكذا والىٰ شهر بكذا والىٰ شهرين بكذا لم يجز.اھ.

ولمافی الهداية:(۷۸/۳،باب المرابحة والتولية،طبع رحمانيه)

لأن للأجل شبهاً بالمبيع الا يرىٰ انه يزاد في الثمن لأجل الأجل.

ولمافی حاشية الهداية:(۷۸/۳،باب المرابحة والتولية،طبع رحمانيه)

ومانحن فيه هو ان يقول ان اجلتني مدة كذا فثمنه يكون بزيادة مقدار فيثبت زيادة الثمن بالشرط.

الجواب صحیح:عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب:محمد شعیب پشاوری

۲۰محرم الحرام ۱۴۳۲ھ — فتویٰ نمبر:۲۷۸۴

﴿قسطوں کا مسئلہ﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں حضرات علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک ادارہ اپنے ملازمین کو قسطوں پر کچھ اشیاء (موٹر سائیکل،فریج وغیرہ) دیتا ہے اور ان اشیاء کی قیمت مارکیٹ ریٹ کے برابر یا کم ہوتی ہے لیکن اس کی شرطوں میں ایک شرط یہ بھی ہے کہ اگر کسی آدمی نے قسط کی ادائیگی میں تاخیر کی تو اس پر جرمانہ عائد کیا جائے گا،دریافت طلب امر یہ ہے کہ ایک آدمی کو معلوم ہے کہ ان کی یہ شرط فاسد ہے لیکن پھر بھی وہ اس ادارے سے معاملہ کر لیتا ہے کہ میں کبھی بھی قسط کی ادائیگی میں تاخیر نہیں کروں گا،آیا اس طرح کا معاملہ کرنا شریعت کی رو سے جائز ہے یا ناجائز؟

﴿جواب﴾ قسطوں کی ادائیگی میں تاخیر کی وجہ سے جرمانہ لینا سود کے حکم میں ہے،معاملہ کے شروع میں باقاعدہ شرط کے درجہ میں اگر طے ہو تو اس سے پورا معاملہ سودی قرار پاتا ہے،

شرعاً اسکی ہرگز گنجائش نہیں ہے، اب کوئی اس توقع پر شروع میں معاملہ کرے کہ سود دینے کی نوبت نہیں آئے گی، اس سوچ سے یہ معاملہ جائز نہیں ہوسکتا، یہ شیطانی دھوکہ ہے اس لئے کہ سودی معاملہ میں نہ صرف لینا دینا حرام ہے بلکہ محض معاملہ پر رضامندی بھی سود ہی کی طرح حرام ہے۔

لمافی البحر:(۱۱۲/۶،المرابحة والتولية،طبع سعيد)

لان للاجل شبيهابالمبيع الاترى انه يزادفى الثمن لاجل الاجل.....ان الاجل فى نفسه ليس بمال فلايقابله شىء حقيقة اذالم يشترط زيادة الثمن بمقابلته قصدا ويزادفى الثمن لاجله اذاذكرالاجل بمقابلة زيادةالثمن قصدافاعتبرمالافى المرابحة احترازا عن شبهة الخيانةولم يعتبرمالافى حق الرجوع عملابالحقيقة.

ولمافى الهداية:(۲۵۲/۳،الصلح فى الدين،طبع رحمانيه)

ولوكانت له الف مؤجلةفصالحه على خمسمائةحالةلم يجزلان المعجل خيرمن المؤجل وهوغيرمستحق بالعقدفيكون بازاء ماحطه عنه وذلك اعتياض عن الاجل وهوحرام.

ولمافى البحوث قضايافقهية معاصرة:(۱۰/۱،بيع بالتقسيط،طبع دارالعلوم كراچى)

امامايفعله بعض الناس من تحديدثمن البضاعة على اساس سعرالنقد،وذكرالقدر الزائد على اساس انه جزء من فوائد التاخير فى الاداء فانه رباصراح.

واللہ اعلم بالصواب: تاجدمحمود کھوسہ الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفااللہ عنہ

فتویٰ نمبر:۳۰۰۲ ۱۱ربیع الاول ۱۴۳۲ھ

﴿جنگل کی لکڑیاں اور درخت فروخت کرنے کا حکم﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اور مفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ جنگل کی لکڑیاں اور درخت کاٹ کے بیچنا کیسا ہے؟ جنگل جب حکومت اور محکمہ جنگلات کی ملکیت میں ہو بعض لوگ ایسا کرتے ہیں، شرعی نقطہ نظر سے اس کا کیا حکم ہے؟ مستفتی: نزاکت علی

﴿جواب﴾ درخت اور لکڑیاں اگر حکومت اور محکمہ جنگلات یا کسی شخص کی ذاتی ملکیت میں ہوں تو انکی خرید وفروخت ناجائز ہے اگر کسی کی ملکیت میں نہ ہوں تو جائز ہے، حکومت کی ملکیت ہو اور منع نہ کرے تب بھی گنجائش ہے۔

لمافی الشامی:(۴۲۰/۶،طبع:سعید کراچی)

والحطب فى ملك رجل ليس لأحدأن يحتطبه بغيراذنه،وان كان غيرملك فلابأس به،ولايضرنسبته الى قرية أوجماعة مالم يعلم أن ذلك ملك لهم،وكذلك الزرنيخ والكبريت والثمارفى المروج ولاودية مضمرات،ويملك المحتطب بمجردالاحتطاب

وان لم يشده ولم يجمعه.

ولمافي بدائع الصنائع:(۵/۱۴۶،طبع سعيد)

(ومنها)أن يكون مملوكالان البيع تمليك فلاينعقدفيماليس بمملوك كمن باع الكلأ وكذابيع الكمأوبيع صيدلم يوجدفي أرضه لاينعقدلأنه مباح غيرمملوك لانعدام سبب الملك فيه وكذابيع الحطب والحشيش والصيودالتي في البراري والطيرالذي لم يصدفي الهواء والسمك الذي لم يوجدفي الماء.

ولمافي البحر:(۶/۷۷،طبع سعيد)

(قوله والمراعي واجارتها)اي لايجوزبيع الكلأواجارته اماالبيع فلأنه وردعلي ما لا يملكه لاشتراك الناس فيه بالحديث:الناس شركاء في ثلاث في الماء والكلأ والنار.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفااللہ عنہ واللہ اعلم بالصواب: طاہرزمان راولپنڈی

۲۲ صفرالخیر ۱۴۳۲ھ فتویٰ نمبر: ۲۸۹۷

﴿بل آف ایکسچینج (ہنڈی) کا کسی تیسرے کو بیچنے کا حکم﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلے کے بارے میں کہ ایک کمپنی نے اپنا مال دوسری کمپنی کو ۴، ماہ کے ادھار پر بیچا پھر دائن کمپنی کو رقم کی فوری ضرورت پڑ گئی تو اس نے قرضہ کا وثیقہ بینک کو فروخت کر دیا اور بینک سے اپنے دین سے ۵، فیصد کم رقم فوراً حاصل کر لی، اب بینک ۴، ماہ گزرنے کے بعد مدیون کمپنی سے پوری رقم وصول کرے گا، کیا شرعاً اس طرح کا معاملہ درست ہے یا نہیں؟ مستفتی: ایک نمازی ابوبکر مسجد

﴿جواب﴾ صورت مسئولہ میں دائن کمپنی اپنے دین کا مالک بینک کو بنا رہی ہے جو کہ غیر مدیون ہے اور یہ بیع الدین من غیر من علیہ الدین ہے اور نا جائز ہے۔

لمافي الشامي:(۴/۵۱۷، مطلب في بيع الجامكية،طبع ايچ ايم سعيد كمپني)

وعبارة المصنف في فتاواه سئل عن بيع الجامكية: وهوان يكون لرجل جامكية في بيت المال ويحتاج الى دراهم معجلة قبل ان تخرج الجامكية فيقول له رجل: بعتني جامكيتك التي قدرهاكذابكذاأنقص من حقه في الجامكية فيقول له. بعتك فهل البيع المذكورصحيح ام لالكونه بيع الدين بنقدأجاب اذاباع الدين من غيرمن هو عليه كماذكرلايصح.

ولمافي التنوير مع الدر:(۵/۶۴۲-۶۴۳ ،فصل في التخارج طبع ايچ .سعيد)

(وبطل الصلح ان خرج احدالورثة وفي التركة ديون بشرط ان تكون الدين لبقيتهم)لان تمليك الدين من غيرمن عليه الدين باطل.

ولمافی الهداية:(۲/۲۶۱،کتاب الصلح،طبع رحمانیه)

قال وان كان في التركة دين على الناس فادخلوه في الصلح على ان يخرجوا المصالح عنه ويكون الدين لهم فالصلح باطل لان فيه تمليك الدين من غير من عليه وهو حصة المصالح.

ولمافي بحوث في قضايا فقهية معاصرة:(۲/۱۰۳۵،مبحث بيع الدين والاوراق طبع دار العلوم)

بيع الدين من غير المديون :الصورة الثالثة من بيع الدين:ان يبيع الدائن دينه من طرف ثالث غير المديون،وان هذه الصورة وقع فيها اختلاف بين الفقهاء.فذهب الحنفية والحنابلة والظاهرية الى ان بيع الدين من غير من عليه الدين لايجوز.قال الامام محمدبن الحسن الشيباني:"لاينبغي للرجل اذاكان له دين ان يبيعه حتى يستوفيه،لانه غرر،فلايدري أيخرج أم لايخرج.وقال ابن حزم من الظاهرية:ولايحل بيع الدين يكون لانسان على غيره،لابنقدولابدين،لابعين ولابعرض،كان ببينة أو مقرابه أولم يكن،كان ذلك باطل.....ثم ان الذين منعوابيع الدين من غير المديون انمامنعواعن طريق البيع،امااذاوقع نقل الدين بطريق الحوالة،فانه جائزعندالجميع والفرق بين البيع والحوالة ظاهرجداًعلى مذهب الحنفية.فانهم قائلون بانه اذاتوى الحوالة بافلاس المحال عليه أوجحوده عندعدم البينة فان المحتال(الدائن الاصيل)ان يرجع على المحيل (المديون الاصلي)

الجواب صحیح:عبدالرحمٰن عفااللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب:نثاراحمد

۲۸محرم الحرام ۱۴۳۲ھ — فتویٰ نمبر:۲۸۵۳

﴿بل آف ایکسچینج (ہنڈی کا حکم)﴾

﴿سوال﴾ کیافرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میں ایک ٹرک ڈرائیور ہوں،پشاور سے کراچی تک ٹرک چلاتا ہوں،کمپنی مالکان ہمیں جو کرایہ ادا کرتے ہیں اس کی صورت یہ ہوتی ہے کہ بسا اوقات ہمیں ایک رسید دیتے ہیں جس کی ادائیگی چند دن بعد ہونا ہوتی ہے کہ کمپنی سے رقم فلاں تاریخ کو ملے گی لیکن رقم کا ملنا یقینی ہوتا ہے،اب اگر ہم اس رقم کا انتظار کریں تو ہمیں نقصان ہوتا ہے،لہذا ہم یہ رسید کسی شخص کو کم پیسوں میں فروخت کردیتے ہیں،مثلاً پچاس ہزار(۵۰۰۰۰) کی رسید ہوتی ہے،انچاس ہزار(۴۹۰۰۰) میں فروخت کردیتے ہیں، خریدار رسید دے کر ۵۰۰۰۰ وصول کرلیتا ہے،شریعت کی رو سے کیا یہ معاملہ درست ہے؟

﴿جواب﴾ قرض وصول کرنے سے پہلے دوسرے کو فروخت کرنا شرعاً ویسے بھی ممنوع ہے

جبکہ اس صورت میں درج شدہ رقم سے کم پیسوں میں فروخت کرنا سود بھی ہے لہذا یہ معاملہ ہرگز جائز نہیں ہے۔

لما فی ردالمحتار: (۵۱۷/۴، طبع سعید)

عبارة المصنف فی فتاواہ سئل عن بیع الجامکیة وہو ان یکون لرجل جامکیة فی بیت المال و یحتاج الی دراہم معجلة قبل ان تخرج الجامکیة فیقول لہ رجل: بعتنی جامکیتک التی قدرہا کذابکذا انقص من حقہ فی الجامکیة فیقول لہ بعتک فہل البیع المذکور صحیح ام لا لکونہ بیع الدین بنقد اجاب اذاباع الدین من غیر من ہو علیہ کما ذکر لا یصح قال مولانا فی فوائدہ وبیع الدین لا یجوز ولو باعہ من المدیون اووہبہ.

لمافی بحوث فی قضایافقہیة معاصرة: (۲۱/۱ طبع دارالعلوم کراتشی)

ولکن المشکلة انما تحدث من جہة ان الکمبیالیة قد اصبحت الیوم آلة قابلة للتداول وان حامل الکمبیالیة ہو الدائن الاصل ربما یبیعہا الی طرف ثالث باقل من المبلغ المکتوب علیہا طمعاً فی استعجال الحصول علی المبلغ قبل حلول الاجل وان ہذاالبیع یسمی خصم الکمبیالیة فکلما اراد حامل الکمبیالیة ان یتعجل فی قبض مبلغہا ذہب الی شخص ثالث وہو البنک فی عموم الاحوال وعرض علیہا الکمبیالیة والبنک یقبلہا بعدالتظہیر من الحامل ویعطی مبلغ الکمبیالیة لہذاالشکل غیرجائز شرعاً اما لکونہ بیع الدین من غیرمن علیہ الدین او لانہ من قبیل النقود بالنقود متفاضلة وموجلة و حرمتہ منصوصة فی احادیث ربا الفضل.

لما فی بحوث فی قضایا فقہیة معاصرة: (۱۰۳/۲ طبع دارالعلوم کراتشی)

الصورة الثالثة من بیع الدین: ان بیع الدین دینہ من طرف ثالث غیرالمدیون وان ہذا الصورة وقع فیہا اختلاف بین الفقہاء فذہب الحنفیة والحنابلة و الظاہریة الی ان بیع الدین من غیرمن علیہ الدین لایجوز قال الامام محمد بن الشیبانی رحمہ اللہ تعالی "لاینبغی للرجل اذا کان لہ دین ان یبیعہ حتی یستوفیہ، لانہ غرر فلا یدری ا یخرج ام لایخرج و قال الکاسانی رحمہ اللہ تعالی ولا ینعقد بیع الدینمن غیر من علیہ الدین لان الدین اما ان یکون عبارة عن مال حکمی فی الذمة واما ان یکون عبارة عن فعل تملیک المال و تسلیمہ و کل ذلک غیرمقدور التسلیم فی حق البائع ولو شرط التسلیم فیکون شرطاً فاسداً فیفسد البیع.

الجواب صحیح: مفتی عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: محمد حامد یاسین، بھکر

۳۰ صفر المظفر ۱۴۳۴ھ — فتویٰ نمبر: ۳۵۶۵

﴿حصہ مشاع کی خرید وفروخت کا حکم﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام کہ ڈی ایچ اے نے نوری آباد میں ایک ہاؤسنگ اسکیم

شروع کی ہے جس کی زمین اور رقبہ متعین ہے اور اس اسکیم سے اپنے ملازمین اور عام لوگوں کو پلاٹ فروخت کیے ہیں اور رقم بھی وصول کر لی ہے مگر خریدار کے پلاٹ کی جگہ کا تعین نہیں کیا گیا تو آیا شرعاً یہ جائز ہے یا ناجائز؟ اسی طرح ایک عمارت کی دسویں منزل کی قبل از تعمیر فروخت اور پھر قبل از قبضہ فروخت در فروخت کا کیا حکم ہے؟ مستفتی: محمد سہیل اور خالد اسٹیٹ ایجنسی ڈیفنس

﴿جواب﴾ صورت مسئولہ میں ڈی ایچ اے کی ہاوسنگ اسکیم درست ہے اور تمام خریدار اس زمین متعینہ میں مشاعاً شریک ہیں اور عمارت کی دسویں منزل کی فروخت بیع استصناع ہے جو کہ بلڈر کے ساتھ جائز ہے، البتہ بک کروانے والے کے ساتھ تیسرے شخص کا معاملہ جائز نہیں۔

لما في الشامي: (۴/۳۰۰، مطلب ان الدين يملك، طبع۔ ایچ۔ ایم۔ سعید)

(قوله فصح له بيع حصته) تفريع على التقييد بمال صاحبه ط...... والفرق ان الشركة اذا كانت بينهما من الابتداء، بان اشتريا حنطة أو ورثاها كانت كل حبة مشتركة بينهما فبيع كل منهما نصيبه شائعا جائز من الشريك والاجنبي، بخلاف ما اذا كانت بالخلط أو الاختلاط كان كل حبة مملوكة بجميع اجزائها ليس للآخر فيها شركة، فاذا باع نصيبه من غير الشريك لا يقدر على تسليمه الا مخلوطا بنصيب الشريك فيتوقف على اذنه، بخلاف بيعه من الشريك للقدرة على التسليم والتسلم اه فتح وبحر.

ولما في المحيط البرهاني: (۲۲/۲۱۰-۲۱۱، طبع۔ ادارة القرآن مجلس علمي)

شركة الاختيار: وهي ان يملك اثنان عينا دارا أو عبدا أو عروضا أو غير ذلك بشراء أو ارث أو نحو ذلك...... والشركة متى تثبت بالارث والشراء، وما يجرى مجراهما يجوز بيع احدهما نصيبه من الشريك، ومن الاجنبي باذن شريكه وبغير اذن شريكه ولا يملك التصرف في غير نصيب صاحبه الا باذنه.

ولما في الهداية: (۳/۲۲، كتاب البيوع، طبع رحمانيه)

ومن اشترى عشرة اذرع من مائة ذراع من دار أو حمام فالبيع فاسد عند أبي حنيفة وقالا هو جائز وان اشترى عشرة اسهم من مائة سهم جاز في قولهم جميعا.

ولما في الشامي: (۵/۲۲۳، طبع ایچ ایم۔ سعید)

قوله هو طلب الصنعة اى ان يطلب من الصانع العمل ففي القاموس: الصناعة: ككتابة حرفة الصانع وعمله الصنعة اه وفي البدائع من شروطه: بيان جنس المصنوع ونوعه وقدره وصفته، وان يكون فيه تعامل، وان لا يكون مؤجلا والا كان سلما وعندهما المؤجل استصناع الا اذا كان مما لا يجوز فيه الاستصناع فينقلب سلما في قولهم جميعا.

ولما في الشامي: (۴/۵۰۵، شرائط البيوع، انواع اربعة، طبع ایچ۔ ایم۔ سعید)

وشرائط المعقود عليه ستة: كونه موجودا مالا متقوما مملوكا في نفسه وكونه الملك

للبائع فيمايبيع لنفسه، وكونه مقدور التسليم فلم ينعقد بيع المعدوم وماله خطر العدم كالحمل واللبن في الضرع والثمر قبل ظهوره وهذا العبد فاذا هو جارية.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ   واللہ اعلم بالصواب: نثار احمد

۴ صفر الخیر ۱۴۳۲ھ   فتویٰ نمبر: ۲۸۵۲

﴿گنے کی فصل کو اگنے سے پہلے اور اگنے کے بعد بیچنے کا حکم﴾

﴿سوال﴾ مفتی صاحب یہ بات تو واضح اور معلوم ہے کہ گنے کی کٹائی سطح زمین سے اوپر کی جاتی ہے اور اس کی جڑیں زمین میں باقی رہ جاتی ہیں جس سے دوبارہ اور سہ بارہ فصل آتی ہے، پوچھنا یہ ہے کہ ہمارے ہاں لوگ اس طرح کرتے ہیں کہ ایک فصل کی کٹائی کے بعد ان مذکورہ جڑوں سے جو دوسری فصل اگنے والی ہے اس کو ابھی سے فروخت کرتے ہیں جبکہ دوسری فصل کا اگنا ابھی شروع نہیں ہوا ہوتا ہے، البتہ چند دنوں میں شروع ہو جائیگی اور بعض لوگ اس دوسری فصل کو اس وقت فروخت کرتے ہیں جب وہ تو اگ چکی ہوتی ہے لیکن فی الحال قابل انتفاع نہیں ہوتی نہ جانوروں کے کھانے کے قابل ہوتی ہے اور نہ اس سے رس (گڑ) نکل سکتی ہے، کیا شریعت مطہرہ کی رو سے اس طرح معاملہ کرنا جائز ہے یا نہیں؟ بینوا توجروا۔

﴿جواب﴾ واضح رہے کہ صورت اولی میں یعنی جب دوسری فصل ابھی تک اگی نہیں اور ظاہر نہیں ہو چکی ہے تو اس کو ابھی سے فروخت کرنا جائز نہیں ہے کیونکہ اگنے اور ظاہر ہونے سے پہلے وہ فصل معدوم ہے اور معدوم چیز کی خرید و فروخت شریعت مطہرہ کی رو سے جائز نہیں ہے، البتہ دوسری صورت میں یعنی جب دوسری فصل اگ چکی ہو اور ظاہر ہوئی ہو تو اس کو ابھی سے فروخت کرنا جائز ہے کیونکہ فی الحال اگرچہ قابل انتفاع تو نہیں ہے لیکن بعد میں قابل انتفاع ہے اور مبیع موجود ہے معدوم نہیں ہے۔

لما في بدائع الصنائع: (۵/۱۳۸، طبع سعيد)

واما الذي يرجع الى المعقود عليه فانواع (منها) ان يكون موجودا فلا ينعقد بيع المعدوم وماله خطر العدم كبيع نتاج النتاج، وكذا بيع الحمل لانه ان باع الولد فهو بيع المعدوم وان باع الحمل فله خطر المعدوم وكذا بيع اللبن في الضرع لانه له خطر، وكذا بيع الثمر والزرع قبل ظهوره لانهما معدوم وان كان بعد الطلوع جار وان كان قبل بدو صلاحهما اذا لم يشترط الترك ومن مشائخنا من قال لا يجوز الا اذا صار بحال ينتفع

به بوجه من الوجوه فان كان بحيث لا ينتفع به اصلا لا ينعقد. وهذا خلاف الرواية. والدليل على جواز بيعه ماروى عن النبي عليه الصلاة والسلام انه قال من باع نخلا مؤبرة فثمرته للبائع الا ان يشترطها المبتاع جعل الثمرة للمشتري بالشرط من غير فصل بين ما اذا بدا صلاحها او لا. دل انها محل البيع كيف ما كان والمعنى فيه وهو انه باع ثمرة موجودة وهي بعرض ان تصير منتفعا بها في الثاني وان لم يكن منتفعا بها في الحال فيجوز بيعها. الخ.

ولما في الفقه الاسلامي وادلته: (۳۳۹۸/۵، طبع رشيديه)

اتفق ائمة المذاهب على انه لا ينعقد بيع المعدوم وماله خطر العدم كبيع النتاج النتاج. وبيع الحمل الموجود لانه على خطر الوجود، وبيع الثمر والزرع قبل ظهوره لان النبي ﷺ نهى عن بيع حبل الحبلة. الخ.

ولما في البزازية على هامش الهندية: (۴۷۷/۴، طبع رشيديه)

والحاصل ان شراء القصيل قبل أن يصلح للانتفاع به بعض على عدم الجواز۔ واختار القدوري والاسبيجابي الجواز ونص محمد دل عليه قال باع قصيلا أو ثمرا في اول ما يطلع ان جزه المشتري في الحال فالعشر على البائع وان تركه باذن البائع وجزه بعد الادراك فعلى المشتري۔ فلولا جواز البيع لما لزم على المشتري...... وفي التجريد بيع الثمرة والزرع الموجود قبل كونه زرعا منتفعا به جائز بلا شرط الترك وبه يفسد...... وان اشترى مطلقا وترك ان تناهى عظمها او لم يتناه لكنه باذن البائع طاب الخ.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: ابوانس بلال شاہ وزیرستانی

۲۷ صفر الخیر ۱۴۳۲ھ — فتوی نمبر: ۲۹۵۶

﴿گنے کی جڑوں کو بیچنا﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان عظام اس مسئلے کے بارے میں کہ یہ بات تو مشاہد اور معلوم ہے کہ گنے کی کٹائی سطح زمین سے اوپر کی جاتی ہے اور اس کی جڑیں زمین میں باقی رہ جاتی ہیں جس سے دوبارہ اور سہ بارہ فصل اگتی ہے، پوچھنا یہ ہے کہ ہمارے علاقے میں لوگ اس طرح کرتے ہیں کہ ایک مرتبہ کٹائی کے بعد دوسری فصل کے آنے سے پہلے ان جڑوں کو فروخت کرتے ہیں جبکہ دوسری فصل کے آنے میں کچھ مدت لگتی ہے، کیا شریعت مطہرہ کی رو سے اس طرح معاملہ کرنا جائز ہے یا نہیں؟

مستفتی: محمود شاہ وزیرستانی

﴿جواب﴾ آپ کے علاقے میں گنے کی جڑوں کو فروخت کرنے کا اگر رواج ہے اور زمین میں فصل کو تیار ہونے کی مدت تک چھوڑنے کا بھی اگر رواج ہے اور آپس میں کوئی تنازع، جنگ

وغیرہ نہیں ہوتا تو ایسا معاملہ جائز ہے، اس میں کوئی گناہ نہیں ہے۔

لما فی الشامی:(۵/۵۳،طبع ایچ ایم سعید)

قلت: بقی شئی لم أر من نبه علیه، وهو ما یکون أصله تحت الأرض ویبقی سنین متعددة مثل الفصفصة تزرع فی أرض الوقف وتکون کالکردار للمستأجر فی زماننا فاذا باع ذلک الأصل وعلم وجوده فی الأرض صح بیعه الخ.

ولما فی التنویر مع الرد:(۴/۵۵۲،طبع ایچ ایم سعید)

(ولا یدخل الزرع فی بیع الارض بلا تسمیة)

وفی الشامیة:(قوله ولا یدخل الزرع الخ)اطلاقه یعم ما اذا لم ینبت وبالاطلاق اخذ ابو اللیث نهر، وقال فی الفتح واختار الفقیه أبو اللیث أنه لا یدخل بکل حال کما هو اطلاق المصنف رحمه الله ... والخلاف مبنی علی الاختلاف فی جواز بیعه قبل أن تناله المشافر والمناجل قال فی الفتح یعنی أن من قال لا یجوز بیعه، قال یدخل ومن قال یجوز قال لا یدخل، ولا یخفی أن کلا من الاختلافین مبنی علی سقوط تقومه وعدمه ... والأوجه جواز بیعه علی رجاء ترکه [illegible] مع الجحش کما ولد رجاء حیاته فینتفع فی ثانی الحال الخ.

ولما فی فیض الباری:(۳/۲۴۱،طبع رشیدیه)

قال صاحب الهدایة ان ساعة مشروطة [illegible] بعده بالترک، طاب الفضل للمشتری وقال الشامی [illegible] الترک مشروطا فی العقد، ولا معروفا بین الناس والأ [illegible] المعروف [illegible] قلت: وتفصیل الشامی لیس بمختار عندی فیجوز له الفضل وان کان الترک معروفا، والحاصل: أن الشرط اذا لم یکن فی العقد ولم یأمره البائع بالقطع طاب له ترکه سواء کان معروفا أو لا، ولا ألتفت الی ما قاله الشامی: أن المعروف کالمشروط بعدما وجدت روایة عن الامام عند الحافظ ابن تیمیة فی فتاواه، وهکذا فی تکملة فتح الملهم:(۱/۳۴۲،طبع دار العلوم کراچی)

الجواب صحیح:عبد الرحمٰن عفا اللہ عنہ واللہ اعلم بالصواب: یونس بادل شاہ جنوبی وزیرستان

۲۳ صفر الخیر ۱۴۳۲ھ فتویٰ نمبر:۲۹۳۴

﴿اراضی مکہ کی خرید وفروخت کا حکم﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام مسئلہ ہٰذا کے بارے میں کہ مکہ کی زمین کی خرید وفروخت جائز ہے یا نا جائز؟ بینوا توجروا

مستفتی: عبد الوہاب لغمانی کراچی

﴿جواب﴾ مکہ کی زمین اوراس کے مکانات کی خرید وفروخت جائز ہے۔

لما في التنوير مع الدر:(۲۹۲/۶،طبع سعيد)

(و)جاز(بيع بناء بيوت مكة وأرضها)بلا كراهة وبه يفتي عينيو قدمرّ في الشفعة وفي البرهان في باب العشر ولايكره بيع أرضها كبنائها وبه يعمل وفي مختارات النوازل لصاحب الهداية لابأس ببيع بنائها واجارتها لكن في الزيلعي وغيره يكره اجارتها وفي آخر الفصل الخامس من التتارخانية واجارة الوهبانية قالا :قال أبوحنيفة أكره اجارة بيوت مكة في أيام الموسم وكان يفتي لهم أن ينزلوا عليهم في دورهم لقوله تعالى سواء العاكف فيه والباد- ورخص في غير أيام الموسم اه فليحفظ.

ولما في مجمع الأنهر:(۲۱۲/۴،فصل في البيع،طبع المنار)

(يجوز بيع بناء)بيوت مكة فتجب الشفعة فيها كمامرّ(ويكره بيع أرضها واجارتها)عند الامام(خلافاً لهما وقولهما رواية الحسن عن الامام)لأن الناس يتبايعون في أراضيها ودورها في سائر الأمصار من غير انكار وهو أقوى الحجج .قلت-أي فيجوز بيع أرضها بلا كراهة كما هو رواية الحسن وهي أحسن بل بها يفتي كما في المنح عن العيني وعبارة البرهان ومواهب الرحمٰن ولايكره أبويوسف بيع أرضها كبنائها وهو رواية عنهما وبه يعمل انتهى.

الجواب صحیح :عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ　　　　واللہ اعلم بالصواب: محمد آمین

۸ صفر الخیر ۱۴۳۲ھ　　　　فتویٰ نمبر :۲۸۶۷

﴿اضافی اخراجات کو قیمت خرید کیساتھ ملانیکا حکم﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے علماء کرام کہ ایک شخص کا بیگ ،بستہ کا کاروبار ہے تو وہ تیار شدہ مال اور وہ کپڑا جو بیگ میں استعمال ہوتا ہے لاہور سے ،فیصل آباد سے منگواتا ہے تو منگوانے کی صورت میں اس پر کافی اخراجات آتے ہیں جسکی وجہ سے ان چیزوں کی قیمت بڑھ جاتی ہے تو کیا ان اضافی اخراجات کو بھی اصل قیمت یعنی قیمت خرید میں شمار کیا جائے گا یا نہیں؟

﴿جواب﴾ جی ہاں کرایہ وغیرہ کیوجہ سے جو اضافی اخراجات سامان تجارت پر آتے ہیں ، ان سب کو قیمت خرید کے ساتھ ملانے کی اجازت شریعت نے دی ہے اور بائع گاہک سے اس زیادتی کے مطالبہ کا حقدار ہے ،البتہ گاہک کو یہ نہ کہے کہ اتنے میں لیا ہے بلکہ کہے کہ یہ بیگ اتنے میں پڑا ہے۔

لما في الهداية:(۷۵/۳،طبع رحمانيه)

ويجوز أن يضيف الى رأس المال أجرة القصار والطراز والصبغ والفتل وأجرة حمل الطعام لأن العرف جار بالحاق هذه الأشياء برأس المال في عادة التجارة ولان كل

مایزیدفی المبیع اوقیمته یلحق به هذاهوالاصل.

ولمافی التنویرمع الدر:(۱۳۵/۵-۱۳۶،طبع سعید)

(ویضم)البائع(الی رأس المال أجرة القصار والصبغ)......وسوق الغنم وأجرة الغسل والخیاطة......وضابطه کل مایزیدفی المبیع اوفی قیمته یضم درر(ویقول قام علی بکذاولایقول اشتریته)لأنه کذب.

ولمافی البحرالرائق:(۱۰۹/۶،طبع سعید)

وله أن یضم الی رأس المال أجرة القصارویقول قام علی بکذاولایقول اشتریته لانه کذب وهوحرام ولایضم أجرة الراعی والتعلیم وکراء بیت الحفظ لعدم العرف بالحاقه.

واللہ اعلم بالصواب: محمد عمران

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ

فتوی نمبر: ۲۹۳۷

۶۲ صفرالخیر ۱۴۳۲ھ

﴿نقد رقم قرض دینے کی بجائے ادھار سامان دینا﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام کہ ایک شخص کا قسطوں پر دینے کا کاروبار ہے، کبھی کبھار اس کے پاس کوئی آدمی آتا ہے اور کہتا ہے کہ مجھے دس ہزار روپے قرض دے دو، وہ آدمی بجائے قرض رقم دینے کے اسکو ایک موبائل بارہ ہزار پر ادھار فروخت کر دیتا ہے جبکہ اس موبائل کی قیمت مارکیٹ میں دس ہزار ہوتی ہے، ضرورت منداس موبائل کو لیکر بازار میں دس ہزار پر فروخت کر دیتا ہے، اس طرح ضرورتمند کو دس ہزار روپے ملے اور بائع کو متعین مدت کے بعد بارہ ہزار روپے ملیں گے تو اسطرح کا معاملہ کرنا شریعت کی رو سے جائز ہے یا نہیں؟

﴿جواب﴾ مذکورہ معاملہ جائز ہے اس لئے کہ اس میں بیع کے منافی کوئی بات نہیں ہے اگرچہ اس میں دوسری کی ضرورت پورا کرنے کے ساتھ ساتھ اپنا فائدہ بھی ہے، البتہ اگر یہ آدمی ضرورت مند کو نقد رقم بطور قرض دے دیتا تو اس کیلئے باعث اجر وثواب ہوتا اور ادھار کی وجہ سے زیادہ قیمت لینا شرعاً ممنوع نہیں ہے۔

لمافی الشامی:(۳۲۶/۵،طبع سعید)

فان لم یعدکمااذاباعه المدیون فی السوق فلاکراهة فیه بل خلاف الأولی،فان الأجل قابله قسط من الثمن والقرض غیرواجب علیه دائمابل هومندوب ومالم ترجع الیه العین المسترجع لاالعین مطلقاوالافکل بیع بیع العینة.

ولمافی البحرالرائق:(۲۳۵/۶،طبع سعید)

المرادبقوله تعین علی حریراشتری حریرابطریق العینة ومالم ترجع الیه العین التی خرجت

منه لایسمی بیع العینة المسترجعة لاالعین مطلقا، والافکل بیع بیع العینة، وفی الهدایة ان الکراهة فی هذاالبیع حصلت من المجموع فان الاعراض عن الاقراض لیس بمکروه والبخل الحاصل من طلب الربح فی التجارات کذلک والا لکانت المرابحة مکروهة.

ولمافی الشامی: (۱۴۲/۵، طبع سعید)

لأن للأجل شبهابالمبیع. ألاترى أنه یزادفی الثمن لأجله.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفااللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: محمد عمران

۲۳ صفرالخیر ۱۴۳۲ھ — فتوی نمبر: ۲۹۲۲

﴿کمپنی کیلئے مال کمیشن پر فروخت کرنے کے متعلق ایک سوال﴾

﴿سوال﴾ کیافرماتے ہیں علمائے کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میں مالک دکان کیساتھ تنخواہ پر سیلری کا کام کرتا ہوں اسکے علاوہ مجھے مالک دکان کیطرف سے کھلی اجازت حاصل ہے کہ میں ان کی دکان میں کسی اور شخص یا ادارے کا سامان بھی بیچوں، لھذا میرے پاس دو کمپنیوں والے ڈبل روٹی فروخت کرنے کے لئے رکھتے ہیں، اُن میں سے ایک کمپنی والے مجھے کچھ معاوضہ بھی دیتے ہیں دونوں کی کوالٹی تقریباً ایک جیسی ہے۔

اب ہوتا یہ ہے کہ جب میرے پاس کوئی گاہک آتا ہے اوراس کمپنی کی ڈبل روٹی مجھ سے خریدنا چاہتا ہے (جو مجھے کوئی معاوضہ نہیں دیتے) تومیں دوسری کمپنی والوں کی ڈبل روٹی کی تعریف کرلیتاہوں کہ یہ اچھی چیز ہے، لہذا گاہک میرے تعریف سے متاثر ہوکر وہی ڈبل روٹی لے لیتا ہے، اب پوچھنا یہ ہے کہ اس صورت میں جو دوسری کمپنی والوں کا سامان نہ نکلنے کی وجہ سے جو نقصان ہوتا ہے اس کی وجہ سے میں گناہ کا مرتکب تو نہیں ٹھہرتا؟ مستفتی: زبیر صاحب کورنگی

﴿جواب﴾ جو کمپنی آپ کو ڈبل روٹی فروخت کرنے پر کمیشن دی رہی ہے تو ان کے مال کی حقیقت کے حد تک تعریف کی گنجائش ہے بشرطیکہ دوسری کمپنی کے مال کی تحقیر نہ کرے ایسی صورت میں دوسری کمپنی والوں کا جو نقصان ہورہا ہے اس کا آپ سے مواخذہ نہیں ہوگا انشاء اللہ،

البتہ مذکورہ صورت میں چونکہ گاہک دوسری کمپنی کی چیز لینے پرراضی ہو چکا ہے اور کمپنی کیطرف سے بھی دلالۃ راضی ہونا پایا گیا ہے، لہذا ایسی صورت میں دوسری کمپنی کی چیز کی ترغیب دینا جائز نہیں کیونکہ یہ سوم علی سوم غیرہ کی ممانعت میں داخل ہے۔

لما فی التنویر مع الدر:(۵/۱۰۱،طبع سعید)

(و)کرہ(النجش)... ان یزید ولا یرید الشراء اویمدحه بما لیس فیه لیروجه ویجری فی النکاح وغیرہ ثم النھی محمول علی ما(اذا کانت السلعة بلغت قیمتھا،أما اذا لم تبلغ لا)یکرہ لانتفاع الخداع.

ولما فی فتح القدیر:(۶/۴۳۶،طبع رشیدیه)

(ونھی رسول الله صلی الله علیه وسلم عن النجش)بفتحتین(وھو ان یزید الرجل فی الثمن ولا یرید الشراء لیرغب غیرہ)ویجری فی النکاح وغیرہ حیث قال علیه الصلوٰۃ والسلام(ولا تناجشوا)ای لا تفعلوا ذلک وسبب ذلک ایقاع رجل فیه بازید من الثمن وھو خداع والخداع قبیح جاور ھذا البیع فکان مکروھا وظھر من ھذا ان الراغب فی السلعة اذا طلبھا من صاحبھا بانقص من ثمنھا فزاد شخص لا یرید الشراء الی ما یبلغ تمام قیمتھا لا یکون مکروھا لانتفاع الخداع.

الجواب صحیح:عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب:سلمان احمد

۲۲محرم الحرام۱۴۳۲ھ — فتویٰ نمبر:۲۹۸۳

﴿ڈیلر کے لئے کمیشن لینا جائز ہے﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام کہ ڈیلر حضرات جو ہم کو زمین یا دکان یا کوئی پلاٹ وغیرہ خرید کر دلاتے ہیں تو یہ لوگ بائع اور مشتری دونوں سے ایک لاکھ کے پیچھے دو ہزار کمیشن صرف سودا بنانے کا لیتے ہیں تو کیا یہ کمیشن از روئے شرع جائز ہے یا نہیں؟ مستفتی:شہباز قصور

﴿جواب﴾ مذکورہ صورت میں ڈیلر کا بائع یا مشتری کی جانب سے کمیشن لینے میں از روئے شرع کوئی قباحت نہیں کیونکہ یہ اس کی اپنی محنت کا صلہ ہے،لہذا جس فریق نے بھی اس کو متعین کیا ہے ڈیلر ان سے کمیشن لے سکتا ہے اور اگر دونوں نے مقرر کیا ہو تو دونوں فریقوں سے متعین کمیشن لے سکتا ہے۔

لما فی الشامی:(۶/۶۳،طبع سعید)

[تتمة]قال فی التاتارخانیة:وفی الدلال والسمسار یجب اجر المثل،وما تواضعوا علیه ان فی کل عشرة دنانیر کذا فذاک حرام علیھم.وفی الحاوی:سئل محمد بن سلمة عن اجرة السمسار،فقال:ارجو انه لا باس به وان کان فی الاصل فاسدا لکثرة التعامل وکثیر من ھذا غیر جائز،فجوزوہ لحاجة الناس الیه کدخول الحمام.

ولما فی الشامی:(۴/۵۶۰،طبع سعید)

وأما الدلال فان باع العین بنفسه باذن ربھا فأجرته علی البائع وان سعی بینھما وباع

المالک بنفسه يعتبر العرف وتمامه في شرح الوهبانية.

وفي الشامية:(وقوله يعتبر العرف)فتجب الدلالة على البائع او المشترى اوعليهما بحسب العرف جامع الفصولين.

ولما في خلاصة الفتاوى:(۲/۱۵۰،طبع رشيديه)

دلال باع ضيعة رجل بامره قال الاجر بعتها بغير أجرة وقال الدلال بعتها باجر.ان كان الدلال معروفا بذلک لايصدق الامر ويجب عليه اجر المثل.

ولما في الولواجية:(۳/۳۸۲،طبع فاروقيه پشاور)

دلال باع ضيعة رجل بامره،فقال البائع بعتها بغير اجرة وقال الدلال باجران كان الدلال معروفا بذلک بان يبيع اموال الناس وياخذ على ذلک اجرا لايصدق لامر ويجب عليه اجر المثل لان المعروف كالمشروط.

الجواب صحیح:عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ　　　　واللہ اعلم بالصواب:محمد عمران غفرلہ ولوالدیہ

۲۵محرم الحرام۱۴۳۲ھ　　　　فتویٰ نمبر:۲۸۱۳

﴿گارنٹی پر سامان دینے کا حکم﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام کہ مشین،فریزر،گھڑیاں،فریج وغیرہ بازار میں ایک مدت تک گارنٹی پر دی جاتی ہیں یا اس مدت معینہ میں خراب ہونے کی صورت میں اسکو درست کرنے کی ذمہ داری لی جاتی ہے تو کیا شرعاً اس طرح کا معاملہ کرنا درست ہے یا نہیں؟

﴿جواب﴾ سال یا کم زیادہ کی گارنٹی کی شرط لگانا اگر عقد کے دوران ہو تو صحیح نہیں ہے،یہ شرط فاسد ہے،اس سے معاملہ فاسد ہو جاتا ہے لیکن شروط فاسدہ کے متعلق فقہاء کرام نے یہ بھی تصریح فرمائی ہے کہ ایسی شروط جو عام طور پر لگائی جاتی ہوں اور ان کا ایک رواج سا ہو جائے تو یہ صحیح شمار ہوتی ہیں اگرچہ اصلاً فاسد ہوں،الیکٹرونک اشیاء کی گارنٹی لینے کا رواج عام ہو چکا ہے اس لئے اس کی گنجائش ہے۔

لما في الفقه الاسلامي:(۵/۳۴۷۱،طبع رشيديه)

من الشروط الصحيحة،ماجرى به العرف،كشراء الساعة او المذياع او الغسالة أو الثلاجة بشرط أن يصلحها البائع لمدة سنة مثلا اذا أصابها خلل،فيجوز البيع استحسانا، والقياس أن لايجوز وهو قول زفر ووجه الاستحسان أن الناس تعاملوا هذا الشرط في البيع،كما تعاملوا الاستصناع،فسقط القياس بتعامل الناس كما سقط في الاستصناع.

ولما في الدر المختار:(۵/۸۵،طبع سعيد)أما لوجرى العرف به......فلافساد.

ولما فی درر الحکام:(۱/۱۵۹،طبع ماجدیه)

الشرط المتعارف ولولم يكن من مقتضيات العقدجوز البيع معه استحسانا وصار معتبرا لان الشرط متى كان متعارفا فلا يكون باعثا على النزاع.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: محمد عمران چارسدہ

۳ ربیع الاول ۱۴۳۲ھ — فتوی نمبر: ۲۹۷۰

﴿حرام اور ناجائز چیز کے بیچنے کا حکم﴾

﴿سوال﴾ دوکان میں ایسی چیز بیچی جائے جس کے بیچنے کو شریعت نے ناجائز قرار دیا ہے یا وہ چیز حرام ہو وغیرہ تو آدمی جب زکوٰۃ دیتا ہے کیا اس سے وہ مال بھی صاف ہو جاتا ہے؟

﴿جواب﴾ خدانخواستہ کوئی ایسی چیز بیچ دے جس کا بیچنا از روئے شرع ممنوع ہو تو باوجود زکوٰۃ ادا کرنے کے بھی اُس سے حاصل شدہ منافع حلال نہیں ہونگے۔

البتہ حدیثِ پاک سے معلوم ہوتا ہے کہ تاجر حضرات سے دورانِ تجارت بعض جو فضول باتیں وغیرہ صادر ہوتی رہتی ہیں اُن کا کفارہ صدقہ وخیرات سے ہو جائے گا۔

لما فی مشکوۃ المصابیح:(۱/۲۴۳،طبع سعید)

وعن قيس بن أبي غرزة قال كنا نسمى في عهد رسول الله صلى الله عليه وسلم السماسرة فمر بنا رسول الله صلى الله عليه وسلم فسمانا باسم هو أحسن منه فقال "يا معشر التجار ان البيع يحضره اللغو والحلف فشوبوه بالصدقة رواه أبوداؤد والترمذي والنسائي.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم: محمد شریف حسین عفا اللہ عنہ

۲۱ رجب ۱۴۲۷ھ — فتوی نمبر: ۵۷۱

﴿ادائیگی ثمن سے پہلے مشتری کے قبضے میں مبیع کا ہلاک ہو جانا﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں مفتیان کرام اس مسئلے کے متعلق کہ زید نے خالد سے ایک گھوڑا خریدا اور کہا میں اس کی قیمت ایک ماہ میں ادا کروں گا، خالد نے بھی مان لیا اور زید گھوڑا لے گئے دس، بارہ دن کے بعد گھوڑا کسی مرض کی وجہ سے مرگیا، اب پوچھنا یہ ہے کہ مہینہ پورا ہونے کے بعد زید پوری قیمت ادا کرے گا یا کمی کی گنجائش ہے؟ مستفتی: سیف الرحمٰن

﴿جواب﴾ جب زید نے گھوڑے پر قبضہ کرلیا تو بیع تام ہوگئی، گھوڑا ہلاک ہونے کی

صورت میں طے شدہ قیمت میں کمی نہیں ہو سکتی، مہینہ پورا ہونے کے بعد زید کو پوری قیمت ادا کرنی ہوگی۔

لمافی الهداية:(۲/۲۰، طبع رحمانیه)

واذاحصل الایجاب والقبول لزم البیع ولاخیارلواحدمنهماالامن عیب أوعدم رؤیة.

ولمافی الهداية:(۲/۲۲، طبع رحمانیه)

فان هلک فی یده هلک بالثمن وکذااذادخله عیب بخلاف اذاکان الخیارللبائع.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفااللہ عنہ | واللہ اعلم: صلاح الدین چترالی

۴ جمادی الاولیٰ ۱۴۲۷ھ | فتویٰ نمبر: ۲۵۷

﴿ایک چیز کو مختلف داموں پر فروخت کرنا﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں مفتیان عظام کہ کاروبار میں ایک ہی چیز ایک آدمی کے ہاتھ مہنگے دام فروخت کرنا جبکہ وہی چیز کسی دوسرے آدمی کے ہاتھ سستے داموں فروخت کرنا کیسا ہے، کیا ایک ہی چیز مختلف قیمتوں پر فروخت کر سکتے ہیں؟ اس لئے کہ بعض گاہک اصرار کرتے ہیں تو ہم قیمت کم کر دیتے ہیں اور بعض بالکل اصرار نہیں کرتے تو قیمت وہی رہتی ہے جو پہلے بتائی تھی۔

﴿جواب﴾ ہر ایک گاہک کو ایک ہی دام پر فروخت کرنا ضروری نہیں ہے، ایک کو مقررہ قیمت پر چیز دی، دوسرے کے ساتھ رعایت کر لی تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں ہے، البتہ ایسے شخص کے ساتھ معاملہ کرنا جو مارکیٹ کے بھاؤ سے ناواقف ہے یا اتفاق سے ایسی چیز صرف آپ کے پاس اس وقت موجود ہے مارکیٹ میں عام دستیاب نہیں ہے تو ایسی صورتوں میں زیادہ پیسے لینا مجبوری سے فائدہ اٹھانے کے مترادف ہے جو کہ شرعاً قبیح اور ناپسندیدہ عمل ہے۔

لمافی قوله تعالیٰ:(سورة النساء، آیت۲۹)

﴿یاأیهاالذین أمنوالاتاکلواموالکم بینکم بالباطل إلاأن تکون تجارةعن تراض منکم﴾

ولمافی العناية بهامش فتح القدیر:(۵/۴۵۲ رشیدیه) البیع مبادلة المال بالمال بالتراضی.

ولمافی الهندية:(۳/۱۶۱ طبع رشیدیه) من اشتری شیئاواغلی فی ثمنه فباعه مرابحةعلی ذلک جاز.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفااللہ عنہ | واللہ اعلم بالصواب: محمد ضیاء الدین

۱۴/۳/۱۴۲۸ھ | فتویٰ نمبر: ۶۶۶

﴿یوٹیلیٹی اسٹور سے اشیاء خرید نے کا حکم﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے متعلق کہ آج کل یوٹیلیٹی اسٹورز میں چینی مارکیٹ کی بنسبت کچھ سستی ملتی ہے لیکن بعض یوٹیلیٹی اسٹورز والے پانچ کلو چینی کیساتھ یہ شرط لگاتے ہیں کہ دو کلو چینی سستی تب ملے گی کہ سوڈیڑھ سو کا سامان اور بھی ہمارے ہاں سے خریدو، شریعت کی نظر میں انکے ساتھ خرید وفروخت کا معاملہ ایسی صورتحال میں درست ہے؟

تنقیح: سامان خرید نے کی جو شرط لگاتے ہیں، یہ حکومت کی طرف سے ہوتی ہے؟

جواب تنقیح: جی ہاں، یہ شرط حکومت کی طرف سے ہوتی ہے، خواہ حکومتی یوٹیلیٹی اسٹور ہو یا ذاتی، البتہ حکومتی یوٹیلیٹی اسٹور میں اس شرط کی زیادہ پابندی نہیں ہوتی کیونکہ اگر دوسری اشیاء کی خریداری کم ہو جائے تو نقصان حکومتی خزانے سے پورا کیا جاتا ہے۔ مستفتی: محمد یعقوب

﴿جواب﴾ مذکورہ صورت میں یوٹیلیٹی اسٹور سے خریداری جائز ہے کیونکہ دوسری چیز جو شرط کی طور پر آپ کو خرید نی پڑ رہی ہے وہ بھی بیع کے لئے محل بننے کی صلاحیت رکھتی ہے، لہذا خریداری میں کوئی شبہ نہیں کرنا چاہیے۔

لمافی الهداية:(۶۱/۳،طبع رحمانيه)

ومن باع عبداعلى ان يعتقه المشترى اويدبره اويكاتبه اوامة على ان يستولدهافالبيع فاسدلان هذابيع وشرط وقدنهى النبى صلى الله عليه وسلم عن بيع وشرط الاان يكون متعارفالان العرف قاض على القياس.

ولمافى فتح القدير:(۲۹۹/۶،طبع رشيديه)

وقبول العقدفى الذى فيه الخياروان كان شرطالانعقادالعقدفى الاخرلكن هذا غيرمفسدلكونه)اى من فيه الخيارمحلاًللبيع فهو(كمالوجمع بين قن ومدبر) وباعهما بالف حيث ينفذالبيع فى القن بحصته وان كان قبول العقدفى المدبرشرطافيه وذلك لدخول المدبرفى البيع لمحليته له فى الجمله.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ　　　　واللہ اعلم بالصواب: سلمان احمد

۱۶ محرم الحرام ۱۴۳۲ھ　　　　فتویٰ نمبر: ۲۷۶۲

﴿کسی چیز کو اس شرط کے ساتھ بیچنا کہ واپس مجھ ہی کو بیچو گے﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام کہ زید نے بکر کو بیس ہزار روپے کا جانور فروخت کیا اور

کہا کہ جب یہ بڑا ہو جائے گا تو میں تم سے چالیس ہزار روپے میں خرید لوں گا لیکن تم یہ جانور کسی اور کو نہیں بیچ سکتے ،زید کا مذکورہ شرط کیساتھ جانور کو فروخت کرنا جائز ہے یا ناجائز؟

﴿جواب﴾ بیع میں اس قسم کی شرط لگانا شرعاً جائز نہیں ہے، اس سے بیع فاسد ہو جاتی ہے، لہٰذا مذکورہ صورت میں بیع فاسد ہونے کی وجہ سے واجب الفسخ ہے۔

لما فی الهندیة:(۱۳۴/۳ ،طبع رشیدیه)

ولو باع شیئاً علی ان یهب له المشتری او یتصدق علیه او یبیع منه شیئاً او یقرضه کان فاسدا.

ولما فی التنویر مع الدر:(۸۴/۵-۸۵ طبع ایچ ایم سعید)

(و)لا(بیع بشرط)عطف علی الی النیروز یعنی الاصل الجامع فی فساد العقد بسبب شرط(لا یقتضیه العقد ولا یلائمه وفیه نفع لاحدهما او)فیه نفع(لمبیع)

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ　　　واللہ اعلم بالصواب: محمد ضیاء الدین

۵ ربیع الثانی ۱۴۲۸ھ　　　فتویٰ نمبر: ۷۳۵

﴿شرط فاسد لگانے سے بیع فاسد ہو جاتی ہے﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میں نے اپنا گھر پڑوسی کو بیچا رقم کی ادائیگی قسطوں پر متعین کی گئی، میں نے یہ شرط بھی لگائی کہ جب آپ قسط مکمل کرلو گے اس کے بعد بھی مجھے چار مہینے تک گھر میں رہنے دو گے تاکہ میں دوسری جگہ اپنے لئے گھر بنالوں تو کیا میرے لئے اس گھر میں چار مہینے رہنا جائز ہے۔　　　مستفتی: نصر اللہ صاحب

﴿جواب﴾ بیع میں اسطرح کی شرط لگانے سے بیع فاسد ہو جاتی ہے اور اس کا فسخ کرنا ضروری ہوتا ہے، لہٰذا آپ دونوں اس بیع کو ختم کریں پھر دوبارہ چاہیں تو نیا سودا کریں اور رہنے وغیرہ کی کوئی شرط نہ لگائیں، البتہ جب تک خریدار آپ کو پورے پیسے نہ دیں آپ گھر قبضہ میں نہ دیں، اس طرح سودا بھی صحیح ہوگا اور گھر میں رہائش بھی بلامعاوضہ کر سکتے ہیں لیکن سوال میں مذکورہ تفصیل کیساتھ سودا میں ایسی شرط لگائیں گے تو جائز نہیں ہوگا۔

لما فی التنویر مع الدر:(۸۴/۵-۸۵ طبع ایچ ایم سعید)

(و)لا(بیع بشرط)عطف علی الی النیروز یعنی الاصل الجامع فی فساد العقد بسبب شرط(لا یقتضیه العقد ولا یلائمه وفیه نفع لاحدهما او)فیه نفع(لمبیع)هو(من اهل الاستحقاق)للنفع.

وفی الشامیة:(قوله مثال لمافیه نفع للبائع)ومنه مالوشرط البائع ان یهبه المشتری شیئااویقرضه اویسکن الدارشهرااوان یدفع المشتری الثمن الی غریم البائع. وفی فتح القدیر:(۶/۲۰۹-۲۱۰،طبع رشیدیه)

ولمافی الشامی:(۴/۵۲۱،طبع ایچ ایم سعید)

[تنبیه]للبائع حبس المبیع الی قبض الثمن ولوبقی منه درهم ولوالمبیع شیئین بصفقة واحدة وسمی لکل ثمنافله حبسهماالی استیفاء الکل. وفی الفقه الحنفی: (۲/۴۲،طبع بیروت)

الجوب صحیح:عبدالرحمٰن عفااللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب:سلمان احمد

۲۷ربیع الاول ۱۴۳۰ھ — فتویٰ نمبر:۲۰۸۹

﴿بیع فسخ ہوتو بیعانہ کی رقم واپس کرنا ضروری ہے﴾

﴿سوال﴾ کیافرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ بعض لوگ کسی چیز کوخرید نے سے پہلے بائع کوکچھ رقم بطور بیعانہ رکھواتے ہیں کہ اگرمشتری نے وہ چیز نہ خریدی تووہ رقم ضبط ہوجاتی ہے تواس طرح کرنا صحیح اور یہ مذکورہ رقم بائع کیلئے حلال ہے؟

﴿جواب﴾ کسی وجہ سے بائع ومشتری بیع فسخ کرناچاہیں توباہمی رضامندی سے فسخ کرسکتے ہیں لیکن بیعانہ کی رقم واپس کرنا ضروری ہے، بائع کوبیعانہ ضبط کرنے کاشرعاکوئی حق نہیں ہے۔

لمافی اعلاء السنن:(ج۱۲ص۱۹۷،طبع دارالکتب العلمیة)أن النبی ﷺ: نهی عن بیع العربان.

ولمافی الهدایة:(۳/۶۱،طبع رحمانیه)

کل شرط لایقتضیه العقدوفیه منفعة لاحدالمتعاقدین اوللمعقودعلیه وهومن اهل الاستحقاق یفسده.

الجواب صحیح:عبدالرحمٰن عفااللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب:عبدالستار

۱۴ربیع الاول ۱۴۲۸ھ — فتویٰ نمبر:۶۶۷

﴿جانوروں کوقسطوں پرلینا﴾

﴿سوال﴾ حضرت مفتی صاحب ہمارے ہاں جانورقسطوں پرلیتے ہیں،اس کی صورت یہ ہوتی ہے کہ جوشخص قیمت اداکرتاہے وہ خودجانورخریدکردیتاہے اوربعض اوقات وہ پیسے دےدیتا ہے اورکہتاہے کہ تم جانورخریدلو، جتنے میں خریدومجھے اس پراتنانفع مثلاًچارہزارروپے بعد میں

قسطوں میں ادا کردینا۔ بینوا توجروا مستفتی: حاجی عبدالغفار کورنگی

﴿جواب﴾ قسطوں پر معاملہ کرنا شرعاً جائز ہے، اسلئے پہلی صورت میں شرعاً کوئی مضائقہ نہیں یعنی جو شخص خود جانور خرید کر آگے قسطوں پر زیادہ دام لے کر بیچتا ہے تو اس میں کوئی حرج نہیں، البتہ دوسری صورت درست نہیں کیونکہ ایک ہی شخص خریدار بھی ہوتا ہے اور بیچنے والا بھی ہوتا ہے، اس کا جائز طریقہ یہ ہوسکتا ہے کہ جو شخص جانوروں کی قیمت ادا کرتا ہے وہ خریدنے والے کو اپنا وکیل مقرر کرلے خرید کر مالک کے حوالے کردے یا مالک کی طرف سے دوسرا شخص وکیل ہو، وہ اس پر قبضہ کرلے پھر اس دوسرے شخص کو فروخت کردے یا مالک کو حوالے کے بعد اسکو بیچ دے، البتہ اس دوران اگر جانور ہلاک ہوجائے تو وہ موکل (پیسے دینے والے) کی ملکیت سے ہلاک ہوگا اور یہ شخص (جس کیلئے جانور خریدا گیا) جانور خریدنے کے بعد اگر انکار کرے کہ اب میں یہ جانور نہیں لیتا تو ان جانوروں کا لینا اس پر لازم نہیں۔

لمافی الهداية:(۳/۱۹۰-۱۹۱،طبع رحمانیه)

فان هلک المبیع فی یده قبل حبسه هلک من مال الموکل لم یسقط الثمن----ولو وکله بشراء شیء بعینه فلیس له ان یشتریه لنفسه.

ولمافی تنویر الابصار:(۵/۵۱۲،طبع ایچ ایم سعید)

(هلک المبیع من یده قبل حبسه هلک من مال موکله ولم یسقط الثمن)

ولمافی الشامی:(۵/۵۱۸،طبع سعید)

وفیه الوکیل بالبیع لایملک شراءه لنفسه لان الواحدلایکون مشتریاو بائعافیبیعه من غیره ثم یشتریه منه.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: عبدالستار

۱۰ ربیع الثانی ۱۴۲۸ھ — فتویٰ نمبر: ۷۵۱

﴿کتے کی خرید وفروخت کا حکم﴾

﴿سوال﴾ کتے کی خرید وفروخت از روئے شریعت جائز ہے یا نہیں؟

﴿جواب﴾ شکار کرانے کیلئے، کھیت وغیرہ کی حفاظت کیلئے اسی طرح گھر کی چوکیداری کیلئے کتا رکھنا جائز ہے اور ان مقاصد کیلئے اسکی خرید وفروخت بھی جائز ہے۔

لمافی الهدایة:(۳/۱۰۷،طبع رحمانیه)

قال علی ابن ابی بکرالمرغانیؒ ویجوز بیع الکلب.....ولانه منتفع به حراسة واصطیادافکان مالافیجوز بیعه.

ولمافی الکنزوحاشیته :(۲/۲۵۷،طبع قدیمی)

صح بیع الکلب والفهدوالسباع والطیور لانه مال متقوم آلة للاصطیادکالبازی۔ومثله فی الشامیة:(۵/۲۲٦،طبع سعید)

الجواب صحیح :عبدالرحمٰن عفااللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب:اسرارعزیز عفااللہ عنہ

۱۸جمادی الثانی ۱۴۲۸ھ — فتویٰ نمبر:۹۹۹

﴿ادائیگی سے پہلے بائع کا اسی چیز کو واپس کم ریٹ پر خریدنا﴾

﴿سوال﴾ آج کل سونے کی معروف قیمت مثلاً ۱۵۰۰۰ ہزار ہے،ادھار ۱۸۰۰۰ ہزار پر بیچنا کیسا ہے؟ جبکہ بغیر کسی شرط کے لینے والے سے واپس ۱۵۰۰۰ ہزار پر خریدے اور اس حیلہ کا کیا حکم ہے؟ کہ پہلے مشتری کو ۱۸۰۰۰ ہزار قرض دیدے اور پھر اسی رقم (۱۸۰۰۰) پر ایک تولہ سونا دیدے جبکہ عام ریٹ ۱۵۰۰۰ ہزار ہو اور بغیر کوئی شرط لگائے ہوئے واپس اس مشتری سے ۱۵۰۰۰ ہزار پر خریدلے؟

مستفتی:شاکراللہ صاحب

﴿جواب﴾ سونا ہو یا کوئی اور چیز ادھار کیوجہ سے مہنگا بیچنے کی گنجائش ہے لیکن ادھار معاملہ میں بیچنے والے کو رقم ادا کئے بغیر پہلی قیمت سے کم پر واپس اسی کو فروخت نہیں کرسکتے کیونکہ یہ ''شراء ماباع باقل مماباع قبل ان ینقدالثمن'' کی صورت ہے جسکو فقہاء کرام نے ناجائز قرار دیا ہے اگرچہ پہلے سے کوئی شرط نہ لگائی ہو،ہاں اسی رقم پر یا اس سے زیادہ پر یا پیسوں کے علاوہ سامان پر اسی شخص کو بیچ سکتے ہے۔

لمافی الهدایة:(۳/۵۹،طبع رحمانیه)

قال ومن اشتری جاریة بالف درهم حالة اونسیئه فقبضهاثم باعهامن البائع بخمس مائة قبل ان ینقدالثمن لایجوزالبیع الثانی ولناقول عائشه رضی الله عنهالتلک المرأة وقد باعت بست مائه بعدمااشتریت بثمان مائة بئس ماشریت واشتریت ابلغی زیدبن ارقم ان الله تعالی ابطل حجه وجهاده مع رسول الله صلی الله علیه وسلم ان لم یتب.

ولمافی البحر:(٦/۸۲،طبع سعید)ای لم یجزشراء البائع ماباع باقل مماباع قبل نقدالثمن.

مذکورہ حیلہ درست نہیں کیونکہ یہ بیع عینہ کی ایک صورت ہے اور بیع عینہ میں بائع کو واپس

بیچنا ناجائز ہے۔

ولما فی الشامی:(۵/۳۲۵-۳۲۶،طبع ایچ ایم سعید)

أو یقرضه خمسة عشر درهمافم یبیعه المقرض ثوبایساوی عشرة بخمسة عشرة فیاخذ الدراهم التی اقرضه علی انهاثمن الثوب فیبقی علیه الخمسة عشر قرضا.درر...... وقال محمدؒ هذاالبیع فی قلبی کأمثال الجبال ذمیم اخترعه أکلة الربا وقدذمهم رسول الله صلی الله علیه وسلم فقال:"اذاتبایعتم بالعینة واتبعتم اذناب البقر ذللتم وظهر علیکم عدوکم"......وقیل ایاک والعینة فانها العینة.

الجواب صحیح:عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب:فرمان اللہ

۱۱ربیع الثانی۱۴۲۸ھ — فتویٰ نمبر:۷۵۴

﴿سونا ادھار بیچنا؟﴾

﴿سوال﴾(۱) آج کل کی معروف کرنسی کے عوض سونا ادھار بیچنا کیسا ہے؟(۲) معروف کرنسی کے عوض سونا خریدنے میں مثلاً بمثل کی شرط ختم ہوگئی ہے اوراسی طرح یدابید کی شرط ختم تو نہیں ہوئی ہے؟(۳) بیوی سے متعین مدت تک مہر والا زیور ادھار لینا کیسا ہے؟ مثلاً کہ اب میں اس سے تجارت شروع کرونگا اوراٹھ دس مہینے بعد اتنا زیور واپس کرونگا۔ مستفتی:شاکراللہ

﴿جواب﴾(۱) معروف کرنسی کے عوض سونا ادھار بیچنا جائز ہے کیونکہ کرنسی کی پشت پر اب سونا نہیں ہے موجودہ کرنسیاں فلوس نافقہ کے حکم میں ہیں اس لئے کرنسی کے عوض سونے کی بیع پر بیع صرف کے احکام جاری نہیں ہونگے،البتہ ادھار کی مدت متعین ہونی چاہیے۔

(۲) سونے کی بیع سونے کے عوض ہو تو یدابید اور مثلاً بمثل دونوں ضروری ہے یعنی زیادتی (تفاضل) اورادھار (نسیئہ) دونوں ناجائز ہے لیکن سونے کی بیع کرنسی کے عوض ہو تو یدابید اور مثلاً بمثل دونوں قید ختم ہوجاتی ہیں کیونکہ سونے اور کرنسی کی جنس وقدر ایک نہیں ہے۔

(۳) یہ صورت جائز ہے کیونکہ یہ قرض حسنہ ہے یعنی جب بیوی خوشی سے دے۔

لمافی التنویر مع الدر:(۵/۱۶۲،طبع ایچ ایم سعید)

(فیصح استقراض الدراهم والدنانیر وکذا) کل (مایکال...... الخ)

ولمافی تکملة فتح الملهم:(۱/۵۱۷،طبع دارالعلوم کراچی)

ولکن من العلماء من جعل اوراق العملة فی حکم الاثمان العرفیة وحکم بوجوب الزکاة

علیها واداء الزکاة بها، وجواز مبادلتها بالذهب والفضة.

ولما فی تکملة فتح الملهم: (۱/ ۵۸۹، طبع مطبع دار العلوم کراچی)

واما اوراق النقدیة وهی التی تسمی "نوت" المختار عندنا قول من یجعلها اثمانا اصطلاحیة، وحینئذ تجری علیها احکام الفلوس النافقة سواء بسواء.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: فرمان اللہ غفرہ اللہ

ا ربیع الثانی ۱۴۲۷ھ — فتویٰ نمبر: ۶۱۷

﴿سونا، سونے کے بدلے میں ہوتو نقد اور برابری دونوں ضروری ہے﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ہم مارکیٹ سے خالص سونے کے بدلے سونے کے تیار زیورات خریدتے ہیں مثلاً اگر ہم پانچ تولے تیار زیورات خریدے تو اس کے بدلے میں ہمیں پانچ تولہ خالص سونا دینا پڑتا ہے اور یہ معاملہ ہاتھ در ہاتھ ہوتا ہے، اس کے علاوہ کبھی ہم اپنے جاننے والوں سے تیار زیورات ادھار لیتے ہیں پھر کئی مہینوں بعد ان کو خالص سونے کی صورت میں ادائیگی کرتے ہیں، لیکن دونوں صورتوں میں زیورات اور خالص سونے کا وزن برابر ہوتا ہے، حالانکہ زیورات تیار کرتے وقت ان میں کچھ کھوٹ ملایا جاتا ہے۔

اب پوچھنا یہ ہے کہ خرید وفروخت کا یہ طریقہ جائز ہے یا نہیں؟ اور کھوٹ کو منہا کر کے زیورات میں موجود سونے کے برابر اگر ہم خالص سونا ادا کریں تو اس صورت میں بیع جائز ہوگی یا نہیں؟ برائے مہربانی وضاحت فرمائیں۔

﴿جواب﴾ سونے کی سونے کے بدلے خرید فروخت کرنا شریعت کی اصطلاح میں "بیع صرف" کہلاتا ہے جس میں ہاتھ در ہاتھ یعنی نقد اور برابری دونوں ضروری ہے، لہذا سوال میں ذکر کردہ پہلی صورت جس میں تیار زیورات خرید کر ان کے بدلے فوراً آپ خالص سونا ادا کرتے ہیں جائز ہے، بشرطیکہ وزن برابر ہو اور زیورات میں کھوٹ کی وجہ سے بدلے میں دینے والا سونا وزن کم کر کے دینا طے نہ ہو اس لئے کہ معمولی ملاوٹ کا اعتبار نہیں ہے یہ تمام سونا شمار ہوتا ہے۔

البتہ دوسری صورت جس میں آپ اپنے جاننے والوں سے ادھار زیورات خریدتے ہیں اور پھر کچھ عرصہ بعد ان کو سونے کی صورت میں ادائیگی کرتے ہیں یہ ناجائز صورت ہے، کیونکہ "بیع صرف" میں ادھار معاملہ جائز نہیں ہوتا اسی مجلس میں ہر دونوں کا قبضہ ضروری ہے۔

لما فی الهندية:(۲۱۹/۳طبع رشیدیه کوئٹه)

واذا كان الغالب على الدراهم الفضة فهي فضة ان كا ن الغالب على الدنانير الذهب فهي ذهب ويعتبر فيهما من تحريم التفاضل ما يعتبر في الجياد حتى لا يجوز بيع الخالصة بها ولا بيع بعضها ببعض الا متساويا في الوزن وكذا لايجوز استقراضها الا وزنا

لما فی الفقه الحنفي في ثوبه الجديد :(۲۲۵/۴طبع دار القلم دمشق)

ولا يصح بيع الذهب الخالص بذهب غير خالص ,ولا بيع فضة خالصة بفضة غير خالصة ولا بيع بعضه ببعض الا متساويا وزنا فيما غلب ذهبه وفضته.

لما فی الهندية:(۲۱۷/۳طبع رشیدیه کوئٹه)

(اما شرائطه)فمنها قبض البدلين قبل الافتراق كذا في البدائع .سواء كا ن يتعينان كالمصوغ او لا يتعينان كالمضروب أو يتعين احدهما ولا يتعين الاخر.

لما فی الهداية :(۱۱۱/۳طبع رحمانیه)

فان باع فضة بفضة أوذهبا بذهب لا يجوز الا مثلا بمثل وان اختلفت في الجودة والصياغة .ولا بد من قبض العوضين قبل الافتراق ۔ سواء كا ن يتعينان كالمصوغ او لا يتعينان كالمضروب أو يتعين احدهما ولا يتعين الاخر.

الجواب صحیح: مفتی عبد الرحمٰن عفا اللہ عنہ واللہ اعلم بالصواب: عزیز احمد خضداری

۲۵ جمادی الثانی ۱۴۳۵ھ فتوی نمبر: ۳۱۹۹

﴿مٹی میں شامل سونے چاندی کے ذرات مٹی سمیت پیسوں سے بیچنا جائز ہے﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ہم سونے کا کاروبار کرتے ہیں اور چونکہ زیورات اپنی دوکان میں تیار کرتے ہیں جسکی وجہ سے اکثر اوقات سونے کی کٹائی کے دوران کچھ ذرات مٹی میں گر جاتے ہیں اور پھر ہم اس مٹی اور راکھ کو جمع کر کے فروخت کرتے ہیں۔اب پوچھنا یہ ہے کہ از روئے شرع ہمارا یہ معاملہ درست ہے یا نہیں؟اگر درست ہے تو مارکیٹ ویلیو کے مطابق ہم باہمی رضامندی سے اسکی قیمت لگا سکتے ہیں؟

﴿جواب﴾ مٹی میں شامل سونے چاندی کے ذرات مٹی سمیت پیسوں سے بیچنا جائز ہے بشرطیکہ خالی مٹی نہ ہو سونے چاندی کے ذرات واقعی شامل ہوں ورنہ دھوکہ ہے جو کہ کسی طرح جائز نہیں ہے۔

لما فی البناية فی شرح الهداية:(۷۰/۱۰طبع مکتبه حقانیه)

اعلم ان بيع تراب الصاغة بخلاف الجنس انما يجوز اذا وجد فيه الذهب اوالفضة

واذا لم یوجد فلا۔

لمافی الولوالجیة: (۳/ طبع مکتبه فاروق پشاور)

رجل اشتری تراب الصواغین بعرض فهذا علی وجهین ان وجد فیها ذهبا أو فضة جاز البیع لأنه تبین انه اشتری الذهب و الفضة بالعروض ان لم یجد فیها ذهبا أو فضة لا یجوز۔

لما فی الهدایه:(۲/ ۹۹طبع رحمانیه لاهور)

بخلاف تراب الصاغة لانه انما لایجوز بیعه بجنسه لاحتمال الرباحتی لو باعه بخلاف جنسه جاز۔

الجواب صحیح: مفتی عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: عزیز احمد خضداری غفرلہ ولوالدیہ

۲۸ جمادی الثانی ۱۴۳۵ھ — فتوی نمبر: ۴۲۱۰

﴿دو مہینوں کے اندر واپسی کی شرط پر قرضہ وصول کر کے زیورات رکھوانا﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ہمارے ہاں خرید وفروخت کی ایک یہ صورت بھی رائج ہے کہ کچھ لوگ اپنے زیورات لیکر آتے ہیں اوران کی قیمت لگوا کر اس شرط پر وصول کرتے ہیں کہ اگر دو مہینوں کے اندر یہ پیسے واپس نہ کر سکے تو ان بدلے آپ ہمارے زیورات رکھ دینا۔کیا اسلامی اصولوں کے مطابق ہمارا اس طرح کا معاملہ کرنا درست ہے یا نہیں؟ وضاحت فرمائیں۔ مستفتی: بھائی شفیق الرحمٰن

﴿جواب﴾ آپ لوگوں کے ہاں رائج خرید وفروخت کے مذکورہ طریقہ کی دو صورتیں ہوسکتی ہیں۔

(۱) دو ماہ کے اندر پیسے لوٹانے اور زیورات واپس لینے کی شرط باقاعدہ عقد کا حصہ اگر ہے یعنی سودا کرتے ہوئے دونوں آپس میں اس طرح اگر طے کر لیتے ہیں تو اس سے بیع فاسد ہو جاتی ہے۔البتہ حکماً ''رھن'' شمار ہوتا ہے،لہذا یہ لوگ اس تاریخ تک پیسہ اگر لوٹا دیں تو انکو زیورات واپس کرنا آپ کے ذمہ ہوگا اور پیسہ اگر نہیں لوٹا سکے تو اس تاریخ میں زیورات کی مارکیٹ ویلیو جو بھی ہو اس حساب سے آپ زیورات کے مالک ہو جائیں گے،لہذا قیمت زیادہ ہونے کی صورت میں بقایا آپ کو ادا کرنا ہوگا،اور آپ کی رقم کی نسبت قیمت اگر کم بنتی ہے تو اتنی رقم کی حد تک ان لوگوں سے مطالبہ کرنے کا آپ کو حق حاصل ہوگا۔

(۲) عقد مکمل ہونے کے بعد اگر اس طرح شرط لگائی جائے تو یہ ایک وعدہ ہے،جس کو شریعت کی اصطلاح میں ''بیع الوفاء'' کہا جاتا ہے،اس صورت میں جب مالک پیسے واپس کریگا تو

آپ پر زیورات لوٹانا ضروری ہوگا۔ البتہ مالک اگر اس بیع کو نافذ کردے تو پھر آپ زیورات سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔

لمافی شرح المجلہ :(۱۲۶/۲ رشیدیہ کوئٹہ)

اختلـوافی البیـع الذی یسمیه الناس بیع الوفاء وبیع الجائز .قال أكثر المشائخ منهم الشیخ الامام ابو شجاع ،والقاضی الاما م ابوالحسن علی السغدی : حكمه حكم الرهن ،لایملكه المشتری ویضمن المشتری ماأكل من ثمره ،ولایباح له الانتفاع ولا الأكل الاباباحة المالک ،ویسقط الدین بهلاکه اذاكان به وفاء بالدین ،ولایضمن الزیادة اذا هلک لا بصنعه وللباع ان یستردها اذا قضی الدین.والصحیح ان العقد الذی جری بینهما ان كان بلفظ البیع لا یكون رهنا ثم ینظر :ان ذكر اشرط الفسخ فی البیع فسد البیع ،وان لم یذكر اذالک فی البیع وتلفظا بلفظ البیع بشرط الوفاء ،او تلفظابالبیع الجائز ،وعندهما ای فی نیة المتعاقدین هذاالبیع عبارة عن بیع غیر لازم ،فكذالک ،ان ذكراالبیع من غیر شرط ثم ذكرا الشرط المواعدة ،فالبیع جائز ویلزم الوفاء بالوعد،لان المواعید قدتكون لازمة فتجعل لازمة لحاجة الناس۔

(هكذا فی فتاوی قاضیخان:۱۶۹/۲ طبع قدیمی)

ولمافی المقالات الفقهیة :(ص ۵۲ مکتبہ دارالعلوم کراچی)

اذانظرناالی ماذكره اجلة الفقهاء من المذاهب الاربعة وجدناهم متفقین علی ان بیع الوفاء لوكان خالیاعن شرط الردفی صلب العقدیكون جائزا،امااذاشرط ردالبیع فی صلب العقدیكون البیع فاسداعندالاحناف والمالكیة والشافعیة اماالحنابلة فیرون البیع صحیحاوالشرط فاسدافاذاكان البیع خالیاعن شرط ردالمبیع فالراجح فی المذاهب الاربعة انه جائز وذلک لكونه بیعاخالیاعن شرط وهل یجب الردعلی احدالمتعاقدین اذااتفقاعلی ردالمبیع عندردالثمن وكان ذلک الاتفاق قبل عقدالبیع اوبعده بصورة المواعدة فنری الراجح انه یجب علیهماالرداذاتراعداعلی ذلک ویكون الوعدملزمادیانة وقضاء ،اماوجوب الوعددیانة فظاهرلقوله تعالی :واوفوابالعهدان العهدكان مسئولا ،وبالنصوص التی تدل علی ایفاء الوعد،واماالزومه قضاء فالامرعندالامام مالک ظاهركماتقدم ،والفقهاء الحنفیة ایضاالختاروافی هذه المسئلة لزوم الوعدقضاء لحاجة الناس فهوالراجح عندالامامین الجلیلین .

ولمافی المحیط البرهانی (ج۱۰/۳۶۹ طبع ادارة القرآن

وفی فتاوی النسفی :ان البیع الذی تعارفوه اهل سمرقند وسموه بیع الوفاء تحرزاعن الرباء فی الحقیقة رهن والمبیع فی یدالمشتری كالرهن فی ید المرتهن لایملكه ولایحل له الانتفاع به الاباذن الراهن وهوضامن لماأكل من ثمرته واستهلكه من عینه ،والدین ساقط بهلاكه فی یده اذكان به وفاء بالدین وللبائع استرداده اذاقضی الدین اذلافرق

عندنا بینه وبین الرهن فی حق حکم من الاحکام۔

الجواب صحیح: مفتی عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ   واللہ اعلم بالصواب: عزیز احمد خضداری غفرلہ ولوالدیہ

۸ رجب المرجب ۱۴۳۵ھ   فتویٰ نمبر: ۴۲۳۸

﴿عام ریٹ سے مہنگا بیچنا، دوکاندار سے کمیشن لینا﴾

﴿سوال﴾ کسی دوسری دوکان سے کوئی چیز اٹھا کر گاہک کو مہنگے ریٹ بیچنا جائز ہے؟ جو کہ ہم دوکاندار سے سستے ریٹ پر لیتے ہیں، اسی طرح گاہک کو دوسری دوکان پر لے جانا اور اس دوکان والے سے کمیشن لینا جائز ہے؟   مستفتی: محمد دین وزیرستانی

﴿جواب﴾ دوسری دوکان سے چیز اٹھا کر گاہک کو مہنگا دینا جائز ہے لیکن عام مارکیٹ سے بہت مہنگا دینا، گاہک کی ناواقفیت یا مجبوری سے غلط فائدہ اٹھانا، خلاف مروّت ہے تاہم منافع جائز ہیں، دوسرے دوکاندار کو گاہک مہیا کر کے دوکاندار سے کمیشن لینا جائز ہے بشرطیکہ پہلے سے معروف یا متعین ہو۔

لمافی قوله تعالیٰ:(سورة النساء،آیت ۲۹)

﴿یاایها الذین امنوا لاتأکلوا اموالکم بینکم بالباطل الّا ان تکون تجارة عن تراض منکم﴾

ولمافی الهندیة:(۱۶۱/۳،طبع رشیدیه)

ومن اشتری شیاواغلی فی ثمنه فباعه مرابحة علی ذلک جاروقال ابویوسفؒ اذازاد زیادة لایتغابن الناس فیهافانی لااحب ان یبیعه مرابحة حتی یبین.

ولمافی الدرمع الرد:(۵۶۰/۴،طبع سعید)

واماالدلال فان باع العین بنفسه باذن ربهافاجرته علی البائع وان سعی بینهماوباع المالک بنفسه یعتبرالعرف.

وفی الشامیة:(فاجرته علی البائع)ولیس له اخذشئی من المشتری لانه هوالعاقدحقیقة شرح الوهبانیة وظاهره انه لایعتبرالعرف هنالانه لاوجه له(قوله یعتبرالعرف)فتجب الدلالة علی البائع اوالمشتری او علیهما بحسب العرف جامع الفصولین.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ   واللہ اعلم بالصواب: فرمان اللہ غفرلہ

۱۷ ربیع الثانی ۱۴۲۸ھ   فتویٰ نمبر: ۷۸۰

﴿عیب ظاہر ہونے کی صورت میں خریدار مبیع کو لوٹا سکتا ہے﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں مفتیان کرام اس مسئلہ کے متعلق کہ میں استعمال شدہ بوٹ اور

جوتے خریدتا اور بیچتا ہوں کبھی جوتوں کے بنڈل میں ایسے جوڑے بھی آجاتے ہیں کہ بناوٹ اور ساخت میں تو ایک ہی قسم کا ہوتا ہے لیکن ایک جوتا چالیس انچ کا ہوتا ہے اور دوسرا بیالیس انچ کا، کیا میرے لیے صرف ایسے جوڑے واپس کرنے کا اختیار ہے یا نہیں، اسطرح کے جوڑے گاہک کو بغیر بتائے بیچ سکتا ہوں یا نہیں جبکہ اکثر گاہکوں کو اسکا پتہ نہیں چلتا، چنانچہ خریداری کے بعد اگر گاہک اسی وجہ سے جوتا واپس کرنا چاہے تو کیا میرے لیے واپس لینا ضروری ہے؟

﴿جواب﴾ عیب کیوجہ سے خریدار کو مبیع واپس کرنے کا حق حاصل ہے بشرطیکہ پوری وضاحت کیساتھ شروع میں وہ خود اپنا یہ حق ساقط نہ کردے مثلاً یوں کہے کہ ہرطرح کے عیب کیساتھ بھی مجھے منظور ہے یا بائع کہدے کہ اس چیز میں کسی قسم کے عیب کی میری کوئی ذمہ داری نہ ہوگی اور خریدار اس شرط کو منظور کرے تو ایسی صورت میں خریدار کو واپس کرنے کا حق باقی نہیں رہتا، لہذا جوڑے کے سائز میں فرق کیصورت میں گاہک آپکو واپس کرسکتا ہے۔

البتہ پورے بنڈل کا سودا ایک ساتھ کیا ہو تو ایسی صورت میں صرف ایک دو جوڑے واپس لینے پر بائع کو مجبور نہیں کیا جاسکتا، آپ واپس کرنا چاہتے ہیں تو پورا بنڈل واپس کریں اسلئے کہ بائع اچھے اور کمزور ملا کر بیچنا چاہتا ہے اور کمزور عیب دار جوتے نکالنے کیلئے اچھے جوڑوں کے بھی کم پیسے وصول کرتا ہے۔

لمافی فتح القدیر:(۳۰/۶-۳۱ طبع رشیدیه)

(و) اما (لو) كان (قبضهما أعني العبدين (ثم وجد باحدهما عيبا) فان له أن (برده خاصة خلافا لزفر)۔ ثم هذا فيما يمكن افراد أحدهما دون الآخر في الانتفاع كالعبدين أما اذا لم يمكن في العادة كنعلين أو خفين أو مصراعي باب فوجد باحدهما عيبا فانه يردهما أو يمسكهما بالاجماع لانهما في المعنى والمنفعة كشئ واحد والمعتبر هو المعنى.

ولمافی البحر الرائق:(۳٦/٦ طبع سعید)

(قوله من وجد بالمبيع عيبا أخذه بكل الثمن أو رده) لان مطلق العقد يقتضي وصف السلامة فعند فواته يتخير كيلا يتضرر بلزوم مالا يرضى به دل كلامه انه ليس له امساكه وأخذ النقصان لان الاوصاف لا يقابلها شئ من الثمن في مجرد العقد ولانه لم يرض بزواله عن ملكه باقل من المسمى فيتضرر به ودفع الضرر عن المشتري ممكن بالرد بدون تضرره أطلقه فشمل ما اذا كان به عند البيع لو حدث بعده في يد البائع وما اذا كان فاحشا أو يسيرا كذا في السراج الوهاج۔

ولمافی البحرالرائق:(۶/۶۲،طبع سعید)

(قوله ولوبرئ من کل عیب به صح وان لم یسم الکل ولایردبعیب)لان الجهالة فی الاسقاط لاتفضی الی المنازعة وان کان فی ضمنه التملیک لعدم الحاجة الی التسلیم فلاتکون مفسدة.

ولمافی التنویرمع الدر:(۵/۵،طبع ایچ ایم سعید)

(من وجدبمشریه ماینقص الثمن)ولویسیراجوهرة(عندالتجار)المرادبهم أرباب المعرفة بکل تجارة وصنعة قاله المصنف(أخذه بکل الثمن أورده)

الجواب صحیح:عبدالرحمٰن عفااللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب:عبدالرحمٰن کوہاٹی

۲۸ربیع الاول ۱۴۳۰ھ — فتویٰ نمبر:۶/۲۱۷

﴿مردہ جانور کے دودھ کی بیع کا حکم﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلے کے بارے میں کہ ہماری ہاں ایک آدمی کی بھینس مرگئی پھراس آدمی نے مری ہوئی بھینس کا دودھ نکالا اور دوسرے صاف دودھ کے ساتھ ملا کر بیچ دیا، کیا اس آدمی کا یہ فعل جائز ہے یا نہیں؟

﴿جواب﴾ اس آدمی کا یہ فعل جائز ہے۔

لمافی الجوهرة النیرة:(ص۲۰،طبع میرمحمد)

وان ماتت شاة فخرج من ضرعهالبن قال ابوحنیفةؒ هوطاهریحل شربه.

ولمافی الهندیة:(۵/۳۳۹،طبع رشیدیه)

البیضةاذاخرجت من دجاجة میتة اکلت وکذااللبن الخارج من ضرع الشاة المیتة.

ولمافی الدرمع الرد:(۱/۲۱۰،طبع امدادیه)

وکذاکل مالاتحله الحیاة حتی الانفحة واللبن علی الراجح.

وفی الشامیة:قوله:(علی الراجح)ای الذی هوقول الامام،ولم ارمن صرح بترجیحه، ولعله اخذه من تقدیم صاحب الملتقی له وتاخیره قولهماکماهوعادته فیمایرجحه. وعبارته مع الشرح:وانفحة المیتة ولومائعة ولبنهاطاهرکالمذکاة خلافالهمالتنجسهمابنجاسة المحل.قلنانجاسته لاتوثرفی حال الحیاة اذاللبن الخارج من بین فرث ودم طاهر،فکذابعدالموت.اھ.

الجواب صحیح:عبدالرحمٰن عفااللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب:محمد حسین

۲۲ربیع الثانی ۱۴۲۸ھ — فتویٰ نمبر:۶/۸۰

﴿بیعانہ کا شرعی حکم﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے کہ میں نے ایک پلاٹ دس لاکھ کا خریدا اور لاکھ روپے بطور بیعانہ کے بائع کو دیدیا اور کہا کہ باقی پیسے ادا کر کے میں پلاٹ پر قبضہ کرلوں گا، چند دنوں کے بعد بائع آیا اور اس نے کہا کہ آپ نے جو ایک لاکھ روپے بطور بیعانہ دیا ہے، اس کا دوگنا لے لو لیکن میں پہلی والی بیع فسخ کرتا ہوں اور پلاٹ دینے کیلئے تیار نہیں ہوں، پوچھنا یہ ہے کہ ایک لاکھ بیعانہ کے ساتھ مزید ایک لاکھ لے سکتا ہوں؟ اور کیا بائع کو اس صورت میں فسخ کرنے کا اختیار ہے؟ جب کہ ایجاب وقبول کے وقت اس نے کسی قسم کا خیار بھی اپنے پاس نہیں رکھا تھا؟ مستفتی: محمد سلیم ڈیفنس فیز ا

﴿جواب﴾ بیع ایجاب وقبول سے مکمل ہوگئی ہے، اب مشتری پر ضروری ہے کہ پیسے ادا کرے اور بائع پر واجب ہے کہ وہ مبیع کو مشتری کے سپرد کرے، بصورت دیگر اگر بائع مبیع کو حوالہ سے انکار کرے تو وہ اس انکار کی وجہ سے گنہگار ہوگا مگر آپ کیلئے بیعانہ کا دوگنا لینا جائز نہیں ہے، اب اگر نزاع سے بچنے کیلئے اپنے حق کو چھوڑ دیں تو عند اللہ ماجور ہونگے۔

لمافی المرقاۃ:(۱۳۵/۶ طبع رحمانیہ)

عن ابی مرۃ الرقاشی عن عمہ قال قال رسول اللہ ﷺ:الالا تظلموا الالا یحل مال امری الابطیب نفسہ.

ولمافی الهدایۃ:(۲۰/۳،طبع رحمانیہ)

واذاحصل الایجاب والقبول لزم البیع ولاخیار لواحدمنهما الامن عیب اوعدم رویۃ.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ واللہ اعلم بالصواب: خضر حیات کمالوی

۲۶ ربیع الاول ۱۴۲۸ھ فتویٰ نمبر: ۷۰۳

﴿مبیعہ کا قبضہ میں آنے نیز ادھار کی صورت میں قیمت بڑھانے کا مسئلہ﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں (۱) میں نے ایک لاکھ روپے نقد دیکر ایک دوکاندار سے چینی خریدی دوکاندار نے چینی میرے سامنے وزن کر کے الگ رکھ دی، اب میں اس چینی کو فروخت کر سکتا ہوں یا وہاں سے اٹھانا ضروری ہے؟

(۲) مذکورہ چینی کو میں ڈیڑھ لاکھ ماہانہ تین ہزار قسطوں پر بیچ سکتا ہوں ادھار کی صورت

میں زیادہ قیمت لینا سود کے زمرے میں تو نہیں آتا؟ مستفتی: محمد دین

﴿جواب﴾ (۱) بیع کے بعد اگر بائع مبیعہ میں تخلیہ کر دے تو اس سے حکماً مشتری کا قبضہ ثابت ہو جاتا ہے جس کی وجہ سے مشتری کے لئے آگے بیچنا درست ہو جاتا ہے اور مذکورہ صورت میں بھی دوکاندار کا چینی کو وزن کر کے الگ رکھ دینا تخلیہ ہے، اس لئے خریدار کیلئے آگے بیچنا شرعاً درست اور جائز ہے۔

لما فی الهندية: (۱۶/۳، طبع رشیدیه)

واجمعوا على ان التخلية في البيع الجائز تكون قبضا وفي البيع الفاسد روايتان والصحيح انها قبض. ومثله في الشامية: (۵/۵۱۱-۶۲، طبع ایچ ایم سعید)

(۲) مذکورہ صورت بیع تام کی ہے، اس لئے خریدار اپنی چینی کو نقد کی صورت میں کم قیمت پر اور ادھار کی صورت میں زیادہ قیمت پر فروخت کر سکتا ہے، البتہ مجلس عقد میں نقد یا ادھار نیز قیمت اور قسطوں کی تعیین ضروری ہے۔

لما فی جامع الترمذی: (۱/۱۴۷، طبع فاروقی ملتان)

نهى رسول الله ﷺ عن بيعتين في بيعة --- ان يقول ابيعك هذا الثوب بنقد بعشرة وبنسئة بعشرين ولا يفارقه على احد البيعين فان فارقه فلا بأس به اذا كانت العقدة على احد منهما.

ولما فی الشامی: (۵/۱۴۲، طبع ایچ ایم سعید)

لان الاجل في نفسه ليس بمال، فلا يقابله شيء حقيقة اذا لم يشترط زيادة الثمن بمقابلته قصدا، ويزاد في الثمن لاجله اذا ذكر الاجل بمقابلة زيادة الثمن قصدا.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: رشید عالم مروت

۲۵ ربیع الثانی ۱۴۲۸ھ — فتویٰ نمبر: ۸۲۲

﴿سامان پہنچنے سے پہلے ریٹ مقرر کرنے نیز اپنے حق سے زیادہ لینے کی شرعی تحقیق﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں (۱) میں ایک تاجر آدمی ہوں مال کی خرید و فروخت میرا ذریعہ معاش ہے، بسا اوقات سامان فروختگی یعنی چینی، گندم، گھی وغیرہ میرے پاس حالاً موجود نہیں ہوتا اور اس دوران گاہک سامان خریدنے کیلئے آجاتا ہے، پوچھنا یہ ہے کہ کیا ہم باہمی رضامندی سے قسط وار ریٹ مقرر کر سکتے ہیں جب کہ مطلوبہ سامان

میرے پاس موجود نہ ہو اور نہ میں نے منگوایا ہے، البتہ بازار میں موجود ہو، نیز اس بات کی بھی وضاحت کریں کہ مذکورہ صورت بیع کی ہوگی یا صرف وعدہ بیع ہوگا؟

(۲) حکومت کے کنٹرول سے مقررہ نرخ پر جو چیزیں ملتی ہیں مثلاً یوٹیلٹی اسٹور وغیرہ سے، جن کا ریٹ نسبتاً سستا ہوتا ہے اگر کوئی شخص چالاکی کر کے محدود مقدار سے زیادہ خریدے تو کیا ان چیزوں گھی، چینی، دال وغیرہ کو زیادہ قیمت پر بیچ سکتا ہے یا نہیں؟ مستفتی: محمد دین

﴿جواب﴾ مذکورہ صورت کی وضاحت یہ ہے کہ بائع مشتری سے یہ کہے کہ اس وقت آپ کا مطلوبہ سامان چینی یا گندم وغیرہ میرے پاس موجود نہیں ہے، اس لئے فلاں تاریخ تک آپ کو انتظار کرنا پڑے گا اور جس دن سامان میرے پاس پہنچے گا تو قسط وار اتنی قیمت پر دیدوں گا اور خریدار بھی یہ کہے کہ ہاں میں آپ سے اتنا سامان قسط وار اتنی قیمت پر لے لوں گا۔

یہ وعدہ بیع ہوگا بیع نہیں ہوگی کیونکہ بیع کی صحت کیلئے ضروری ہے کہ مبیعہ بائع کی ملکیت اور قبضے میں ہو جب کہ مذکورہ صورت میں بائع نے [illegible] سے سامان خریدا ہی نہیں ہے، اس لئے آگے بیچنا "بیع مالا یملک یا بیع قبل القبض" [illegible] آئے گا جو کہ شرعاً ناجائز ہے، لہٰذا اس طرح کا زبانی معاملہ اگر کسی مسلمان کیساتھ کر لیا ہو تو سامان پہنچنے پر طے شدہ قیمت کے مطابق باہمی رضامندی سے دوبارہ ایجاب وقبول کرنا ضروری ہوگا، ورنہ بیع فاسد ہی رہی گی۔

لمافی الهندية:(۲/۲ طبع رشيديه)

ومنها في المبيع وهو ان يكون موجودا فلا ينعقد بيع المعدوم وماله خطر العدم ..... وان يكون مملوكا في نفسه وان يكون ملك البائع فيما يبيعه لنفسه فلا ينعقد بيع الكلا ولو في ارض مملوكة ولا بيع ماليس مملوكا له وان ملكه بعده الا السلم

(۲) حکومت کی طرف سے رعایتی نرخ پر معین مقدار میں جو چیزیں یوٹیلٹی اسٹور وغیرہ سے ملتی ہیں، متعینہ مقدار میں خرید کر ذاتی استعمال میں لانا چاہے یا منافع پر کسی کو فروخت کرنا چاہے تو یہ جائز ہے، البتہ چالاکی سے اپنے حق سے زیادہ خرید کر دوسروں کو منافع پر بیچنا دھوکہ اور ناجائز عمل ہے۔

لمافي قوله تعالى:(سورة البقرة، ايت ۱۸۸) ﴿ولا تأكلوا اموالكم بينكم بالباطل ..... الآية﴾

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ

واللہ اعلم بالصواب: رشید عالم مروت

۱۴۲۸ھ

فتویٰ نمبر:

﴿ٹیلی فون پر بیع کی صورت میں اگر مال راستے ہی میں ضائع ہوگیا تو نقصان کس پر آئیگا؟﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میں نے بھائی بخت منیر سے بذریعہ فون (ایک ہزار) کلو شہد منگوایا، انہوں نے میرے کہنے پر مال کو ٹرک کے ذریعے روانہ کیا، راستے میں آتے وقت گاڑی کا ایکسیڈنٹ ہوگیا، اور اس مال میں سے (سو) کلو ضائع ہوگیا، اب اس نقصان کا ذمہ دار میں ہوں گا یا بھائی بخت منیر ہوگا یا گاڑی کا ڈرائیور ہوگا؟

واضح رہے کہ یہ کاروبار ہمارا آپس میں کافی عرصے سے چل رہا ہے لیکن ہم نے یہ واضح نہیں کیا تھا کہ اگر راستے میں مال ہلاک ہوا تو نقصان کس کو اٹھانا پڑے گا، اب ہم دونوں چاہتے ہیں کہ ہمیں شرعی مسئلہ معلوم ہو جائے تا کہ اس پر عمل کریں۔ مستفتی: محمد محسن صاحب

﴿جواب﴾ مذکورہ مسئلہ میں نقصان کا ذمہ دار خریدار ہوگا۔ کیونکہ خریدار کے کہنے پر بائع نے جب مال گاڑی کے حوالہ کر دیا اور گاڑی کے عملہ نے اس مال کو قبضے میں لے لیا تو گویا کہ مال بائع کے قبضے سے نکل کر خریدار کے قبضے میں آ گیا کیونکہ گاڑی کا عملہ خریدار کی طرف سے وکیل کی حیثیت رکھتا ہے اور وکیل کا قبضہ مؤکل کا قبضہ سمجھا جاتا ہے اور جب گاڑی کے عملہ کا سامان پر قبضہ کر لینا حکماً خریدار ہی کا قبضہ قرار دیا تو اب نقصان کا ذمہ دار بھی خریدار ہوگا لیکن یہ اس صورت میں جب گاڑی کرایہ پر لینے کا خریدار نے آرڈر دیا ہو، بالفرض گاڑی کا انتظام کرنے کو خریدار نے آڈر نہیں دیا ہو اور پہلے سے بھی ایسا معمول نہ رہا ہو بلکہ بائع از خود گاڑی کا انتظام کر لیتا ہے تو اس صورت میں نقصان بائع کا شمار ہوگا۔

دوسری بات یہ بھی ملحوظ رہے کہ ڈرائیور نے بھی حتی الامکان مال بچانے کی کوشش کی ہو اور اگر مال ڈرائیور کی بے احتیاطی کی وجہ سے ہلاک ہوگیا ہو تو پھر نقصان کا ذمہ دار گاڑی کا ڈرائیور ہوگا۔

لما فی الفقه الاسلامی وادلته: (۳۲۹۵/۵، طبع رشیدیه)

البیع بالمراسلة او بواسطة رسول (ای وکیل) یصح اتفاقا و یکون مجلس التعاقد هو مجلس بلوغ الرسالة من العاقد الاول الی العاقد الثانی الخ.

ولما فی العالمگیریة: (۱۹/۳، طبع رشیدیه)

اذا قال المشتری للبائع ..... استاجر علی من یحمله فقبض الاجیر یکون قبض المشتری ان صدقه انه استاجر ودفع الیه وان انکر استئجاره والدفع الیه فالقول قوله.

ولما فی الفقه الاسلامی وادلته:(۳۲۷۹/۵،طبع رشیدیه)

اذاهلک بعض المبیع بعدالقبض: فان کان الهلاك بآفة سماوية اوبفعل المشترى او المبيع نفسه اوبفعل اجنبى فالهلاك على المشترى.

ولما فی العالمگیریة:(۵۰۰/۴،طبع رشیدیه)

وحکم اجیرالواحدانه امین فی قولهم جمیعاحتی ان ماهلک من عمله لاضمان علیه..... وحکم الاجیرالمشترك ان ماهلک فی یده من غیرصنعه فلاضمان علیه فی قول ابی حنیفة وهوقول زفروالحسن وانه قیاس سواء هلک بامریمکن التحرزعنه کالسرقة والغصب اوبامرلایمکن التحرزعنه کالحرق الغالب والغارة الغالبة والمکابرة وقال ابو یوسف ومحمد:ان هلک بامریمکن التحرزعنه فهوضامن وان هلک بامرلایمکن التحرزعنه فلاضمان کذافی المحیط ... وبقولهمایفتی الیوم لتغیراحوال الناس وبه یحصل صیانة اموالهم کذا فی التبیین.

الجواب صحیح:عبدالرحمٰن عفااللہ عنہ　　　　واللہ اعلم:رشید عالم مروت

۲۶ جمادی الاولیٰ ۱۴۲۸ھ　　　　فتویٰ نمبر:۹۲۳

﴿سمندری جہاز کا مال پہنچنے سے پہلے بیع کا حکم﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام کہ ہم باہر سے مال منگواتے ہیں اور وہ مال ابھی تک سمندر میں ہوتا ہے کہ ہم ان کاغذات (مال) کو دوسرے پر بیچ دیتے ہیں اسی طرح وہ آگے تیسرے پر بیچ دیتا ہے تو کیا یہ معاملہ درست ہے، نیز اگر مال ہلاک ہو گیا تو کس کا ہلاک ہوگا؟

﴿جواب﴾ مذکورہ صورت میں اس مال کا مالک یعنی پہلا خریدار کسی دوسرے کو یہ مال فروخت کرسکتا ہے اسلئے کہ جہاز کے عملہ کا قبضہ خریدار کی طرف سے وکالۃً قبضہ تصور ہوگا لہٰذا یہ بیع قبل القبض میں داخل نہ ہوگا۔

لمافی الهندیة:(۱۹/۳،طبع رشیدیه)

الاان یقول استاجرعلی من یحمله فتبض الاجیریکون قبض المشتری ان صدقه انه استاجره فدفع الیه وان انکراستئجاره والدفع الیه فالقول قوله کذافی التاتارخانیة.

البتہ ہلاک ہونے کی صورت میں اصل خریدار کا نقصان شمار ہوگا اسلئے کہ مال جہاز کے عملہ کے قبضہ میں ہے جو بائع کا وکیل ہے۔

لمافی فتح القدیر:(۲۸۴/۶،طبع رشیدیه کوئٹه)

(ولوهلک)المبیع(فی یدالبائع)والحال ان الخیارله فلااشکال فی انه ینفسخ(ولا شئی

علی المشتری اعتبارابالبیع الصحیح المطلق)عن شرط الخیارفان فیه اذا هلک المبیع فی یدالبائع قبل التسلیم انفسخ البیع.

ولمافی الهندیة:(۱۸/۳،طبع رشیدیه)

ولوقبض بعدذالک حقیقة الآن یصیرمشتریاقابضاحتی لوهلک هلک علیه بالاتفاق کذافی الغیاثیه (بحواله مذکوره بالا بتغیر)

لیکن یہ دوسرا شخص آگے کسی تیسرے خریدار کو مال پہنچنے سے پہلے نہیں بیچ سکتا ورنہ تو بیع قبل القبض ہوگی جو کہ ناجائز ہے۔

لمافی الصحیح لمسلم:(۵/۲،طبع قدیمی)

عن ابن عباسؓ قال قال رسول اللہ ﷺ من ابتاع طعامافلایبیعه حتی یقبضه قال ابن عباسؓ احسب کل شئی بمنزلة الطعام.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفااللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: بلال احمد غفرہ الاحد

۱۴۲۸ھ — فتویٰ نمبر: ۸۱۶

﴿قیمت مقرر کرنے سے پہلے بیچنا﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک سبزی فروش صبح سویرے منڈی سے سبزی لاتا ہے پھر تھوڑی دیر بعد اس کی قیمت مقرر کرتا ہے، گاؤں کے بعض لوگ اس سے قیمت مقرر کرنے سے پہلے سبزی خرید لیتے ہیں اور بعد میں سبزی فروش جو قیمت مقرر کرتا ہے وہ ادا کرتے ہیں تو کیا قیمت مقرر کرنے سے پہلے بیچنا جائز ہے یا نہیں؟

﴿جواب﴾ قیمت طے کر کے سودا ہونا چاہیے تاہم قیمت طے کئے بغیر حسن اعتماد سے سبزی وغیرہ بیچ دی اور قیمت وصول کرتے ہوئے کسی قسم کے جھگڑے یا ناراضگی کا کوئی اندیشہ نہ ہو تو جائز ہے ورنہ ناجائز جبکہ بہتر یہی ہے کہ پہلے سے قیمت طے ہو۔

لمافی بدائع الصنائع:(۱۵۶/۵،طبع سعید)

منهاأن یکون المبیع معلوماوثمنه معلوماعلمایمنع من المنازعة فان کان أحدهمامجهولاجهالة مفضیة الی المنازعة فسدالبیع وان کان مجهولاجهالة لاتفضی الی المنازعة لایفسدلان الجهالة اذاکانت مفضیة الی المنازعة کانت مانعة من التسلیم والتسلم فلایحصل المقصودواذالم تکن مفضیة الی المنازعةلاتمنع من ذلک فیحصل المقصود.

ولمافی الهندیة:(۳/۳،طبع رشیدیه)

منهاأن یکون المبیع معلوماوالثمن معلوماعلمایمنع من المنازعة فبیع المجهول

جهالة تفضى اليها غير صحيح.

ولمافى ردالمحتار:(۵۰۵/۲،طبع سعيد)

وأما الثالث وهو شرائط الصحة...... ومعلومية الثمن بمايرفع المنازعة.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: عبداللہ عفا اللہ عنہ

۱۶ جمادی الثانی ۱۴۲۸ھ — فتویٰ نمبر: ۹۹۶

﴿خریدار پر عقد کے وقت طے شدہ قیمت ہی لازم ہے﴾

﴿سوال﴾ کیافرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ عبداللہ نے ایک دوکاندار سے ۶۵۰ روپے کی گھڑی خریدی اور گھر جا کر گھڑی ڈبے سے نکال دی، ۴ گھنٹے بعد عصر کے وقت وہ دوکاندار عبداللہ کیساتھ ملا اور کہا، کہ میں نے جو آپ کو گھڑی بیچی تھی، میں نے ریٹ لسٹ نہیں دیکھا تھا۔ اس کی قیمت ۶۵۰ نہیں بلکہ ایک ہزار روپے ہے۔

اب پوچھنا یہ ہے کہ کیا مشتری (عبداللہ) پر مزید ۳۵۰ روپے دینا از روے شرع ضروری ہے یا نہیں؟ براہ کرم شریعت کی روشنی میں وضاحت فرمائیں؟ مستفتی: قاری سید قیوم دیروی

﴿جواب﴾ دوکاندار کا ریٹ لسٹ نہ دیکھنا اسکی اپنی کوتاہی ہے عبداللہ کے ذمہ صرف وہی رقم ۶۵۰ روپے ہے اضافی رقم ۳۵۰، اس کے ذمہ نہیں ہے بائع اور مشتری ایک چیز کی قیمت سودا کے وقت جو طے کر لیتے ہیں اسی کا اعتبار ہوتا ہے۔ رہا یہ کہ ایسی صورت میں دوکاندار کا واضح نقصان ہے تو تجارت میں کبھی نقصان ہونا بھی تجارت کا حصہ ہے لھذا یہ کوئی بات نہیں، تاہم عبد اللہ بخوشی ۳۵۰ روپے یا کم وبیش اپنی طرف سے دیدے تو یہ اس کا احسان ہوگا۔

لمافى الدرالحكام شرح مجلة الاحكام:(۳۶۸،۳۶۷/۱،طبع: ماجديه)

لا يثبت الخيار بالغبن الفاحش بلاتغرير الا ان بيع مال الوقف ومال اليتيم ومال بيت المال بغبن فاحش يعد باطلا.............وكذا لو اشترى شخص من آخر داره بلا تغرير باربعين الف قرش أى بدون ان يقول للبائع ان دارك لاتساوى اكثرمن أربعين الف قرش فليس للبائع ان يفسخ البيع بداع انه باع الدار باقل من قيمتها

ولمافى تنوير الابصار مع الدر المختار:(۱۴۲/۲،طبع :سعيد)

(ان غره) اى غر المشترى البائع اوبالعكس اوغره الدلال فله الرد (والا لا) وبه أفتى صدر الاسلام وغيره

وفى الشامية وحيث كان ظاهر الرواية محمول على هذاالقول يكون هو ظاهر

الرواية وحينئذ لم يبق لنا الا قول واحد وهو المصرح بانه ظاهر الرواية بانه التفصيل المصحح المفتى به

ولما في تكملة فتح الملهم:(۱/۱۵۳،طبع :دار العلوم کراچی

واما الحنفية والشافعية واكثر المالكية فلاخيار عندهم للمغبون سواء كان مسترسلا او غيره لان العقد وقع على ثمن مخصوص بالتراضي وكل من المتعاقدين عاقل فصار تجارة عن تراض.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ　　　واللہ اعلم بالصواب: سمیع الرحمٰن دیروی

۵ شعبان ۱۴۳۲ھ　　　فتوی نمبر: ۳۳۶۵

﴿والد اپنے بیٹے کو اپنی جائیداد فروخت کرسکتا ہے﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام دریں مسئلہ کہ باپ اپنے بیٹے کو اپنی مملوکہ زمین، گھر فروخت کرسکتا ہے یا نہیں؟　　　مستفتی: عرباض شمس

﴿جواب﴾ والد اپنی مملوکہ جائیداد میں ہر قسم کے تصرفات کا حق رکھتے ہیں اور جس کو بھی چاہے فروخت کرسکتے ہیں لہٰذا اپنے بیٹے کو بھی اپنی مملوکہ زمین فروخت کرسکتے ہیں، اس میں شرعاً کوئی قباحت نہیں ہے۔

لمافي فتاوى قاضي خان على هامش الهندية:(۲/۲۸۳،طبع رشيديه)

ولو كانت الدار مشتركة بين الأب وأجنبي فقالت المرأة لهما اشتريت منكما هذه الدار لابني بماله فقالا بعنا يجوز لان الأب لما جوز شرائها للصغير جملة الدار فقد أذن لها بشراء الجملة.

ولما في البزازية على هامش الهندية:(۲/۴۷۶،طبع رشيديه)

دار لرجل اومشترك بين الاب والرجل وللاب ابن صغير له ام فقالت اشتريت هذه الدار لابني بماله والاب حاضر او اشتريت منكما لابني بماله فقالا بعنا وقع الملك للابن لاجازة الاب بالحضور او بقبول العقد.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ　　　واللہ اعلم بالصواب: ظہور احمد شمس

۲۷ رجب المرجب ۱۴۲۹ھ　　　فتوی نمبر: ۱۷۳۹

﴿روٹیوں کے ٹکڑے فروخت کرنا جائز ہے﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام دریں مسئلہ میں کہ ضرورت سے زیادہ روٹیاں ''ٹکڑے'' جمع کر کے فروخت کرنا جائز ہے یا نہیں؟　　　مستفتی: عرباض شمس

﴿جواب﴾ بنیادی طور پر خرید و فروخت کے لئے کسی چیز کا مال متقوم ہونا لازمی ہے چونکہ

روٹی "ٹکڑے" اور آٹا مال متقوم میں سے ہیں اس لئے اسکی خرید وفروخت شرعاً جائز ہے۔

لمافی حاشیة الشلبی علی تبیین الحقائق:(۴/۲۷۶،طبع سعید)

وشرط ان یکون فی العقد عوضان کل واحد منهما مال لیتحقق رکن البیع وهو مبادلة المال بالمال.

ولمافی البحر الرائق:(۶/۹۲،طبع ایچ ایم سعید)

وقیدہ بقوله وکل من عوضیه مال لیخرج البیع بالمیتة وکل بیع باطل کالبیع مع نفی الثمن فانه باطل ومع السکوت عنه فاسد.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: ظہور احمد شمس

۲۷رجب المرجب ۱۴۲۹ھ — فتویٰ نمبر: ۱۷۴۰

﴿مملوکہ حوض میں بارش کے جمع شدہ پانی کے بیچنے کا حکم﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں ایک آدمی اپنی مملوکہ زمین میں ٹینکی بنادے یا گھر کے اندر حوض سا بنادے جس میں بارش کا پانی جمع ہوجائے تو یہ شخص اس پانی کو بیچ سکتا ہے یا نہیں؟ نیز دوسرے لوگوں کو روک سکتا ہے یا نہیں؟ شرعاً اس کا کیا حکم ہے؟

﴿جواب﴾ اس شخص نے چونکہ اپنی مملوکہ زمین وغیرہ میں پانی کو جمع کرنے کا سسٹم بنا رکھا ہے، اس لئے یہ پانی بھی اسکی ملکیت میں داخل ہے، اس میں جس طرح تصرف کرنا چاہے کرسکتا ہے اور دوسروں کو اس میں تصرف کرنے سے روک بھی سکتا ہے چونکہ دور حاضر میں پانی کی مقدار کو آلات کے ذریعے معلوم کرنا بھی آسان ہے اور پانی بیچنے کا مانع (جہالت مقدار) دور ہوگیا ہے، اس لئے بیچنے کی بھی گنجائش معلوم ہورہی ہے، البتہ انسانوں اور جانوروں کے پینے کا پانی بیچنا جائز نہیں بلا معاوضہ دینا چاہیے۔

لمافی المرقاة:(۶/۷۳،طبع رشیدیه)

(وعنه) ای عن جابر (قال نهی رسول الله صلی الله علیه وسلم عن بیع فضل الماء) ای ممن یریدان یشربه اویسقیه دابته فأماان ارادان یسقیه الزرع اوالنخل جازلصاحب الماء ان لایعطیه الابعوض.(والحدیث رواه مسلم)

ولمافی تکملة فتح الملهم:(۱/۵۲۱-۵۲۲،طبع دارالعلوم کراچی)

واماکون الماء المحرز مملوکافیدل علیه حدیث الباب الی قوله وقدعقدالامام البخاری بابالاثبات الملک علی الماء المحرز فی کتاب الشرب...... فیقاس علیهاالماء فانه مباح فی اصله ویتملک بالاحراز وصارت هذه الاستنباطات الیوم موکدة باجماع الامة

فلایجوز العدول عنه.

ولمافی تکملة فتح الملهم:(۱/۲۲-۵۲۳،طبع دار العلوم کراچی)

والثالث ماء الابهار والحیاض والعیون ......وقیاس هذا التعلیل ان یجوز ذلک الیوم لان الیوم قد وجد العدادات التی یمکن بها ضبط مقدار الماء وعلی هذا ینبغی ان یجوز ذلک الیوم اذا امکن ضبط مقداره بالعداد.

ولمافی حاشیة شرح الوقایة:(۸۷/۳،قبیل باب الصرف،طبع امدادیه)

ولو فرع هذه احکام اخری بنی فی الاشیاء المباحة لمناسبة الملک واصله ان المباح لایملک الابسبق الید..... اوحفر حفرة لاجتماع الماء.

الجواب صحیح:عبدالرحمٰن عفااللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب:عزیز الرحمٰن چارسدوی

۶ ربیع الثانی ۱۴۲۹ھ — فتویٰ نمبر:۱۲۳۶

﴿زندہ مرغیوں کووزن کر کے بیچنے کا حکم﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام کہ دیہاتوں میں مرغیاں اٹکل اوراندازہ سے بیچی جاتی ہیں جبکہ شہروں میں زندہ مرغیاں وزن کر کے بیچنے کا بھی رواج ہے،زندہ مرغی کووزن کر کے خریدنے کے بعد ذبح کیا جائے،تو صاف کرنے کے بعد اس کا وزن کافی کم رہ جاتا ہے، پوچھنا یہ ہے،زندہ مرغیاں وزن کر کے بیچنا جائز ہے؟ مستفتی:زین العابدین مینگورہ سوات

﴿جواب﴾ فقہاء کرام نے زندہ جانور کووزن کر کے بیچنے سے منع فرمایا ہے کیونکہ جانور کے وزن کا صحیح اندازہ مشکل ہے،اس لئے کہ جانور طبعی طور پر اپنے آپکو بوجھل بنا دیتا ہے اور کبھی ہلکا سا ہو جاتا ہے اوروزن صحیح معلوم نہ ہونے کی بناء پر بیع درست نہیں ہونی چاہیے،تاہم آجکل کے عرف میں یہ طریقہ عام اور رائج ہو گیا ہے اور لڑائی جھگڑے کا اندیشہ بھی نہیں رہتا،اس لئے مرغیوں کووزن کر کے بیچنے کی گنجائش دی گئی ہے۔

لمافی الهدایة:(۸۷/۳،طبع رحمانیه)

لان الحیوان لایوزن عادة ولایمکن ثقله بالوزن لانه یخفف نفسه مرة ویثقل اخری.

ولمافی فتح القدیر:(۶۲/۷،طبع رشیدیه)

وانما قلنا ان الحیوان لیس بموزون (لانه لایوزن عادة)فلیس فیه احد المقدرین ......فلایدری حاله بخلاف الدهن والسمسم.

ولمافی الکفایة علی هامش فتح القدیر:(۶۲/۷،طبع رشیدیه)

(لانه یخفف نفسه مرة لصلابته)لاسترخاء مفاصله والمیت لاسترخاء مفاصله اثقل

من الحی والنساء لاسترخاء هن اثقل من الرجال لصلابتهم.

ولمافی التنویر مع الدر:(۷/۱۱-۱۲،طبع امدادیه ملتان)

وشرعا:(مبادلة شئی مرغوب فیه بمثله)خرج غیر المرغوب ....ای بایجاب او تعاط.

الجواب صحیح:عبدالرحمٰن عفااللہ عنہ　　　واللہ اعلم:عزیز الرحمٰن چارسدوی غفرلہ

۱۷ ربیع الثانی ۱۴۲۹ھ　　　فتویٰ نمبر:۱۴۰۱

﴿مکان کے اطراف میں موجود درخت بدون ذکر کے بھی بیع میں داخل ہونگے﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ مکان کی فروختگی کے وقت احاطے میں انار کے چند درخت لگے ہوئے تھے وقتی طور پر ان کا مستقل تذکرہ نہیں کیا گیا تھا، اس کے کچھ عرصہ بعد بائع کی اہلیہ کا اصرار ہے کہ یہ درخت ہمارے ہیں، اب سوال یہ ہے کہ بدون تذکرہ کے مکان کی بیع کے ضمن میں درخت داخل ہے یا نہیں؟　　　مستفتی: حافظ راشد چارسدہ

﴿جواب﴾ درخت پھل دار ہو یا نہ ہو زمین کے تابع ہو کر بیع میں داخل ہوتا ہے، الگ سے بیع کرنے کی ضرورت نہیں ہوتی، لہٰذا مذکورہ عورت کا اصرار غلط دعویٰ ہے انار کے ایک دانے میں بھی اسکا حق نہیں ہے۔ البتہ موسم میں پھل میں سے اسکو بھی اگر کچھ دیتے ہیں تو یہ آپ کا احسان ہے بائع یا اسکی بیوی کو مطالبہ کا کوئی حق حاصل نہیں ہے۔

لمافی التنویر مع الدر:(۷/۷۹،طبع امدادیه ملتان)

(ویدخل الشجر فی بیع الارض بلاذکر)قیدللمسالتین فبالذکراولی مثمرة کانت اولا صغیرة اوکبیرة الالیابسة.

وفی الشامیة:قوله:(ویدخل الشجرالخ)قال فی المحیط:کل ماله ساق ولایقطع اصله کان شجرایدخل تحت بیع الارض بلاذکرومالم یکن بهذه الصفة لایدخل بلاذکرلانه بمنزلة الثمرة.اه عن الهندیة..... قلت:لکن فی الذخیرة ان العرائش والاشجاروالابنیة تدخل،لانهالیس لنهایتهامدة معلومة فتکون للتأبید فتتبع الارض.....ومقتضاه ان غیرالمثمرالمعدللقطع کالزرع،الاان یقال:انه لیس له نهایة معلومة.

الجواب صحیح:عبدالرحمٰن عفااللہ عنہ　　　واللہ اعلم بالصواب:عزیز الرحمٰن چارسدوی

۱۹ ربیع الثانی ۱۴۲۹ھ　　　فتویٰ نمبر:۱۳۹۹

﴿سڑک کے کنارے بیٹھ کر خرید وفروخت کرنے کا حکم﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں، علماء کرام اور مفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک

شخص روڈ کے کنارے بیٹھ کر مستقل صبح سے شام تک سودا بیچتا ہے، اب پوچھنا یہ ہے کہ شریعت کی رو سے یہ خرید وفروخت جائز ہے یا نہیں؟ مستفتی: رضوان مردانی

﴿جواب﴾ آپ اور آپ کے سامان سے عام لوگوں کو اگر تکلیف نہ ہو اور گزرنے میں دشواری کا سبب نہ بنے تو ایسی خرید وفروخت میں کوئی مضائقہ نہیں۔

لمافی التنویر مع الدر:(۱۰/۲۵۹ طبع امدادیه)

(والقعود فی الطریق لبیع وشراء) یجوزان لم یضر باحد، والالا(علی هذا التفصیل) السابق، وهذا فی النافذ(وفی غیر النافذ لایجوزان یتصرف باحداث مطلقا)اضربهم اولا(الا باذنهم)لانه کالملک الخاص بهم.

ولمافی الخلاصة:(۱۰۱/۳ طبع رشیدیه)

رجل یبیع ویشتری علی الطریق ان لم یکن فی قعوده ضرر للناس لسعة الطریق لا باس بالشراء منه وان کان فی قعوده ضرر لاینبغی له ان یشتری فیه منه وقیل یکره للبائع وان کان الطریق واسعا.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم: عزیز الرحمٰن غفرلہ

۲۰ ربیع الثانی ۱۴۲۹ھ — فتویٰ نمبر: ۱۴۰۲

﴿پرندوں کو فروخت کرنا جائز ہے﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ پرندوں کو شکار کر کے فروخت کرنا مثلاً باز چیل وغیرہ اور اس میں کمائی کرنا شرعاً کیسا ہے؟ مستفتی: غلام ربی دیروی

﴿جواب﴾ پرندوں کا شکار اور خرید وفروخت جائز ہے اور اسکو کاروبار اور کمائی کا ذریعہ بنانے میں کوئی حرج نہیں ہے، البتہ ان کے کھانے پینے اور رہن سہن کے حقوق بجالانا بھی ضروری ہے۔

لمافی التنویر مع الدر:(۵/۲۲۷-۲۲۶ طبع سعید)

(وصح بیع الکلب)ولوعقور..... وکذاالطیور.

وفی الشامیة:(قوله وکذاالطیور)أی الجوارح..... والفهد والبازی یقبلان التعلیم فیجوز بیعهما علی کل حال والحاصل أن المتون علی جواز بیع ماسوی الخنزیر مطلقا وصحح السرخسی التقییدبالمعلم منهاوکذافی الهندیة:(۳/۱۱۲،طبع رشیدیه)

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: محمد حسن عفا اللہ عنہ

۳۰ رجب ۱۴۲۹ھ — فتویٰ نمبر: ۱۷۶۴

﴿شیئرز(Shares) کی بیع قبل القبض کا حکم﴾

﴿سوال﴾ کہ آج کل شیئرز(Shares) کی خرید وفروخت عام ہوگئی ہے بعض اوقات ایک شخص شیئرز خرید لیتا ہے لیکن اس شیئرز پر قبضہ اور ڈیلیوری (Deliverey) سے پہلے آگے فروخت کر دیتا ہے، کیا اسطرح قبضہ اور ڈیلیوری ملنے سے پہلے آگے فروخت کرنا جائز ہے؟

﴿جواب﴾ کسی چیز کو خرید کر قبضہ کرنے سے پہلے آگے فروخت کرنا جائز نہیں لیکن قبضہ کے اندر ہمیشہ حسّی قبضہ(Physical possession) ضروری نہیں ہوتا بعض چیزوں پر حکمی قبضہ(Construitve possession) کافی ہوتا ہے یعنی وہ چیز جب خریدار کے ضمان(Risk) میں آجائے، چونکہ یہ بھی قبضہ تصور کیا جاتا ہے تو اسکے بعد آگے بیچنے کی اجازت ہے، اس لئے فقہاء کرام نے شئی ضمان میں آجانے، حقوق وذمہ داریاں خریدار کی طرف منتقل ہوجانے اور غرر ودھوکہ سے محفوظ ہونے کی صورت میں قبضہ تصور کیا ہے۔

شیئرز(Shares) درحقیقت کمپنی کے اندر شیئرز ہولڈر(hares holder) کی ملکیت کا نام ہے اور شیئرز سرٹیفکیٹ اس ملکیت کی علامت اور اسکا ثبوت وشہادت ہے، لہذا شیئرز خریدتے ہی قانونی طور پر کمپنی کے اثاثے اور املاک شیئرز کے بقدر خریدار کے ضمان میں آجاتے ہیں اور حقوق وذمہ داریاں خریدار کی طرف منتقل ہوجاتی ہیں۔

ایسی صورت میں قانونی دشواریوں کی وجہ سے اگر چہ شیئرز سرٹیفکیٹ نہ ملا ہو تب بھی خریدتے ہی ان پر خریدار کا قبضہ سمجھا جائیگا اور اسمیں تصرف کرنا جائز ہوگا بشرطیکہ ہلاکت کی صورت میں خریدار کا نقصان سمجھا جاتا ہو، لہٰذا شیئرز کی خرید وفروخت کی ترتیب اگر مذکورہ بالا تفصیل کے مطابق ہے تو شیئرز سرٹیفکیٹ ہاتھ آنے سے پہلے بھی آگے بیچنا جائز ہے، تاہم احتیاط کا تقاضہ بہر صورت یہی ہے کہ جب تک ڈیلیوری نہ مل جائے اس وقت تک آگے فروخت نہ کیا جائے۔

لمافی الصحیح لمسلم:(۲/۵،طبع قدیمی)

عن ابن عباسؓ ان رسول الله ﷺ قال:من ابتاع طعامافلایبعه حتی یستوفیه قال ابن عباسؓ:احسب کل شئی مثله.

ولمافی سنن النسائی:(۲/۲۲۲،طبع قدیمی)لاتبعه حتی تقبضه.

ولمافی درس المسلم للمفتی الاکبرمحمدرفیع العثمانی حفظه الله:(۲/۵۰،طبع دارالعلوم)

نقل الشیخ السهارنفوریؒ فی بذل المجهودعن الخطابی انه قال القبض تختلف فی

الاشياء حسب اختلافها في انفسها فمنها مايكون بان يوضع المبيع في يد صاحبه و منها مايكون بالتخلية بينه وبين المشترى ومنها مايكون بالنقل من موضعه ومنها ما يكون بان يكتال.

ولما في البدائع:(۱۴۸/۵ طبع ايچ ايم سعيد)

ولا يشترط القبض بالبراجم لان معنى القبض هو التمكين والتخلى وارتفاع الموانع عرفا وعادة حقيقة.

ولما فيه ايضا:(۲۴۴/۵ طبع سعيد)

ثم لاخلاف بين اصحابنا في ان اصل القبض يحصل بالتخلية في سائر الاموال..... تفسير التسليم والقبض فالتسليم والقبض عندنا هو التخلية والتخلى هو أن يخلى البائع بين المبيع وبين المشترى برفع الحائل بينهما على وجه يتمكن المشترى من التصرف فيه فيجعل البائع مسلما للمبيع والمشترى قابضا له.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ　　　　واللہ اعلم بالصواب: محمد اسلم چترالی غفرلہ

۳ ربیع الثانی ۱۴۲۹ھ　　　　فتوی نمبر: ۱۳۹۸

﴿کوئی چیز ادھار خرید کر نقداً بیچنا جائز ہے﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام کہ ہمارے ہاں لوگ پنجاب جا کر ادھار پر ٹریکٹر خریدتے ہیں اور یہاں ہمیں نقد قیمت پر بیچتے ہیں جبکہ بسا اوقات یہ بیچنے والے ان لوگوں کو جن سے ٹریکٹر ادھار کے طور پر خریدا ہے قسطیں ادا نہیں کرتے، اب پوچھنا یہ ہے کہ اسطرح ہمیں ان لوگوں سے ٹریکٹر خریدنا جائز ہے یا نہیں؟ شریعت کی رو سے اس کی کیا حیثیت ہے؟

﴿جواب﴾ صورت مسئولہ کے مطابق اس شخص کا اقساط کی ادائیگی میں کوتاہی وٹال مٹول کرنا ظلم اور انسانی شرافت کے خلاف ہے جس کی مذمت حدیث شریف میں وارد ہوئی ہے: مطل الغنی ظلم (ترجمہ) مالدار شخص کا ٹال مٹول کرنا ظلم ہے۔

بلا شبہ اس شخص کا یہ عمل شرعاً مذموم اور قابل اصلاح ہے اسلئے دوسری جگہ سے ٹریکٹر وغیرہ خریدنا ممکن ہو تو ایسا ہی کریں ممکن ہے کہ آپ کے اس رویے کی بناء پر وہ اپنی اس حرکت سے باز آجائے تاہم اس شخص سے خریدنا بھی جائز ہے اگرچہ قسطوں کی ادائیگی میں وہ کوتاہی کر رہا ہے کیونکہ فروخت کنندہ اور خریدار کے درمیان ایجاب وقبول کے بعد بیع تام ہو جاتی ہے اور انعقاد بیع کے بعد بغیر رضا مندی کے بیع فسخ کرنے کا حق نہیں رہتا لہٰذا بیع تام ہونے کی وجہ سے آگے بیچنا بھی جائز ہے۔

لمافی شرح المجلة: (۲/۲۷۲، طبع رشیدیه)

اذاکان البیع لازماًفاذاًفلیس لاحدالمتبایعین الرجوع عنه.

ولمافی الهدایة: (۲۰/۳، طبع رحمانیه)

واذاحصل الایجاب والقبول لزم البیع ولاخیارلواحدمنهماالامن عیب أوعدم روية.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفااللہ عنہ　　　واللہ اعلم: محمد اسلم چترالی عفااللہ عنہ

۲۲ ربیع الاول ۱۴۲۹ھ　　　فتویٰ نمبر: ۱۲۳۹

﴿مبیع پر قبضے کا مطلب﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ زید نے کپڑے کی گٹھڑیاں خالد کو فروخت کیں. خالد نے اٹھا کر ابھی تک اپنے گودام منتقل نہیں کیں یعنی ابھی تک زید کے گودام میں مال پڑا ہے زید کو ایک تیسرے شخص نے زیادہ قیمت کی پیشکش کی. زید چاہتا ہے کہ کسی طرح یہ نفع بھی حاصل کر سکے لیکن سودا خالد سے ہو چکا ہے اب کوئی صورت ہے کہ شریعت کے خلاف بھی نہ ہو اور اس موقع سے فائدہ بھی حاصل کر سکے اور نفع حاصل کرے خالد کی اجازت سے تو وضاحت فرمائیں؟　　　مستفتی: ایک سائل

﴿جواب﴾ دین اسلام میں مسلمان کی زبان کا بڑا اعتبار ہے ایک بار ایجاب وقبول ہو جائے خواہ صرف زبانی ہو تو اس سے سودا مکمل ہو جاتا ہے چنانچہ بائع اس چیز کا مالک نہیں رہتا مشتری اس کا مالک ہو جاتا ہے اب اس سودے کو ختم کرنے کی ایک ہی صورت ہے کہ بائع ومشتری اس عقد کو کمی وبیشی کے بغیر باہمی رضامندی سے فسخ کر دیں جس کو فقہی اصطلاح میں ''اقالہ'' کہتے ہیں اس کے علاوہ کوئی صورت نہیں ہے۔

زید چونکہ اس مال کا اب مالک نہیں رہا اس لیے تیسرے شخص کو فروخت کرنے کا اسے اختیار نہیں ہے البتہ خالد سودا فسخ کرنے پر راضی ہو تو سودا فسخ کر لیں پھر زید تیسرے شخص کو چاہے تو فروخت کر سکتا ہے۔

ایک صورت یہ بھی ہو سکتی ہے کہ زید خالد کی رضامندی سے دلالی پر تیسرے شخص کے ساتھ سودا کرے تو جائز ہوگا بشرطیکہ خالد نے مال پر قبضہ کیا ہو قبضہ سے پہلے آگے بیچنا جائز نہیں ہے احادیث میں اس کی ممانعت آئی ہے مذکورہ صورت میں بظاہر خالد نے ابھی تک مال پر قبضہ نہیں

کیا ہے لیکن ممکن ہے غیر حسی معنوی قبضہ کیا ہو تو بھی بیع قبل القبض کے زمرہ میں نہیں آئیگا یعنی آگے بیچنا جائز ہوگا چنانچہ فقہاء کرام نے تصریح فرمائی ہے کہ قبضہ دو طرح کا ہوتا ہے

(۱) حسی قبضہ جو کہ ظاہر ہے (۲) معنوی قبضہ کہ مشتری کو مبیع اپنی تحویل میں لینے کا پورا موقع ملے اور بائع کی جانب سے مشتری کے لیے تصرف کرنے میں کوئی رکاوٹ نہ ہو سو یہاں پر خالد کا مال اگر ممتاز ہو یعنی زید کے دیگر مال میں مخلوط نہ ہو اور زید نے خالد کے لیے اپنا گودام کھول دیا ہو وہ چاہتا تو اٹھالیتا لیکن کسی وجہ سے نہیں اٹھایا تو یہ صورت بھی معنوی قبضہ کی ہے گویا خالد نے مال پر قبضہ کرلیا ہے اس لیے آگے بیچنا جائز ہے خود بیچے یا کسی دلال وغیرہ کے ذریعے بیچنا چاہے دونوں طرح جائز ہے.

لما فی الصحیح لمسلم:(۵/۲ قدیمی کتب خانہ)

عن ابن عباس رضی الله عنه قال قال رسول الله ﷺ من ابتاع طعاما فلا يبعه حتى يقبضه قال ابن عباس واحسب كل شيء بمنزلة الطعام

عن ابن عمر رضی الله عنه قال كنا في زمان رسول الله ﷺ نبتاع الطعام فيبعث علينا من يامرنا بانتقاله من المكان الذي ابتعناه فيه الى مكان سواه قبل ان نبيعه .

عن ابن عمر رضی الله عنه قال قال رسول الله ﷺ من ابتاع طعاما فلا يبعه حتى يقبضه .

ولما فی الرد المحتار:(۵۶۲/۴ طبع: سعید)

ثم التسليم بالتخلية على وجه يتمكن من القبض بلا مانع ولا حائل وشرط في الاجناس شرطا ثالثا وهو ان يقول خليت بينك وبين المبيع

ولما فی الرد المحتار:(۵۶۲/۴ طبع: سعید)

وحاصله ان التخلية قبض حكما لو مع القدرة عليه بلا كلفة لكن ذلك يختلف بحسب حال المبيع ففي نحو حنطة في بيت مثلا فدفع المفتاح اذا امكنه الفتح بلا كلفة قبض وفي نحو دار فالقدرة على اغلاقها قبض وبعد اسطر قلت ومفاده ان تخلية القرب في الهبة قبض لكن هذا في غير الفاسد كما في الخانيه حيث قال اجمعوا على ان التخلية في البيع الجائز تكون قبضا وفي البيع الفاسد روايتان والصحيح انه قبض .

ولما فی بدائع الصنائع:(۱۴۸/۵ طبع: سعید)

ولا يشترط القبض بالبراجم لان معنى القبض هو التمكين والتخلي وارتفاع الموانع عرفا وعادة قديمة

ولما فی بدائع الصنائع:(۲۴۴/۵ طبع: سعید)

(وأما) تفسير التسليم والقبض .فالتسليم والقبض عندنا التخلية والتخلي وهو ان

یخلی البائع بین المبیع وبین المشتری برفع الحائل بینهما علی وجه یتمکن المشتری من التصرف فیه فیجعل البائع مسلما للمبیع والمشتری قابضا له وکذا تسلیم الثمن من المشتری الی البائع .

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: ضیاء الحق المکی

۱۳ صفر الخیر ۱۴۳۳ھ — فتویٰ نمبر: ۳۲۴۴

﴿خریدے ہوئے درخت کو جڑ سے اکھاڑنے کا حکم﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اور مفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک آدمی نے دوسرے سے درخت خریدا، درخت کاٹتے وقت بائع وخریدار کے درمیان اختلاف ہوا، خریدار درخت کو جڑ سے اکھاڑنا چاہتا ہے جبکہ بائع کو اپنی زمین کی خرابی کا خوف ہے، اس وجہ سے وہ سطح زمین سے کاٹنے کو کہہ رہا ہے، سوال یہ ہے کہ بائع وخریدار میں سے کس کا قول معتبر سمجھا جائیگا؟ نیز شریعت میں اس کی کوئی حد مقرر ہے؟ مستفتی: محب اللہ

﴿جواب﴾ درخت کی خرید وفروخت کے وقت کوئی شرط نہ لگائی گئی ہو تو خریدار کیلئے درخت کو جڑ سے اکھاڑنے کا حق ہے، البتہ بائع نے سطح زمین سے کاٹنے کی شرط پہلے سے لگائی ہو تو سطح زمین [illegible] لیکن جڑ سے اکھاڑنے کی صورت میں قریبی دیوار یا زمین وغیرہ کو نقصان پہنچنے کا قوی اندیشہ ہو تو سطح زمین سے ہی کاٹنا ہوگا۔

لما فی الشامی: (۴/۵۵۴، طبع ایچ ایم سعید)

اشتری شجرة للقلع یؤمر بقلعها بعروقها، ولیس له حفر الارض الی انتهاء العروق بل یقلعها علی العادة الا ان شرط البائع القطع علی وجه الارض، أو یکون فی القلع من الاصل مضرة للبائع ککونها بقرب حائط أو بئر فیقطعها علی وجه الارض.

ولما فی البحر: (۵/۲۹۲، طبع سعید)

وفیها اذا اشتری شجرا للقلع فانه یؤمر بقلعها بعروقها ولیس له حفر الارض الی انتهاء العروق بل یقلعها علی العادة الا ان شرط البائع القطع علی وجه الارض أو یکون فی القلع من الاصل مضرة علی البائع کما اذا کانت بقرب حائط أو بئر فانه یقطعها علی وجه الارض.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم: محمد اسلم چترالی غفرلہ

۱۷ رجب المرجب ۱۴۲۹ھ — فتویٰ نمبر: ۱۶۲۴

﴿بیعانہ کا مسئلہ﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ سعید نے ایاز سے مکان لینے کا سودا کیا اور بیعانہ کے طور پر دس ہزار روپے (۱۰۰۰۰) کی ادائیگی کر دی بعد میں سعید کا ارادہ تبدیل ہو گیا اور اس نے اس سے انکار کر دیا اور ایاز سے بیعانہ کا مطالبہ کیا لیکن ایاز بیعانہ واپس کرنے کو تیار نہیں، اب سوال یہ ہے کہ بیعانہ کے رقم پر قبضہ کر لینا شرعاً جائز ہے یا نہیں؟ اور کیا سعید کو بیعانہ کے مطالبہ کا حق حاصل ہے؟ مستفتی: راشد خان

﴿جواب﴾ سودا کرنے کے بعد خریدار اور بیچنے والے دونوں میں سے کسی ایک کو بھی انکار کی گنجائش نہیں ہے، ایاز مکان حوالہ کر دینے کا پابند ہے اور سعید پوری قیمت ادا کرنے کا پابند ہے، دین اسلام مسلمان کے قول کو بڑی اہمیت دیتا ہے، سودا کرنے کے بعد یکطرفہ فیصلہ سے عقد ختم نہیں ہوگا، البتہ باہمی رضامندی سے دونوں سودا ختم کرنے پر متفق ہوں تو جائز ہے، شریعت میں اس کو ''اقالہ'' کہتے ہیں، اقالہ کی صورت میں خواہ صرف بیعانہ کی رقم ہو یا پوری رقم خریدار کو واپس کر دینا ضروری ہے، یہ خریدار کا واپس اپنا حق بن جاتا ہے جس کا وہ مطالبہ بھی کر سکتا۔

لمافی قوله تعالى (سورة المائدة، آيت ۱) يا ايها الذين امنوا اوفوا بالعقود ..... الآية.

ولمافی مشكوة المصابيح (۱/۲۵۵، طبع سعيد)

قال رسول الله ﷺ الا لا يحل مال امرئ الا بطيب نفس منه.

ولمافی الهداية (۳/۲۰، طبع رحمانيه)

اذا حصل الايجاب والقبول لزم البيع ولا خيار لواحد منهما الا من عيب أو عدم رؤية. وفی حجة الله البالغة (۲/۱۹۱، طبع قديمی)

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: عبدالرزاق عفا اللہ عنہ

۱۷ رجب المرجب ۱۴۲۹ھ — فتویٰ نمبر: ۱۷۲۳

﴿کتاب سے متعلق جملہ حقوق صاحب تالیف کی ملکیت ہیں﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں حضرات علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ اگر کوئی شخص اپنی تحقیق کر کے کسی کتاب کا مسودہ تیار کر لے اور چھپائی سے قبل کوئی دوسرا شخص اس کو چرا کر اپنے نام سے چھپوا لے تو ایسے شخص کا کیا حکم ہے؟ اور جس شخص نے محنت کی ہو اگر اسے جائز اور قانونی

طریقے سے حصول حق کی توقع نہ ہو تو کیا جھوٹ بول کر یا رشوت دیکر اس شخص سے اپنا حق وصول کر سکتا ہے یا نہیں؟
مستفتی: حق نواز ڈیفنس کراچی

﴿جواب﴾ اگر کوئی شخص اپنی تحقیق کر کے کسی کتاب کا مسودہ تیار کر لے تو اس کے جملہ حقوق صاحب تالیف کی ملکیت میں آجاتے ہیں پھر کوئی دوسرا شخص چھپائی سے پہلے اس مسودہ کو چرا کر اپنے نام سے چھپوالے تو ایسا شخص چور اور غاصب ہے، اس پر قانونی طور پر ضمان عائد کیا جائے اور اپنا حق وصول کرنے کی کوشش کی جائے اگر قانونی چارہ جوئی سے اپنا حق وصول کرنا ممکن نہ ہو تو توریہ کر کے یعنی گول مول بات کر کے (صاف جھوٹ سے بچتے ہوئے) یا رشوت وغیرہ دیکر اپنا حق وصول کر لے تو اس کی بھی گنجائش ہے۔

لما فی سنن ابی داؤد:(۸۶/۲،طبع رحمانیه)من سبق الی ماء لم یسبقه الیه مسلم فهوله.

ولما فی الدر مع الرد:(۴۲۷/۶،طبع سعید)

الکذب مباح لاحیاء حقه ودفع الظلم عن نفسه والمراد التعریض لان عین الکذب الحرام الخ.
وفی الشامیة:واعلم ان الکذب قدیباح وقدیجب والضابط فیه کمافی تبیین المحارم وغیره من الاحیاء ان کل مقصود محمود یمکن التوصل الیه بالصدق والکذب جمیعا الخ.

ولما فی الشامی:(۴۲۳/۶-۴۲۴،طبع سعید)

(قوله اذاخاف علی دینه)عبارة المجتبی لمن یخاف وفیه ایضا دفع المال للسلطان الجائر لدفع الظلم عن نفسه وماله ولاستخراج حق له لیس برشوة یعنی فی حق الدافع اه.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ　　　　　واللہ اعلم بالصواب: انیس طالب کان اللہ لہ

۳ ربیع الاول ۱۴۳۱ھ　　　　　فتویٰ نمبر: ۲۲۸۴

﴿راستہ کی بیع کا مسئلہ﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک زمین ہم چار آدمیوں میں یعنی زید، عمرو، بکر اور خالد کے درمیان مشترکہ تھی، اس زمین سے متصل ایک ایسا راستہ ہے جو کہ ایک طرف سے بند اور دوسری طرف سے ایک بڑے راستہ کی طرف کھل رہا ہے، اسکے بعد ہم چاروں نے اپنا اپنا حصہ الگ کر لیا، بکر اور خالد نے اپنا اپنا حصہ ہماری اجازت اور ہم سے پوچھے بغیر عثمان کو بیچ دیا جسکا گھر ہماری مشترکہ زمین کے پاس دائیں ہاتھ میں واقع ہے، عثمان نے ان دونوں سے خریدی ہوئی زمین میں سے ہمارے لئے اتنا راستہ چھوڑ دیا تا کہ

ہم دونوں یعنی زید اور عمرو اس راستہ کی طرف نکل سکیں جو کہ ایک طرف سے بند اور دوسری طرف سے ایک بڑے راستہ کی طرف نکل رہا ہے۔

اسکے بعد عمرو نے بھی مجھ کو اپنی زمین بیچ دی تو یہ راستہ صرف میری ملکیت میں رہ گیا، عثمان نے بکر اور خالد سے جو زمین خریدی تھی اس میں خالد کا حصہ چونکہ میری زمین سے متصل تھا تو اس نے وہ حصہ ہم کو دے دیا اور ہم نے بدلے میں اسکو وہ راستہ دے دیا (جو عثمان نے ان دونوں سے خریدی ہوئی زمین میں سے ہمارے لیے چھوڑا تھا) جو کہ اس کے گھر سے متصل ہے۔

جب میں نے اور عثمان نے یوں آپس میں زمین اور راستہ کا تبادلہ کیا تو عمرو کہنے لگا کہ عثمان نے جو تم کو راستہ کے بدلے میں زمین دی ہے اس میں میرا بھی حصہ بنتا ہے کیونکہ یہ زمین تم کو اس راستہ کے بدلے میں ملی ہے جس میں تمھارے ساتھ میں اپنے حصہ کی زمین تم کو بیچنے سے پہلے شریک تھا جبکہ میں نے اسے کہا کہ جب تم نے اپنی زمین مجھ کو بیچ دی تو راستہ بھی زمین کے ساتھ بک گیا اور میری ملکیت میں آ گیا۔

مفتی صاحب! آپ سے دو باتوں کا جواب مطلوب ہے:

(۱) بکر اور خالد نے اپنی زمین عثمان کو ہم سے پوچھے بغیر بیچ دی حالانکہ ہم اسکے ساتھ زمین میں براہ راست شریک تھے تو کیا اب ہم کو شفعہ کا حق حاصل ہے؟

(۲) عمرو نے اپنے حصہ کی زمین مجھ کو بیچ دی ہے اور وہ راستہ جو کہ میرے اور عمرو کے درمیان مشترک تھا اب میرے استعمال میں ہے، عمرو کا کہنا ہے کہ یہ راستہ زمین بیچنے سے پہلے چونکہ دونوں کی ملکیت تھا، لہٰذا اس راستہ میں میرا حق اب بھی باقی ہے، برائے مہربانی شریعت کی روشنی میں بتلائیں کہ عمرو کا مطالبہ صحیح ہے؟ مستفتی: محمد زید

﴿الجواب﴾ (۱) بلا شبہ آپکو شفعہ کا حق حاصل تھا۔ (۲) فقہاء کرام نے راستے کی تین اقسام ذکر کی ہیں: (۱) شارع عام کی طرف نکلنے والا راستہ جو کہ ایک طرف سے بند ہو۔ (۲) کسی ایک طرف بند راستہ میں کھلنے والا چھوٹا راستہ جو چند اُفراد کا مشترکہ ہو۔ (۳) کسی کی ذاتی مملوکہ زمین میں ذاتی راستہ، لہٰذا مذکورہ راستوں سے متعلقہ زمین کا سودا اگر کوئی کرے تو پہلے والے دونوں راستوں کو ذکر کیے بغیر بھی سودا میں شامل ہے، البتہ صرف راستہ نمبر (۳) جو کسی کی ذاتی

ملکیت میں ذاتی راستہ ہو تو ایسا راستہ ذکر کیے بغیر سودا میں شامل نہ ہوگا، آپ کا متنازعہ راستہ، راستہ نمبر (۲) ہے، سودا کے وقت اگرچہ اس کا کوئی تذکرہ نہیں ہوا ہے لیکن زمین بیچنے میں اس راستہ کا بھی سودا ہو گیا، لہٰذا عمر کا مطالبہ غلط ہے۔

لما فی الشامی: (۵/۷۷، طبع سعید)

(قوله وصح بيع الطريق) ثم في الدرر عن التتارخانية: الطرق ثلاثة: طريق الى الطريق الأعظم، وطريق الى سكة غير نافذة، وطريق خاص في ملك انسان. فالأخير لا يدخل في البيع بلا ذكره أو ذكر الحقوق أو المرافق، والأولان يدخلان بلا ذكر اه ملخصاً. وحاصله: لو باع داراً مثلاً دخل فيهما الأولان تبعاً بلا ذكر بخلاف الثالث — والفرق بين هذا الطريق والطريق الثاني وهو ما يكون في سكة غير نافذة، أن هذا ملك للبائع وحده ولذا سمى خاصاً، بخلاف الثاني فانه مشترك بين جميع أهل السكة، وفيه أيضا حق للعامة كما يأتي بيانه قريبا، وقد اشتبه ذلك على الشرنبلالي فراجعه.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: مزمل شاہ

۲ شعبان ۱۴۳۰ھ — فتوی نمبر: ۲۳۹۲

﴿سرکاری زمین پر اُگے درخت ملازمین فروخت کر سکتے ہیں﴾

﴿سوال﴾ سرکاری زمین جیسے سرکاری سکولوں، عام شاہراہوں پر اُگے ہوئے درختوں کو سرکاری ملازمین کے ذریعے فروخت کرنے کا شرعاً کیا حکم ہے؟

﴿جواب﴾ حکومت کیطرف سے اگر ملازمین کو اجازت ہو اور رقم حاصل کر کے قومی خزانہ میں پہنچتی ہو تو متعلقہ ملازمین کے لئے درختوں کو فروخت کرنے میں شرعاً کوئی حرج نہیں ہے۔

البتہ ملازم خیانت و بددیانتی سے فروخت کرتے ہوں تو اس صورت میں فروخت کرنا اور علم ہونے کے باوجود اس سے خریدنا شرعاً جائز نہیں کیونکہ قومی ملکیت ہونے کی وجہ سے ان درختوں میں پوری قوم کا حصہ ہے۔

لما فی شرح المجلة: (۴/۲۸۵-۲۸۶، المادة ۱۴۹۵، طبع رشیدیه)

ليس للوكيل ان يبيع بانقص مما عينه الموكل يعني اذا كان الموكل قد عين ثمنا فليس للوكيل ان يبيع بانقص من ذالك واذا باع ينعقد البيع موقوفا على اجازة موكله ولو باعه بانقص مما عينه بلا اذن الموكل وسلم المال الى المشترى فللموكل ان يضمنه ذلك النقصان — ثم لو خالف الوكيل بالبيع وباع وسلم المبيع للمشترى ثم

هلك في يد المشتري يكون الوكيل ضامنا القيمته لانه بالمخالفة صار غاصبا.

الجواب صحیح: عبدالرحمن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: ذوالنورین احمد شمس

۲۷ رجب المرجب ۱۴۲۹ھ — فتویٰ نمبر: ۱۴۳۸

﴿ادھار معاملہ میں زیادہ قیمت مقرر کرنے کا حکم﴾

﴿سوال﴾ ایک شخص گندم کی بوری سات سو روپے میں نقد خرید کر چھ ماہ ادھار پر سات سو پچاس روپے میں فروخت کرتا ہے، پوچھنا یہ ہے کہ شریعت میں اسکا یہ معاملہ جائز ہے یا نا جائز؟

﴿جواب﴾ مذکورہ صورت میں اس شخص کا یہ معاملہ بلاشبہ درست ہے، البتہ چھ ماہ گذرنے کے بعد مذکورہ رقم نہ دے سکے تو تاخیر کی وجہ سے زیادہ کا مطالبہ کرنا شرعا درست نہ ہوگا۔

لما في الهداية:(۷۸/۳،طبع رحمانيه)

لان للاجل شبها بالمبيع الايرى انه يزاد في الثمن لاجل الاجل.

ولما في قضايا فقهية:(۷/۱،طبع دار العلوم كراچي)

اما الائمة الاربعة وجمهور الفقهاء والمحدثين فقد اجازوا البيع المؤجل باكثر من سعر النقد.

ولما في الفقه الاسلامي:(۵۰۷/۴،طبع دار الفكر بيروت)

لان الاجل سبب في زيادة الثمن عادة،فان ثمن المبيع يختلف بين النسيئة والنقد.

الجواب صحیح: عبدالرحمن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: عبدالحکیم

۶ جمادی الاولیٰ ۱۴۲۹ھ — فتویٰ نمبر: ۱۴۱۹

﴿بیع ثمار کی مروجہ صورتوں کا شرعی حکم﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام مندرجہ ذیل مسائل کے بارے میں کہ (۱) اگر پھل درخت پر موجود نہ ہوں تو بیع جائز ہے یا نہیں؟ (۲) پھل اگر بالکل کچے ہوں قابل انتفاع بھی نہ ہو تو بیع جائز ہے یا نا جائز؟ (۳) کچھ پھل موجود ہوں اور کچھ موجود نہ ہوں بلکہ دن بدن اسمیں اضافہ ہوتا رہے جو عقد کے وقت موجود نہ ہو تو انکی بیع کا کیا حکم ہے؟ (۴) آج کل جو لوگ پھلوں کی بیع کرتے ہیں اور کاٹتے نہیں بلکہ کچھ عرصہ تک درختوں پر چھوڑنے کی شرط لگاتے ہیں، اس بیع کا کیا حکم ہے؟ حالانکہ فقہاء عظام نے ایسی بیع کو فاسد قرار دیا ہے جس میں پھلوں کو درخت پر چھوڑنے کی شرط لگائی جائے۔

مستفتی: فرمان اللہ کوہاٹی

﴿جواب﴾ پھلوں کی بیع ایسی حالت میں کہ وہ موجود ہی نہ ہوں، جائز نہیں ہے کیونکہ بیع

کے وقت مبیع کا وجود ضروری ہے، حدیث میں اسکو بیع معاومہ یا بیع سنین سے تعبیر کیا گیا ہے۔

لمافی جامع الترمذی:(۱۵۷/۱،طبع فاروقی ملتان)

عن جابران النبیﷺ نهی عن المحاقلة والمزابنة والمخابرة والمعاومة ورخص فی العرایا.هذاحدیث حسن صحیح.

ولمافی الشامی:(۸۵/۷،طبع امدادیه)

قال فی الفتح:لاخلاف فی عدم الجوازبیع الثمارقبل ان تظهر.

ولمافی تکملة فتح الملهم:(۳۹۳/۱،طبع دارالعلوم کراچی)

ان تباع الثمارقبل ظهورهاوهذالم یقل بجوازه احدسواء جری به التعامل اولا.والمراد من الظهورانفراك الزهرعنهاوانعقادهاثمرة وان صغرت كماصرح به ابن عابدین فی ردالمحتار(۴۲،۴)ولاینعقدهذاالبیع سلمالفقدان شرائطه من كون المبیع معلوم القدر وكون الاجل معیناوغیرذلك.

(۲) پھل کم ازکم موجود ہوں، خواہ بالکل کچے ہوں اور نا قابل انتفاع ہوں تو انکی بیع جائز ہے کیونکہ بعد میں قابل انتفاع ہوسکتے ہیں۔

لمافی الشامی:(۸۵/۷،طبع امدادیه)

والصحیح انه یجوزلانه مال منتفع به فی ثانی الحال ان لم یكن منتفعابه فی الحال، والحیلة فی جوازه باتفاق المشائخ ان یبیع الكمثری اول ماتخرج مع اوراق الشجرفیجوزفیهاتبعاللاوراق كانه ورق كله.

ولمافی تکملة فتح الملهم:(۳۹۳/۱،طبع دارالعلوم کراچی)

ان تظهرجمیع الثماربمعنی انعقادهاثمرةولكنهاغیرمنتفع بهافی الاكل ولافی علف الدواب وفیه خلاف ایضابین مشائخناالحنفیة فذكرقاضی خان ان بیعهالایجوز عندعامةالمشائخ ولكن صحح ابن الهمام جوازه كمااسلفناعن الفتح.

(۳) کچھ پھل موجود ہوں اور کچھ بعد میں وجود پزیر ہوں گے ایسی حالت میں سودا کو فقہاء کرام نے عموم بلوی کی وجہ سے جائز قرار دیا ہے اوراب علماء کرام جواز کا ہی فتوی دیتے ہیں۔

لمافی الشامی:(۸۶/۷،طبع امدادیه)

قلت:لكن لایخفی تحقق الضرورة فی زمانناولاسیمافی مثل دمشق الشام كثیرة الاشجاروالثمار،فانه لغلبة الجهل علی الناس لایمكن الزامهم بالتخلص باحدالطرق المذكورة،وان امكن ذلك بالنسبة الی بعض افرادالناس لایمكن بالنسبة الی عامتهم وفی نزعهم عن عادتهم حرج كماعلمت،ویلزم تحریم اكل الثمارفی هذه البلدان اذلاتباع الا كذلك،والنبیﷺ انمارخص فی السلم للضرورة مع انه بیع المعدوم،

فحيث تحققت الضرورة هذا ايضا امكن الحاقه بالسلم بطريق الدلالة فلم يكن مصادما للنص فلذا جعلوه من الاستحسان، لان القياس عدم الجواز، وظاهر كلام الفتح الميل الى الجواز، ولذا اورد له الرواية عن محمد بل تقدم ان الحلواني رواه عن اصحابنا، وماضاق الامر الا اذا اتسع، ولا يخفى ان هذا مسوغ للعدول عن ظاهر الرواية كما يعلم من رسالتنا المسماة نشر العرف في بناء بعض الاحكام على العرف فراجعها.

ولما في تكملة فتح الملهم:(۱/ ۳۹۳ مطبع دار العلوم كراچی)

ان تباع سائر الثمار الشجر او البستان في حين ظهر بعضها ولم يظهر بعضها وفيه خلاف بين مشائخنا الحنفية فظاهر المذهب انه لا يجوز ايضا ولكن افتى شمس الائمة الحلواني لو كان الخارج اكثر جاز البيع في الجميع وبه افتى الامام الفضلي بل يظهر من عبارته انه لا يشترط كون الخارج اكثر بل يجعل الموجود اصلا في البيع وما يحدث بعد ذلك تبعاله ويقول استحسن فيه لتعامل الناس فانهم تعاملوا بيع ثمار الكرم بهذه الصفة ولهم في ذلك عادة ظاهرة وفي نزع الناس من عادتهم حرج، حكاه ابن الهمام في الفتح(۵ ص ۱۰۵)ثم قال وقد رأيت رواية في نحو هذا عن محمد رحمه الله وهو بيع الورد على الاشجار فان الورد متلاحق. ثم جوز البيع في الكل بهذا الطريق وهو قول مالك رحمه الله والحاصل ان هذه الصورة وان كانت غير جائزة في اصل المذهب غير ان فيها سعة عند عموم البلوى.

(۴) اگر چہ احتیاط کا تقاضا یہ ہے، کہ عقد کے دوران صراحت کے ساتھ ترک (چھوڑنے) کی شرط نہ لگائی جائے لیکن آج کل اسکا بھی عام رواج ہو گیا ہے، اس لئے عموم بلویٰ اور ضرورت کے پیش نظر ایسی بیع کے جواز کی گنجائش معلوم ہو رہی ہے۔

لما في تكملة فتح الملهم:(۱/ ۳۹۵ مطبع دار العلوم كراچی)

قال العبد الضعيف عفا الله عنه يظهر من كلام ابن الهمام في الفتح (۵/ ۱۰۲) ايضا ان العرف اذا جرى ببيع الثمار بعد بدو صلاحها بشرط الترك واشتدت اليه الحاجة كان قياس قول محمد رحمه الله الجواز وان لم يتناه عظم الثمار لانه اجاز شرط الترك بعد ما تناهى عظمها للعرف والضرورة قلت وكذلك اجاز محمد رحمه الله بيع الثمار في حين ظهر بعضها ولم يظهر بعضها للضرورة والعرف، كما قدمنا عن الفتح ورد المحتار فكان قياس قوله الجواز عند الضرورة وان لم يتناه عظمها ثم ههنا۔ لان التعامل رافع للنزاع.

الجواب صحیح: عبد الرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: ریاض الرحمٰن کوہاٹی غفرلہ

۲۵ ذی الحجہ ۱۴۲۸ھ — فتویٰ نمبر: ۱۰۵۰

﴿خودرو گھاس فروخت کرنے کا حکم﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ہمارے گاؤں کے بڑے

بڑے پہاڑ ہیں. سردی کے موسم میں افغانی لوگ مال مویشی سمیت آتے ہیں پھر چھ مہینوں کیلئے پہاڑ اجرت پر لیتے ہیں ایک لاکھ روپیہ کے عوض تا کہ اس میں مال مویشی چرائیں تو کیا شرعا اس طرح کا عقد جائز ہے؟

مستفتی: ملک خوائیداد خان کوھائی

﴿جواب﴾ چراگاہ جانوروں کو چرنے کیلئے کرایہ پر دینا یا اس میں موجود خودرو گھاس کو فروخت کرنا جائز نہیں ہے.

البتہ یہ پہاڑ آپ لوگوں کی اگر ملکیت ہے تو پورا پہاڑ یا اس کا خاص حصہ جانوروں کو رکھنے کیلئے کرایہ پر دے سکتے ہیں کرایہ باہمی رضامندی سے جو بھی طے کریں جائز ہے اور پورے پہاڑ میں جانوروں کو چرنے سے نہ روکا جائے. خودرو گھاس میں سب لوگ برابر شریک ہیں.

لما فی الشامی: (۵/۶۶..۶۷ سعید)

(والمرعى) أي الكلأ أما بطلان بيعها فلعدم الملك لحديث "الناس شركاء في ثلاث في الماء والكلأ والنار" وأما بطلان اجارتها فلانها على استهلاك عين (قوله وحيلة) أي حيلة جواز بيع الكلأ وكذا اجارته قال في البحر: والحيلة في جواز اجارته أن يستأجرها ارضا لايقاف الدواب فيها أو لمنفعة اخرى بقدر ما يريد صاحبه من الثمن أو الاجرة فيحصل به غرضهما.

ولما في البحر الرائق: (۶/۷۷،۷۸،طبع: سعيد)

(قوله والمرعى واجارتها) اى لاتجوز بيع الكلأ واجارته ــــــ والحيلة في جوازه اجارته ان يستأجر أرضا لايقاف الدواب فيها او لمنفعة اخرى بقدر مايريد صاحبه من الثمن او الاجرة فيحصل به غرضها.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ　　　واللہ اعلم بالصواب: ارشد سعید کوھائی

۶ ربیع الاول ۱۴۳۳ھ　　　فتویٰ نمبر: ۳۳۲۰

﴿کیا پانی کی باری کو فروخت کرنا جائز ہے؟﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلے کے بارے میں کہ ہمارے علاقے میں زمین سیراب کرنے کیلئے پانی کی باریاں مقرر ہیں، اب اگر کوئی شخص زمین کو سیراب کرنے کیلئے کوئی اور پانی استعمال کرے اور اپنی باری کو فروخت کرنا چاہے تو شرعا یہ جائز ہوگا یا نہیں؟

﴿جواب﴾ پانی کی باری کو فروخت کرنے سے متعلق فقہاء احناف کا اصل فتویٰ تو ناجائز ہونے کا ہے، لیکن مشائخ بلخ اور موجودہ دور کے بعض محققین علماء بھی جواز کا فتویٰ دے رہے ہیں۔

لما في الشامي: (۸۰/۵،طبع:سعید)

وكذابيع الشرب اي فانه يجوز تبعاللارض بالاجماع ،ووحده في رواية ، لايباع الشرب ولايوهب ولايؤجر ولا يتصدق لانه بمال متقوم في ظاهر الرواية وعليه الفتوى ثم نقل عن شرح الوهبانية ان بعضهم جوز بيعه ثم قال وينفذالحكم بصحه بيعه.

ولما في الهداية (۵۷/۳،طبع:رحمانيه)

بخلاف الشرب حيث يجوز بيعه تبعا للارض باتفاق الروايات ومفردا في رواية وهو اختيار مشائخ بلخ

ولما في المبسوط سرخسي: (۱۷۱/۲۳،طبع:دارالقلم بيروت)

وفي بعض المتأخرين من مشائخنا افتى ان يبيع الشرب وان لم يكن معه ارض للعادة الظاهرة فيه في بعض البلدان وهذه عادة معروفة بنسف

دیکھئے (جدید فقہی مباحث،مولانا مجاھد اسلام قاسمیؒ :۱۷۹/۳)(احسن الفتاوی=مفتی رشید احمدؒ صاحب:۴۶۴/۸)(فقہی مقالات =مفتی محمد تقی عثمانی صاحب :۱۸٦/۱)(جدید معاملات کے شرعی احکام=مفتی [illegible] ان اللہ صاحب:۲۱۴/۱)

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفااللہ عنہ

واللہ اعلم بالصواب: ارشد سعید کوھاٹی

۲۱ محرم الحرام ۱۴۳۳ھ

فتویٰ نمبر: ۳۱۲۵

﴿ثمن ادا کرنے سے پہلے مشتری کا بائع کو وہی چیز فروخت کرنے کا حکم﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میں نے حنیف نامی ایک شخص سے دوہزار ۲۰۰۰ روپیہ کے عوض موبائل خریدا ثمن دینے سے پہلے میں نے موبائل حنیف سے لیا، دیکھا تو وہ میری پسند کا نہیں تھا۔ [illegible] نے چاہا کہ اسکو کہیں فروخت کردوں تو حنیف ہی نے (جو بائع اول تھا) مجھ سے [illegible] روپیہ کے عوض خریدا تو میں نے موبائل مع دوسو روپیہ (کیونکہ ۲۰۰۰ روپیہ عقد اول میر[illegible]ے ذمہ لازم تھے) حنیف کو حوالہ کردیا۔اب پوچھنا یہ ہے کہ اس طرح عقد کرنا جائز ہے؟ اگر جائز نہیں تو جواز کی کوئی صورت ہے یا نہیں؟

﴿جواب﴾ [illegible] رکسی چیز کا سودا کوئی کرلے تو سودا مکمل نہیں ہوتا دیکھنے کے بعد خریدار کو پسند نہ آنے تو شریعت نے سودا ختم کرنے کا خریدار کو اختیار دیا ہے۔ بائع کو منظور ہو یا نہیں۔ خریدار لینے کا پابند نہیں ہے۔ بلکہ خریدار نے پہلے سے اگر ثمن ادا کردیا ہے تو بائع پر لوٹانا واجب ہے۔

البتہ دیکھنے کے بعد خریدار ایک بار سودا منظور کرلے تو سودا مکمل ہوجاتا ہے۔اس کے بعد

صرف باہمی رضامندی سے کمی بیشی کے بغیر عقد فسخ ہوسکتا ہے۔جس کو شریعت میں ''اقالہ'' کہتے ہیں۔اور اگر ثمن ادا کر دیا ہوتو کمی وبیشی کیساتھ نیا سودا بھی ہوسکتا ہے۔آپ نے پہلے دیکھا نہیں تھا اور دیکھنے کے بعد موبائل پسند نہیں آیا تو اسی سے سودا ختم ہوگیا اضافی رقم ۲۰۰ روپے لینے کا حق بائع کو حاصل نہیں ہے واپس کرنا لازم ہے۔اور بالفرض دیکھنے کے بعد آپ سودا منظور کرتے تب بھی ۲۰۰ روپیہ کی شرط سے سودا ختم کرنا جائز نہیں ہے۔بائع کو منظور ہوتو اسی رقم پر یا اس سے زائد رقم پر سودا ختم کریں۔اضافی رقم لینا کسی صورت میں بھی جائز نہیں ہے اس لئے کہ آپ نے ابھی تک ثمن ادا نہیں کیا۔ہاں ثمن بھی پورا ادا کرتے تو آپس میں نیا عقد کمی وبیشی کیساتھ کرنا جائز ہوتا۔

لما فی تنویر الابصار:(۸۲/۵ طبع سعید)

(و)فسد (شراء ماباع بنفسہا و بوکیلہ) من الذی اشتراہ أو حکما کوارثہ (بالاقل)من قدر الثمن الاول (قبل النقد) کل (الثمن) لاول .صورتہ یباع شیئا بعشرۃ ولم یقبض الثمن ثم شراہ بخمسۃ لم یجز

ولما فی الھندیہ:(۱۳۲/۳ طبع: رشیدیہ)

ولم یجز شرا من لا یصح شہادتہ لہ ماباع بنفسہ أو بیع لہ بأن باع وکسا باقل نقد الثمن الاول.

ولما فی البحر الرائق:(۸۱/۲ طبع سعید)

(قولہ شراء ماباع بالاقل قبل النقد) ای لم یجز شراء البائع ما باع بالاقل مما باع قبل نقد الثمن فہو مرفوع علی بیع لا انہ مجرور عطفاً علی المجرورات لانہ لوکان کذلک لصار المعنی لم یجز بیع شراء وہو فاسد وانما منعنا جوازہ استدلالا بقول عائشہؓ لتلک المرأۃ وقد باعت بستمائہ بعد ما اشترت بثمانمائہ بئسما شریت واشتریت ابلغی زید بن ارقم ان اللہ تعالی أبطل حجہ وجہادہ مع رسول اللہ ان لم یتب ولا ن الثمن لم یدخل فی ضمانہ.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: ارشد سعید کوہاٹی

۸ ربیع الاول ۱۴۳۳ھ — فتوی نمبر: ۳۳۴۷

﴿بیٹ کی خرید وفروخت کا حکم﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں: کہ مرغیوں کی بیٹ کی خرید وفروخت جائز ہے یا نہیں؟ ہمارے علاقہ میں بکثرت اسکی خرید وفرخت ہونے لگی ہے،لوگ بطور کھاد استعمال کرتے ہیں برائے کرم شریعت کی روشنی میں رہنمائی فرمائیں.

﴿جواب﴾ مرغیوں کی بیٹ ہو یا چوپائے جانوروں کا گوبر بطور کھاد استعمال کرنا جائز ہے

اور ایسی چیزوں کی خرید وفروخت بھی شرعاً منع نہیں ہے۔

لما فی البحر (ج۱ص۲۰۱) طبع سعید

(کرہ بیع العذرۃ لا السرقین لأن المسلمین یتمولون السرقین وانتفعوا بہ فی سائر البلاد والأمصار من غیر نکیر، فانہم یلقونہ فی الأراضی لاستکثار الریع بخلاف العذرۃ لأن العادۃ لم تجر بالانتفاع بہا الا مخلوطۃ برماد أو—

ولما فی التنویر مع الدر (ج۱ص۳۸۵) طبع سعید

(وکرہ بیع العذرۃ) رجیع الآدمی (خالصۃ لا) یکرہ بل یصح بیع (السرقین) أی الزبل۔

ولما فی الشامی (قولہ أی الزبل) وفی الشرنبلالیۃ: ہو رجیع ما سوی الانسان۔

ولما فی الشامی (۵/۲۰۱) طبع سعید ویجوز بیع السرقین والبعر والانتفاع بہ والوقود بہ.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ   واللہ أعلم بالصواب: سیف اللہ

۲ صفر المظفر ۱۴۳۳ھ   فتویٰ نمبر: ۳۱۳۶

﴿مہتمم صاحب اپنی کتابیں مدرسہ کو فروخت کرسکتا ہے یا نہیں﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان عظام اس مندرجہ ذیل مسئلہ کے بارے میں کہ مہتمم صاحب اپنی کتابیں مدرسہ کو اگر فروخت کرے مناسب قیمت پر اور مدرسہ کو ضرورت بھی ہو تو کیا وہ اسطرح کرسکتے ہیں؟   مستفتی: مولوی عنایت اللہ کلاچوی

﴿جواب﴾ ایک آدمی بائع اور خریدار نہیں بن سکتا، مہتمم صاحب بائع ہے تو خریدار انکے علاوہ کوئی اور ہو تو بیع جائز ہے ورنہ نہیں، مدرسہ خود خریدار نہیں ہو سکتا، البتہ مہتمم صاحب کے علاوہ اس مدرسہ کی اگر کمیٹی ہے تو کمیٹی والے خریدار ہو جائیں پھر قیمت مدرسہ کے پیسوں سے ادا کریں یا مدرسہ میں پڑھنے والے طلباء عاقل بالغ ہوں تو وہ بھی مدرسہ کیلئے خرید سکتے ہیں، اس کے علاوہ علاقہ کے علماء کرام بھی خریدار بن سکتے ہیں اس لئے کہ جہاں قاضی نہیں ہوتا تو ایسے امور میں علماء کرام قاضی کے قائم مقام ہوتے ہیں۔

لما فی الہندیہ (۳/۲) طبع رشیدیہ کوئٹہ

اما شرائط الانعقاد فانواع منہا فی العاقد وہو ان یکون عاقلا ممیزا کذا فی الکافی والنہایہ فیصح بیع الصبی والمعتوہ الذین یعقلان البیع واثرہ کذا فی فتح القدیر وان یکون متعددا فلا یصح الواحد عاقدا من الجانبین.

ولما فی بدائع الصنائع (۳۷۸/۶) طبع دار الکتب العلمیہ بیروت)

العدد فی العاقد فلا یصلح الواحد عاقدا من الجانبین فی باب البیع الا الاب فیما یبیع مال

نفسه من ابنه الصغير بمثل قيمته او بما يتغابن الناس فيه عادة او يشتري مال الصغير لنفسه بذالك عند اصحابنا الثلاثة استحسانا، و القياس ان لا يجوز ذالك ايضا و هو قول زفر رحمه الله تعالى.

وجه القياس ان الحقوق في باب البيع ترجع الى العاقد وللبيع حقوق متضادة مثل التسليم والتسلم والمطالبة، فيؤدي الى ان يكون الشخص الواحد في زمان واحد مسلما و متسلما، طالبا و مطالبا، و هذا محال و لهذا لم يجز ان يكون الواحد وكيلا من الجانبين في باب البيع.

ولما في الهندية (۳/۵۸۸ طبع رشيديه كوئٹه)

الوكيل بالبيع لا يملك شراءه لنفسه لان الواحد لا يكون مشتريا و لا بائعا كذا في الوجيز لكردري.

ولما في الشامي (۲/۴۰۷ طبع ايچ ايم سعيد)

(كتاب الوقف، مطلب في قطع الجهات لاجل العمارة)

لو عمل المتولي في الوقف باجر جاز و يفتى بعدمه اذ لا يصلح موجرا و مستاجرا و صح لو امره الحاكم ان يعمل فيه اه و عليه كما في القنية اذا عمل القيم في عمارة المسجد او الوقف كعمل الاجير لا يستحق اجرا محمول على ما اذا كان بلا امر الحاكم والظاهر ان الناظر غير قيد بل كل من عمل في التعمير من المستحقين له اجرة عمله وانما نصوا على الناظر لانه لا يصلح موجرا و مستاجرا اي مستاجرا لنفسه، فاذا كان بامر الحاكم كان الحاكم هو المستاجر له بخلاف غيره من المستحقين فان المستاجر له هو الناظر، فلا شبهة في استحقاقه الاجرة كالاجنبي.

الجواب صحیح: مفتی عبدالرحمٰن عفی اللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: محمد داؤد فاروقی

۱۶ ربیع الاول ۱۴۳۵ھ — فتویٰ نمبر: ۳۹۲۸

گاڈر کی بیع گاڈر کے بدلے جائز ہے

سوال: کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک گاڈر کے بدلے دوسرے گاڈر کی بیع جائز ہے یا نہیں؟ اگر کسی نے اسطرح کی بیع کرلی تو اس میں ربا تو لازم نہیں آئیگا۔

جواب: گاڈر اصل کے اعتبار سے تو موزونی ہے لیکن آجکل چونکہ اسکی خرید و فروخت فٹ کے حساب سے عام رائج ہوگئی ہے اسلئے اب یہ موزونی نہیں رہا لہذا گاڈر کی بیع گاڈر کے بدلے کمی بیشی کیساتھ بھی جائز ہے لیکن دونوں ایک ہی جنس کے ہیں اس لئے ادھار بیچنا جائز نہیں بلکہ سودا کے وقت دونوں فریق کے گاڈر کا موجود اور متعین ہونا ضروری ہے خواہ ہر ایک اپنے گاڈر کو اسی وقت نہ اٹھائیں بائع کے پاس امانت پڑا رہے، ہاں تبادلہ ایسی چیزوں کا ہو کہ ہر ایک

کا جنس الگ الگ ہو اور وہ کیلی موزونی اشیاء میں سے نہ ہو تو کمی بیشی کیساتھ بیچنا بھی جائز ہے اور ادھار معاملہ بھی جائز ہے۔

لمافی شرح المجلۃ تحت المادۃ ۱۲۲ ج ۱۶/۲ طبع رشیدیۃ

﴿بیع المقایضۃ بیع العین بالعین ای مبادلۃ مال بمال غیر النقدین﴾

ثم ان اتفقا جنسا وقدرا اشترط لصحتہا تساوی البدلین وتعیینہما ،وان اتفقا جنسا فقط اوقدرا فقط اشترط التعیین دون التساوی فصح بیع کرحنطۃ بکرحنطۃ معینین ولا یصح نسیئۃ ولامتفاضلا وصح بیع کرحنطۃ بکری شعیر وثوب ہروی بثوبین ہرویین معینات ولا یصح نسیئۃ ،وان اختلفا جنسا وقدرا فلا یشترط شئی ،فصح بیع ثوب ہروی بثوبین مرویین الی اجل معلوم لانہ اذا وجد القدر والجنس حرم کل من الفضل والنسأ وان عدما حل کل منہما فالمراد بالتعیین عدم التأجیل لا التقابض واما اشتراط التقابض فیما اذا اتفقا جنسا وقدرا اوجنسا فقط اوقدرا فقط فلا قائل بہ ،لان التقابض فی المجلس لایشترط الا فی الصرف وہو بیع الاثمان بعضہا ببعض اما ماعداء فانہ یشترط فیہ التعیین لا التقابض کمافی ردالمحتار وغیرہ .

ولمافی الہدایۃ ج۳ /۸۳ طبع رحمانیۃ

واذاعدم الوصفان الجنس والمعنی المضموم الیہ حل التفاضل والنسأ لعدم العلۃ المحرمۃ والاصل فیہ الاباحۃ واذا وجدا حرم الفضل والنسأ لوجود العلۃ واذا وجد احدہما وعدم الاخر حل التفاضل وحرم النسأ مثل ان یسلم ہرویا فی ہروی اوحنطۃ فی شعیر،فحرمۃ ربوی الفضل بالوصفین وحرمۃ النسأ باحدہما .

ولمافی المحیط البرہانی ج۹ /۳۲۵ طبع ادارۃ القرآن

ومتی ترکوا الوزن فی شئی مع الامکان فانہ یخرجہ من ان یکون موزونا فانہ لوباع قمقمۃ من حدید اوصفر اونحاس بقمقمتین من جنسہا وتلک القمقمۃ لاتباع وزنا فانہ یجوز یدا بید لان الناس ترکوا الوزن مع الامکان فیہا وترک الوزن فیما ثبت وزنہ باصطلاحہم اعراض عن الاصطلاح عن الوزن فینسخ الاصطلاح علی الوزن والوزن فی ہذہ الاشیاء ثبت باصطلاحہم.

ولمافی التنویر مع الدر ج۵/۱۷۱ طبع سعید

(وعلتہ)ای علۃ تحریم الزیادۃ (القدر)المعہود بکیل اووزن (مع الجنس فان وجدا حرم الفضل)ای الزیادۃ (والنسأ)بالمد التأخیر فلم یجز بیع قفیز بر بقفیز منہ متساویا واحدہما نسأ (وان عدما)بکسر الدال من باب علم (حلا)کہروی بمرویین لعدم العلۃ فبقی علی اصل الاباحۃ (وان وجد احدہما)ای القدر وحدہ اوالجنس (حل الفضل وحرم النسأ)ولومع التساوی حتی لوباع عبدا بعبد الی اجل لم یجز لوجود الجنسیۃ .

الجواب صحیح: مفتی عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب: عاقل شاہ

۲۰ صفر الخیر ۱۴۳۵ھ فتویٰ نمبر: ۳۹۵۰

﴿چوری کا مال خریدنا جائز نہیں﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ہمارے ہاں (سہراب گوٹھ میں) بعض لوگ جو کہ زیادہ تر چرس پینے والے ہوتے ہیں موبائل بیچنے کیلئے لاتے ہیں اور آدھے سے بھی کم قیمت پر فروخت کرتے ہیں جس سے ظاہر ہیکہ یہ چوری ڈکیتی وغیرہ کا مال ہے۔اب پوچھنا یہ ہیکہ اسطرح کی چیز خریدنا جائز یا نہیں؟ایک ساتھی کا کہنا ہیکہ ہم تو پیسے دیکر خریدتے ہیں اگر چہ انہوں نے چوری کئے ہوں لہذا ہمارے لیے خریدنا جائز ہے۔اس ساتھی کا یہ کہنا درست ہے یا نہیں؟ برائے کرم وضاحت فرما کر ممنون فرمائیں۔

﴿جواب﴾ چوری کے مال کا جب تک ضمان ادا نہ کیا جائے چور اسکا مالک نہیں بن پاتا اصل مالک بدستور اس مال کا مالک رہتا ہے،لہذا خریدار کو اگر معلوم ہیکہ یہ چوری کا مال ہے تو خریدنا ہرگز جائز نہیں بلکہ خریدنے سے وہ بھی مالک نہیں بنے گا۔آپکے ساتھی کا یہ عذر پیش کرنا کہ ہم تو پیسے دیکر خرید لیتے ہیں کوئی معقول اور سمجھداری کی بات نہیں ہے آپکے دوست کے ذاتی مال کا کوئی غیر شخص سودا کر کے بیچدے تو کیا آپکا دوست اسکے عذر کو قبول کریگا کہ اس نے پیسہ دیکر حاصل کیا ہے؟

لمافی الرد ج۵/۹۸ طبع سعید

(قوله الحرمة تتعدى ....الخ)نقل الحموى عن سيدى عبدالوهاب الشعرانى انه قال فى كتابه المنن :وماتقل عن بعض الحنفية من ان الحرام لايتعدى ذمتين :سألت عنه الشهاب ابن الشلبى فقال :هومحمول على ماذالم يعلم بذلك، امالوراى المكاس مثلاياخذمن احد شيئا من المكس ثم يعطيه اخرثم ياخذمن ذلك الاخرلاخرفهوحرام

ولمافى العالمكيرية ج۳/۱۱۱ طبع رشيدية

ومن باع ملك غيره ثم اشتراه وسلم الى المشترى لم يجزويكون باطلا لافاسدا وانما يجوزاذاتقدم سبب ملكه قبل ذلك كذافى الفصول العمادية .

الجواب صحیح :مفتی عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب :عاقل شاہ

۱۴ صفر الخیر ۱۴۳۵ھ — فتویٰ نمبر :۳۹۲۳

﴿بیع الوفاء کی ایک صورت کا حکم﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک آدمی بہت زیادہ مقروض

تھا قرض خواہوں نے اسکو بہت زیادہ تنگ کر رکھا تھا، اسکے پاس کچھ تھا نہیں انکو دینے کیلئے، بالآخر وہ مجبور ہوا اس بات پر کہ اپنی جائیداد میں سے تھوڑا سا فروخت کردے اور انکا منہ بند کردے، چنانچہ اسنے اپنی جائیداد کا ایک حصہ دوسرے شخص پر فروخت کردیا (چونکہ علاقے میں یہ رواج ہے کہ جو آدمی اپنی زمین جائیداد وغیرہ بیچتا ہے اسکو معیوب سمجھا جاتا ہے اسلئے) ساتھ یہ شرط بھی لگایا کہ جب میری مالی حالت اچھی ہوگی اور اتنی رقم میرے پاس آئیگی تو میں آپکو دیکر مذکورہ زمین کا حصہ آپ سے واپس لے لوں گا، کافی عرصہ گزرنے کے بعد اب بائع کی مالی حالت اچھی ہوگئی ہے وہ مشتری سے کہتا ہے کہ میں آپکو آپکی رقم ادا کرتا ہوں تم مجھے میری زمین واپس کردو، لیکن مشتری اس کیلئے تیار نہیں وہ کہتا ہے اتنے سال میرے پیسے آپکے پاس رہے اب آپ وہی پیسے دیکر اپنی زمین واپس لے لوگے تو اسمیں میرا نقصان ہے یہ مجھے منظور نہیں۔ برائے کرم قرآن، حدیث اور فقہاء کرام کے اقوال کی روشنی میں اس مسئلہ کا حکم بیان فرمائیں۔

﴿جواب﴾ صورت مسئولہ میں بائع کا مشتری سے یہ کہنا کہ ''جب میری مالی حالت اچھی ہوگی میں آپکی رقم آپکو واپس کرکے اپنی زمین واپس لے لوں گا'' اسکی دو صورتیں ہوسکتی ہیں:

(۱) یہ کہ بائع اور مشتری نے شروع عقد میں یہ شرط لگائی ہو کہ جب بائع رقم واپس کریگا تو اپنی مبیع واپس لینے کا اسکو اختیار ہوگا تو اس صورت میں یہ بیع فاسد ہے اور معاملہ رہن کے حکم میں ہے۔ لہذا بائع جب رقم ادا کردیگا تو مشتری پر لازم ہوگا کہ وہ زمین واپس کردے اور اس دوران اس زمین سے اگر فائدہ اٹھایا ہے مثلاً زمین سے منافع اٹھائے ہیں تو وہ بھی لوٹانا ضروری ہے۔

(۲) اور دوسری یہ کہ شروع عقد میں اس قسم کا تذکرہ نہیں کیا بعد میں دونوں نے اس بات پر اتفاق کیا کہ جب ثمن لوٹائے گا تو زمین واپس بائع کو دی جائیگی، تو اسکی حیثیت وعدہ کی ہے لیکن یہ عام وعدہ کیطرح نہیں ہے کہ پورا نہ کرنے کی صورت میں صرف گناہ ہوگا بلکہ یہ وعدہ قضاءً بھی پورا کرنا لازم ہے، مشتری کا یہ عذر کہ آپنے اتنی مدت تک میری رقم استعمال کی ہے اسلئے میں زمین واپس نہیں کرسکتا قابل اعتبار نہیں ہے۔ بائع اگر یہ وعدہ قاضی کے ہاں حق ثابت کردے تو قاضی زبردستی زمین بائع کو لوٹائیگا۔ بیع وفاء کی یہ دوسری صورت بہتر ہے اس صورت میں مشتری نے زمین سے جو منافع حاصل کیے ہیں وہ لوٹانا ضروری نہیں ہے اور پہلی صورت

چونکہ حکماً رہن ہے اسلئے منافع لوٹانا واجب ہے۔

لمافی الدر:(ج ۵/۲۷۷طبع سعید)

ثم ان ذکر الفسخ فیه اوقبله اوزعماه غیر لازم کان بیعاً فاسداولوبعده علی وجه المیعاد جازولزم الوفاء به لان المواعید قدتکون لازمة لحاجة الناس وهوالصحیح .

ولمافی الهندیة :(ج ۳/۲۰۸،۲۰۹طبع رشیدیة)

البیع الذی تعارف اهل زماننااحتیالاللربا، وسموه بیع الوفاء هوفی الحقیقة رهن وهذاالمبیع فی یدالمشتری کالرهن فی یدالمرتهن لایملکه ولایطلق له الانتفاع الاباذن مالکه وضامن لمااکل من ثمره واستهلک من شجره والدین ساقط بهلاکه فی یده اذاکان به وفاء بالدین ولاضمان علیه فی الزیادة اذاهلکت من غیرصنعه وللبائع استرداده اذاقضی دینه ولافرق عندنابینه وبین الرهن فی حکم من الاحکام کذافی الفصول العمادیة وعلیه فتوی سیدابی شجاع السمرقندی وفتوی القاضی علی السغدی ببخاری وکثیرمن الائمة علی هذاکذافی المحیط وصورته ان یقول البائع للمشتری :بعت منک هذاالعین بدین لک علی علی انی متی قضیت الدین فهولی، اویقول البائع :بعت هذابکذاعلی انی متی دفعت لک الثمن تدفع العین الی، والصحیح ان العقدالذی جری بینهماان کان بلفظ البیع لایکون رهناثم ینظران ذکراشرط الفسخ فی البیع فسد البیع وان لم یذکراذلک فی البیع وتلفظابلفظ البیع بشرط الوفاء اوتلفظابالبیع الجائزوعندهماهذاالبیع عبارة عن بیع غیرلازم فکذلک وان ذکرالبیع من غیرشرط ثم ذکرالشرط علی وجه المواعدة جازالبیع ویلزم الوفاء بالوعد.

ولمافی المحیط البرهانی (ج۱۰/۲۶۹طبع ادارة القرآن

وفی فتاوی النسفی :ان البیع الذی تعارفوه اهل سمرقند وسموه بیع الوفاء تحرزاعن الربا، فی الحقیقة رهن والمبیع فی یدالمشتری کالرهن فی ید المرتهن لایملکه ولایحل له الانتفاع به الاباذن الراهن وهوضامن لمااکل من ثمرته واستهلکه من عینه والدین ساقط بهلاکه فی یده اذاکان به وفاء بالدین وللبائع استرداده اذاقضی الدین اذلافرق عندنابینه وبین الرهن فی حق حکم من الاحکام .وهکذافی الشامی (ج۵/۲۷٦طبع سعید)

ولمافی المقالات الفقهیة :(ص ۵٦ مکتبه دارالعلوم کراچی)

اذانظرناالی ماذکره اجلة الفقهاء من المذاهب الاربعة وجدناهم متفقین علی ان بیع الوفاء لوکان خالیاعن شرط الردفی صلب العقدیکون جائزا،امااذاشرط ردالمبیع فی صلب العقدیکون البیع فاسداعندالاحناف والمالکیة والشافعیة اماالحنابلة فیرون البیع صحیحاوالشرط فاسدافاذاکان البیع خالیاعن شرط ردالمبیع فالراجح فی المذاهب الاربعة انه جائز وذلک لکونه بیعاخالیاعن شرط وهل یجب الردعلی احدالمتعاقدین اذااتفقاعلی ردالمبیع عندردالثمن وکان ذلک الاتفاق قبل عقدالبیع اوبعده بصورة المواعدة فنری الراجح انه یجب علیهماالرداذاتواعداعلی ذلک

ویکون الوعد ملزما دیانة وقضاء ، اما وجوب الوعد دیانة فظاهر لقوله تعالی :واوفوا بالعهد ان العهد کان مسئولا ، وبالنصوص التی تدل علی ایفاء الوعد واما لزومه قضاء فالامر عند الامام مالک ظاهر کما تقدم والفقهاء الحنفیة ایضا اختاروا فی هذه المسئلة لزوم الوعد قضاء لحاجة الناس فهو الراجح عند الامامین الجلیلین.

ولما فی المقالات الفقهیة (ص ۳۲۴ مکتبه دار العلوم کراچی)

ولکن المتأخرین من الحنفیة لم یبیحوا انتفاع المرتهن وان کان باذن الراهن لان العرف قد جری بالانتفاع بالرهن والمعروف کالمشروط ولذلک ذکر ابن عابدین نفسه فی رد المحتار فی کتاب الرهن انه لا یحل للمرتهن ولو بالاذن لانه ربا.

الجواب صحیح: مفتی عبد الرحمٰن عفا اللہ عنہ   واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب: عاقل شاہ

۲۴ جمادی الاولیٰ ۱۴۳۵ھ   فتویٰ نمبر: ۳۶۶۱

﴿بیع فاسد، باطل اور موقوف کا بیان﴾

﴿بیع میں شرط فاسد کا حکم﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک دوکاندار گاہک کو مقررہ مدت تک ادھار موبائل دیتا ہے، جب گاہک سے متعین مدت تک قرضہ ادا نہیں ہو پاتا تو دوکاندار اس کو دوسرا مہنگا موبائل اس شرط پر ادھار بیچتا ہے کہ اس کو فروخت کر کے میرا پہلا ادھار ادا کرنا ہوگا اور اس موبائل کی کچھ رقم آپ کے ذمے باقی رہ جائے گی وہ بعد میں ادا کرنا۔

پوچھنا یہ ہے کہ یہ معاملہ شرعاً درست ہے یا نہیں؟ بینوا توجروا۔ مستفتی: محمد ذاکر پشاور

﴿جواب﴾ بیع میں ایسی شرط لگانا جس سے بائع یا مشتری کو کوئی خاص فائدہ ہو شرعاً منع ہے ،اس سے بیع فاسد ہو جاتی ہے، البتہ ایجاب وقبول سے پہلے یا بعد میں لگانے سے بیع فاسد نہیں ہو تی ،لہٰذا مذکورہ صورت میں بھی ایجاب وقبول کے موقع پر ایسی شرط لگانے سے گریز کریں، پہلے یا بعد میں بیشک ایسی شرط لگائیں پھر وعدہ کے درجہ میں اس پر عمل کرنا بھی ضروری ہوگا۔

لما فی الهدایة:(۳/۶۱،طبع رحمانیه)

کل شرط لا یقتضیه العقد وفیه منفعة لاحد المتعاقدین او للمعقود علیه ـــــ یفسد العقد.

ولما فی الشامی :(۵/۸۵،طبع سعید)اما لو جری العرف به ـــــ فلا فساد.

ولما فی درر الحکام:(۱/۱۵۹ طبع ماجدیه کوئٹه)

الشرط المتعارف ولو لم یکن من مقتضیات العقد جوز للعقد معه استحسانا وصار

معتبرا لان الشرط متی کان متعارفا فلایکون باعثا علی النزاع.

ولما فی الشامی:(۸۴/۵،طبع:سعید)

ولو ذکر المبیع بلاشرط ثم ذکر الشرط علی وجه العقد جاز البیع ولزم الوفاء بالوعداذالمواعید قدتکون لازمة فیجعل لازما لحاجة الناس.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفااللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: عبدالرحمٰن کوہاٹی

۲۹صفرالخیر۱۴۳۲ھ — فتوی نمبر: ۲۹۴۲

﴿نامعلوم مقدار واپس کرنے کی شرط لگانے سے عقد فاسد ہو جاتا ہے﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ اگر خریدار نے دوکاندار سے کوئی چیز لیتے وقت یہ شرط لگائی کہ جتنا مجھ سے زائد ہو جائے تو میں آپکو واپس کرونگا، جیسے چونا وغیرہ، تو کیا اس طرح کے شرط کے ساتھ یہ عقد جائز ہوگا؟ مستفتی: مولوی نور محمد عبدل خیل

﴿جواب﴾ مبیعہ کا کچھ حصہ (نامعلوم مقدار) واپس کرنے کو عقد میں شرط لگانے سے عقد فاسد ہو جاتا ہے، اس لئے کہ اس سے مبیعہ میں جہالت آجاتی ہے، لیکن اگر کسی علاقے میں ایسا رائج ہو گیا ہو، تو عرف بننے کی وجہ سے عقد فاسد نہ ہوگا۔

لمافی التنویر مع الدر:۸۴/۵طبع سعید کراچی

(ولابیع بشرط)وفی الشامیۃ تحتہ :من أنہ لو باع مطلقاً عن ھذہ الأجال ثم أجل الثمن الیھا صح فانہ فی حکم الشرط الفاسد کما أشرنا الیہ عناك ثم ذکر فی البحر أنہ لو أخرجہ مخرج الوعد لم یفسد وصورتہ کما فی الولوالجیۃ: قال اشترحتی ابنی الحوائط۔۔۔۔

قلت:وفی جامع الفصولین أیضا لو ذکر البیع بلاشرط ثم ذکر الشرط علی وجہ العقد جاز البیع ولزم الوفاء بالوعد اذالمواعید قدتکون لازمة فیجعل لازما لحاجة الناس تبایعا.

ولمافی تکملۃ فتح الملھم :۶۳۰،۶۲۹/۱طبع دارالعلوم کراچی

وخلاصة مذھب الحنفیۃ فی ذلک أنہ ان کان شرطا یقتضیہ العقد أو یلائم العقد أو شرطا جری بہ التعامل بین الناس فھو جائز ولا یفسد بہ البیع۔۔۔ومثال الشرط الذی جری بہ التعامل ما اذا اشتری نعلا علی أن یحذوہ البائع أو جرابا علی أن یخرزہ لہ خفا قال السرخسی رحمہ اللہ فی المبسوط: وان کان شرطا لا یقتضیہ العقد وفیہ عرف ظاھر فذلک جائز أیضا کما لو اشتری نعلا وشراکا بشرط أن یحذوہ البائع لأن الثابت بالعرف ثابت بدلیل شرعی ولأن فی النزع عن العادة الظاھر حرجا بینا وقال الکاسانی فی البدائع :والقیاس أن لا یجوز وھو قول زفر رحمہ اللہ وجہ القیاس ان ھذا شرط لا یقتضیہ العقد وفیہ منفعة لاحد العاقدین وانہ مفسد ۔۔۔ولنا أن الناس تعاملوا ھذا الشرط فی البیع کما تعاملوا

الاستصناع لسقط القياس بتعامل الناس كما سقط في الاستصناع.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ　　　واللہ اعلم بالصواب: محمد زبیر غفرلہ ولوالدیہ

۶ جمادی الثانی ۱۴۳۴ھ　　　فتوی نمبر: ۲۷۵۱

﴿خریدار واپس بیچنے کی شرط لگائے تو بیع فاسد ہے﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ہمارا اسٹیٹ ایجنسی کا کاروبار ہے، ہم کبھی ایسا کرتے ہیں کہ ایک پلاٹ ۵۰ لاکھ کا کسی کو اس شرط پر فروخت کرتے ہیں کہ بعد میں یہی پلاٹ میں آپ سے ۵۵ لاکھ کا خریدلوں گا، پوچھنا یہ ہے کہ کیا شرعاً ہمارا یہ معاملہ جائز ہے یا نہیں؟　　　مستفتی: محمد شہزاد صاحب ڈیفنس

﴿جواب﴾ مذکورہ صورت میں آپ کا یہ معاملہ شرعاً درست نہیں ہے، اس لئے کہ پلاٹ فروخت کرتے وقت بائع یعنی (بیچنے والے) کا یہ کہنا کہ میں اس پلاٹ کو دوبارہ آپ سے ۵۵ لاکھ روپے کا خریدلوں گا یہ شرط فاسد ہے، جس کی وجہ سے یہ معاملہ ناجائز ہوجاتا ہے، البتہ اگر اس شرط کو ذکر کیے بغیر دونوں باہمی معاملہ کرلیں، اور معاملہ کرنے کے بعد اسی وقت یا بعد میں بائع خریدار سے کہے کہ بعد میں یہی پلاٹ میں آپ سے خریدلوں گا تو ایسا کرنے کی گنجائش ہے اور بائع کو بعد میں اپنے وعدہ کی پاسداری کرنی چاہیے اگر وعدہ پورا نہ کیا تو وعدہ خلافی کی وجہ سے گنہگار ہوگا۔

لما في التنوير مع الدر: (۸۴/۵، طبع سعيد)

(و) لا (بيع بشرط)... (لا يقتضيه العقد ولا يلائمه وفيه نفع لاحدهما أو)

وفي الشامية: (قوله ولا بيع بشرط) شروع في الفساد الواقع في العقد بسبب الشرط لنهيه ﷺ عن بيع وشرط...... قلت: وفي جامع الفصولين ايضا: لو ذكر البيع بلا شرط ثم ذكر الشرط على وجه العقد جاز البيع ولزم الوفاء بالوعد اذ المواعيد قد تكون لازمة، فيجعل لازما لحاجة الناس تبايعا بلا ذكر شرط الوفاء، ثم شرطاه، يكون بيع الوفاء..... وبه أفتى في الخيرية وقال: فقد صرح علماءنا بانهما لو ذكرا البيع بلا شرط ثم ذكرا الشرط على وجه العدة جاز البيع ولزم الوفاء بالوعد اه.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ　　　واللہ اعلم بالصواب: عبدالحکیم کشمیری عفا اللہ عنہ

۳ شعبان ۱۴۲۹ھ　　　فتوی نمبر: ۱۷۵۰

﴿معتوہ کا معیار اور اس کے معاملات کا حکم﴾

﴿سوال﴾ ایک شخص جو کہ معتوہ ہے معاملات میں اکثر دھوکہ کھا جاتا ہے اور زیادہ قیمت والی اشیاء کم قیمت میں فروخت کر دیتا ہے جس سے اہل خانہ کا کافی نقصان ہوتا ہے، پوچھنا یہ ہے کہ شریعت میں معتوہ کا معیار کیا ہے؟ کیا اس کے اہل خانہ کو اس کے معاملات فسخ کرنے کا حق حاصل ہے یا نہیں؟

مستفتی: مولوی محمد شاہ صاحب عبدل خیل

﴿جواب﴾ فقہاء کرام کی اصطلاح میں معتوہ سے مراد وہ شخص ہوتا ہے جسکی سمجھ میں کچھ کمی ہو اور کلام میں خلط ملط ہو رہا ہو اور اسکی تدبیر بھی فاسد ہو یعنی سوچ سمجھ کر معاملہ نہ کر سکتا ہو لیکن اسکی عقل میں اتنی کمی نہ ہو کہ وہ مجنون کی طرح سب وشتم کرنے لگے۔

لمافی الشامی:(۱/۱۴۳،طبع سعید)

العته:ھو آفة توجب الاختلال بالعقل بحیث یصیر مختلط الکلام فاسدالتدبیر الاانه لا یضرب ولا یشتم بخلاف المجنون.

ولمافی العالمگیریة:(۵/۵۴طبع رشیدیه)

والمعتوہ... ھو من کان قلیل الفھم مختلط الکلام فاسدالتدبیر الاانه لایضرب ولایشتم کمایفعل المجنون کذافی التبیین.

معتوہ کے وہ تمام معاملات جو نفع ونقصان کے مابین ہوں نافذ نہیں ہوتے بلکہ ولی کی اجازت پر موقوف ہوتے ہیں اگر ولی اس معاملے کو فسخ کرنا چاہے تو کر سکتا ہے، مذکورہ صورت میں اگر اس شخص پر مذکورہ تعریف صادق آتی ہو تو اس کے ولی یعنی باپ یا دادا اگر موجود ہوں اور وہ چاہیں تو اس کے معاملات کو فسخ کر سکتے ہیں اس کے بیٹے اس کے مجاز نہیں، البتہ اگر مذکورہ اولیاء نہ ہوں تو اس کے اہل خانہ کو چاہیے کہ وہ عدالت کے ذریعے اس کے معاملات فسخ کروالیں۔

لمافی قوله تعالی:(سورة البقرة،آیت ۲۸۲)

﴿فان کان الذی علیه الحق سفیھا او ضعیفا او لا یستطیع ان یمل ھو فلیملل ولیه بالعدل﴾

ولمافی المبسوط للسرخسی:(ج ۲۴ص۱۵۷،طبع دارالمعرفة بیروت)

وقال شمس الدین السرخسی:ھو تنصیص علی اثبات الولایة علی السفیه وانه مولی علیه ولایکون ذالک الابعدالحجر علیه.وقال اللہ تبارک وتعالی:ولاتؤتوا السفھاء اموالکم الی ان قال واکسوھم وھذا ایضا علی اثبات الحجر علیه بطریق النظر له فان الولی الذی یباشر التصرف فی ماله علی وجه النظر منه له.وفی التنویر مع الدر:(۵/۱۱۰،طبع سعید)

ولما فی الکفایة:(۶/۴۲،طبع رشیدیه)

(ومن باع من هؤلاء شیئااواشتری وهویعقل البیع ویقصده)المرادبهؤلاء الصبی والعبد والمجنون الذی یجن ویفیق وهوالمعتوه الذی یصلح وکیلاعن غیره وهویعقل البیع ویقصده وان کان لایرجح المصلحة علی المفسدة لاالذی ذهب عقله فان تصرفه لا یصح..... ولابدان یعقلاالبیع لیتحقق رکن البیع فینعقدموقوفاعلی الاجازة.

ولمافی البحر:(۸/۷۹-۷۸،طبع سعید)

(ولایصح تصرف المجنون المغلوب بحال)یعنی لایجوزتصرفه بحال ولواجازه الولی.....وان کان یجن تارة ویفیق اخری فهوفی حال افاقته کالعاقل والمعتوه کالصبی العاقل فی تصرفاته وفی رفع التکلیف عنه وهوالناقص العقل.وقیل هومدهوش من غیر جنون.....(ومن عقدمنهم وهویعقله یجیزه الولی اویفسخه)یعنی من عقدالبیع والشراء من هؤلاء المحجورین وهویعقله ای وهویعقل ان البیع سالب والشراء جالب ویعلم الغبن الفاحش من الیسیرویقصدبه تحصیل الربح والزیادة فالولی بالخیاران شاء اجازه وان شاء رده.وهکذافی العالمگیریة:(۵/۵۴،کتاب الحجر،طبع رشیدیه)والعنایة:(۹/۱۶۲،طبع رشیدیه)

الجواب صحیح:عبدالرحمن عفااللہ عنہ   واللہ اعلم بالصواب:ظہوراحمد شمس

۱۴۲۹/۱/۹ھ   فتویٰ نمبر:۱۰۸۳

﴿چوری کا مال خریدنا یا بیچنا جائز نہیں ہے﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام کہ ایک شخص کے پاس چوری کا موبائل ہے اور میرے علم میں ہے کہ یہ موبائل چوری کا ہے، معلوم یہ کرنا ہے کہ میرے لئے اس موبائل کا خریدنا کیسا ہے؟ نیز اگر لاعلمی میں خریدلیا اور بعد میں معلوم ہوا تو ایسی صورت میں شرعا کیا حکم ہے؟

﴿جواب﴾ چوری کے مال کا مالک چور نہیں ہے، اسکو بیچنے کا اختیار نہیں ہے اور نہ آپ خریدنے سے مالک قرار پاتے ہیں، لہٰذا آپ کیلئے اسکا خریدنا ہرگز جائز نہیں ہے، لاعلمی میں خریدنے کی صورت میں بھی اصل مالک کو لوٹانا ضروری ہے، البتہ چور سے پیسہ وصول کرنے کا حق آپ کو حاصل ہے۔

لمافی التنویرمع الدر:(۴/۱۱۰،طبع سعید)

(ولاغرم علی السارق بعدماقطعت یمینه..... وتردالعین لوقائمة)وان باعها أو وهبها لبقائها علی ملک مالکها--- وفیه لواستهلکه المشتری منه اوالموهوب له فللمالک تضمینه.

وفی الشامیة:(قوله فللمالک تضمینه)ای تضمین المشتری أوالموهوب له ثم یرجع

المشتری علی السارق بالثمن لا بالقیمة تاتارخانیة عن المحیط.

ولمافی بدائع الصنائع:(۷/ ۸۵،طبع سعید)

ولو باع السارق المسروق من انسان أو ملکه منه بوجه من الوجوه فان کان قائما فلصاحبه ان یاخذه لانه عین ملکه وللماخوذ منه ان یرجع علی السارق بالثمن الذی دفعه)

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ واللہ اعلم بالصواب: عبدالرزاق عفا اللہ عنہ

۴ جمادی الثانی ۱۴۲۹ھ فتویٰ نمبر: ۱۵۵۲

﴿سودی بینک سے کاروبار کے لئے قرضہ لینا﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے متعلق کہ ایک شخص ایک فیکٹری کھولتا ہے اس پر چھ لاکھ ۶۰۰۰۰۰ روپے کی لاگت آئی ہے، دولاکھ ۲۰۰۰۰۰ اس کے پاس پہلے سے موجود ہیں اور چار لاکھ ۴۰۰۰۰۰ سودی بینک سے قرضہ لیتا ہے، اب ان تمام رقوم سے جو نفع ہوگا، اس کا کیا حکم ہے؟ نیز سودی بینک میں کرنٹ اکاؤنٹ کھولنا کیسا ہے؟ مستفتی: محمد اسحاق ڈیفنس

﴿جواب﴾ سود لینا حرام ہے، اسی طرح سود پر قرض لے کر سود دینا حرام ہے، تاہم سودی قرضہ لے کر کاروبار میں لگانے سے اس پر ملکیت آجاتی ہے اور اب اس سرمایہ سے حاصل ہونے والا منافع سود کی طرح حرام اگرچہ نہیں لیکن نحوست اور بے برکتی سے خالی بھی نہیں۔

کنونشنل بینکوں میں کرنٹ اکاؤنٹ کھولنے کے جواز کے فتاویٰ ہمارے اکابر ضرورت کے پیش نظر دیتے رہے ہیں، اس وقت سودی بینکوں کا متبادل غیر سودی بینک موجود نہ تھے، اب چونکہ یہ ضرورت غیر سودی بینکوں سے پوری ہوجاتی ہے، لہٰذا سودی بینکوں میں کرنٹ اکاؤنٹ کھولنے سے گریز کیا جائے تاکہ آپکی رقم سودی معاملات میں استعمال نہ ہو، البتہ جہاں غیر سودی بینکوں کی سہولت میسر نہ ہو بوجہ ضرورت کرنٹ اکاؤنٹ کھولنے کی گنجائش ہے لیکن موجودہ دور میں اس قسم کے بینکوں کا غیر سودی ہونا بھی یقینی نہیں رہا، اس لئے کہ اکثر علماء نے مذکورہ بینکوں میں رائج معاملات کو سودی قرار دیا ہے اور مضبوط حوالوں سے استشہاد کیا ہے جن کا اب تک اطمینان بخش جواب نہیں آیا، اس لئے ایسے بینکوں کے بارے میں ہم توقف اختیار کرتے ہیں، لہٰذا دونوں قسم کے بینکوں میں بوجہ ضرورت کرنٹ اکاونٹ کھولنے کی گنجائش ہے۔

لمافی مشکوۃ المصابیح:(۲/ ۲۴۴،باب الربا،طبع سعید)

عن جابر رضی اللہ عنہ قال لعن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آکل الربا وموکلہ

وکاتبه وشاهدیه وقال هم سواء(رواه مسلم)

ولمافی الدر مع الدر:(۵/۱۶۶ طبع سعید)

وفی الخلاصة القرض بالشرط حرام والشرط لغوبان یقرض علیٰ ان یکتب به الیٰ بلد کذالیوفی دینه وفی الاشباه کل قرض جرنفعا حرام.

وفی الشامیة:(قوله کل قرض جرنفعا حرام)ای اذاکان مشروطا کما علم ممانقله عن البحر.

الجواب صحیح:عبدالرحمٰن عفااللہ عنہ واللہ اعلم:عبدالوہاب النعمانی عفااللہ عنہ

۳ ربیع الاول ۱۴۱۳ھ فتویٰ نمبر:۲۳۷۹

﴿قرض دیکر شرط لگانے کا حکم﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں حضرات علماء کرام کہ زید عمرو کو اس شرط پر پیسے دیتا ہے کہ تم مارکیٹ سے جو چیز بھی خریدو پہلے مجھے دکھلانا اگر مجھے پسند آگئی تو میں خرید لونگا اگر پسند نہ آئی تو پورے پیسے واپس لے لونگا شریعت کی رو سے ایسا معاملہ کرنا کیسا ہے؟ مستفتی: ملک محمد عمران

﴿جواب﴾ ایسا معاملہ کرنا از روئے شریعت درست نہیں، اس لئے کہ یہ رقم بطور قرض دی گئی ہے اور قرض دی گئی رقم پر یہ شرط لگانا کہ (تم جو بھی چیز خریدو پہلے مجھے دکھلانی ہوگی) یہ قرض سے فائدہ حاصل کرنا ہے جو کہ ایک گونہ نفع ہی ہے اور قرض پر کسی طرح کا نفع حاصل کرنا احادیث میں سود قرار دیا گیا ہے۔

لمافی بدائع الصنائع:(۷/۳۹۵ طبع سعید)

(وأما)الذی یرجع الی نفس القرض فهوان لایکون فیه جرمنفعه فان کان لم یجز نحوما اذااقرضه دراهم غلة علی ان یردصحاحاأواقرضه وشرط شرطاله فیه منفعة لما روی عن رسول الله صلی الله علیه وسلم انه نهی عن قرض جرنفعا ولان الزیادة المشروطة تشبه الربا لانها فضل لایقابله عوض والتحرزعن حقیقة الربا وعن شبهة الربا واجب.

ولمافی الشامی:(۵/۱۶۶ طبع سعید)

(قوله کل قرض جرنفعا حرام)أی اذاکان مشروطا کما علم ممانقله عن البحروعن الخلاصة وفی الذخیرة وان لم یکن النفع مشروطافی القرض فعلی قول الکرخی لا بأس به ویأتی تمامه.

الجواب صحیح:عبدالرحمٰن عفااللہ عنہ واللہ اعلم بالصواب:انیس طالب کان اللہ لہ

۱۹ صفر ۱۴۳۱ھ فتویٰ نمبر:۲۳۶۶

﴿آتش بازی کے سامان کی خرید وفروخت کا حکم﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام کہ آتش بازی کے سامان کا کاروبار اور اس کا فروخت

کرنا کیسا ہے؟ نیز اس قسم کا کاروبار کرنے والوں کو اپنی دکان کرایہ پر دینے کا کیا حکم ہے؟

جواب آتش بازی کے سامان کا کاروبار اور اس کا فروخت کرنا ناجائز ہے، اس لئے کہ یہ سامان اس بے ہودہ کام کے علاوہ کسی جائز کام میں استعمال نہیں ہوتا اور آتش بازی محض اسراف اور فضول خرچی پر مشتمل کام ہے، قرآن کریم میں فضول خرچی سے ممانعت آئی ہے، چنانچہ سورۃ اسراء ایت ۲۷ میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد مبارک ہے:

ان المبذرین کانوا اخوان الشیاطین و کان الشیطن لربه کفورا......الأیۃ.

ترجمہ: بے شک فضول خرچ لوگ شیطان کے بھائی ہیں اور شیطان رب کا نافرمان ہے، نیز آتش بازی کے سامان میں لوگ خصوصاً نوجوان طبقہ خاصا شغف رکھتا ہے اور نوجوان لڑکے اسکو خرید کر ساری رات پٹاخ چلاتے رہتے ہیں جس سے عام لوگ خصوصاً بزرگ اور کمزور لوگوں کو کافی تکلیف ہوتی ہے تو یہ ایذاء مسلم ہونے کی وجہ سے ناجائز اور حرام ہے، پس اسکا کاروبار اور خرید و فروخت اعانت علی المعصیۃ ہونے کی وجہ سے ناجائز ہوگا۔

اس کے علاوہ بھی ہمارے علم کے مطابق آتش بازی کے سامان کی تجارت اور اس کی خرید و فروخت قانوناً جرم ہے اگرچہ محکمہ پولیس اس بارے میں اپنا فریضہ کما حقہ انجام نہیں دے رہی، پس قانوناً جرم ہونے کی وجہ سے بھی اس کا کاروبار و خرید و فروخت درست نہیں۔

رہا مسئلہ اس قسم کے کاروبار کرنے والوں کو دوکان کرایہ پر دینا تو عام طور پر کوئی شخص مستقل آتش بازی کے سامان کیلئے دوکان نہیں کھولتا بلکہ جنرل اسٹور یا دیگر کسی دوکان میں مخصوص سیزن میں مذکورہ سامان فروخت کرتا ہے، ایسی صورت میں دوکان کرایہ پر دینے میں کوئی مضائقہ نہیں، البتہ اگر صرف آتش بازی کے سامان کا کاروبار اور خرید و فروخت ہو تو ایسی صورت میں ''اعانت علی المعصیۃ'' کی وجہ سے دوکان کرایہ پر دینا مناسب نہیں ہے۔

لما فی قوله تعالیٰ (سورۃ المائدۃ، ایت ۲) ﴿وتعاونوا علی البر والتقوی ولا تعاونوا علی الاثم والعدوان﴾

ولما فی الدر المختار: (۳۹۱/۶، طبع سعید)

قلت: وقدمنا انه معزیا للنهر ان ما قامت المعصیة بعینه یکره بیعه تحریما والافتنزیها.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: عبدالرزاق

۲ رجب المرجب ۱۴۲۹ھ — فتویٰ نمبر: ۱۶۷۴

﴿ذبح کرنے سے پہلے جانور کی کھال بیچنا جائز نہیں ہے﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ہم قربانی کیلئے جانور خریدتے ہیں، ذبح کرنے سے پہلے خریدار اسکی کھال کی قیمت لگا کر بعض یا کل پیسے دیکر چلا جاتا ہے اور ذبح کے بعد آ کر کھال لے جاتا ہے کیا ایسا کرنا شرعاً درست ہے؟　　مستفتی عادل شیر سواتی

﴿جواب﴾ ذبح کرنے سے پہلے خریدار کا جانور کی کھال کی باقاعدہ بیع کرنا جائز نہیں ہے، البتہ وعدہ کے درجہ میں ہو تو اس کی گنجائش ہے، کھال اتارنے کے بعد دوبارہ نیا سودا کرنا ضروری ہے خواہ اسی رقم پر دونوں راضی ہوں یا اس کے علاوہ قیمت مقرر کریں۔

لما فی الهندية: (۱۲۸/۳ طبع رشیدیه)

لا یجوز بیع لبن فی ضرع ولا ولد فی بطن ولا یجوز بیع صوف علی ظهر الغنم فی الروایة المشهورة كذا فی محیط السرخسی...ولو باع الجلد والكرش قبل الذبح لا یجوز فان ذبح بعد ذلک ونزع الجلد والكرش وسلم لا ینقلب العقد جائزا كذا فی الذخیرة.

ولما فی الشامی: (۷۳/۵ طبع سعید)

(قوله وجلد میتة) قیدبها، لانها لو كانت مذبوحة فباع لحمها او جلدها جاز لأنه یطهر بالزكاة الا الخنزیر خانیة.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ　　　واللہ اعلم: حبیب الوہاب

۲۷ جمادی الاولیٰ ۱۴۲۹ھ　　　فتویٰ نمبر: ۵۲۰

﴿معاملہ میں زندہ جانور بطور ادھار ہو تو جائز نہیں ہے﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلے کے بارے میں کہ ہمارے یہاں سردیوں کے موسم میں جب کوئی بڑا جانور مثلاً گائے وغیرہ مرنے لگتا ہے تو اسے ذبح کر کے سات یا آٹھ آدمی اس کو تقسیم کر لیتے ہیں اس شرط پر کہ وہ اس جانور کے مالک کو اسی موسم میں پیدا ہونے والا بھیڑ یا بکری کا بچہ دیں گے کیا یہ معاملہ کرنا درست ہے؟

واضح رہے کہ اس بدلے میں دیئے جانے والے بچے میں اکثر متعاقدین کا نزاع ہوتا ہے؟

﴿جواب﴾ گوشت کے بدلے میں زندہ جانور لینا دینا جائز ہے بشرطیکہ اسی وقت دونوں طرف سے ادائیگی ہو مذکورہ صورت میں بھیڑ یا بکری کا بچہ چونکہ بعد میں وصول ہوگا تو یہ گوشت کے بدلے زندہ جانور کا ادھار معاملہ ہے اس لئے ہرگز جائز نہیں ہے۔

لما فی الدر المختار مع رد المحتار:(۵/۱۷۹،طبع:سعید کراچی)

کما جاز بیع لحم بحیوان ولو من جنسه لانه بیع الموزون بما لیس بموزون فیجوز کیفما کان بشرط التعیین اما نسیئة فلا(قوله اما نسیئة فلا)لانها ان کانت فی الحیوان او فی اللحم کان سلما،وهو فی کل منهما غیر صحیح نهر.

ولما فی البحر:(۶/۱۳۲،طبع:سعید کراچی)

(قوله واللحم بالحیوان)ای صح بیع اللحم بالحیوان عندابی حنیفة وابی یوسف ـــــ وانما لایجوز بیع احدهما بالآخر نسیئة لان المتأخر منهما لایمکن ضبطه لالانهاجنس واحدالاتری انه لایجوز ذلک اذابیع بغیره من خلاف الجنس ایضاً.

ولما فی الفقه الحنفی فی ثوبه الجدید:(۴/۲۲۱،طبع:دار القلم دمشق)

جاز بیع لحم بحیوان ولو من جنسه لانه بیع الموزون بما لیس بموزون فیجوز کیفما کان سواء کان اللحم من جنس ذلک الحیوان او لامساو یالما فی الحیوان اولااما بیعه نسیئة فلاتجوز،لانها ان کانت فی اللحم او فی الحیوان کان سلماًوهو فی کل منهما غیر صحیح .

الجواب صحیح:مفتی عبدالرحمٰن حفظہ اللہ تعالیٰ واللہ اعلم بالصواب:محمد اویس غفرلہ ولوالدیہ

۱۴جمادی الثانیہ۱۴۳۴ھ فتویٰ نمبر:۳۸۰۹

ثمن نقد یا ادھار متعین نہ ہو تو عقد فاسد ہے

سوال جناب مفتی صاحب !ہمارے علاقے میں یہ رواج ہے کہ لوگ ایک چیز نقد پیسوں پر خرید لیتے ہیں پھر تیسرے شخص کو ایک سال کیلئے ادھار دوگنا یا سہ گنا آگے فروخت کر دیتے ہیں تو کیا یہ خریدنا اور فروخت کرنا جائز ہے یا نہیں؟فروخت اسطرح کرتے ہیں کہ اگر تم نقد دو گے تو اصل قیمت پر دونگا اور اگر ادھار کرو گے تو دوگنی یا سہ گنی قیمت لونگا۔مستفتی:سیف الرحمٰن

جواب سوال میں جو صورت ذکر کی گئی ہے اس میں چونکہ معاملہ کو دو صورتوں یعنی نقد یا ادھار کے درمیان دائر کیا ہے،کسی ایک صورت پر فیصلہ نہیں کیا،اس لئے ناجائز ہے،معاملہ کرتے وقت اسی مجلس میں نقد یا ادھار میں سے ایک صورت طے کرلی جائے اور اسکی کل قیمت اور کل مدت اسی وقت طے کرلی جائے اور پھر مقررہ وقت پر ادائیگی نہ ہوسکنے پر مزید کوئی جرمانہ عائد نہ کیا جائے تو یہ جائز ہے۔

لما فی بحوث:(۱/۷،طبع دار العلوم کراچی)

اما الائمة الاربعة وجمهور الفقهاء والمحدثین،فقد أجازوا البیع المؤجل باکثر من سعر النقد،بشرط أن یبت العاقدان بانه بیع مؤجل بأجل معلوم وبثمن متفق علیه عند

العقد، فأما إذا قال البائع: أبيعك نقداً بكذا ونسيئة بكذا أو افترقا على ذلك دون أن يتفقا على تحديد واحد من السعرين، فإن مثل هذا البيع لا يجوز، ولكن إذا عين العاقدان أحد الثمنين في مجلس العقد، فالبيع جائز.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ　　　　واللہ اعلم بالصواب: محمد وارث

۳۱ رجب المرجب ۱۴۲۹ھ　　　　فتویٰ نمبر: ۱۶۲۱

﴿عقد بیع میں دوسرے وقت کی قیمت متعین کرنا﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ زید کے پاس ایسی گندم ہے جو بطور بیج کے استعمال ہوتی ہے وہ عمرو کو کٹائی کے موسم میں اس کی تین بوریاں اس شرط پر فروخت کرتا ہے کہ جب کاشت کا موسم آئے گا تو مارکیٹ میں جو قیمت ایسے گندم کی ہوگی وہ اس وقت ادا کرو گے اور عمرو گندم پر قبضہ بھی کر لیتا ہے تو کیا شرعاً ایسا معاملہ کرنا درست ہے؟

﴿جواب﴾ شریعت میں ایسا معاملہ کرنا درست نہیں ہے کیونکہ اس میں زید اور عمرو کے درمیان کوئی قیمت طے نہیں ہوئی ہے اور جب قیمت مجہول ہو تو شرعاً وہ معاملہ فاسد ہوتا ہے، البتہ زید عمرو کو گندم ہی بطور ادھار دیدے اور جب واپس کرنا چاہیں تو بے شک اس وقت کی قیمت عمرو سے وصول کرے تو یہ قرض کا معاملہ ہے نہ صرف جائز بلکہ اس میں زید کو قرض دینے کا اجر و ثواب بھی ملے گا لیکن اس صورت میں گندم ہی عمرو کے ذمے واجب ہے، ہاں باہمی رضامندی سے اس وقت کی قیمت لینا دینا بھی جائز ہے.

لما في الشامي (۴/۵۵ طبع سعيد)

وأما الثالث وهو شرائط الصحة فخمسة وعشرون منها عامة ومنها خاصة فالعامة لكل بيع شروط الانعقاد المارة لأن ما لا ينعقد لا يصح وعدم التوقيت، ومعلومية المبيع، ومعلومية الثمن بما يرفع المنازعة فلا يصح بيع شاة من هذا القطيع وبيع الشيئ بقيمته أو بحكم فلان.

ولما في الهندية (۳/۱۲۷ مكتبة رشيدية)

وفي الأصل إذا قال أخذت هذا منك بمثل ما يبيع الناس فهو فاسد.

ولما في الفقه الإسلامي وأدلته (۵/۳۲۲۵ مكتبة رشيدية)

ولا يجوز البيع عند الفقهاء بما ينقطع عليه السعر في السوق أو بما يبيع الناس أو بما يقول فلان لجهالة الثمن.

ولما في الدر المختار (۵/۱۶۳ طبع سعيد)

فجاز شراء المستقرض القرض ولو قائماً من المقرض.

(وفی الشامی تحت قوله فجاز شراء المستقرض القرض) تفریع علی قولهما، والمراد شراءه ما فی ذمته لا عین القرض الذی فی یده وحینئذ فقوله ولو قائما فیه استخدام، لأنه عائد الی عین القرض الذی فی یده وبیان ذلک أنه تارة یشتری ما فی ذمته للمقرض وتارة ما فی یده أی عین ما استقرضه فان کان الأول ففی الذخیرة اشتری من المقرض الکر الذی له علیه بمائة دینار جاز لأنه دین علیه لا بعقد صرف ولا سلم فان کان مستهلکا وقت الشراء فالجواز قول الکل لأنه ملکه بالاستهلاک وعلیه مثله فی ذمته بلا خلاف وان کان قائما فکذلک عندهما وعلی قول أبی یوسف ینبغی ان لا یجوز لأنه لا یملکه فلم یجب مثله فی ذمته فاذا اضاف الشراء الی الکر الذی فی ذمته فقد اضافه الی معدوم فلا یجوز.

الجواب صحیح: عبد الرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: صدیق انور

۱۲ ربیع الاول ۱۴۳۳ھ — فتویٰ نمبر ۳۱۷۷

﴿خاص رقبہ میں گندم کی فصل کی بیع صاف گندم کے بدلے میں﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ گندم کی فصل جو کہ ایک خاص رقبہ میں محیط ہو، مقصد اس سے چارہ حاصل کرنا ہو اور اس میں ابھی تک خوشہ بھی نہیں آیا ہے کا خرید نا صاف گندم کی متعین مقدار کے بدلے میں جائز ہے یا نہیں؟ مستفتی: ارشد سعید کوہاٹی

﴿جواب﴾ چونکہ مذکورہ صورت میں گندم کے فصل کی حیثیت گھاس کی ہے لہٰذا صاف گندم اور اسکی جنس ایک نہیں ہوئی اس لئے برابری بھی ضروری نہیں، معاملہ جائز ہے، البتہ فصل کو پکنے تک زمین پر چھوڑنے کی شرط نہیں لگانی چاہیے پھر مالک زمین اگر چھوڑنے پر راضی ہے تو کوئی مسئلہ نہیں ہے اور علاقہ میں اس معاملہ کا رواج اگر عام ہو چکا ہے تو باقاعدہ شرط لگانے سے بھی معاملہ فاسد نہیں ہوگا۔ تاہم اصل حکم کے اعتبار سے چونکہ یہ ناجائز شرط ہے اس لئے احتیاط اسی میں ہے کہ شرط باقاعدہ نہ لگائی جائے۔

لما فی شرح معانی الآثار (۲/۲۱۶، طبع: سعید)

قال رسول الله صلی الله علیه وسلم لا تبایعوا الذهب بالذهب ولا الورق بالورق الا وزنا بوزن ولا التمر بالتمر ولا الحنطة بالحنطة ولا الشعیر بالشعیر ولا الملح بالملح الا سواء عینا بعین فمن زاد او ازداد فقد اربی ولکن بیعوا الذهب بالورق والحنطة بالشعیر والتمر بالملح یدا بید کیف شئتم.

ولما فی البزازیة علی هامش الهندیة (۴/۳۸۴، مکتبه: رشیدیة)

وشراء قصیل الحنطة بالحنطة کیلا أو جزافا یجوز لأن هذا بیع الحشیش بالحنطة فیصح کیفما کان.

ولمافی شرح المجلة(۱۱/۲مکتبۃ رشیدیۃ)

وعلیه فاشتراط ترك الثمار البارزة حتی تنضج وان کان شرطا لایقتضیه العقد ولایلائمه وفیه نفع لأحدالعاقدین لکن حیث جری به العرف الشائع فی بلادنا واستفاض بین الخاص والعام...... فیکون معتبرا.

الجواب صحیح: عبدالرحمن عفااللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: صدیق انور

۱۵رجب المرجب ۱۴۳۳ھ — فتوی نمبر: ۳۳۵۱

﴿قبل الدباغۃ مردار جانور کی کھال فروخت کرنے کا حکم﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے متعلق کہ ایک آدمی کی بھینس مرگئی تو اس نے عیسائیوں کو بلاکر بھینس سے چمڑا اتروایا پھر اس کھال کو دو ہزار روپیہ میں مالک بھینس نے انہی عیسائیوں کے ہاتھ فروخت کردیا، اب ان پیسوں کا کیا حکم ہے؟ مستفتی محمد شفیع ضلع قصور

﴿جواب﴾ اگر کھال دباغت کے بغیر فروخت کی گئی ہے اور ابھی تک یہی کھال اس عیسائی کے پاس موجود ہے تو اس معاملہ کو منسوخ کر کے کھال واپس لے لے اور رقم اس کے حوالے کردے کیونکہ مردار کی کھال کی دباغت سے پہلے اسکی خرید و فروخت جائز نہیں ہے لیکن اگر کسی وجہ سے اس سودا کو منسوخ کرنا ممکن نہ رہا ہو۔

مثلاً عیسائی نے یہ کھال آگے فروخت کردی ہو یا اس کا کچھ بنالیا ہو تو ایسی صورت میں اس رقم کا صدقہ کرنا واجب ہے اور اگر دباغت کے بعد کھال فروخت کی گئی ہے تو یہ پیسے حلال ہیں۔

لمافی مجمع الانهر:(۸۱/۳طبع المنار کوئٹه)

(لا)یجوز(بیع جلودالمیتة قبل الدباغ)لانهاغیر منتفع بهاولیست بمال لنجاستهافیبطل.

ولمافی الهندیة:(۱۱۵/۳،طبع رشیدیه)اهل الکفر اذاباعوالمیتة فیمابینهم لایجوز.

الجواب صحیح: عبدالرحمن عفااللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: محمد وارث خان

۱۳رجب المرجب ۱۴۲۹ھ — فتوی نمبر: ۱۷۱۲

﴿کریڈٹ کارڈ کا استعمال جائز نہیں﴾

﴿سوال﴾(۱) میرے پاس ایک کریڈیٹ کارڈ citi bank کا ہے جس سے میں نے دو تین چیزیں قسطوں پر لی تھیں، اسکے بارے میں علماء کرام کیا کہتے ہیں کیونکہ جب ہم کوئی

چیز قسطوں پر لیتے ہیں تو بینک والے اس کی اضافی رقم لگاتے ہیں اور اسکی قسطیں کرتے ہیں اسکے بارے میں بتائیں؟

(۲) دوسری بات جب ہم کریڈٹ کارڈ استعمال کرتے ہیں تو اس پر ہمیں پچاس ۵۰ روپے پر ایک پوائنٹ ملتا ہے تو میں پچھلے آٹھ سال سے کارڈ استعمال کر رہا ہوں تو میرے پاس ۱۱۰۰۰/ پوائنٹ جمع ہو گئے تھے، تو میں نے ایک ہاتھ کی گھڑی منگوالی، اسکے بارے میں بتائیں کہ میرے لئے اسکا استعمال جائز ہے یا نہیں؟

(۳) اگر صحیح نہیں تو میں اس گھڑی کا کیا کروں اور اسکے علاوہ اس گھڑی کو میں نے پہن کر حج بھی کیا اگر یہ گھڑی صحیح نہیں تو میرے حج پر اسکا کیا اثر پڑا تحریر فرمائیں؟

(۴) میرے پاس ایک اور کریڈٹ کارڈ ہے جس پر میں نے اپنے آفس کے سامان کا انشورنس کیا ہوا ہے، وہ بھی بینک کے توسط سے ہے، اسکے بارے میں بتائیں کہ فی زمانہ حالات کی نزاکت کو دیکھتے ہوئے میں نے ۵۰۰۰۰۰/ لاکھ روپے کی انشورنس کروائی تھی، آپ بتائیں کہ گودام یا آفس کی انشورنس کروانا جائز ہے یا نہیں؟ مستفتی: محمود احمد

﴿جواب﴾ (۱) بینک سے کریڈٹ کارڈ بنیادی طور پر سودی عقد کے ذریعے ہی حاصل ہوتا ہے، اس لئے اس کا حاصل کرنا، استعمال کرنا جائز نہیں ہے اور بعض لوگ جو کہتے ہیں کہ وقت پر بینک کو پیسہ ادا کرنے کی صورت میں سود نہیں دینا پڑتا، لہٰذا اس کا کوئی اہتمام اگر کرے گا تو اسکے لئے جائز ہے، یہ دراصل سودی معاملات میں تسامح (چشم پوشی) ہے، اس لئے کہ عملی طور پر سود لینا دینا جس طرح حرام ہے، اسی طرح اس کا معاملہ کرنا اور کسی درجہ میں سود دینے پر رضا مندی کا اظہار کرنا بلکہ تسلیم کرنا قطعاً حرام ہے۔ (۲-۳) گھڑی کسی غریب کو دیدیں حج آپ کا صحیح ہے۔ (۴) انشورنس ذات کی ہو یا آفس کی شرعاً اسکی کوئی گنجائش نہیں ہے، حالات کی نزاکت کو دیکھ کر اللہ تعالیٰ کے تقدیری فیصلوں کا مقابلہ کوئی انشورنس سے نہیں کرسکتا، انشورنس جوا، سود پر مشتمل ہے، اس کے علاوہ توکل اور رضا بالقضا سے فرار کا ناکام راستہ اختیار کرنا ہے۔

لمافی قوله تعالیٰ: (سورة البقرة، آیت ۲۷۵) واحل الله البیع وحرم الربا ..... الآیة.

ولمافی الشامی: (۳۸۵/۶ طبع سعید)

لأن سبیل الکسب الخبیث التصدق اذا تعذر الرد علی صاحبه.

ولما فی قوله تعالیٰ:(سورة المائدة،آیت ۹۰)

﴿انما الخمر والمیسر والانصاب والازلام رجس من عمل الشیطان فاجتنبوه لعلکم تفلحون﴾

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفااللہ عنہ　　واللہ اعلم بالصواب: محمد طیب حسن زئی

۱۶ ربیع الاول ۱۴۳۰ھ　　فتویٰ نمبر: ۲۰۲۵

﴿کریڈٹ کارڈ کا شرعی حکم﴾

﴿سوال﴾ میں کاروباری شخص ہوں بیکری چلاتا ہوں میرا چھوٹا بھائی بھی میرے ساتھ ہے وہ کہتا ہے کہ میں کریڈٹ کارڈ سے خریداری کیا کروں مگر میرا دل نہیں مانتا کیونکہ یہ سارا سودی لین دین ہے وہ کہتا ہے میں اپنا کریڈٹ کارڈ استعمال کیا کروں گا آپ مجھے پیسے بعد میں دے دیا کریں، میری راہنمائی فرمائیں یہ طریقہ درست ہے جبکہ میرا دل نہیں مانتا ہے اور ہم دکان پر کریڈٹ کارڈ مشین بھی لگوانا چاہتے ہیں جس میں ایک پرسنٹ ہمارا بھی کٹے گا۔

﴿جواب﴾ بینک سے کریڈٹ کارڈ وصول کرتے وقت معاہدہ پر دستخط لئے جاتے ہیں اس میں باقاعدہ سود دینے کا معاہدہ ہوتا ہے، اس لئے کارڈ کا وصول کرنا ناجائز اور حرام ہے۔

لما فی قوله تعالیٰ:(سورة البقرة،آیت ۲۷۵) احل الله البیع وحرم الربوا الآیة

ولما فی المظهری:(۳۹۹/۱،طبع رشیدیه)

الربوا فی اللغة الزیادة: قال الله تعالیٰ ویربی الصدقات والمعنی ان الله تعالیٰ حرم الزیادة فی القرض علی القدر المدفوع والزیادة فی البیع (احد البدلین

ولما فی المشکوٰة:(۲۴۴/۲،طبع سعید)

عن جابرؓ قال لعن رسول الله ﷺ آکل الربوا وموکله وکاتبه وشاهدیه وقال هم سواء

ولما فی الهدایة:(۸۵/۳،طبع رحمانیه)

وماسواه ممافیه الربوا یعتبر فیه التعیین ولا یعتبر فیه التقابض

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفااللہ عنہ　　واللہ اعلم بالصواب: بلال احمد وادہ [illegible]

۱۴۲۹ھ　　فتویٰ نمبر:

﴿کنوینشنل بنکوں سے قسطوں پر گاڑی نکلوانے کا حکم﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں مفتیان کرام اس مسئلے کے بارے میں کہ کنوینشنل بینکوں سے قسطوں پر گاڑی نکلوانا اس طور پر کہ میں کوئی قسط ضائع نہیں ہونے دونگا ورنہ بینک مجھ سے مزید

منافع لیگا جو سود ہوتا ہے، کیا یہ صحیح ہے؟

نیز کیا کنوینشل بینکوں کے کرنٹ اکاؤنٹ میں رقم جمع کرانا صحیح ہے یا نہیں؟ جبکہ بنک ہماری رقوم سے سود کماتے رہتے ہیں اور اگر بجلی کے بل کی ادائیگی کی تاریخ گذر جائے تو سرچارج لگا کر جمع کرنے سے ہم گنہگار تو نہیں ہونگے؟

﴿جواب﴾ کنوینشل بینکوں سے مذکورہ معاملے کے طور پر گاڑی نکلوانا جائز نہیں کیونکہ معاملہ کی دستاویزات میں یہ بات واضح ہوتی ہے کہ قسط کو مؤخر کرنے کی صورت میں زائد رقم دینا ہوگی تو یہ سودی معاملہ ہے اس طرح معاملہ کرنا ہی غلط ہے، لہٰذا اس معاملے کے تحت آپ گاڑی نہ نکلوائیں، نیز کنوینشل بینکوں کے کرنٹ اکاؤنٹ میں رقم جمع کرانا جائز ہے اور مناسب یہ ہے کہ آپ مقررہ وقت پر بجلی کا بل جمع کرادیں تاکہ سرچارج سے بچ جائیں، البتہ سرچارج کے ساتھ بل جمع کرانے سے آپ گنہگار نہیں ہونگے۔

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: محمد ضیاء الدین

۱۷ ربیع الثانی ۱۴۲۸ھ — فتویٰ نمبر: ۷۸۵

﴿جنرل پراویڈنٹ فنڈ کا مسئلہ﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام کہ سرکاری ملازم کی تنخواہ میں سے حکومت ہر ماہ (جی-پی) فنڈ کے نام پر کچھ رقم کاٹتی ہے جس پر ہر سال اضافہ لگتا ہے، جسے گورنمنٹ پرافٹ کا نام دیتی ہے، میں نے مفتی شفیع صاحب کا اس کے متعلق رسالہ پڑھا تھا کہ یہ اضافہ سود نہیں ہے بلکہ ملازم کو ملازمت کے آخر میں ساری رقم بمع پرافٹ کے دی جاتی ہے یہ سود نہیں ہے بلکہ جائز ہے، یہ فتویٰ آپ کی نظروں سے لازمی گذرا ہوگا۔

اس میں وضاحت طلب بات مزید یہ ہے کہ اب ہمارے سرکاری محکمے میں یہ گنجائش دی گئی ہے کہ کوئی شخص اپنی اس کٹوتی پر پرافٹ نہ لینا چاہے تو فارم پر لکھ کر بھیج دے، اسکی رقم تو کاٹی جائے گی لیکن سال کے بعد منافع نہیں ملے گا اور ملازمت کے آخر میں ساری رقم اتنی ہی اسکو دیدی جائے گی، اب اس صورت میں کوئی آدمی فارم پر نہ کرے تو اسکی رقم پر اسی طرح سال بعد پرافٹ لگتا ہے اور ملازمت کے آخر میں اسکو ساری رقم اضافے کے ساتھ مل جائے گی، ہماری رہنمائی

فرمائیں اگر یہ لینا سود ہے تو اب تک ۱۵ سالوں میں جو رقم ہماری کٹ چکی ہے اسکا کیا کیا جائے؟

﴿جواب﴾ صورت مسئولہ میں سرکاری ادارے نے جب آپ کو اختیار دیدیا ہے تو احتیاط اسی میں ہے کہ فارم پر کر کے دیدیا جائے اور نفع نہ لیا جائے تاہم فارم پر نہ کرنے کی صورت میں اضافی رقم لینے کی بھی گنجائش ہے، اس لئے کہ سودی معاملہ تو محکمہ والوں نے بینک سے کیا ہے، ملازم کا اس سے کوئی واسطہ نہیں ہے، رقم کی نسبت اگرچہ ملازم کی طرف ہوتی ہے لیکن اسکے قبضے میں آنے سے پہلے شرعاً وہ اس رقم کا مالک قرار نہیں پا رہا، اس لئے ملازم کے حق میں اس اضافی رقم کا حکم سود کا نہیں ہے۔

لیکن یہ حکم اس صورت میں ہے اگر ملازم اپنے ہی محکمے سے وہ پوری رقم وصول کرے اور اگر ملازم کو یہ رقم براہ راست بینک سے وصول کرنا پڑتی ہے تو اس صورت میں اضافی رقم وصول کرنے کی گنجائش نہیں ہے اگر غلطی سے وصول کر لی ہو تو اسکا صدقہ کرنا واجب ہے۔

لما فی البحر الرائق:(۷/۳۰۰،طبع سعید)

(قوله بل بالتعجيل أو بشرطه أو بالاستيفاء أو بالتمكن)يعني لايملك الأجرة الابواحد من هذه الاربعة والمراد أنه لايستحقها المؤجر الابذلك كما اشار اليه القدوري في مختصره لأنها لو كانت دينا لايقال أنه ملكه المؤجر قبل قبضه......لكن ليس له بيعها قبل قبضها.

ولما فی الهداية:(۳/۸۲،طبع رحمانيه)

لأن الربوا هو الفضل المستحق لأحد المتعاقدين في المعاوضة الخالي عن عوض شرط فيه.

(پراویڈنٹ فنڈ پر زکوٰۃ اور سود کا مسئلہ ص ۱۹ از مفتی محمد شفیعؒ)

الجواب صحیح: عبد الرحمٰن عفا اللہ عنہ | واللہ اعلم بالصواب: شاہد محمود عفا اللہ عنہ

۵ جمادی الثانی ۱۴۲۹ھ | فتویٰ نمبر: ۱۵۲۲

﴿Life Insurance (بیمہ زندگی) کرانا جائز نہیں ہے﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں مفتیان عظام کہ ملازمت اختیار کرنے کے بعد کمپنی نے اپنے قانون کے مطابق بیس (20) سال کے لئے میرا Life Insurance (بیمہ زندگی) کرائی تھی اور جب یہ عرصہ گذرا تو میں نے مزید کچھ عرصہ کیلئے یہ معاملہ جاری رکھا، بیس سال (20) گذرنے کے بعد اب تک میں نے پچھتر ہزار (75,000) روپے جمع کئے ہیں، اب

کمپنی مجھے تین لاکھ (300000) روپے دے رہی ہے تو کیا میرے لئے یہ تین لاکھ (300000) روپے لینا جائز ہے یا نہیں؟ مستفتی: مقتدی ابوبکر صدیق مسجد ڈیفنس فیز 2

﴿جواب﴾ انشورنس سود، جوے اور غرر پر مشتمل معاملہ ہے، شرعاً حرام ہے، شروع میں کمپنی والوں نے اگر چہ آپ کی اجازت کے بغیر انشورنس کرایا تھا لیکن بعد میں آپ نے اس حرام معاملہ کو اپنے اختیار سے جاری رکھا، اس لئے اس پر توبہ واستغفار کریں اور آئندہ ایسے حرام کاموں سے دور رہنے کا عزم کریں اور اب تک آپ کی رقم انشورنس کمپنی میں جتنی جمع ہوئی ہے، صرف وہی اصل رقم لینا جائز ہے اضافی رقم سود ہے جس کا لینا حرام ہے اگر غلطی سے لی ہو تو ثواب کی نیت کے بغیر صدقہ کرنا واجب ہے۔

لما فی قوله تعالی: (سورۃ البقرۃ آیت ۲۷۸)

یا ایها الذین آمنوا اتقوا الله وذروا ما بقی من الربا ان کنتم مومنین، فان لم تفعلوا فاذنوا بحرب من الله ورسوله...... الآیة.

ولما فی قوله تعالی: (سورۃ المائدۃ آیت ۹۰)

یا ایها الذین آمنوا انما الخمر والمیسر والانصاب والازلام رجس من عمل الشیطان فاجتنبوه لعلکم تفلحون...... الآیة.

ولما فی الصحیح لمسلم: (۲/۲، کتاب البیوع طبع قدیمی کراچی)

عن أبی هریرة قال: نهی رسول الله صلی الله علیه وسلم عن بیع الحصاة وعن بیع الغرر.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: صادق محمد سواتی غفرلہ ولوالدیہ

۲۹ ربیع الاول ۱۴۳۲ھ — فتویٰ نمبر: ۳۰۹۱

﴿ڈی ایس پی فنڈ کا شرعی حکم﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان دین اس مسئلہ کے بارے میں کہ میں پی-اے-ایف میں ملازم ہوں، محکمہ کی طرف سے ہمیں اختتام ملازمت پر ڈی-ایس-پی فنڈ ملتا ہے جس کا طریقہ یہ ہے کہ ہر مہینہ ہماری تنخواہ سے پچیس روپے جبراً کاٹ لئے جاتے ہیں، اس پر ہم کو بارہ فیصد منافع ملتا ہے، اس طرح آنے والے مہینوں کی کٹوتیاں پچھلے مہینوں کی تمام کٹوتیوں سے ملا کر مجموعہ پر بارہ فیصد ملتا ہے۔

اگر کوئی ملازم اپنی رضا سے پچیس روپے پر زیادہ رقم اپنی تنخواہ سے کٹوانا چاہے تو اتنی ہی رقم پر

اس کو بارہ فیصد منافع ملتا ہے، پوچھنا یہ ہے کہ دونوں صورتوں میں ملنے والا بارہ فیصد منافع سود میں شمار ہے یا نہیں؟

مستفتی: [illegible] شاہ ولی مروت

﴿جواب﴾ ملازم کو تنخواہ کی رقم موصول ہونے کے بعد اسکی ملکیت میں داخل ہوتی ہے ملازم کے قبضہ میں آنے سے پہلے محکمہ والے جو بھی تصرف اس میں کریں یہ انکی ذاتی رقم میں تصرف شمار ہوتا ہے، لہذا جبراً کٹوتی کی صورت میں محکمہ والے اگر سود پر یہ رقم دیتے ہیں تو سودی معاملہ کا گناہ بھی انہی کو ہوتا ہے ملازم کا اس معاملہ سے کوئی تعلق نہیں ہے لہذا ریٹائرمنٹ کی صورت میں ملازم کو اصل رقم کے ساتھ سودی رقم بھی اگر ملتی ہے تو اس کے لئے یہ سود نہیں ہے اس لئے کہ محکمہ والوں نے اپنی رقم سے سودی معاملہ کرکے سود لیکر ملازم کو اصل رقم کے ساتھ شامل کرکے دیا ہے، ملازم کے کسی قول یا فعل کا اس میں کوئی دخل نہیں ہے۔

البتہ کوشش یہ ہو کہ ملازم براہ راست خود سودی ادارہ سے وصول نہ کرے بلکہ محکمہ سے ہی وصول کرے لیکن جبری کٹوتی کے علاوہ مزید رقم اپنی مرضی سے کوئی ملازم اگر شامل کرے اور اس پر سود لینے کا مطالبہ کرے گا تو یہ سودی صورت ہوگی جس سے بچنا ضروری ہے۔

لمافی تنویر الابصار:(۵/۱۶۸ طبع سعید)

(فضل خال عن عوض بمعیار شرعی مشروط لاحد المتعاقدین فی المعاوضة)

ولمافی البحر الرائق:(۶/۱۲۲ طبع سعید)

وھو ان یکون الفضل الخالی مشروطا فی العقد لاحد المتعاقدین

ولمافی فتح القدیر:(۷/۷ طبع رشیدیہ)

لان الربا ھو الفضل المستحق لاحد المتعاقدین فی المعاوضة الخالی عن عوض شرط فیہ

ولمافی بدائع الصنائع:(۵/۱۹۳ طبع سعید)

ومنہا ان لا یکون البدلان ملکا لاحد المتبایعین فان کان لا یجری الربا

ولمافی کتاب الاختیار لتعلیل المختار:(۲/۳۰ طبع قدیمی)

وروی الحارث فی مسندہ قال رسول اللہ: کل قرض جر منفعة فہو ربا

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ

واللہ اعلم بالصواب: حسن شاہ ولی مروت

۲۶ محرم الحرام ۱۴۳۰ھ

فتویٰ نمبر: ۱۹۶۹

﴿غیر اختیاری طور پر کرائی گئی انشورنس کی رقم کا حکم﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ہمارے والد صاحب

مرحوم فوج میں ملازم تھے، کمپنی نے انکی رضامندی کے بغیر اپنے قانون کے مطابق انکا لائف انشورنس (بیمہ زندگی) کرائی تھی، اب والد صاحب کے انتقال کے بعد کمپنی انکے لائف انشورنس کی رقم ہمیں دے رہی ہے تو آیا ہمارے لئے یہ رقم لینا جائز ہے یا نہیں؟

واضح رہے کہ انشورنس کی رقم والد صاحب کی (Besec selewry) یعنی اصل تنخواہ سے نہیں بلکہ (medical allowance) میڈیکل الاؤنس وغیرہ سے کاٹی جاتی تھی، نیز جس کمپنی میں والد صاحب کام کرتے تھے وہ خود وصول کر کے ادا کرے گی۔

﴿جواب﴾ صورت مسئولہ میں اس انشورنس کی رقم کے جائز یا ناجائز ہونے میں یہ تفصیل ہے کہ اگر واقعۃً انشورنس کی رقم ادارہ اپنے خزانے میں شامل کر کے مرحوم ملازم کے پسماندگان کو دیگا تو اس کو لینا جائز ہے، اس لئے کہ انشورنس والا معاملہ ادارہ نے کیا ہے، ملازم کا اس سے کوئی واسطہ نہیں ہے رقم کی نسبت اگرچہ ملازم کی طرف ہوتی ہے لیکن اس کے قبضے میں آنے سے پہلے شرعاً وہ اس رقم کا مالک قرار نہیں پا رہا، اس لئے ملازم کے حق میں اس اضافی رقم کا حکم سود کا نہیں ہے لیکن اگر انشورنس کی یہ رقم براہ راست انشورنس کمپنی سے وصول کرنی پڑتی ہے تو اس صورت میں اتنی رقم وصول کرنا جائز ہے، جتنی رقم ادارہ نے پریمیم کے طور پر انشورنس کمپنی کو ادا کی تھی اس سے زائد لینا جائز نہیں ہے اگر غلطی سے لے لی ہے تو اس زائد رقم کو صدقہ کرنا واجب ہے، واضح رہے کہ انشورنس کی یہ رقم ادارہ مرحوم ملازم کے پسماندگان میں جس کو متعین کر کے دیگا وہ اس کا مالک ہوگا یہ رقم مرحوم کے ترکہ میں شامل نہیں ہوگی۔

لما فی البحر: (۷/۲۰۰ طبع سعید)

(قوله بل بالتعجيل أو بشرطه أو بالاستيفاء أو بالتمكن) يعني لا يملك الأجرة الا بواحد من هذه الاربعة والمراد انه لا يستحقها المؤجر الا بذالك كما اشار اليه القدوري في مختصره لانها لو كانت دينا لا يقال انه ملكه المؤجر قبل قبضه. اهـ.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ واللہ اعلم بالصواب: خلیل اللہ

۱۳ جمادی الثانی ۱۴۲۹ھ فتویٰ نمبر: ۱۵۶۲

﴿جبری بیمہ کرانے کی ایک صورت﴾

﴿سوال﴾ ٹریول ایجنسی کسی شخص کی رضامندی کے بغیر اپنے قانون کے تحت انشورنس

کرالیتی ہے، پوچھنا یہ ہے کہ اس شخص کے لئے مذکورہ انشورنس کی رقم لینا جائز ہے یا نہیں؟

﴿جواب﴾ مذکورہ انشورنس کی رقم ادارہ اگر اپنے خزانے میں شامل کر کے دے رہا ہے تو اس کا لینا جائز ہے، البتہ اگر انشورنس کی رقم براہ راست انشورنس کمپنی سے وصول کرنی پڑتی ہے تو اس صورت میں اتنی رقم وصول کرنا جائز ہے، جتنی رقم ادارہ نے انشورنس کمپنی کو فراہم کی تھی، اس سے زائد رقم لینا جائز نہیں اگر غلطی سے لے لی ہے تو اس زائد رقم کو صدقہ کرنا واجب ہے۔

واللہ اعلم بالصواب: ظہور احمد شمس — الجواب صحیح: عبدالرحمن عفا اللہ عنہ

فتویٰ نمبر: ۱۵۱۱ — ۵ جمادی الثانی ۱۴۲۹ھ

﴿دین مؤجل کا کچھ حصہ اجل کے عوض معاف کرنا جائز نہیں ہے﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام کہ زید نے عمرو سے ڈیڑھ لاکھ روپے کی ایک گاڑی خریدی اور اس میں سے پچاس ہزار روپے فی الفور ادا کر دئے اور باقی ایک لاکھ روپے قسطوں کے ذریعہ ادا کریگا، اور اس کیلئے چھ ماہ کی مدت مقرر کی گئی لیکن مدت مقررہ سے پہلے عمرو کو پیسوں کی ضرورت پڑی تو اس نے زید سے کہا کہ تم ابھی مجھے اسی ہزار روپے ادا کر دو باقی بیس ہزار روپے میں تمہیں معاف کرتا ہوں اس معاملہ کا شرعاً کیا حکم ہے؟ مستفتی: [illegible]

﴿جواب﴾ مذکورہ صورت میں قرض خواہ مدیون سے وقت مقررہ کے بدلے کچھ رقم ساقط کر رہا ہے اور یہ دراصل وقت مقررہ کا معاوضہ ہے جس کو شریعت نے حرام قرار دیا ہے، اس لئے یہ معاملہ جائز نہیں ہے۔

لما فی التنویر مع الدر: (۶۲۰/۵ طبع سعید)

(أو عن ألف مؤجل علىٰ نصفه حالا)..... (أو عن الف سود علىٰ نصفه بيضا) والاصل أن الاحسان ان وجد من الدائن فاسقاط وان منهما فمعاوضة.

وفی الشامية: قوله (حالا) لانه اعتياض عن الاجل وهو حرام... قوله: (فمعاوضة) اى ويجرى فيه حكمها فان تحقق الربا أو شبهته فسدت والا صحت قال ط: بأن صالح على شيئ هو أدون من حقه قدرا أو وصفا أو وقتا وان منهما: اى من الدائن والمدين بان دخل فى الصلح ما لا يستحقه من الدائن من وصف كالبيض بدل السود أو ما هو فى معنى الوصف كتعجيل المؤجل او عن جنس بخلاف جنسه اھ.

ولما فی الهداية: (۲۵۶/۳ طبع رحمانیہ)

ولو كانت له الف مؤجلة فصالحه علىٰ خمسمائة حالة لم يجز لان المعجل خير من

المؤجل وهو غير مستحق بالعقد فيكون بإزاء ما حطه عنه وذالك اعتياض عن الاجل وهو حرام.اه كذا في العناية:(۱۶۹/۷)

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: محمد حسن غفرلہ

۲ جمادی الثانی ۱۴۲۹ھ — فتویٰ نمبر: ۱۵۳۶

﴿قسطوں پر خریدی ہوئی چیز کو قسطوں کی مکمل ادائیگی سے پہلے فروخت کرنا﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ اگر کوئی شخص قسطوں پر کوئی چیز خریدے مثلاً موٹر سائیکل یا کار وغیرہ پھر قسطوں کی مکمل ادائیگی سے پہلے پہلے اسے دوسرے شخص کے ہاتھ فروخت کردے، پوچھنا یہ ہے کہ قسطوں کی مکمل ادائیگی سے پہلے اس چیز کو فروخت کرنا درست ہے یا نہیں؟ مستفتی: عبدالحنان حیدرآباد

﴿جواب﴾ قسطوں پر کوئی چیز خریدنے سے خریدار اس کا مالک ہوجاتا ہے اور ہر شخص کو اپنی مملوکہ چیز میں ہر طرح کے جائز تصرف کا حق حاصل ہے، لہٰذا خریدار چاہے تو تمام قسطوں کی ادائیگی سے پہلے بھی دوسرے کو فروخت کرسکتا ہے، البتہ باقی ماندہ قسطوں کی ادائیگی کی ذمہ داری اسی اول خریدار پر ہے۔

لما في الشامي:(۵۰۲/۴، طبع ایچ ایم سعید)

(قوله وهما ركنه)ظاهره ان الضمير للايجاب والقبول.

ولما في الشامي:(۵۰۵/۴ طبع سعيد) واما الثاني وهو شرائط النفاذ فاثنان: الملك والولاية.

ولما في الهداية:(۲۰/۳، طبع رحمانيه)

واذا حصل الايجاب والقبول لزم البيع ولا خيار لواحد منهما الا من عيب او عدم رؤية.

ولما في الهداية:(۷۸/۳، طبع رحمانيه)

ومن اشترى شيئا مما ينقل ويحول لم يجز له بيعه حتى يقبضه لانه نهى عن بيع مالم يقبض ولان فيه غرر انفساخ العقد على اعتبار الهلاك.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: عدنان خدا بخش

۲۶ ربیع الاول ۱۴۳۱ھ — فتویٰ نمبر: ۲۵۵۷

﴿گوبر کی خرید وفروخت جائز ہے﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ زمیندار لوگ فصل کیلئے

بطور کھاد جانوروں کا فضلہ استعمال کرتے ہیں جس سے فصل اچھی ہوتی ہے، چنانچہ زمیندار اس کو باقاعدہ خریدتے ہیں، کیا فضلہ حیوانی کی خرید وفروخت جائز ہے یا نہیں؟ مستفتی: محمد اقبال مانکی

﴿جواب﴾ فقہاء کرام نے لکھا ہے کہ جانوروں کے فضلہ یعنی گوبر کی خرید وفروخت جائز ہے کیونکہ یہ ایسی چیز ہے جس سے نفع حاصل کیا جاسکتا ہے۔

لما فی البحر الرائق: (۱۹۹/۸ طبع سعید)

کرہ بیع العذرۃ لا السرقین لان المسلمین یتمولون السرقین وانتفعوا بہ فی سائر البلاد والامصار من غیر نکیر فانھم یلقونہ فی الاراضی لاستکثار الریع.

ولما فی التنویر مع الدر: (۳۸۵/۶ طبع سعید)

(کرہ بیع العذرۃ) رجیع الآدمی (خالصۃ لا) یکرہ بل یصح بیع (السرقین) ای الزبل.

ولما فی الشامی: (۵۸/۵ طبع سعید) یجوز بیع السرقین والبعر والانتفاع بہ والوقود بہ.

الجواب صحیح: عبد الرحمٰن عفا اللہ عنہ واللہ اعلم بالصواب: عقیل احمد حقانی عفی عنہ

۵ ربیع الثانی ۱۴۳۱ھ فتویٰ نمبر: ۲۵۷۳

﴿قیمت کے تعین کے بغیر بیع درست نہیں ہوتی﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ میں نے اپنے ایک دوست کو موٹر سائیکل بیچی اور اس کو کہا دو ماہ بعد اسکی جو قیمت ہوگی وہ ادا کر دینا، کیا اس طرح کا معاملہ کرنا درست ہے یا نہیں؟ مستفتی: سمیع اللہ کوٹ

﴿جواب﴾ بیع کے صحیح ہونے کیلئے ضروری ہیکہ مبیع کی قیمت معلوم ہو، مذکورہ صورت میں مبیع کی قیمت معلوم نہیں ہے بلکہ مجہول ہے اسلئے مذکورہ بیع درست نہیں ہے، البتہ معاملہ کے وقت اگر قیمت کو متعین کرلیا جائے اور ادائیگی کو باہمی رضامندی سے معین مدت تک مؤخر کرلیا جائے تو پھر یہ معاملہ درست ہوگا۔

لما فی التنویر مع الدر: (۵۲۹/۴ طبع ایچ ایم سعید) (وشرط لصحتہ معرفۃ قدر) مبیع وثمن

ولما فی الشامی: (۵۳۶/۴ مطلب یعتبر الثمن فی مکان العقد وزمنہ طبع سعید)

وکما یعتبر مکان العقد یعتبر زمنہ ایضاً کما یفھم مما قدمناہ فی مسئلۃ الکساد والرخص فلا یعتبر زمن الایفاء: لان القیمۃ فیہ مجھولۃ وقت العقد وفی البحر عن شرح المجمع لو باعہ الی اجل معین وشرط ان یعطیہ المشتری ای نقد یروج یومئذ کان البیع فاسداً.

ولما فی الھندیۃ: (۳/۳ طبع رشیدیہ)

واما شرائط الصحۃ..... ومنھا ان یکون المبیع معلوماً والثمن معلوماً علماً یمنع من المنازعۃ

فبیع المجهول جهالة تفضی الیها غیر صحیح کبیع شاة من هذا القطیع وبیع شئ بقیمته.

ولمافی الهداية:(۲/ ۲۱،طبع رحمانیه) ویجوز البیع بثمن حال ومؤجل اذاکان الاجل معلوما.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ واللہ اعلم بالصواب: عدنان خدا بخش

۷ جمادی الثانی ۱۴۳۱ھ فتویٰ نمبر: ۲۶۸۹

﴿گاہک کے مطالبے پر منگوائی ہوئی چیز پر نفع لینا جائز ہے﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام ان مسائل کے بارے میں کہ (۱) میرا جنرل اسٹور ہے جسمیں نقد اور ادھار ہر قسم کی خرید وفروخت ہوتی ہے، ہوتا اس طرح ہے کہ جن لوگوں کو ہم ادھار پر کوئی چیز فروخت کرتے ہیں ان سے جو نفع ہم لیتے ہیں، اس کی شرح اس نفع سے ذرا بڑھی ہوتی ہے جو نفع ہم نقد خریدنے والوں سے لیتے ہیں، ایسا کرنا شرع میں جائز ہے یا نہیں؟

(۲) بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ گاہک کی مطلوبہ چیز ہمارے پاس بروقت موجود نہیں ہوتی اس لئے ہم ان سے کہدیتے ہیں کہ بعد میں آجانا ہم منگوا کر دیدینگے منگوانے کے بعد ہم اپنا نفع لیکر وہ چیز اس گاہک کو دیدیتے ہیں، پوچھنا یہ ہے کہ گاہک کے مطالبے پر جو چیز ہم نے منگوائی ہے اس پر ہمارا نفع لیکر بیچنا جائز ہے یا اسی قیمت پر گاہک کو دیں جس پر ہمیں ملی ہے؟

﴿جواب﴾ (۱) شرعاً ادھار معاملہ جائز ہے اور ادھار کی وجہ سے نفع کی شرح زیادہ مقرر کر لینا بھی جائز ہے بشرطیکہ معاملہ کے شروع میں اس چیز کی ایک خاص قیمت طے ہوجائے اور ادائیگی کی تاریخ بھی واضح ہوجائے اور ادائیگی میں تاخیر کی وجہ سے مقرر قیمت سے اضافے کا مطالبہ بھی ہرگز نہ ہو۔

لمافی الهندية:(۳/ ۷۸،طبع رشیدیه) الایری انه یزاد فی الثمن لاجل الاجل.

ولمافی فقه السنة:(۳/ ۱۲۵،طبع دار الکتب)

واذاکان الثمن مؤجلا وزاد البائع فیه من اجل التاجیل جاز لان للاجل حصة من الثمن والی هذا ذهب الاحناف والشافعیة وجمهور الفقهاء.

ولمافی مرقاة المفاتیح:(۶/ ۷۸،طبع رشیدیه)

عن ابی هریرة قال نهی رسول الله صلی الله علیه وسلم عن بیعتین فی بیعة..... فسروا البیعتین فی بیعة علی وجهین احدهما ان یقول:بعتک هذا الثوب بعشرة نقدا او بعشرین نسیئة الی شهر فهو فاسد عند اکثر اهل العلم لانه لایدری ایهما جعل الثمن.

ولمافی الهندية:(۳/ ۱۳۶،طبع رشیدیه)

رجل باع علی انه بالنقد بکذا وبالنسیئة بکذا او الی شهر بکذا والی شهرین بکذا لم یجز.

(۲) دوکاندار سے گاہک کوئی ایسی چیز منگوائے جو دکان سے متعلق ہو تو یہ عموماً توکیل کی صورت نہیں ہوتی، چنانچہ گاہک کو لینے نہ لینے کا اختیار رہتا ہے، اس لئے دوکاندار کے لئے منافع لینا بھی جائز ہے، تاہم بہتر یہ ہے کہ مطلوبہ چیز مہیا کرنے کے بعد دوکاندار گاہک پر واضح کردے کہ یہ چیز میں آپ کو اتنے میں فروخت کرتا ہوں پسند ہو تو لے لینا تاکہ گاہک مروت کی وجہ سے اپنے کو لینے کا پابند نہ سمجھے جبکہ توکیل کی صورت میں گاہک بلا وجہ لینے سے انکار نہیں کرسکتا اور ایسی صورت میں دوکاندار کے لئے منافع لینا بھی جائز نہیں ہے۔

ولما فی الشامی:(۵۰۹/۵ طبع سعید)

ولو قال اشتر هذه الجارية بالف درهم كان مشورة والشراء للمامور الا اذا قال البائع على ان اعطيك لاجل شرائك درهما لان اشتراط الاجر له يدل على الانابة والعادانه ليس كل امر توكيلا بل لابد مما يفيد كون فعل المامور بطريق النيابة عن الآمر فليحفظ.

الجواب صحیح: عبد الرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: نعیم اقبال عفا اللہ عنہ

۱۷ صفر ۱۴۳۱ھ — فتویٰ نمبر: ۲۳۳۵

﴿زمین میں پوشیدہ چیزوں کی خرید و فروخت کا حکم﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام کہ ہمارے گاؤں میں بعض حضرات گاجر، مونگ پھلی وغیرہ کی خرید و فروخت اس طرح کرتے ہیں کہ جب ان کی کاشت کا وقت قریب آتا ہے تو زمین میں ہی فروخت کرتے ہیں حالانکہ نہ تو مبیع کی حقیقی مقدار کا علم ہوتا ہے اور نہ ہی مبیع نظر آرہی ہوتی ہے، آیا ایسی خرید و فروخت درست ہے یا نہیں؟ مستفتی: امان اللہ کرک

﴿جواب﴾ صورت مسئولہ میں خرید و فروخت کا یہ معاملہ شرعاً جائز ہے بشرطیکہ معاملہ کرتے وقت اس بات کا یقین ہو کہ گاجر، مونگ پھلی وغیرہ کا واقعی وجود ہے اگرچہ یہ چیزیں نظر نہ آرہی ہوں، البتہ مشتری کو خیار رؤیت حاصل ہوگا یعنی گاجر، مونگ پھلی وغیرہ کا کچھ حصہ زمین سے نکالنے کے بعد مشتری کو اختیار ہے پسند آنے کی صورت میں بیع کو برقرار رکھے اور ناپسندیدگی کی صورت میں بیع فسخ کردے۔

لما فی الشامی:(۵۱۲/۴ طبع سعید)

وما فی المبسوط من ان الاشارة اليه أو الى مكانه شرط الجواز ... وفی العناية قال القدوری: من اشترى شيئا لم يره فالبيع جائز ... وكذلك العين الغائب المشار الى

مکانه ولیس فی ذلک المکان بذلک الاسم غیر ماسمی والمکان معلوم باسمه والعین معلومة،وقال صاحب الاسرار:لان کلامنافی عین هی بحالة لوکانت الرؤیة حاصلة لکان البیع جائزاً وفی الدر المختار:(۵/۵۲،طبع سعید)

ولمافی الهندیة:(۳/۶۳طبع رشیدیه)

ولواشتری شیئاًمغیباًفی الارض کالبصل والثوم والجزروماشبهه لم یکن مرؤیة بعضه مختاراوهوعلی خیاره مالم یره جمیعه وهذاعندابی حنیفةؒ وعندهمااذاقلع شیئا منه یستدل به علی الباقی ورضی به سقط خیاره کذافی السراج الوهاج.وهذااذاکان المغیب معلوماوجوده فی الارض فان باعه قبل النبات اوبعدمانبت فی الارض الا انه لایدری اهونابت فی الارض اولیس بنابت لایجوزبیعه.

الجواب صحیح:عبدالرحمٰن عفااللہ عنہ واللہ اعلم بالصواب:نعیم اقبال عفااللہ عنہ

۲۳صفرالخیر۱۴۳۱ھ فتویٰ نمبر:۲۳۷۶

﴿زمین میں پوشیدہ پیاز وغیرہ کی بیع درست ہے﴾

﴿سوال﴾ کیافرماتے ہیں مفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ہم پیاز اور سبزیاں وغیرہ کی کاشت کرتے ہیں بعض اوقات پیاز زمین سے نکالنے سے پہلے ہم اس کی بیع کرتے ہیں ،جس کا طریقہ یہ ہوتا ہے کہ خریدار ظاہری اوپر سے پیاز کی فصل دیکھ کر یا زیادہ زیادہ مختلف حصوں سے کچھ پیاز نکال کر دیکھتا ہے اور پھر کسی قیمت پر ہمارے مابین عقد ہو جاتا ہے۔کیا ازروئے شرع ہمارا یہ معاملہ جائز ہے یا نہیں؟برائے مہربانی وضاحت فرمائیں۔مستفتی:غلام رسول

﴿جواب﴾ خریدار کھیت کے مختلف حصوں سے کچھ پیاز نکال کر اگر دیکھ لے اور باقی کھیت میں دیکھے بغیر سودا اس کو منظور ہو تو شرعاً یہ سودا جائز اور معتبر ہے۔خدانخواستہ بعد میں اس کے اندازے سے فصل کم نکلے تو اسے انکار کرنے کی گنجائش نہیں ہوگی۔

لمافی الشامی:(۴/۵۲۹طبع سعید)

وشرط لصحته معرفة قدر مبیع وثمن .وفی الشامیة:لوکان قدر المبیع مجهولا ای جهالة فاحشة فانه لایصح .....والمشتری لایعلم مافیها لایصح لفحش الجهالة اما لو باعه جمیع مافی هذا البیت ،أو الصندوق او الجوالق فانه یصح لان الجهالة یسیرة قال فی التنبه :الا اذا کان لایحتاج معه الی التسلیم والتسلم ،فانه یصح بدون معرفة قدر المبیع ،کمن اقر أن فی یده متاع فلان غصبا أو ودیعة ثم اشتراه جاز وان لم یعرف مقداره اه ومعرفة الحدود تغنی عن معرفة المقدار.

لمافی قاضی خان :(۲/۳۷طبع قدیمی)

وان اشتری شیأ مغیبافی الارض کالجزر والبصل والثوم والشلجم والفجل ذکر الشیخ

الامام على بن محمد البزدوی قال: اذا قلع البائع بعضها او قلع المشتری باذن البائع فرآه ورضی به عن ابی حنیفة فیه روایتان فی روایة: بطل خیاره فیما رآه وله الخیار فیما لم یره وعنه فی روایة: مالم یر الکل بعد القلع لا یبطل خیاره — وعن ابی یوسف انه قال ان کان المغیب فی الارض مما یکال أو یوزن بعد القلع: کالثوم والبصل والجزر فقلع المشتری شیئاً باذن البائع أو قلع البائع — فاذا رأی المقلوع ورضی به لزم البیع فی الکل ویکون رؤیة البعض کرؤیة الکل اذا وجد الباقی — والفتوی فی هذه المسائل علی قول ابی یوسف.

ولما فی الهندیة: (۲/ ۶۲ طبع رشیدیه)

ولو اشتری شیئاً مغیباً فی الارض کالبصل والثوم والجزر وما اشبهه لم یکن برؤیة بعضه مختارا وهو علی خیاره مالم یره جمیعه وهذا عند ابی حنیفة وعندهما اذا قلع شیئا منه یستدل به علی الباقی ورضی به سقط خیاره کذا فی السراج الوهاج وهذا اذا کان المغیب معلوما وجوده فی الارض فان باعه قبل النبات او بعد ما نبت فی الارض الا انه لایدری اهو نابت فی الارض اولیس بنابت لا یجوز بیعه.

الجواب صحیح: مفتی عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ   واللہ اعلم بالصواب: عزیز احمد خضداری غفرلہ ولوالدیہ

۴ رجب المرجب ۱۴۳۵ھ   فتویٰ نمبر: ۴۲۳۳

﴿دکان دار کی غیر موجودگی میں زائد رقم کو اپنے پاس رکھنا﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام مندرجہ ذیل مسئلہ کے بارے میں کہ میری کپڑے کی دکان ہے اور میرے سامنے میرے دوست کی بھی پینٹ شرٹ کی دکان ہے، جب میرا دوست نماز کے لئے جاتا ہے، وہ میرے حوالے دکان کر کے جاتا ہے اور کہتا ہے کہ یہ شرٹ ۲۰۰ روپے میں فروخت کرنا اور فلاں پینٹ ۵۰۰ سو روپے میں فروخت کرنا۔

اب میں اسطرح کرتا ہوں کہ وہ شرٹ وغیرہ ۳۰۰ سو روپے کی فروخت کر کے ۲۰۰ سو روپے اسکو دیتا ہوں اور ۱۰۰ سو روپے خود رکھتا ہوں، کیا میرا اسطرح کرنا درست ہے؟ اور یہ رقم میرے لئے جائز ہے؟ جواب دے کر عنداللہ ماجور ہوں۔   مستفتی: محمد تابش پوسٹ گارڈ

﴿جواب﴾ مسئولہ صورت میں آپ کی حیثیت اپنے دوست کی جانب سے دلال اور وکیل کی ہے، آپ تمام کام اسکی خیر خواہی میں انجام دے رہے ہیں، اس وجہ سے جس قیمت پر سامان فروخت کیا ہے اسکی تمام قیمت دوست کو دینا لازم ہے، اس کا استعمال آپ کیلئے جائز نہیں ہے۔

لما فی شرح المجلة: (۲/ ۶۷۷ طبع رشیدیه)

لو اعطی احد ماله للدلال وقال بعه بکذا درهم فان باعه الدلال بأزید من ذلک

فالفاضل ایضا لصاحب المال ولیس للدلال سوی الاجرۃ.

ولما فی بدائع الصنائع:(۲۷/۶،طبع سعید کمپنی)

فالوکیل بالبیع فالتوکیل بالبیع لایخلواما ان یکون مطلقاواماان یکون مقیدافان کان مقیدابراعی فیه القیدبالاجماع حتی انه اذاخالف قیده لاینفذعلی الموکل ولکن یتوقف علی اجازته الاان یکون خلافه الی خیرلماان الوکیل یتصرف بولایة مستفادة من قبل الموکل فیلی من التصرف قدرماولاہ وان کان الخلاف الی خیر فانماینفذلانه ان کان خلافاصورة فهووفاق معنی لانه آمربه دلالة فکان متصرفا بتولیة الموکل فینفذ بیان هذہ الجملة.

الجواب صحیح: عبدالرحمن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: محمد زبیر اکرام

۱۳ جمادی الاولی ۱۴۳۱ھ — فتوی نمبر: ۲۶۹۱

﴿مجہول چیز کی کفالت کا حکم﴾

﴿سوال﴾ کیافرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک شخص دکاندار سے سوداخریدتا ہے لیکن دکاندار اس کوعدم اعتماد کی وجہ سے نہیں دیتا،دوسرا آدمی دکاندار سے کہتا ہے کہ تم اسکوسودادیدیا کرو جتنی رقم خرچ ہوگی،اسکا میں ذمہ دار ہوں تو یہ مجہول چیز کی کفالت درست ہے یانہیں؟

﴿جواب﴾ کسی شخص کی طرف سے مال کی ذمہ داری لینا کفالت ہے جسمیں بنیادی طور پر ہمدردی کا جذبہ کارفرما ہوتا ہے،ایسے امور میں معمولی جہالت قابل برداشت ہے،صورت مسئولہ میں بھی ایسے شخص کا مجہول چیز میں ذمہ داری اٹھانا جائز ہے۔

لمافی البحر الرائق:(۲۱۸/۶،طبع ایچ ایم سعید)

(قوله ومابایعت فلانافعلی)من امثلة الکفالة بالمجهول وفی المبسوط ولوقال اذا بعته شیئافهوعلی فباعه متاعابالف درهم ثم باعه متاعابعدذلک بالف درهم لزم الکفیل الاول دون الثانی لان حرف اذالایقتضی التکرار بخلاف کلماوماومثل اذامتی.

ولمافی الهندیة:(۲۵۴/۳،طبع رشیدیه)

ولوقال من بایعک من هؤلاء واشارالی قوم معدودین فاناکفیل عنک بثمنه جازلان المکفول له معلوم کذافی خزانة المفتیین.

ولمافی الهندیة:(۲۵۱/۳،طبع رشیدیه)

ولوقال لرجل مابایعت فلانافهوعلی جازلانه اضاف الکفالة الی سبب الوجوب وهوالمبایعة.

ولمافی الهندیة:(۲۵۱/۳،طبع رشیدیه)

الکفالة بالمال جائزة معلوماکان اومجهولاباموالمکفول عنه اوبغیر امره.

الجواب صحیح: عبدالرحمن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: احمد علی عفی عنہ

۱۵ ربیع الثانی ۱۴۳۱ھ — فتوی نمبر: ۲۵۹۶

﴿قسطوں پر معاملہ کرنا درست ہے﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام مندرجہ ذیل مسئلہ کے بارے میں کہ (۱) قسطوں پر سامان لینا جائز ہے یا نہیں؟ (۲) یہ بیع کی کون سی قسم ہے؟ (۳) قسطوں میں تاخیر کی وجہ سے جرمانہ لینا جائز ہے یا نہیں؟

مستفتی: عبدالعزیز سنہری مسجد کورنگی

﴿جواب﴾ (۱) قسطوں پر خرید و فروخت کرنا جائز ہے بشرطیکہ سودا کرتے وقت قیمت متعین ہو اور قسطوں کی ادائیگی کی تاریخ بھی معلوم ہو۔ (۲) بیع بالتقسیط سے موسوم ہے۔ (فقہی مقالات: ۱/۸۲، طبع میمن اسلامک پبلیشرز، شیخ الاسلام مفتی تقی عثمانی صاحب مدظلہ) (۳) قسط میں تاخیر کی وجہ سے جرمانہ لینا جائز نہیں ہے بلکہ یہ حکماً سود ہے۔

لما فی جامع الترمذی: (۱/۱۴۷، طبع فاروقی ملتان)

عن ابی هریرة قال: نهی رسول الله ﷺ عن بیعتین فی بیعة ـــ وقد فسر بعض اهل العلم قالوا بیعتین فی بیعة ان یقول ابیعک هذا الثوب بنقد بعشرة وبنسیئة بعشرین ولا یفارقه علی احد البیعین فاذا فارقه علی احدهما فلا باس اذا کانت العقدة علی واحد منهما.

ولما فی البحر الرائق: (۶/۱۱۴-۱۱۵، طبع سعید کمپنی)

لان للاجل شبها بالمبیع الاتری انه یزاد فی الثمن لاجل الاجل ان الاجل فی نفسه لیس بمال فلا یقابله شئی حقیقة اذا لم یشرط زیادة الثمن بمقابله قصدا ویزاد فی الثمن لاجله اذا ذکر الاجل بمقابلة زیادة الثمن قصدا فاعتبر مالا فی المرابحة احترازا عن شبهة الخیانة ولم یعتبر مالا فی حق الرجوع عملا بالحقیقة.

ولما فی الهدایة: (۳/۷۸، باب المرابحة طبع رحمانیه)

الا یری انه یزاد فی الثمن لاجل الاجل والشبهة.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ | واللہ اعلم بالصواب: محمد زبیر اکرام

۳ جمادی الاولیٰ ۱۴۳۱ھ | فتویٰ نمبر: ۲۶۹۵

﴿سیل مین کا جھوٹ بول کر سامان فروخت کرنا جائز نہیں ہے﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام مندرجہ ذیل مسئلہ کے بارے میں کہ میری ایک دکان ہے، اس میں ۵-۶ سیلز مین کام کرتے ہیں، بعض سیلز مین کی تنخواہ مقرر ہے لیکن دو سیلز مین کمیشن پر ہیں اگر دو ہزار کی سیل کریں تو ۲۰۰ سو روپے انکو ملتے ہیں تو یہ سیلز مین اپنا کمیشن زیادہ کرنے کے لئے خریدار سے کچھ زیادہ جھوٹ بولتے ہیں تا کہ چیز زیادہ منافع میں فروخت ہو اور انکو نفع زیادہ

ہو، اب معلوم یہ کرنا ہے کہ انکے جھوٹ سے ہماری جو کمائی ہوئی ہے وہ جائز ہے اور جھوٹ بول کر فروخت کرنا کیسا ہے؟

مستفتی: مقصود علی ناظم آباد کراچی

﴿جواب﴾ جھوٹ بول کر خرید و فروخت کرنا جائز نہیں کیونکہ جھوٹ فی نفسہ حرام ہے اور اس صورت میں دھوکا بھی ہے، سیل مین کی حیثیت آپکی جانب سے دلال اور وکیل کی ہے دھوکہ کے ذریعہ زیادہ منافع حاصل ہوئے ہوں تو اصل مالک کو لوٹانا ضروری ہے اور یہ ممکن نہ ہو تو اسکی طرف سے صدقہ کرنا ضروری ہے۔

لمافی مشکوۃ المصابیح:(ص ۲۴۳ طبع سعید کمپنی)

التجار یحشرون یوم القیمۃ فجار االا من اتقی وبر وصدق۔

ولمافی بدائع الصنائع:(۳۳/۶، طبع سعید کمپنی)

ان الوکیل متصرف بطریق النیابۃ عن الموکل وتصرف النائب تصرف المنوب عنہ الاتری ان حکم تصرفہ یقع للموکل فکذا حقوقہ لان الحقوق تابعۃ للحکم والحکم ھو المتبوع فاذا کان الاصل لہ فکذا التابع۔

ولمافی صحیح البخاری:(۳۱۷/۱، طبع قدیمی)

قال رسول اللہ ﷺ ثلثۃ لاینظر اللہ الیھم یوم القیمۃ ولا یزکیھم ولھم عذاب الیم — ورجل اقم سلعتہ بعد العصر فقال واللہ الذی لا الہ غیرہ لقد اعطیت بھا کذا وکذا فصدقہ رجل۔

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: محمد زبیر اکرام

۱۱ ربیع الثانی ۱۴۳۱ھ — فتوی نمبر: ۲۵۹۰

﴿مروجہ پگڑی کے معاملہ کی شرعی حیثیت﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کہ بارے میں کہ میں نے ایک دوکان پگڑی پر لی ہے پندرہ لاکھ روپے میں، ہر ماہ سات سو روپے اس شخص کو ادا کرتا ہوں جس سے دوکان لی ہے، چونکہ دوکان پگڑی پر ہے، لہذا آگے کسی اور کو وہ دوکان ہم اس شخص کی اجازت کے بغیر نہیں بیچ سکتے مزید یہ کہ اسکی اجازت سے بیچ بھی دیں تو ہمیں اس شخص کو ۲۰ فیصد اسمیں سے ادا کرنا ہوگا سوال یہ ہے کہ اس بیع کی شرعی حیثیت کیا ہے؟ اور پندرہ لاکھ روپے جو اس شخص کو دیئے ہوئے ہیں ان پر زکوۃ ہے یا نہیں؟

مستفتی: محمد فیصل دہلی کالونی

﴿جواب﴾ مروجہ پگڑی کا معاملہ شرعا جائز نہیں ہے اور پگڑی کے نام پر کرایہ دار سے لی

جانے والی رقم شریعت کے کسی قاعدہ پر منطبق نہیں ہوتی، لہٰذا یہ رشوت اور حرام ہے جس سے بچنا ضروری ہے، البتہ مروجہ پگڑی کے متبادل کے طور پر درج ذیل صورتیں ہوسکتی ہیں:

(۱) مالک دکان کے لیے جائز ہے کہ وہ کرایہ دار سے خاص مقدار میں یکمشت رقم لے لے جسے متعینہ مدت کا پیشگی کرایہ قرار دیا جائے، یہ یکمشت رقم سالانہ یا ماہانہ کرایہ کے علاوہ ہوگی، اس یکمشت رقم پر اجارے کے سارے احکام جاری ہونگے اگر کرایہ داری کا معاملہ کسی وجہ سے طے شدہ مدت سے پہلے ختم ہوجائے تو مالک کے ذمہ واجب ہوگا کہ اجارہ کی باقی ماندہ مدت کے مقابل یک مشت رقم کا جتنا حصہ آرہا ہے اسے واپس کردے۔

(۲) اگر کرایہ داری کا معاملہ متعینہ مدت کے لئے ہوا ہے تو کرایہ دار کو اس مدت تک کرایہ داری باقی رکھنے کا حق ہے، لہٰذا اگر کوئی دوسرا شخص یہ چاہے کہ پہلا کرایہ دار اپنے حق سے دستبردار ہوجائے اور یہ دوسرا شخص اسکی جگہ کرایہ دار ہوجائے تو پہلے کرایہ دار کے لئے یہ جائز ہے کہ دوسرے شخص سے عوض کا مطالبہ کرے، اور پہلے کرایہ دار کا یہ عمل بالعوض، حق کرایہ داری سے دستبرداری کا عمل ہوگا لیکن اسکے لئے یہ شرط ہے کہ اصل کرایہ داری کا معاملہ معینہ مدت کے لئے کیا گیا ہو مثلاً دس سال کے لئے اور دس سال پورے ہونے سے قبل پہلا کرایہ دار دستبردار ہورہا ہو، جہاں تک مذکورہ رقم پر زکوۃ کا مسئلہ ہے تو یہ ضمار کے حکم میں ہے کیونکہ اس میں غالب اس رقم کا نہ ملنا ہی ہے، لہٰذا اس پر زکوۃ واجب نہیں اور اگر یہ رقم مل گئی تو اس وقت سے اسپر زکوۃ کے احکام لاگو ہونگے۔

قال شيخ الاسلام مفتى محمدتقى العثمانى حفظه الله:

تحقق مماذكرناان بدل الخلوالمتعارف الذى ياخذه المؤجرمن مستاجره لايجوز ولا ينطبق هذاالمبلغ الماخوذعلى قاعدة من القواعدالشرعية ،وليس ذلك الارشوة حراما نعم يمكن تعديل النظام الرائج للخلوالى مايلى:(١)يجوز للمؤجران ياخذمن المستاجرمقدارامقطوعامن المال،الخ.فى الملتقى:ولافى مال ضمار بالكسرمغلى وشرعامال زائل اليدغيرمرجوالوصول غالبا وانمالاتجب الزكوة عندهم لان كلامن الملك والنماء فيه مفقود(فتوى نمبر:١٢٢٠(٢٦)ازتبويب دارالافتاء دارالعلوم كراچى)

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ

واللہ اعلم بالصواب: نعمان اقبال عفا اللہ عنہ

۲۱ ربیع الثانی ۱۴۳۱ھ

فتوی نمبر: ۲۶۳۸

﴿ایک وارث کا دوسرے وارث کو اپنے حصہ کی زمین کم قیمت پر فروخت کرنا﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ زید اور بکر دو بھائی ہیں اور دونوں کو وراثت میں زمین ملی، اب زید اپنے بھائی بکر کو کچھ رقم پیش کرتا ہے اور کہتا ہے کہ تمہارا جو حصہ زمین میں ہے اسکی عوض مجھ سے اتنی رقم لے لو اور زمین کو چھوڑ دو، دونوں اس پر راضی ہو گئے حالانکہ زید نے جو رقم دی ہے وہ بکر کے زمین کے حصہ کے بنسبت کم ہے، آیا شرعا یہ صورت جائز ہے یا نہیں؟ مستفتی: عمران خان بنارس

﴿جواب﴾ بکر اگر سمجھدار ہے یعنی فائدہ ونقصان کو جانتا ہے اور خوشی ورضامندی سے کم پیسوں کے بدلے بھائی کو قیمتی زمین دے رہا ہے تو اس میں کوئی قباحت نہیں ہے۔

لمافی التنویر مع الدر:(۶۴۲/۵،طبع ایچ ایم سعید)

(اخرجت الورثة احدهم عن)التركة وهي(عرض او)هي(عقار بمال)اعطاه له(او)اخرجوه (عن)تركة هي(ذهب بفضة)دفعوها له(او)على العكس او عن نقدين بهما(صح)في الكل صرفا للجنس بخلاف جنسه(قل)مااعطوه(اوكثر)

ولمافي البداية:(۲۶۰/۲،طبع رحمانيه)

واذاكانت التركة بين ورثة فاخرجوااحدهم منهابمال اعطوه اياه والتركة عقاراوعروض جاز قليلاكان مااعطوه اوكثيرا.

ولمافي الهندية:(۲۶۸/۴طبع رشيديه كوئٹه)

اذاكانت التركة بين ورثة فاخرجوااحدهم منهابمال اعطوه اياه والتركة عقاراوعروض صح قليلاكان مااعطوه اوكثيرا.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: عقیل احمد حقانی عفی عنہ

۱۴ ربیع الاول ۱۴۳۱ھ — فتویٰ نمبر: ۲۵۲۸

﴿خریدے ہوئے درختوں کو کہاں سے کاٹا جائے؟﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام کہ ہمارے گاؤں میں زمین میں لگے ہوئے درختوں کی خرید وفروخت ہوتی ہے، پوچھنا یہ ہے کہ خریدنے کے بعد ان کو سطح زمین سے کاٹا جائے یا جڑوں سے اکھیڑ لیا جائے، کیا شریعت نے اس کی کوئی حد مقرر کی ہے یا نہیں؟

﴿جواب﴾ درختوں کی خرید وفروخت میں بائع ومشتری کا معاملہ کاٹنے سے متعلق اگر واضح

نہ ہو تو اس علاقہ کے عرف کے مطابق کاٹنا ہوگا، البتہ سودا کرتے وقت کاٹنے کی جگہ متعین ہوئی ہو تو اسی جگہ سے کاٹنا ضروری ہوگا اگرچہ عرف اس کے خلاف ہو۔

لمافی الشامی:(۴/۵۵۴،طبع سعید)

اشتری شجرة للقطع یومر بقلعها بعروقها ولیس له حفر الارض الی انتهاء العروق بل یقلعها علی العادة الاان شرط البائع القطع علی وجه الارض، اویکون فی القطع من الاصل مضرة للبائع ککونها بقرب حائط او بئر فیقطعها علی وجه الارض وکذافی البحر الرائق:(۵/۲۱۴،طبع سعید)والهندیة:(۳/۳۵،طبع رشیدیه)

ولمافی الشامی:(۵/۲۳۸،طبع سعید)

لوباع شجرة ان بین موضع قطعها من وجه الارض فعلی ذلک وان بین باصلها فعلی قرارها من الارض وان لم یبین له ان یقطع من اصلها الاان تقوم دلالة اه.

الجواب صحیح: عبد الرحمٰن عفا اللہ عنہ واللہ اعلم بالصواب: نعیم اقبال عفا اللہ عنہ

۶ ربیع الثانی ۱۴۳۶ھ فتویٰ نمبر: ۲۶۱۴

﴿خرید وفروخت میں نفع کا معیار﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان دین اس مسئلہ کے بارے میں کہ میری سبزی کی دکان ہے، جس میں ہر قسم کی سبزیاں بیچی جاتی ہیں، کچھ سبزیاں بہت جلد خراب ہو جاتی ہیں اور ان کی مانگ بھی نہ ہونے کے برابر ہے، بسااوقات ہمیں پھینکنی پڑتی ہیں اور دگنا نقصان اٹھاتے ہیں لیکن دکان داری ہے رکھنا پڑتا ہے، پوچھنا یہ ہے کہ ہم ایسی سبزیوں کو مثلاً اگر ۱۰ روپے کلو میں ہمیں ملے تو ہم ۵۰ یا ۶۰ روپے کلو کے حساب سے فروخت کر سکتے ہیں یا کہ نہیں آیا اتنا نفع میرے لئے جائز ہے یا نہیں؟ جبکہ پوری مارکیٹ میں یہی ریٹ چل رہا ہو۔ مستفتی: خان محمد ڈیفنس فیز ۲

﴿جواب﴾ شریعت مطہرہ نے کسی بھی چیز پر زیادہ سے زیادہ نفع حاصل کرنے کو حرام یا ناجائز کے درجے میں منع نہیں فرمایا، ہر شخص کو اپنی مملوکہ اشیاء خواہ جتنے بھی نفع پر بیچنا چاہے اجازت ہے بشرطیکہ ظلم اور دھوکا نہ ہو لیکن مروت، ہمدردی اور انسانوں کی خیر خواہی کا تقاضہ یہ ہے کہ نفع کی مقدار کم، مناسب اور مارکیٹ کے مطابق رکھا جائے جیسا کہ احادیث میں بھی اجمال فی الطلب کا ذکر آیا ہے اور لوگوں کی ہمدردی، خیر خواہی کی غرض سے کم نفع پر بیچنا بلا شبہ باعث برکت وثواب ہوگا، لہٰذا صورت مسئولہ میں آپ کا ۱۰ روپے کلو والی سبزی کو ۵۰ یا ۶۰ روپے میں

فروخت کرنا نہ صرف جائز ہے بلکہ مذکورہ عذر کی وجہ سے اتنے پیسوں میں بیچنا مروت کے خلاف بھی نہیں ہے۔

لمافی کنز العمال:(۲/۲۱،طبع رحمانیه)سيد السلعة احق ان يسام.

ولمافی الهندية:(۳/۱۶۱،طبع رشيديه)

اشترى متاعاً ورقم باكثر من ثمنه فباعه مرابحة على الرقم جاز ولا يقول قام على بكذا.

ولمافی احياء علوم الدين:(۲/۱۱۰،دار الكتب العلمية)

ومهما لم يكن تلبيس لم يكن اخذ الزيادة ظلماً.

ولمافی فقه السنه:(۳/۱۲۳،طبع دار الكتب العلمية)

وروى ابن ماجه والحاكم عن ابن عمران رسول الله صلى الله عليه وسلم قال:الجالب مرزوق والمحتكر ملعون والجالب هو الذي يجلب السلع ويبيعها بربح يسير.

ولمافی الجامع العلوم والحكم:لابن رجبؒ الحديث السابع:(۱/۲۲۲،طبع بيروت)

واما النصيحة للمسلمين فان يحب لهم ما يحب لنفسه ويكره لهم ما يكره..... ويفرح لفرحهم وان ضره ذلك فی دنياه كرخص اسعارهم.

الجواب صحیح:عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب:نعیم اقبال عفا اللہ عنہ

۱۰صفر ۱۴۳۱ھ — فتویٰ نمبر:۲۴۶۶

﴿غیر ملکی کرنسی کو روک کر رکھنا پھر زیادہ منافع سے بیچنے کا حکم﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ ایک آدمی جاپانی کرنسی خریدتا ہے اور اپنے پاس محفوظ رکھتا ہے جب انکی قیمت مارکیٹ میں بڑھ جاتی ہے تب اس کرنسی کو زیادہ منافع کیساتھ بیچ دیتا ہے، پوچھنا یہ ہے کہ کرنسی کی اسطرح خرید وفروخت جائز ہے کہ نہیں؟ اور یہ سود میں تو شمار نہیں ہوگا؟

مستفتی:احسن رابعہ صاحب

﴿جواب﴾ دو مختلف ملکوں کی کرنسی کو کمی وزیادتی کیساتھ بیچنا جائز ہے کیونکہ مختلف ممالک کی کرنسیوں کی جنس مختلف ہے، اس لئے جب کرنسیوں کی جنس الگ الگ ہو تو کمی وزیادتی کیساتھ بیچنا جائز ہے۔ جیسے سعودی ایک ریال کو (۲۲) بائیس روپے پاکستانی کے بدلے بیچنا جائز ہے، اس لئے کچھ مدت تک مہنگا بیچنے کی غرض سے رکھنا بھی جائز ہے۔

لمافی بحوث فی قضايا فقهية معاصرة:(۱/۱۶۹،طبع دار العلوم كراچی)

فتبين أن عملات الدول المختلفة أجناس مختلفة،ولذلك تختلف أسماءها وموازينها

ورحداتها المتشعبة منها، ولما كانت عملات الدول اجناسا مختلفة ،جاز بيعها بالتفاضل بالأجماع ـــ واما عند أبي حنيفةؒ واصحابه، فلأن تحريم بيع الفلس بالفلسين مبنى عندهم على كون الفلوس أمثالا متساوية قطعا، فيبقى عند التفاضل فضل خال عن العوض، ولكن عملات البلاد المختلفة لما كانت أجناسا مختلفة، لم تكن أمثالا متساوية، فلا يتصور الفضل الخالي عن العوض، فيجوز اذن أن يباع الريال السعودى مثلا بعدد أكثر من الروبيات الباكستانية.

الجواب صحیح: عبدالرحمٰن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب: علی خان

۷ جمادی الاولی ۱۴۳۱ھ — فتویٰ نمبر: ۲۶۸۳

﴿انسان کے بال کی خرید وفروخت جائز نہیں ہے﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیانِ شرع دین اس مسئلہ کے بارے میں کہ ہمارے علاقہ میں بعض لوگ عورتوں کے وہ بال جو کنگھی کرتے وقت کنگھی میں رہ جاتے ہیں خریدتے ہیں۔ اور بسا اوقات مہنگے بھی خریدتے ہیں پوچھنا یہ ہے کہ بنی آدم کے بال کی خرید وفروخت جائز ہے یا نہیں۔ مستفتی: مولوی فضل رحمانی

﴿جواب﴾ انسان اشرف المخلوقات ہے جس طرح وہ محترم ہے اسکے بدن کے اجزاء بھی محترم ہیں۔ بال بھی انسان کے بدن کا جزء وحصہ ہے۔ شریعت نے بیچنے کو سختی سے منع فرمایا ہے نہ صرف بیچنا بلکہ دوسرے کے استعمال میں لانے کو بھی منع کیا ہے۔ اسلئے کہ بیچنا اور استعمال میں لانا احترام کے منافی ہے۔

لما في التنوير مع الدر والرد: ۵/۵۸، طبع سعيد

(كما بطل بيع صبى لا يعقل ومجنون...... وشعر الانسان) لكرامة الآدمى ولو كان كافرا ذكره المصنفؒ وغيره في بحث الخنزير (قوله وشعر الانسان) ولا يجوز الانتفاع به لحديث " لعن الله الواصلة والمستوصلة"

(ولما في شرح الطحطاوى: ۳/۶۱، طبع رشيديه)

(قوله ذكره المصنف) حيث قال والآدمى مكرم شرعا وان كان كافرا فايراد العقد عليه وابتذاله به والحاقه بالجمادات اذلال له انتهى اى وهو غير جائز وبعضه في حكمه وصرح في فتح القدير ببطلانه.

(ولما في الهداية: ۳/۵۴، طبع رحمانيه)

ولا يجوز بيع شعور الانسان ولا الانتفاع به لأن الآدمى مكرم لا مبتذل فلا يجوز أن

یکون شیئی من أجزائه مهانا ومبتذلا وقد قال ﷺ "لعن الله الواصلة والمستوصلة" الحدیث.

ولما فی فتح القدیر:(۲۹۱/۲، طبع رشیدیه کوئٹه)

(ولا یجوز بیع شعر الانسان)مع قولنا بطهارته (والانتفاع به لأن الآدمی مکرم غیر مبتذل فلا یجوز أن یکون شیئی من أجزائه مهانا ومبتذلا)وفی بیعه اهانة وکذا فی امتهانه بالانتفاع، وقد قال ﷺ فیما ثبت عنه فی الصحیحین(لعن الله الواصلة والمستوصلة والواشمة والمستوصلة)

ولما فی العنایة بهامش فتح القدیر:(۲۹۱/۲،۲۹۲)

(ولایجوز بیع شعور الانسان الخ)بیع شعور الآدمیین والانتفاع بها لایجوز وعن محمد أنه یجوز الانتفاع بها استدلالا بما روی" أن النبی حین حلق رأسه قسم شعره بین أصحابه فکانوا یتبرکون به" ولو کان نجسا لما فعله ، اذ النجس لا یتبرک به، وجه الظاهر أن الآدمی مکرم غیر مبتذل وما هو کذالک لا یجوز أن یکون شیئی من أجزائه مبتذلا مهانا وفی البیع والانتفاع ذلک، ویؤید ذلک قوله ﷺ"لعن الله الواصلة والمستوصلة"

الجواب صحیح:مفتی عبدالرحمن عفا اللہ عنہ — واللہ اعلم بالصواب:عمران الحق

۱۰ ربیع الثانی ۱۴۳۵ھ — فتوی نمبر:۴۰۳۷

﴿فروخت کردہ چیز واپس زیادہ قیمت دیکر لینا لینا جائز ہے﴾

﴿سوال﴾ کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے کہ میں ایک شخص سے گاڑی دولاکھ میں لے رہا ہوں اور اسکو نقد دے رہا ہوں پھر وہی مجھ سے اڑھائی لاکھ میں واپس گاڑی ادھار لے رہا ہے تو یہ جائز ہے یا نہیں؟ یاد رہے قبضہ بھی گاڑی پر کر لیتا ہوں اور اسکو واپس خریدنے کا پابند بھی نہیں کرتا اسکی مرضی ہے واپس لے یا نہ لے۔

﴿جواب﴾ آپ واقعی اس شخص کو ادھار اڑھائی لاکھ روپے میں دوبارہ خریدنے کا پابند اگر نہیں بناتے وہ اپنی مرضی سے زیادہ پیسوں سے وہی گاڑی واپس خریدنا چاھتا ہے تو شرعا اس میں کوئی قباحت نہیں ہے۔

(لمافی الجوهرة النیرة جزء الاول ،ص۲۷۰میر محمد کتب خانه)

(قوله ومن اشتری شیئا ممایتقل ویحول لم یجز له بیعه حتی یقبضه)مناسبة هذه المسئلة بالمرابحة والتولیة ان المرابحة انماتصح بعد القبض ولاتصح قبله وقید بقوله لم یجز بیعه ولم یجز ان یتصرف فیه یقع المسئلة علی الاتفاق فان عند محمد یجوز الهبة والصدقة والرهن قبل القبض فیما ینقل ویحول وکان عدم جواز البیع علی

الاتفاق كذا في النهاية ...الخ

(الفتاوى الهندية: ج٣/١٨، رحمانيه)

ومن اشترى شيئا مما ينقل ويحول لم يجز له بيعه حتى يقبضه لانه نهى عن بيع مالم يقبض ولان فيه غرر انفساخ العقد على اعتبار الهلاك.

(شرح مختصر الطحاوى: ج٣/١١٠، ١١١، كتاب البيوع)

قال ابوجعفر: ولا يجوز بيع مالم يقبض من الاشياء المبيعة الا العقار ...انما تعتبر التخلية في جواز البيع، وتقام مقام النقل فيما يتأتى فيه القبض الحقيقي.

قال الخجندي: اذا اشترى منقولا لا يجوز بيعه قبل القبض لا من بائعه ولا من غيره ...وقال محمد: لا يجوز بيع العقار قبل القبض اعتبارا كالمنقول

(البحر: ج٦/١٢٢، ١٢٥، باب المرابحة طبع دار المعرفة)

لان للأجل شبها بالمبيع الاترى انه يزاد في الثمن لأجله اذا ذكر الأجل بمقابلته زيادة الثمن قصدا فاعتبر مالاً في المرابحة احترازا شبهة الخيانة ولم يعتبر والا في حق الرجوع عملا بالحقيقة.

الجواب صحیح: مفتی عبدالرحمٰن عفااللہ عنہ

۸ جمادی الاولیٰ ۱۴۳۵ھ

واللہ اعلم بالصواب: صفی اللہ غفرلہ والوالدیہ

فتویٰ نمبر: ۴۱۴۰